منتخب ادب

منتخب ادب

ترتیب دینے والے :-

سیّد احتشام حسین
غلام ربّانی تاباں

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

پنجاب نیشنل پریس دہلی

۱۰

قیمت چھ روپے

بار اول ایکہزار

ترتیب

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

طنز و مزاح

ڈرامہ

عنوانِ انتخاب

یہ ایک شگون نیک ہے کہ اردو شعر و ادب کے انتخابات سال بہ سال مختلف ادبی مرکزوں سے
شایع ہو رہے ہیں اور انہیں مقبولیت بھی حاصل ہو رہی ہے۔ مقبولیت کی سب سے بڑی پہچان یہ
ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور لوگ ان کے مطالعہ کی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ زیر نظر
انتخاب ایک ایسے ہی نئے سلسلہ کا آغاز ہے اور متنوع مطالعہ کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے
جس نے اس سے پہلے بعض ناشرین کو منتخب ادب شائع کرنے پر آمادہ کیا۔ آسانی کے لئے ہم نے بھی
انتخاب کے لئے گزشتہ سال ہی کے ادبی سرمایہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ جس وقت ہم یہ انتخاب کر رہے
تھے ہمارے ذہن میں یہ سوال بار بار اٹھ رہا تھا کہ اسے سال کا بہترین ادب کہنا مناسب ہوگا یا
نہیں؟ اور ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس کے لئے بہترین کا لفظ استعمال کرنا درست نہیں۔ اس کے
متعدد اسباب ہیں اور ان پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے تمام رسائل کا بہ غور مطالعہ کر لیا ہے اگرچہ اس سلسلہ میں غیر
معروف رسائل دیکھنے پر یہ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ان میں بھی اچھی چیزیں شائع ہو جاتی ہیں اور عام طور سے
نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ اس انتخاب میں پچھلے سال میں شائع ہونے والے رسائل کے کچھ اچھے ادب
پارے ضرور آگئے ہیں اور اگر صفحات میں گنجائش ہوتی تو اس سے زیادہ لئے جا سکتے تھے بہت کچھ

بے لاگ، غیر جانب دار اور دیانتدار ہونے کے باوجود پسندیدگی اور انتخاب کے جچے تلے معیار مقرر کرنا محال ہے۔ انتخاب کے لئے کوئی ایسی کسوٹی استعمال نہیں کی جا سکتی جس پر آسانی سے ادبی تخلیقات کی اضافی قدر و قیمت کو یقینی طور پر پرکھا جا سکے۔ مجموعی تاثر اور عام فنی خصوصیات کے لحاظ سے پسندیدگی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں اور ادب کے کسی نمونے کو بہترین کہہ دینا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ صرف رسائل میں شائع ہونے والے ادب کو بہترین کیسے کہا جائے جب کہ بہت سی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اس انتخاب میں شائع ہونے سے رہ گئی ہیں۔ خود ہم لوگوں کو بہت سے اچھے لیکن طویل مضامین کو اس مجموعہ میں شامل کرنے سے احتراز کرنا پڑا کیونکہ صفحات کا دامن تنگ تھا۔ انہیں اہم کوتاہیوں کو پیش نظر رکھ کر ہم اس انتخاب کو بہترین کہنے سے گریز کرتے ہیں گو یہ ممکن ہے کہ ہماری طرح بہت سے اور مطالعہ کرنے والوں کو بھی ادبی تخلیقات سال بھر کے تحریری مواد میں سب سے زیادہ گراں قدر معلوم ہوں۔ ہم نے اپنی جانب سے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ انتخاب کرتے وقت اچھے ادب کی ان تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھیں جنھیں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے درست کہا جا سکتا ہے۔ معیاری انتخاب کے شرائط مختلف لوگوں کے خیال میں مختلف ہوں گے اور اس معاملہ میں سبھوں کا ہم خیال ہونا ضروری بھی نہیں ہے ایسے انتخاب میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ سال بھر کے اچھے ادب کا ضروری حصہ اس میں شامل کر لیا گیا ہے یا نہیں۔ بعض اوقات ایک ہی ادیب کی لکھی ہوئی مختلف چیزیں سامنے آتی ہیں اور اہمیت یا عصری تقاضوں کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، ایسی حالت میں ـــ اور خاص کر اس وقت جب ایک ہی مقالہ یا افسانہ انتخاب میں شامل کیا جا سکتا ہے ـــ انتخاب میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور صرف ایک مضمون کو انتخاب میں شامل کرنے کے خیال سے دوسروں کو نظر انداز کر دینا پڑتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اور مضامین معمولی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم صرف دو ہی ادبی تنقیدی مقالات کو لیتے ہیں اگر اور مضامین شائع ہو سکتے تو ہم ممتاز حسین، آل احمد سرور، مجتبیٰ حسین وغیرہ کے چند اور مضامین شامل کر لیتے۔ ہمارا خیال ہے کہ سال بھر کے مضامین میں حسب ذیل مقالات اہم ہیں اور ان کا مطالعہ مفید ہوگا۔

چند ادبی اصطلاحیں	ممتاز حسین	ادب لطیف لاہور
نیا ادبی فن	ممتاز حسین	شاہراہ دہلی

محبوب کے لئے فعل مذکر کا استعمال — ڈاکٹر عندلیب شادانی — نقوش لاہور
جدید اردو ادب کے بعض مسائل — ڈاکٹر عبادت بریلوی — نقوش لاہور
میرے بھی صنم خانے — جلال الدین احمد — نقوش لاہور

یہ فہرست مثال کے طور پر دی گئی ہے تاکہ انتخاب کرنے والوں کی دشواری اور مجبوری کا احساس پڑھنے والوں کو بھی ہو سکے یہ فہرست بھی بعض حیثیتوں سے نامکمل ہے۔ ایک ایسی ہی فہرست اچھے افسانوں، ڈراموں، نظموں اور غزلوں کی بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اسی بات سے ذہن ایک اور ضروری کام کی جانب منتقل ہوا کیسی نہ کسی ذمہ دار، حوصلہ مند اور محنتی نقاد کو قدیم اور جدید رسائل کے اہم مضامین کا ایک ایسا ہی اشاریہ تیار کر کے کسی رسالہ میں یا مختصر کتاب کی صورت میں شائع کر دینا چاہیئے تاکہ علمی کام کرنے والوں کو پتہ چل سکے کہ کس موضوع پر کس زمانہ میں کتنا کام ہوا ہے۔ یہ باتیں ضمناً آ گئی ہیں مقصود صرف اتنا تھا کہ ہمارے مطالعہ کرنے والے وسیع النظری اور وسیع القلبی سے اپنے ادبی ذخیروں کا مطالعہ کریں اور اس کے جتنے حصے کو محفوظ رکھ سکیں محفوظ رکھیں۔ رسالوں میں مضامین شائع ہوتے ہیں اور کھو جاتے ہیں، انتخابات میں اس کا کچھ نہ کچھ حصہ محفوظ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بہت کچھ بے لاگ ہونے کے باوجود انتخاب سے انتخاب کرنے والوں کے انداز نظر کی غمازی ہوتی ہے اسی طرح شعرا اور مصنفین بھی اپنی ساری کائنات اور اپنے پورے شعور کے ساتھ پڑھنے والوں کے روبرو پیش ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سال بھر کے اندر ایک ادیب یا شاعر نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے پچھلے کارناموں کے مقابلہ میں زیادہ اہم نہ ہو لیکن چونکہ اس کے کسی نمائندہ مضمون، افسانہ یا کارنامہ شعری کے انتخاب کی کوشش ہوتی ہے اس لئے وہ ادب پارہ اس کے نقطۂ نظر یا بدلتے ہوئے شعور کا پتہ ایک حد تک ضرور دے گا۔ اس بات کو بالکل ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ایک مضمون، افسانہ یا نظم کی بنا پر کسی مصنف کے بارے میں رائے قائم نہیں کی جا سکتی، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اسی ایک مضمون، افسانہ یا نظم میں اس نے وہ بات کہہ دی ہے جو اس کے شعور اور کمال فن کے ارتقا یا زوال کا پتہ دیتی ہے تو اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس انتخاب کے مطالعہ سے اور مطالعہ کی خواہش پیدا ہوتی ہے یا کسی مخصوص ادبی، سماجی یا سیاسی مسئلہ کی چھان بین کا جذبہ ابھرتا ہے یا ادب کا سماجی مقصد واضح ہوتا ہے تو

سمجھنا چاہئے کہ یہ انتخاب مرتبین کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا صرف سال بھر کے ادب ـــ اور وہ بھی محض رسائل میں شائع ہونے والے ادب کے انتخاب سے کسی ترقی کرتے ہوئے ادب کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا مگر ہم اُسے ایسا اشارہ یہ ضرور قرار دے سکتے ہیں جس میں شاعروں اور ادیبوں کی کامیابی اور ناکامی، الجھن اور کشاکش، خواہش اور خواب، ماضی کی جانب رویہ، حال کے تجزیہ اور مستقبل کے متعلق تمناؤں کی جھلک سبھی چیزیں مبہم اور ناقص شکل میں دیکھی جاسکتی ہیں جس سال کا انتخاب کیا جارہا ہے اگر اس میں کسی قوم کی زندگی نے زبردست کروٹ لی ہے تو اس کا واضح اثر ادب میں مل سکتا ہے ورنہ جو عام مسائل آہستہ آہستہ ادیبوں کے شعور میں جگہ پاتے رہے ہیں انہیں کا اظہار سال بھر کے ادب میں بھی ہوگا اس لحاظ سے گذشتہ سال کوئی عظیم الشان سال نہیں رہا ہے۔ مگر جو شخص بھی سال بھر کے ادب کا یعنی ادیبوں کے شعور کا مطالعہ کرے گا اسے پہلی ہی نظر میں اس بات کا احساس ہوگا کہ روز بروز ان کا مطمح نظر انسان دوستی ہوتا جارہا ہے ادب کے سلسلہ میں جب انسان دوستی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو وہ محض ایک خیالی جذبہ کا مظہر نہیں ہوتا بلکہ اس میں، جمہوریت پسندی، امن دوستی، انسانی عظمت کا احساس اور ان باتوں کی جانب عملی اقدام کے امکانات سبھی شامل ہوتے ہیں۔ سماجی انصاف کا وہ تصور جو انسانوں میں ربط اور موانست قائم کرتا ہے اسی انسان دوستی کی ایک شکل ہے جسے ادب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کا اظہار متحدہ ادبی محاذ کے نظریئے میں ہو رہا ہے۔ موجودہ حالات میں اس نظریہ کے امکانات اور حدود کا سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اس انتخاب میں کئی ایسے مضامین شامل کئے گئے ہیں جن سے صحیح صحت مند اور متوازن نقطۂ نظر قائم کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔

اسی سال کے دوران میں ادبی جمود کی بحث بھی بار بار سامنے آتی رہی ہے۔ مختلف الخیال لوگوں نے اس بحث میں حصہ لیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ گو بعض حضرات نے بہت خیال انگیز اور غور طلب باتیں اس سلسلہ میں کہیں پھر بھی کسی نے اصل صورت حال کا پورا تجزیہ نہیں کیا ہماری ناقص رائے میں ایسی بحثیں صرف ایک حد تک مفید ہوسکتی ہیں، اسی وجہ سے ہم نے اس انتخاب میں اس بحث کو اہمیت نہیں دی ہے۔

اس انتخاب میں جو مضامین، افسانے نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ان کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ بعض ادب پارے ہم نے اختلاف خیال کے باوجود شامل کر لئے ہیں لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھا ہے۔ کہ کوئی ایسی چیز شریک اشاعت نہ ہو جو بنیادی طور پر رجعت پسند یا اس کی کسی اور شکل کی ترجمانی کرتی ہو

ہم ان تمام مصنفین، شعرا اور رسائل کے ممنون ہیں جن کے پارہ ہائے جگر اس انتخاب کی زینت ہیں۔

مرتبین

مقالات

سید احتشام حسین

ا

حسرت کی شاعری کے نشاطیہ عناصر

رندِ بادہ نوش کبھی صوفیِ صافی ہے کبھی
حسرت آخر یہ ترا رنگِ طبیعت کیا ہے

"رندِ بادہ نوش اور صوفیِ صافی" کے درمیان کتنا فاصلہ ہے، مختلف الخیال لوگوں میں اس پر زبردست اختلاف ہوگا۔ کوئی اسے ایک ہی تصویر کے دو رخ بتائے گا اور کوئی دو متضاد تصویریں۔ کوئی مجاز اور حقیقت کی بحث چھیڑے گا اور کوئی شخصیت کے مکمل بننے یا خام رہ جانے کی طرف اشارہ کرے گا، تاہم کسی نہ کسی طرح حسرت کی شخصیت اور مزاج میں ایسے پہلو ایک ہو جاتے ہیں اور ایک خاص انداز کی دلکشی پیدا کرتے ہیں جہاں ایک رومانی مثالیت کے سہارے درویشی اور انقلاب پسندی، تصوف اور اشتراکیت کا امتزاج ہوتا ہے اور حسرت اعلان کرتے ہیں۔

درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم

[illegible] وقت [illegible] بحث چھیڑنا مقصود نہیں کہ حقیقت کی دنیا میں ان مختلف تصورات کو مکمل طور پر ہم آہنگ [illegible] جا سکتا ہے یا نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ حسرت جس دنیا میں بستے تھے اور جو دنیا بسانا [illegible] چاہتے تھے ان کے ملے جلے تصورات سے ان حسین خوابوں کی تخلیق ہوتی جو صحت مند بھی ہوتے [illegible] اور حقیقت سے [illegible] بھی۔ حسرت کی شاعری میں جو رعنائی تازگی، گداز، کیفِ تغزل اور وارفتگی [illegible] کے سر چشمے حسرت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ملیں گے شخصیت

کی تعمیر و تشکیل میں جو عناصر کام کرتے ہیں انہیں سے مختلف طبائع وجود میں آتے ہیں اور انفرادیت کی داغ بیل پڑتی ہے، یہ انفرادیت اگر زندگی کے سمجھنے کے سلسلہ میں پیدا ہو تو قوس قزح کے رنگوں کی طرح اپنی الگ حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ کل سے ہم آہنگ بھی ہوتی ہے۔ حسرت کی سادہ اور بے لوث، عوامی اور عملی زندگی میں ان کی شخصیت اس طرح نمایاں ہوئی کہ ایک جانب تو وہ عام لوگوں سے الگ تھلگ نظر آئی اور دوسری جانب عوامی زندگی کا اس طرح جزو بنی رہی کہ اسے کسی طرح اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھیک یہی بات ان کی شاعری پر بھی صادق آتی ہے وہ کسی طرح بھی اردو شاعری کی عام روایات سے الگ نہیں اور کسی طرح اسے اس عام روایت کی رسمی شکل نہیں کہا جا سکتا جس شاعر کو یہ بات نصیب ہو جائے وہ پائدار اور ابدی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کی انفرادیت نارمل انسانوں کی انفرادیت رہتے ہوئے بھی ایک خاص انداز کا بانکپن رکھتی ہے۔ حسرت کی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو نہ کہیں فلسفیانہ موشگافیاں ملتی ہیں نہ فکر انگیز خیالات، نہ والہانہ پن اور ربودگی، نہ غیر فطری کرب اور اضطراب لیکن زندگی ہے کہ ان سے پھوٹی پڑتی ہو کیونکہ حسرت نے زندگی کی فطری خواہشات محبت اور جد و جہد سے کبھی دوری اختیار نہیں کی اسی میں ان کی حقیقت پسندی کا راز بھی پوشیدہ ہے۔

حسرت موہانی غزل کے شاعر ہیں اور غزل میں حقیقت کا اظہار بیانیہ شاعری کے مقابلہ میں کسی قدر پیچیدہ طریقہ سے ہوتا ہے پھر بھی اس کی جستجو کر لینا ناممکن نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جب غزل ہی کے اندر بیانیہ عنصر کسی طرح آ جاتا ہے وہاں اظہار حقیقت نمایاں شکل اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ حسرت کی اکثر مسلسل غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مشہور غزلوں میں سے

دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے — یاد ہیں سارے وہ عیش با فراغت کے مزے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

اس کی واضح مثالیں بلکہ ان میں تو وہ رمز وایما بھی برائے نام ہیں جو حسرت کی غزلوں میں جان پیدا کرتے ہیں۔ بہرحال حسرت کا ادراکِ حقیقت خالص ادبی بنیادیں نہ رکھنے کے باوجود عمومی ہے جسے ہم زندگی کے کسی ایسے پہلو کو سامنے رکھ کر دیکھ سکتے ہیں جس کا تذکرہ حسرت کے یہاں زیادہ ملتا ہو مثال کے لئے اس روایتی پرستاری غم کو لیجئے جس سے اردو شاعری بھری پڑی ہے اور اس کے

مقابلہ میں حسرت کی نشاط جوئی اور مسرت کوشی کا مطالعہ کیجئے تو ادراک حقیقت کا مطالعہ بھی ہو جائیگا اور ہم دیکھ سکیں گے کہ حسرت کے سرمایۂ نشاط کے ساز و برگ کیا ہیں اور ان کی آرائش و زیبائش میں کس قسم کے رنگ و روغن سے کام لیا گیا ہے۔ زندگی میں غم اور نشاط دونوں ہیں ایک کو نظرانداز کر کے دوسرے کو دیکھنا سطحیت اور مبالغہ انگیزی ہے پھر کوئی پیمانہ بھی ایسا نہیں جس سے دونوں کو ناپا جا سکے۔ تاہم انفرادی اور سماجی زندگی کی کامرانیوں اور پسپائیوں کے آئینہ میں اس کے خط و خال دیکھے جا سکتے ہیں۔ جو شاعر جس پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے اس سے اس کی زندگی کے نظریات کو سمجھنے میں مدد لی جا سکتی ہے اور اسی کے پس پردہ خیال اور عمل کے تعلق کا جائزہ لیا جا سکتا ہے غم اور نشاط کی مختلف شکلیں، مختلف منزلیں اور مختلف مدارج ہیں، مختلف سماجی اور انفرادی حالات میں ان کے احساس کی شدت بھی مختلف ہو سکتی ہے لیکن محبت اور جد و جہد کی زندگی میں مد و جزر پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی غم خوشی پر چھا جاتا ہے اور کبھی خوشی غم کا گلا گھونٹ دیتی ہے حسرت کے یہاں دونوں کے مختلف پہلو موجود ہیں لیکن غم ہلکا اور سطحی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نشاط محبوب کے جسم اور لباس کے احمریں رنگ کی طرح حسرت کے وجود پر چھایا ہوا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں انہیں کی بنیادوں کی جستجو کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

حسرت کی شاعری کا محور محبت ہے اور جن شعرا سے وہ متاثر ہیں ان کی شاعری کا محور بھی وہی ہے۔ میر، مصحفی، جرأت، مومن، نسیم دہلوی اردو شعرا میں اور شمس تبریز، مولانا روم، فارسی شعرا میں ان کے رہنما ستارے ہیں۔ ان سب کی شاعری محبت ہی کے گرد چکر کاٹتی رہتی ہے اگرچہ ان کی محبت کی نوعیتیں اور مدارج مختلف ہیں۔ حسرت کو ابتدائے محبت میں جو کامیابی ہوئی اس نے ان کے شعور پر گہرا اثر ڈالا اور اس کے ساتھ ان کی قناعت پسندی، عقائد اور جہدِ حیات نے اس پر اور جلا کر دی جس طرح انہیں محبت میں کامیابی کا یقین تھا اسی طرح عملی سیاسی زندگی میں منزلِ مقصود پر پہنچنے کا یقین بھی تھا اور جب یہ یقین جد و جہد پر کسا ملا ہو اس وقت غم کا پسپا ہو جانا لازمی ہے۔ حسرت کی غزل گوئی ۱۸۹۴ء سے شروع ہوتی ہے اور اسی وقت سے محنت اور محبت دونوں حقیقتیں ان کی شخصیت میں سموئی ہوئی ملتی ہیں۔ بالکل شروع کی ایک غزل ہے جو ان کے کردار کے وہ خط و خال معین کر دیتی ہے جس میں آخر وقت تک کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی ؎

محوِ حسرت ہوں وقفِ محنت ہوں | میں کہ دلدادۂ محبت ہوں
لاابالی مزاج رکھتا ہوں | شاعرِ مبتلا طبیعت ہوں
عالمِ بے خودی میں ہوں مسکن | مست ہوں ہوشیارِ حیرت ہوں
حکمرانِ دیارِ استغنا! | صاحبِ دولتِ فراغت ہوں
الغرض کیا بتاؤں کون ہوں میں | حسرتِ آشنائے حسرت ہوں

یہی "وقفِ محنت" اور "دلدادۂ محبت" کے یہاں محنت اور محبت دونوں جزوِ ایمان بن جاتے ہیں اس لئے اسے مستقبل پر بھروسہ ہے اور اسی وجہ سے عمل اور جد وجہد محبت اور رسمِ عشق بازی دونوں میں حسرت کو لذت ملتی ہے اگر جد وجہد کے نفسیاتی پہلوؤں کا تجزیہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ صحت مند محبت خود ایک طرح افادی عمل ہے اور اسی کے سہارے وہ نئی سے نئی لذتوں کی تلاش میں مستقبل کی جانب اپنے ہاتھ پھیلاتی ہے۔

ابتدائے محبت میں حسرت کو جو کامیابی نصیب ہوئی تھی وہ زہرِ غم سے خالی نہیں تھی ورنہ وہ ہلکی سی کسک جو آرزوؤں کی تخلیق کرتی ہے اور انھیں فنا ہونے سے بچاتی ہے بار بار ظاہر نہ ہوتی۔ حسرت چونکہ مبالغہ سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے یہ غم بھی ناقابلِ برداشت نہیں رہتا اور شاعرانہ صداقت کی وجہ سے کمزور ہو کر سامنے آتا ہے۔

ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آ گئی تھی آج | سو کتنے شرمسار ہوئے بے کسی سے ہم
اللہ ری مزاج کی حسرت پرستیاں | گویا کہ آشنا ہی نہیں ہیں ہنسی سے ہم

دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ بیانِ غمِ حسرت کے یہاں یاس اور قنوطیت کا رنگ اختیار نہیں کرتا کیوں کہ التفاتِ محبوب پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور غم کے تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں امید انسانی ہے اور زندگی کے تاریک گوشے منور ہو جاتے ہیں ؂

یاس ہے اور اس کہ چشمِ امید | پھر تری جانب نگراں ہو گئی

حسرت کا فراق دائمی نہیں ہے ان کے لئے کسی کے دل میں محبت اور التفاتِ فراواں ہے، محبوب کے زیرِ لب آہ التفات ہے راحتِ حیرت ہے، عیش با فراغت ہے، رخصت کے وقت حدِ نظر تک مڑ مڑ کر دیکھنا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ تغافل بھی ہے اور ہجر بھی، مایوسی

فراق بھی ہے اور بگڑنا روٹھنا بھی لیکن یہ آخر الذکر باتیں وقتی ہیں اور جس وقت اپنی جھلک دکھلاتی بھی ہیں اس وقت ایک طرف ان سے ماضی کی رنگین یادیں وابستہ رہتی ہیں دوسری طرف مستقبل میں التفات فراواں کی امید۔ اس لئے حسرت کے یہاں غم بے جان اور کمزور ہے۔ ان اشعار سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

وہ بگڑنا بھی کبھی مجھ سے تو ملنے کیلئے ۔۔۔ یاد ہے انداز تیرے جو رِ لطف آمیز کا

زہے بےکس نوازی وہ دلِ بیمار پر میرے ۔۔۔ نہیں کہتے ستم مشہور گو ہیں کج ادائی میں

وہ جو بے چین ہوئے دیکھ کے حالت میری ۔۔۔ ہو گئی اور پریشان طبیعت میری!

اب وہ ہجومِ شوق کی سرمستیاں کہاں ۔۔۔ مایوسیٔ فراق نے دل ہی بجھا دیا

اب میں ہوں اور تغافلِ بسیار کے گلے ۔۔۔ وہ میں کہ موردِ کرمِ بے حساب تھا

ناز بے جا اٹھائے ہیں ان کے! ۔۔۔ اے دل اب نازِ اضطراب اٹھا

خاطرِ مایوس میں نقشِ امیدِ وصلِ یار ۔۔۔ ور ہے صحرا میں گویا اک چراغ دور کا

مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت ۔۔۔ وہ ستم بھی گر کرے ہیں تو بہ لطفِ ہوشمندی

ایسے نہ جانے کتنے اشعار ہیں اور ہر شعر میں "غم نشاطِ فردا" سے منہ چھپاتا ہے۔ محبوب کی وفا پرستی ہجر و فراق کو دائمی بننے سے روکتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دور بہت ہی ناپائدار ہے۔ پھر اس ہجر و فراق کی حالت میں بھی محبوب کے التفات کی یاد ایک قیمتی سرمایہ بنی رہتی ہے۔ حسرت نے وصل کی لذتوں کا ذکر جس نشاط انگیز انداز میں کیا ہے وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔

ہیں سرورِ وصل سے لبریز مشتاقوں کے دل ۔۔۔ کر رہی ہیں آرزوئیں سجدۂ شکرانہ آج

حسرتیں دل کی ہوئی جاتی ہیں پامالِ نشاط ۔۔۔ ہے جو وہ جانِ تمنا رونق کاشانہ آج

جس محبت کی دنیا میں حسرت پامالِ نشاط ہوں وہاں غم دیر تک کیسے ٹھہر سکتا ہے محبوب کی طرف سے التفات ہے اور التفات کی امید۔ اس لئے حسرت کبھی معمولی طور پر بے صبر نہیں ہوتے اگر ناکامی اور مایوسی نے محبت کے حوصلے بالکل پست نہ کر دئے ہوں تو وصل و ہجر دونوں میں لذت کے اسباب نکل آتے ہیں۔ بس اور خیال آرائی دونوں میں لطف اور تسکین کے پہلو پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ حسرت کے یہاں اس لذت کی فراوانی ہے، یہ اعتماد کہ محبوب کے دل میں عاشق کی جگہ

محبت میں صحت مند توانائی کشش اور گیرائی پیدا کرتی ہے اور یہ خیال ابتدا سے لے کر آخر تک حسرت کے ساتھ رہا کیونکہ اس کی بنیاد رسمی خیال آرائی پر نہیں حقیقت پر تھی' اسی وجہ سے اس کا اظہار بھی ہر جگہ پُرخلوص اور نشاط انگیز ہے مثال کیلئے چند شعر بسلسلہ وار لکھے جاتے ہیں ؎

تاثیر صبر کی ہے نہ میری دعا کی ہے — وہ مائل وفا ہیں یہ قدرت خدا کی ہے (سنہ ۱۹۰۰ء)

برسرِ ناز وہ از راہِ کرم ہو چپا تھا — شب عجب لطف کا سامان بہم پہنچا تھا (سنہ ۱۹۰۳ء)

ہم خوب سمجھتے ہیں حسرت سی تری باتیں — اقرار کا پردہ ہے انکار نہیں تیرا (رر)

رنجشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے ! — ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے (رر)

آج سن کر مرے نالوں کو زراہِ التفات — زیرِ لب اس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات (سنہ ۱۹۱۶ء)

اک رنگِ التفات بھی اس بے رخی میں تھا — اک سادگی بھی اس نگہہ سحر فن میں تھی (رر)

اب منہ بھی دکھاؤ ہمیں اصرار نہ ہوتا — خود شوق کی تم آگ اگر تیز نہ کرتے (رر)

میں بے خبر غم تھا مگر وہ دمِ رخصت — دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حد نظر تک (سنہ ۱۹۱۱ء)

یہ کس کے عجز تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ — بہ زعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا (سنہ ۱۹۲۲ء)

طعنِ عزیزاں کا نہ ہو خوف اگر — میرے لئے اب بھی وہ رنجور ہیں (سنہ ۱۹۲۵ء)

جذبۂ شوق کی تاثیر دکھانا ہے مجھے — آپ روٹھ کے خود ان کو بھی لانا ہے مجھے (سنہ ۱۹۴۶ء)

یہ اشعار اِدھر اُدھر سے لئے گئے ہیں لیکن یہ کم سے کم اس حقیقت کا پتہ دیتے ہیں کہ ابتدا سے انتہا تک محبت کے تانے بانے میں ایک مضبوط اور رنگین تار محبت کی کامیابی اور محبوب پہ اعتماد کا باقی رہا جس نے اور عناصر کے ساتھ مل کر اس داستان کو وہ المیہ نہ بننے دیا جو مایوسی قنوطیت اور زہرِ غم پر ختم ہوتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں محض ان نشاطیہ عناصر کی بنیادوں کو دیکھا ہے جو بہت نمایاں ہیں۔ دوسرے جذبات کی طرح محبت کی راہ بھی خط مستقیم میں نہیں ہے' اس میں بڑے پیچ ہیں۔ اس لئے حسرت کی محبت بھی نشیب و فراز سے خالی نہیں تاہم اس میں امید کا بنیادی عنصر ہر موڑ کے بعد استواری اور ہر نیرنگی کے بعد یک رنگی پیدا کر دیتا ہے نہ تو حسرت اپنا راستہ کھوتے ہیں اور نہ ان کا پڑھنے والا محبت کے بعض پہلوؤں کی تکرار اور بعض خیالات کی تکرار اس کا یقین دلاتی ہے کہ وہ زندگی کی بعض قدروں کو بعض کے مقابلہ میں اہمیت

دیتے تھے اور چاہے عشق و محبت کا بیان ہو یا شعر و ادب کا، مذہب کا ہو یا سیاسیات کا وہ قدیم
روش اور اجاگر ہو کر حسرت کی شخصیت اور شاعرانہ خیالات کا پتہ دے دیتی ہیں۔ محبت
سیاست، عشق سخن اور مذہب میں حسرت کی استواری دیکھ کر یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم
ان کے رنگ نشاط کا راز نہ پا سکیں۔ عشق سخن اور عمل کی شفقت ہی کی طرح ان کا انداز محبت
اور درد مذہبی بھی پائداری رکھتا ہے اور یہ تمام پہلو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں
چنانچہ محبت کا بیان کہیں کہیں ایسی صوفیانہ حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ محبت کے ارضی اور
مادی تصور اور صوفیانہ تصور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تصوف کی سریت اور رمزیت اور
غزل کی ایمائیت اور اشاریت کی وجہ سے اس کے مواقع بھی آسانی سے آجاتے ہیں یہاں
ان کے اچھے برے ہونے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کی بحث نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ یہ صوفیانہ
خیالات بھی اسی کل کا جزو ہیں جسے حسرت پیش کرتے ہیں اور یہ بھی مایوسی کے بجائے نشاط
انگیزی کے ضامن ہیں۔ حسرت کے تصوف میں وہ ماورائیت نہیں ہے جس سے فارسی اور
اردو شاعری بھری ہوئی ہے بلکہ مذہبی پاکیزگی اور عقیدے کی گرمی سے پیدا ہونے والی...
وجدانی کیفیت ہے اور مذہب کے شرعی اور ظاہری تصورات سے بہت زیادہ دور نہیں
ہے بعض اشعار پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت زیادہ واضح ہو سکے گی ؎

مایوس نہ یوں ملتے تو دود اگر ہوتا — ہم کچھ نہ تجھے کہتے مجبور اگر ہوتا

دب گئی خاک معاصی میں ترے شوق کی آگ — دل میں وہ شعلہ جو بھڑکا تھا فروزاں نہ رہا

منبع شوق اک نمونہ ہی لاریب — راحتِ خلد حبا ددانی کا

نگاہِ اہلِ ولا میں وہ نور بن کے رہے — قلوب اہل ولا میں سرور بن کے رہے

سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے — مایوس کر سکا نہ ہجوم بلا مجھے

مقصود ہے پابندی آئین محبت — زنہار اگر ہم کو سر سود و زیاں ہو

یہ لے آخر عمر کی غزلوں میں اور تیز ہو گئی اور وہ محبت جو محبوبہ کو چھپکے چھپکے رونے اور دبے پاؤں ملنے کو
بہلانے کی دعوت دیتی تھی دھندلکے میں کھو جاتی ہے اور محبوب کی نشان دہی نشان بے نشان

سی ہونے لگتی ہے ؂

گرویدہ اہلِ شوق جو حسن بتاں کے ہیں — شاید یہ سب نشاں اُسی بے نشاں کے ہیں

صوفیانہ اور عاشقانہ شاعری میں رمز و علامات کے استعمال کی وجہ سے اتنا باریک پردہ حائل ہو جسے کبھی کبھی سخن فہم کی نگاہ بھی نہیں دیکھ سکتی، حافظ کے سرمستی اور رندی کے والہانہ نغمے تصوف کے ترجمان بن گئے ہیں اس لئے اگر حسرت کے یہاں بھی یہ خیالات الجھن کا سبب بنتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن اگر ہم حسرت کی شاعری کا مجموعی طور پر مطالعہ کریں اور ان کے ادراک حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو ایک میں مدغم ہوتا ہوا دیکھ کر ان کی شخصیت کی روشنی میں انھیں سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم گوشت اور پوست کے ان محبوبوں کو بے نقاب دیکھ سکیں گے جن کا دیدار انھیں آمادۂ ہوس" کرتا تھا اور جن سے محبت کرنے کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

مذہبیت اور محبت کے اس امتزاج کو دیکھنے کے بعد ہم محبت اور سیاست، سیاست اور مذہب کے امتزاج کو بھی دیکھ سکتے تھے یہ بھی ان کی شخصیت میں گھلتے ملتے دکھائی دیتے ہیں یہاں بھی ایک طرف ہم حسرت کے سیاسی اور مذہبی خیالات سے واقفیت کی بنا پر اور دوسری طرف غزل میں عشقیہ شاعری کی اشاریت اور رمزیت کی بنا پر امید، نشاط انگیزی اور جہد عمل کی انھیں قدروں کی جستجو کر سکتے ہیں جو محبت اور مذہبیت کے مخصوص تصورات کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں اسلام میں حشر و نشر کے عقیدے کی وجہ سے مستقبل کا دامن غیر معمولی امکانات سے بھرا ہوا ہے بشرطیکہ انسان کا عمل صحیح ہو، خدا رحیم ہے اس لئے اس کی رحمت سے مایوس ہونا مسلمان کے لئے بداعتقادی کے برابر ہے۔ اب اس کی روشنی میں حسرت کی سیاسی جد و جہد کو دیکھئے تو مختلف تصورات کے امتزاج کی بنیاد واضح ہو سکے گی ؂

نہ بھولا گھر کے اعدا میں بھی حسرت — ترے فرمودۂ لاتقنطو کو

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر — مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

اسلام میں حق صداقت اور مقصد کیلئے جان دینا شہادت ہے، عقیدت مند کے لئے سب سے بڑی سعادت اور حسرت جن قدروں کے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے تھے وہ انھیں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی عزیز تھیں اس لئے سیاسی اور مذہبی جذبات اور معتقدات میں ایک

قسم کی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی اور جد و جہد میں اس نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا جو تکلیف اور مشقت میں راحت کا احساس دلاتی ہے ایک طرف یہ عقیدہ کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اس میں بھلائی ہے دوسری طرف یہ یقین کہ تکلیف کے بعد خوشی ہو گی، غم کے تصور کو بدل دینے کی طاقت رکھتے ہیں ؎

تھی راحتِ حیرت کی کس درجہ فراوانی　　ہم نے غمِ ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی

یاس کا دل پہ کچھ اثر نہ ہوا　　قصۂ شوق مختصر نہ ہوا

عیشِ گدازِ دل بھی غمِ عاشقی میں تھا　　اک راحتِ لطیف بھی ضمنِ محن میں تھی

پھر اک شوقِ بسیار کی آرزو ہے　　طوافِ درِ یار کی آرزو ہے

تن آسانیاں دوسروں کو مبارک　　یہاں امرِ دشوار کی آرزو ہے

حسن کی بے مہریوں کے سبب　　آرزو کو بھول جانا چاہیے

زہد مایوس و نامراد رہا　　عشق دنیائے غم میں شاد رہا

غم ایک حقیقت ہے اور اس سماجی زندگی کا جز جو حسرت کے گرد و پیش تھی لیکن حسرت اس کے ہو کر نہیں رہنا چاہتے تھے کیونکہ یہ بات نہ صرف ان کے مذہبی اور اخلاقی تصورِ زندگی کے منافی تھی بلکہ ان کے سیاسی مسلک کے لئے بھی مضر تھی اس لئے وہ مایوسی کو قریب نہیں آنے دیتے تھے

غم ہائے دہر سے جو بری ہو وہی ہے مرد　　حزن و ہراس شیوۂ مردانگی نہیں

حسرت نے اپنی زندگی میں محبت، مذہب، اخلاق اور سیاست کی سرحدوں کو کئی جگہ ملا دیا تھا اور اس کو اپنے نفس کے خلوص سے تغزل کے رنگین پردوں پر ابھارا تھا عشقیہ زندگی کے اشعار سے اور اشعار سیاسی زندگی کے اشعار سے مشابہ بن جاتے ہیں اور غزل کے داخلی اندازِ بیان میں محبت مذہب اور سیاست کا بعد سمٹ جاتا ہے ان تینوں تصورات میں جد و جہد کے ذریعہ منزلِ مقصود تک پہونچنے کا جذبہ اور اس سے پیدا ہونے والے ضمنی جذبات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے جب ہم مندرجہ ذیل اشعار پڑھتے ہیں تو ان کی بلیغ ایمائی کیفیت حسرت کی اس شخصیت کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے جس میں یہ اشتراک پیدا ہوا تھا ؎

اپنا سا شوق اور دل میں لائیں کہاں سے ہم　　گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم

میکشو یوں ہی گذر جائیگی تاریکیِ ابر	جام کو بادۂ پرور سے لبریز کرو
عاشقو دور نہیں منزلِ مقصود وصال	بادپائے طلبِ یار کو مہمیز کرو
ہوائے گل میں نہ پروائے خار ہم کرتے	رہِ طلب میں قدم استوار ہم کرتے
وہ بار بار سزا جرمِ شوق کی دیتے	گر قصور وہی بار بار ہم کرتے
لبریزِ نشاط ہے دلِ شوق	آثار بہار ہیں نمودار
کچھ ہوش سر و پا کا نہیں رندِ خرابات	اٹھی ہے گھٹا دھوم مچانے میں لگے ہیں

ان اشعار کے پرکیف اشارے عاشق مزاج اور حسن پرست حسرت اور سیاسی جدوجہد میں مر مٹنے والے حسرت دونوں کے دل کی واردات پیش کرتے ہیں۔ ان میں محبت کا مدوجزر بھی ہے اور قومی تحریک آزادی کے نشیب و فراز بھی ہیں۔ اور دونوں حالتوں میں حسرت پر جوش، پر آرزو اور پر امید نظر آتے ہیں۔

حسرت کا سیاسی مطمح نظر ہے مکمل آزادی، اشتراکیت اور آئین سویت ان تصورات کی فلسفیانہ اور عالمانہ پیچیدگیوں سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسرت کے یہاں ان کا مفہوم بہت معین اور واضح نہ ہونے کے باوجود آزادی مساوات اخوت اور اشتراک باہمی کے عام تصورات سے دور نہیں ہے وہ انھیں کی تلقین کرتے ہیں اور انھیں کی امید سے اپنی زندگی کے خاکے میں رنگ بھرتے ہیں اسی لئے انھوں نے اپنی ابتدائی شاعری ہی میں کہا تھا ؎

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو	ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان	روشنیِ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت پہ جو کرے گریز	اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار	فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

سیاسیات میں یہ اعلیٰ تصورات ان کے ضمیر کی آواز اور اجتہادِ عقل کا نتیجہ کہے جا سکتے ہیں اسی ذ سے جدوجہد میں یقین رکھنے والے حسرت نے اس راہ کو تقدیر کے سہارے طے نہیں کیا بلکہ دل پر شوق کی گرم جوشی اعلیٰ عزم تدبر اور تدبیر کو اپنا رہنما بنایا اور اس طرح اپنے وطن میں تک

گئے کہ ترکِ خیالِ یار ناممکن معلوم ہونے لگا ؎

دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے — کسے یقین ہو کون اس کا اعتبار کرے

پیہم عمل کے بغیر زندگی میں مسرت اور حسن کی تخلیق نہیں ہو سکتی اور کسی نہ کسی حیثیت سے یہ نکتہ ہمارے حسرت کے سامنے رہتا ہے یہی چیز انہیں اشتراکیت کی طرف کھینچتی ہے لیکن دوسری بندشیں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ٹوٹ نہ سکیں اس لئے وہ اشتراکیت کے حکیمانہ اور عملی فلسفہ کو مکمل طور پر اپنا نہ سکے۔ پھر بھی ۱۹۳۶ء کی ان کی ایک غزل جس کا عنوان "مقامِ اشتراکیت" ہے ان کے ذہن کی رفتار کو سمجھنے میں معاون ہو سکتی ہے ؎

معیشت میں بہر سو رنگِ فطرت ہر جہاں میں ہو — اخوت ہر جہاں میں ہو، مساوات ہر جہاں میں ہو
نظامِ فرد بھی محفوظ ہے فوزِ جماعت میں — نمایاں ہر طرف وحدت میں کثرت ہر جہاں میں ہو
اصولِ اشتراکِ آئینِ بیت المال سے مشتق — اساس کارِ جمع و خرچِ ملت ہر جہاں میں ہو
فلاحت ہو کہ حرفت کامیابی سعیِ انساں کی — نظامِ اجتماعی کی بدولت ہر جہاں میں ہو
بری ہو منکریاں ہر فرد کی لوثِ عقیدت سے — مسلّم اقتدارِ علم و حکمت ہر جہاں میں ہو
رواجِ بربریت ہے مذاہب کے تعصب میں — فضائے امن و صلح و آدمیت ہر جہاں میں ہو
بلا تائیدِ محنت کچھ بھی افزائش جو ہو حسرت — وہ دولت کے لئے اک طوقِ لعنت ہر جہاں میں ہو

ان اشعار میں اشتراکی نصب العین کی پرشوق تصویر کشی اور مستقبل کی دنیا کی روشن تنویر ہے جسے مایوس ذہن تخلیق کرنے سے عاجز ہے۔ محض اصولِ اشتراک، فضائے امن و آدمیت تائیدِ محنت پر یقین رکھنے والے اس دنیا کا تصور کر سکتے ہیں۔ شاید اسے محض خیالی موشگافی کہا جائے لیکن حسرت کے یہاں سرخ رنگ سے اتنی وابستگی بھی ایک زندہ اور انقلابی رجحان کا پتہ دیتی ہے۔ محبوب کا جسم بھی سرخ ہے اور لباس بھی سرخ اور اس میں بسی ہوئی محبت کی خوشبو کیف و لذت نا شراب کو دو آتشہ اور سہ آتشہ بنا دیتی ہے۔ چند اشعار میں اسی کیفیت کے مختلف پہلو پیش کئے جاتے ہیں ؎

راحت کو اضطراب سے مقرون کر دیا — ان سرخ پوشیوں نے تو دل خون کر دیا
مل گیا حسرت شہیدانِ وفا کا خوں بہا — ہو گئی ہیں روتے روتے ہر دو چشمِ یار سرخ

کھل گیا ہے ترے جمال سے رنگ | تیرے ملبوسِ ارغوانی کا
رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں | اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت جد و جہد اور سیاسی منظریات کی روشنی میں ان کا عمل زندگی بخش، صحت مند اور نشاط انگیز ہی نظر آتا ہے اس لئے وہ عام طور سے انہیں پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جن میں زندگی، امید اور گرمی کی فراوانی ہے ۔

اس حقیقت پر زور دیا جا چکا ہے کہ محبوب کے وفا شعار اور محبت نواز ہونے کی وجہ سے حسرت کے یہاں عشق و محبت کی نفسیات ایک دوسرے ہی سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں ۔ لیکن کیف و نشاط کی اس افراط کا سبب تنہا اسی چیز کو قرار نہیں دیا جا سکتا یہ محض ایک جز ہے اس مجموعی شخصیت کا جس میں شعور کے مختلف چشمے آکر ملتے تھے اور ایک بہت بڑا دھارا بننے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس مختصر مضمون میں محض اس پہلو کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس نے ان کے یہاں نشاط اور امید کے جذبے کو تقویت پہونچائی ۔ ان کی سادہ، بے خوف، پرخلوص اور بے غرض زندگی محبت اور سیاست دونوں میں توانائی اور مستی پیدا کرتی تھی ان کا دل قوی، ذہن صاف اور جذبہ بیباک تھا اس لئے ان کی غزلیں پڑھ کر کبھی گھٹی ہوئی مایوس اور بیمار فضا کا احساس نہیں ہوتا ۔ محبت کی صداقت قوت اور طاقت کا احساس ہوتا ہے زندگی کی عظمت کا پتہ ملتا ہے اور دنیا جد و جہد کر کے بہتر بنائے جانے کے قابل معلوم ہوتی ہے ۔ انھوں نے عام انسانوں کی طرح محبت کی اور زندگی کو چاہا، عمل کے ذریعہ سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور سچائی کے ساتھ اپنے جذبات اور محسوسات کو پیش کیا اس طرح جو شاعری ظہور میں آئے گی چاہے وہ فکری حیثیت سے بلند پایہ نہ ہو، تازہ شگفتہ اور حیات بخش ضرور ہوگی چند اشعار سے اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ ان کے تخیل کی پرواز زندگی سے کس قدر قریب اور وابستہ تھی ۵

نزدیک ہے کہ شوق سے سن کے وعدۂ وصال | لب ہائے نازِ یار ہیں لرزاں مرے لیے
ان سے مل کر شکوۂ بے اعتنائی پھر کہاں | شاہدہ ہے دل کہ یہ لطفِ جدائی پھر کہاں
اہلِ دل سنتے رہیں اک سازِ محبت کی نوا | ہم تری یاد میں جب نغمہ سرا ہوتے ہیں
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب | آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

معلوم ہو گئی مرے دل کو زیادہ شوق — وہ بات پیار کی جو ہنوز اس ذہن میں تھی
حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
تجھ سے مل کر یہ تعجب ہے کہ عرصہ اتنا — آج تک تیری جدائی میں یہ کیونکر گزرا
قدموں پہ ان کے رکھ کے سر رفع ملال کر دیا — ہمت عذر خواہ نے آج کمال کر دیا
دور ہم ان کی بزم سے جیتے رہے تو کیا ہے — آہ وہ زندگی جسے غم نے وبال کر دیا
تری یاد بے اختیار آ رہی ہے — تمنا کی محفل بہار آ رہی ہے

خوبصورت اور بے داغ الفاظ کے لباس جمیل میں یہ عام فہم لیکن دل کی گہرائی سے نکلے ہوئے
قلب میں اتر جانے والے خیالات اچھے شعر میں ظاہر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر اور اچھے
انسان کا پتہ بھی دیتے ہیں ایک ایسے انسان کا جو زندگی کی کشمکش میں محبت کو بھی اونچی جگہ دیتا
تھا اور محبوب کی انسانیت پر بھروسہ رکھتا تھا ایسا نہیں ہے کہ اردو شاعری اس قسم کے خیالات
اور جذبات سے خالی ہے لیکن حسرت کے یہاں ان کے تسلسل اور تکرار پیہم نے ان میں انفرادی شان
پیدا کر دی ہے اسی لئے اس مضمون کی ابتدا میں کہا گیا تھا کہ حسرت اردو شاعری کی روایت سے الگ
بھی نہیں ہیں اور اس میں ان کی شخصیت اور شاعری کے کھو جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہے ابتدائے
محبت کی وہ کامیابی جس کا نشہ ان پہ آخر وقت تک چھایا رہا اور جس کی یاد ہمیشہ ان کے لئے وجہ
تسکین بنی رہی۔ مذہبی عقائد کی صداقت پر مکمل یقین بڑھتی ہوئی سیاسی جدوجہد کی کامیابی
پر بھروسہ ان تمام باتوں نے مل کر حسرت کی تخلیقی قوتوں کو جلا دی اور آزادی کی جدوجہد میں عملی
سرگرمی نے ذہن کو اس تلخی اور تلخ کامی سے بچا لیا جو عمل سے دور رہ کر محض تخیل کے سہارے
جینے اور ٹھوکریں کھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ حسرت کی شاعری تلخی، طنز اور تعریض سے اسی لئے
خالی ہے کہ وہ عملی زندگی کے سلسلہ میں ان مصائب اور شدائد کے جھیلنے کے لئے بالکل آمادہ تھے۔
جن سے دوچار ہونا ضروری تھا۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ ان کی تقریباً آٹھ سو غزلوں میں زندان
اور قید کا ذکر بہت کم آتا ہے اور آتا بھی ہے تو تلخی اور غم کے ساتھ نہیں آتا۔ کردار کی اس خصوصیت
نے ان کی غزلوں میں رعنائی اور شگفتگی پیدا کی ہے جو تفکر گہرائی اور بلندی خیال کا نعم البدل بن جاتی
ہیں اور نشاط اور لطف سے بھر دیتی ہیں۔

آل احمد سرور

سرمایہ داری اور کلچر

سرمایہ داری کے موجودہ دور میں تہذیب انسانی کو جو خطرہ لاحق ہو رہا ہے اور جنگ، انتشار، بے روزگاری اور عالمگیر بے چینی کے سائے جس طرح لمبے ہوتے جا رہے ہیں وہ ارباب نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ امریکہ اور بعض نام نہاد جمہوری ملکوں میں عوام کو یہ دھوکا دیا جا رہا ہے کہ انسانی آزادی تہذیب کے تحفظ اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے بچاؤ کی خاطر ہمیں روس اور اس کے حاشیہ نشینوں کا مقابلہ کرنا ہے کوریا کی لڑائی کو بعض امریکی اخبار انسان کی آزادی اور اس کے تحفظ کی جنگ کہتے ہیں، ہندوستان میں سماجی انصاف کی جدوجہد کو قوم پرستی کے منافی کہا جاتا ہے اور عوام دوستی کے علمبرداروں کو ہندوستان کا دشمن ٹھہرایا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے اخباروں رسالوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عوام کی بے روزگاری، جہالت اور غربت کو دور کرنے پر اتنا زور نہیں دیا گیا تھا جتنا ہندوستان کے اعلیٰ پرچار پر قدیم ہندوستان کی عظمت کے ترانے گا کر ہمارا حکمراں طبقہ موجودہ محدود اور ناقص آزادی کی تلخیوں کو کم کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان ایک زرخیز ملک ہے اور زراعتی اور صنعتی دونوں وسائل سے مالا مال ہے۔ اس کی آبادی کے لئے کافی غذا مہیا کرنا اس کے لئے مشکل نہ ہونا چاہئے، اس کی ضروریات سے زیادہ کپڑا یہاں بنتا ہے مگر یہاں کے رہنے والوں کو نہیں ملتا یہاں حالت اب بھی حیرت انگیز ہے اور جس رفتار سے تعلیم بڑھ رہی ہے اس کے مطابق مستقبل میں یہاں کے

لوگوں کو مکمل طور پر خواندہ بنایا جا سکے گا۔ صنعتی تعلیم کی جو اسکیمیں بنتی ہیں وہ روپیہ کی کمی کی وجہ سے طاق
نسیان کی نذر ہو جاتی ہیں یہاں کے لوگوں کا معیار زندگی، ان کی عمر کا اوسط، ان کی کارکردگی، سب بہت
کم ہیں اور جو طریقے زمین پر ہل چلانے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں وہ اب بھی خاصے فرسودہ ہیں پاکستان
کی ضد اور عالمگیر جنگ کے خطرے کے نام سے اب بھی آمدنی کا بیشتر حصہ فوج پر صرف کیا جا رہا ہے۔ مذہبی
اختلافات کم ہونے کی بجائے اور استوار ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنس کے طریقۂ کار کو ...... میکانکی
طریقے سے برتا جا رہا ہے۔ سائنٹیفک نظریہ اور عقلی استدلال بہت کم ملتا ہے۔ عوام کو روزی کی فکر اتنی
کی فرصت نہیں دیتی کہ دنیا کے تہذیبی سرمائے سے لطف اندوز ہو سکیں۔ متوسط طبقہ دو چکیوں کے بیچ
پستا جا رہا ہے اور حیران و پریشان سوچتا ہے کہ کدھر جائے۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ عیش امروز پر عمل کر رہے
ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ کل نہ معلوم کیا ہو جائے۔ شاعر اور ادیب انسانوں کو ان کے اچھے
خواب اور قیمتی تجربے یاد دلانا چاہتے ہیں۔ موجودہ نظام کی چیرہ دستیاں انہیں دھنک کی طرف دیکھنے کے
بجائے زندگی کی بے رحم حقیقی کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں عالم اور ودوان کہتے ہیں کہ انسان کو موجودہ
دور نے جانور بنا دیا ہے اگر وہ مہذب ہو جائے تو ایک دوسرے سے جنگ اور خونریزی اور ہوس چھوڑ
دے۔ نفسیات کے ماہرین انسان کے یہاں بہیمیت کی رگ دریافت کرنے میں مصروف ہیں تاکہ اس
آب حیات سے انسانوں کی مردہ روح کو زندہ کیا جا سکے۔ عوام قسمت کو، متوسط طبقہ حکومت کو اور حکومت
روس کو الزام دیتی ہے کچھ لوگ دبی زبان سے امریکہ کا بھی نام لے دیتے ہیں۔ غرض ذہنی الجھن، جذباتی
تعصب، سماجی کوتاہ بینی کا کچھ ایسا دور دورہ ہے کہ موجودہ انتشار اور خلفشار کے حقیقی اسباب پر توجہ بہت
کم ہے وہ اسباب یہ ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں سرمایہ داری ایک خاص عروج کے دور پر پہونچ چکی ہے جسے ہم اجارہ داری
کا دور کہہ سکتے ہیں اس دور میں جب اسے عوام طاقتوں سے خطرہ ہوتا ہے تو وہ واضح طور پر فاشزم کا ساتھ
دیا کرتی ہے۔ ہندوستان کو غیر ملکی سرمایہ داری نے سرمایہ داری کی منزل پر پوری طرح گامزن نہ ہونے دیا
اس کی زراعت کو نیم جاگیردارانہ نظام کے ماتحت رکھا، صنعت و حرفت کی ترقی اپنے مخصوص سامراجی
مقاصد کے ماتحت کی۔ ریلوں اور سڑکوں کے جال بچھائے اور ملک میں امن و امان قائم رکھا مگر اس کا مقصد
ہندوستان کی خام پیداوار کو اپنے کارخانوں کے لئے فراہم کرنا تھا۔ اس نے اپنی ضرورت کو اچھی طرح

پورا کرنے کے لئے ایک دفتری نظام اور ایک تاجر طبقہ پیدا کیا جس نے بڑھ کر سفید سرمایہ داری کے بجائے سیاہ سرمایہ داری کی حکومت قائم کرنی چاہی ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے اور اس کی تاریخ ایسی رہی کہ اس میں کئی قومیں اپنی اپنی زبانوں اور تہذیبوں کے ساتھ بستی ہیں۔ ان میں ایک عام وحدت بھی ہے اور بعض مخصوص روایات اور خصوصیات بھی انگریز نے ان کی معاشرت میں کم دخل دیا۔ ایک اوپری ہمواری کو کافی سمجھا نتیجہ یہ ہوا کہ جب عالمگیر حالات کی وجہ سے انگریزوں کو اپنی فوجیں ہندوستان سے ہٹانی پڑیں تو اس نے اپنے اقتصادی رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے ان لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت سونپ دی جن کا مفاد ان کے مفاد سے زیادہ سے زیادہ قریب تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان میں قومیت کی تحریک اور آزادی کا ولولہ نہ تھا، مگر موجودہ آزادی صرف اس تحریک اور ولولے کا نتیجہ نہیں ہے دوسری جنگ عظیم اور اس کے پیدا کردہ حالات کا عطیہ ہے قاعدہ ہے کہ حکراں طبقہ اپنے مفاد کو قائم رکھنے کے لئے علاوہ فوج اور اختیار کے چند تہذیبی حربوں سے بھی کام لیتا ہے یہ تہذیبی حربے سرمایہ دارانہ نظام نے سکھائے ہیں اس لئے سرمایہ داری کی بنیادی خصوصیات پر پہلے غور کر لینا ضروری ہے۔

سرمایہ داری کے تین بنیادی ستون ہیں، ذاتی ملکیت، مزدوروں کی اجرت اور مقابلہ جاگیردارانہ نظام کی سب سے بڑی خصوصیت غلامی ہے اسی طرح سرمایہ داری کی سب سے بڑی پہچان اجرت پر مزدوری ہے جاگیرداری میں زمین اور زمیندار سے ایک انسانی رشتہ ہے سرمایہ داری میں انسانی رشتوں کی جگہ روپیہ کا رشتہ لے لیتا ہے روپیہ کے رشتے نے بہت سی آسانیاں بھی پیدا کی ہیں صنعت، تجارت اور زراعت میں اس سے بڑے بڑے کام انجام دئے گئے ہیں سرمایہ کے چند ہاتھوں میں پہونچ جانے کی وجہ سے بڑے پیمانہ پر مصنوعات ممکن ہو گئی ہیں۔ سائنٹیفک آلات نے اور میکانکی طریقوں نے زراعت کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے اجرت کی وجہ سے کام زیادہ ہوا ہے پیداوار دیسی ضروریات کے علاوہ بدیسی ضروریات کے لئے بھی فراہم کی گئی ہے سرمایہ داروں نے نئی منڈیاں فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا ہر ذہن کے سینے کو چیر کر زر و جواہر سے دامن بھر لئے ہیں مادی ضروریات کو ہر طرح پورا کیا ہے۔ بھاپ کوئلے پٹرول اور بجلی کی طاقت سے کام لے کر مشینیں تیار کی ہیں اور مشینوں کے ذریعے سے کم سے کم آدمیوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا ہے صناعی نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی انتہا نہیں۔ کاشت کے بہتر طریقوں کے استعمال۔ ٹریکٹر اور دوسرے آلات کی ایجاد سے پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ ساری دنیا کو کفایت کر سکتی

زراعت کے زمانے میں یورپ میں اسی فی صدی آبادی اتنی غذا فراہم نہ کرسکتی تھی کہ اس کے لئے اور باقی بیس
فی صدی کے لئے کافی ہو۔ ہندوستان کی ۸۰ فی صدی آبادی کسی نہ کسی طرح دیہات سے وابستہ
ہے اور زراعت اس کا ذریعہ معاش ہے۔ مگر ہندوستان کی ضرورت کے لئے غلہ باہر سے منگایا جاتا ہے
یہ جاگیردارانہ یا نیم جاگیردارانہ سماج کا تحفہ ہے۔ سرمایہ دار سماج اگر روپیہ پیدا کرنے اور اسے چند شخصوں
کے ہاتھوں میں پہنچانے میں مصروف نہ ہو تو وہ پیداوار کے لحاظ سے دیسی کیا بدیسی ضروریات کو بھی
پورا کرسکتا ہے۔ پھر ذرائع آمد و رفت کی ترقی نے سارے ممالک کو قریب کردیا ہے۔ ایک ملک کے باشندے
دوسرے کی مدد کرسکتے ہیں۔ ملک کے ایک حصہ میں کمی ہو تو دوسرے بھرپور علاقوں کی یہ کمی پوری کی جاسکتی
ہے۔ جاگیرداری کے زمانہ میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ غلامی میں مشین کی یہ ترقی ممکن نہ تھی نہ اسے اس
طرح کام میں لایا جاسکتا تھا۔ مشین سے یہ وفاداری نہ تھی۔ بعض دوسرے خاندانی یا سامنتی رشتوں سے
وفاداری تھی۔ قومی اور بین الاقوامی منڈیوں کے لئے مصنوعات مہیا کرنا اور ایسی تعداد میں مہیا کرنا بہت
مشکل کام تھا۔ ذاتی سرمایہ، آزاد تجارت، اجرت، نفع کے لئے لگاتار مقابلہ جو سرمایہ داری کے بنیادی ارکان
ہیں پیداوار کی اس وسعت اور قدرتی وسائل پر اس قدر حکومت اور اسی طرح انسانی تہذیب کی اس وسعت
کا باعث ہوئے۔

سرمایہ داری نے فرد کو آزاد کیا۔ خاندان، مذہب، قبیلے کی پابندیاں کم کیں۔ قومیت کا تخیل پیدا کیا
آزادیٔ خیال اور آزادیٔ عمل کا تخیل پیدا کیا۔ انفرادیت کو ترقی دی۔ جمہوری ادارے بنائے۔ مساوات کا سنہرا
خواب دکھایا۔ ایک ملک کے ادبی سرمائے کو دوسرے ملک تک پہونچایا۔ ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ
جلائے۔ سائنس اور تجربے کے لئے فضا ہموار کی۔ عقلیت کی کسوٹی پیش کی۔ ذہن کو ضبط و نظم دیا۔ ایک
جذباتی انسان دوستی کی بنیاد ڈالی۔ حقیقت پسندی کی راہ دکھائی۔ نفسیات کی گرہیں کھولیں۔ قوموں کی
تاریخ مرتب کی۔ تعلیم کو عام لوگوں کا حق قرار دیا۔ بیماریوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ زلزلوں، قحط، وباؤں
طوفان کو اسیر کیا۔ موت کی شرح کو کم کرنے کی کوشش کی۔ تہذیبی قدروں کو چند اونچے طبقوں
کی میراث رکھنے کے بجائے ذاتی محنت اور کوشش سے سیڑھی کے آخری زینے تک پہونچنے کے ذرائع فراہم
کئے۔ خون کی پاکیزگی کو کم کیا اور خونِ جگر کی عظمت بڑھائی۔ صحت، دوا اور تفریح کے لاتعداد راستے کھولے۔ شہروں
میں تفریح گاہیں قائم کیں۔ فلم، ریڈیو، ناول، رسالے اور اخبار کے ذریعے تہذیبی قدروں کو عام کیا۔ فردوں کے لئے

تعطیل ان کے لئے تفریح گاہیں، پارک کھیل کے میدان، سمندر کے کنارے کیمپ موٹروں اور سائیکلوں کی ارزانیاں یہ سب سرمایہ داروں کی نعمتیں نہیں تو کیا ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اور اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جا سکے چونکہ سرمایہ دار اجرت پر کام لیتا ہے اور اسے دوسرے سرمایہ داروں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اس لئے اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ کم سے کم خرچ ہو اور زیادہ سے زیادہ نتیجہ نکلے شروع شروع میں وہ اچھی مزدوری دیتا ہے جس کی وجہ سے لوگ زراعت کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ مزدوروں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے اور مزدوری کی شرح کم۔ پہلے جو مزدوری کبھی کبھی یا فرصت کا مشغلہ تھی، وہ اب زندگی کا پیشہ بن جاتی ہے کیونکہ اکا دکا مصنوعات یا گھریلو دستکاریاں مشین کی بنی ہوئی چیزوں سے سستی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ بڑی تعداد میں تیار ہو سکتی ہیں۔ سرمایہ دار کی فتح کسان یا مزدور کی شکست ہے دوسری طرف ایک قدرتی قانون کے مطابق چھوٹے سرمایہ داروں کو بڑے سرمایہ دار نگلنے لگتے ہیں۔ اس طرح اجارہ داری کا ہوتا ہے ابتدائی دور میں سرمایہ دار کا تعلق اپنے کارخانہ سے ایک براہ راست رشتے کی شکل میں ہوتا، رفتہ رفتہ ایسے سرمایہ دار وجود میں آتے ہیں جو محض بینکنگ کے فروغ کی بنا پر کارخانوں سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں جو کارخانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ان کا کام صرف تھا کارخانوں کے منافعوں کا حساب رکھنا۔ نفع کیلئے نئے راستے نکالنا اور دوسرے سرمایہ داروں پر فتح حاصل کرنا رہ جاتا ہے۔ سرمایہ دار چھوٹے پیمانہ پر ایمانداری سے کام لیتا ہے مگر بڑے پیمانے پر ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کرتا ہے اس کے نزدیک مشین انسان سے زیادہ قیمتی شے ہے کیونکہ مشین مہنگی ہو اور انسان سستے جاگیرداری اور شہنشاہیت کے زمانے میں خاندان، شرافت، سرفرازی اور بلندی روپے سے نہیں میراث سے تعلق تھا۔ تہذیب کی قیادت یہی طبقہ کرتا تھا۔ مذہبی مفاد اسی سے وابستہ تھا اس کے پاس اتنی فرصت اور فراغت تھی کہ فنون لطیفہ کی سرپرستی کر سکے اسے فنی کمالات سے مستفید ہونے کا حق تھا۔ سرمایہ داری کے دور نے یہ قدریں بدل دیں۔ شرافت کے بجائے ان کی ہونے لگی جو چاندی تھی وہ سونا ہو گئی اور دانائی کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ روپے کے زور سے قدریں حاصل کی جانے لگیں۔ امریکہ نسبتاً ایک نیا ملک ہے۔ وہاں جاگیرداروں کی روایات کم ہیں اس لئے سرمایہ داروں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا ہے اور سرمایہ داری کے انتہائی عروج اس کی نعمتوں اور

داروں کی تصویر وہاں ملتی ہے جب مزدور زمین سے اور پیداوار کے ذرائع کی ملکیت سے علیحدہ ہو جاتا ہے
تو اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی صلاحیت اور کارکردگی کو فروخت کرے اور اس کے بدلے میں روپیہ
کمائے تاکہ اس روپے سے ضروریات زندگی خرید سکے۔ اشٹائن بیک نے (SKAPES of WORTH)
سرمایہ داری کی اس چکی کی قلعی کھولی ہے جو کسانوں کو زمین سے علیحدہ کرکے انھیں پیس ڈالتی ہے کسی نے
خوب کہا ہے کہ جو محنت مزدوری کرتا ہے وہ اپنی محنت کے لئے نہیں بلکہ اپنے نفع کے لئے۔ سرمایہ داری
نے حصہ داری کو جنم دیا۔ یہ لوگ اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ کمانے کے بعد روپیہ کو سرمایہ کی شکل میں
لگا دیتے ہیں اور اس کا باقاعدہ منافع وصول کرتے ہیں۔ امریکہ میں ایک کروڑ آدمی چھوٹے حصہ دار ہیں
لیکن انھیں بہت کم ملتا ہے دس ہزار ۲۵ فی صدی کاروبار کے شریک ہیں پچھتر ہزار آدمی سے زیادہ کے
شریک ہیں ان پچھتر ہزار کے دو بڑے گروپ ہیں ــــ ان میں سے دو سو خاندان ایسے ہیں جن کا اقتدار
اقتدار سارے ملک پر پھیلا ہوا ہے اور جو ملک کے کاروبار پر اتنا اختیار رکھتے ہیں کہ اسے جس طرف چاہیں
موڑ سکیں۔ جارج سیلڈس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "ایک ہزار امریکن ریاست ہائے متحدہ کے اصلی
حکمران" اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ایک ہزار میں بھی مارگن، بادرسٹ، راک فیلر اور دوپانٹ قریب
قریب امریکہ کے بیشتر قومی سرمائے کے مالک ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے سیاسی اسباب پر اب
تک بہت زور دیا جاتا رہا ہے مگر اس کے جو اقتصادی اسباب ہیں ان کی اہمیت کو پوری طرح محسوس
نہیں کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے اتنی ترقی کرلی تھی کہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں کو اس سے
خطرہ پیدا ہونے لگا تھا۔ اس جنگ میں کروڑوں جانیں ضائع ہوئیں مگر انگریزوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا
کوئلہ، چکنائی، جست اور دوسرا سامان سویڈن اور ڈنمارک کے راستے سے جرمنی تک پہنچتا رہا اور وہ چند
پیسے سرمایہ داروں کے نام لوگ جانتے ہیں جو دونوں طرف گولہ بارود اور بندوقیں فراہم کرتے تھے یعنی جو
قومیں صدیوں سے دو بہادر ملکوں کے درمیان انھوں نے بنا رکھی تھیں ان ہی کو خود جبور کرتے تھے دوسری
جنگ عظیم نے یورپ کو ہر طرح تباہ کردیا مگر امریکہ اپنے جغرافیائی حالات کی وجہ سے محفوظ رہا۔ اس لئے لڑائی
کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ دار طاقت بن گیا اور دوسری سرمایہ دار حکومتیں اس کے زیر اثر ہوگئیں
انگلستان کو تو اب مذاقاً امریکہ کی انچاسویں ریاست کہا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں روز
ویلٹ نے جو یادداشت کانگریس کو بھیجی تھی اس میں کہا تھا "ہمارے درمیان ذاتی اقتدار کا ایک سیلاب

پچھلے ہفتے جس کی قوت کی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ہے" ٹرومین کو بھی یہ احساس ہوا تھا "سرمایہ دار
صرف ان شرطوں پر کام کرنے کے لیے آمادہ ہے جو اس کی پیش کی ہوئی ہیں۔ اس کے پاس قدرتی وسائل
اور صنعتی علم کا جو خزانہ ہے اس سے وہ صرف اس شرط پر کام لینے کے لیے تیار ہے کہ اسے اس کی مرضی کے
مطابق دام دیئے جائیں" اس لئے امریکہ کی پالیسی امریکہ کے عوام کی مرضی پر نہیں بلکہ ان بڑے سرمایہ داروں
کی مرضی پر منحصر ہے جو وہاں کی اصل حکومت ہیں وہاں کا سیاسی نظام ان کے خلاف کسی طرح نہیں جا سکتا۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ سرمایہ داری اگرچہ انسانیت کی تاریخ میں بڑی ترقی اور وسعت کا باعث
ہوئی ہے مگر اپنے اندرونی تضاد کی بنا پر وہ نظام کو قدرتی طور پر تباہی کی طرف لے جا رہی ہے وہ غربت بیکاری
جہالت کو اسی حد تک دور کرنا چاہتی ہے جس حد تک اس کا مفاد اجازت دیتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ روپے کو
صرف چند بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں مرکوز کر دیتی ہے اس کے لئے نوآبادیاں اسی طرح ضروری
ہیں جیسے ایک مشین کے لئے سامان جنگ اس کے لئے کاروبار کے فروغ کا دوسرا نام ہے کیونکہ اس زمانہ
میں اس سے اونچی قیمتیں مقرر کی جا سکتی ہیں اور منہ مانگے دام مل سکتے ہیں اور ہر قسم کی بے چینی کو روکنا حکومت کا
فرض ہوتا ہے۔ سائنس اس کے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کا آلہ ہے علم اپنے وسائل
کی ترقی کا دوسرا نام ہے تہذیب اپنے مفاد کو قائم رکھنے کا اوزار ہے۔ قومی مذہبی اور نسلی کشمکش سے وہ آگاہ
ہے مگر ان سے کام لینے کے لیے تیار ہے کیونکہ اس کے نفع سے اس کا الّو سیدھا ہو سکتا ہے مگر ان چیزوں کے
باوجود چونکہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی طاقت پھیلتی ہوئی تعلیم علم و ادب کی روح اس کے مفاد کے خلاف
چلتی ہے اس لیے وہ ان سے گھبراتا ہے اس میں ایک بے چینی ایک سماجی خلش یا ایک خوف ایک
بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ وہ روپے اور مشین کا غلام ہو جاتا ہے اور انسانیت کی قدریں کھو بیٹھتا ہے ادھر
مزدوروں کو مشین کے طفیل میں ایک دوسرے کے قریب آنے اور اپنی اصلی طاقت کا اندازہ کرنے کا موقع
ملتا ہے اس کی پیدا کی ہوئی فضا اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے سماج میں ایک شکست
ایک غم ایک بے یقینی ایک بے کیفی آ جاتی ہے۔ تفریح جو نئے کام کے لیے نئے سرے سے تیار ہونے کا نام ہے
ایک مقصد بن جاتی ہے۔ شراب جو غم غلط کرتی تھی خود ایک مستقل غم کا باعث بن جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اور زیادہ تفریح کی طرف دوڑتے ہیں اور اپنی رو میں سارے اخلاقی اور سماجی رشتوں کو
کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ حسن مالِ تجارت بن جاتا ہے۔ جتنی مقدس چیزیں تھیں وہ کھلونا بن جاتی ہیں

کچھ لوگ نیک نیتی لیکن ناسمجھی سے اس دنیا سے فرار پر آمادہ ہو جاتے ہیں کچھ لوگ تن دہی سے عیش کوشی میں مصروف ہو جاتے ہیں، جب نارمل اور عام نعمتوں میں لذت نہیں ملتی تو دل میں کجی اور بے راہ روی شروع ہوتی ہے۔ پستی بلندی بن جاتی ہے اور بلندی پستی۔ خرد کا نام جنوں پڑ جاتا ہے اور جنوں کا خرد۔ اقبال نے مغربی تہذیب پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ دراصل سرمایہ دارانہ تہذیب پر اعتراض ہیں۔ ان کی گہرائی دیکھئے۔

پیام مشرق میں یورپ سے خطاب کرتے ہیں۔

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب ایں است کہ بیمار تو بیمار تر است

نیز بال جبریل میں جو نظم ہے اس میں ارشاد ہوتا ہے۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
بیکاری و بے خودی و عریانی و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

عصر حاضر کے انسان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

عشق ناپید و خرد میگزدش صورت مار — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

جو لوگ ترقی، سائنس، انسان، علم و ادب، اخلاق سے مایوس ہو گئے ہیں اگر وہ غور سے دیکھیں [illegible] سرمایہ داروں نے بیکار کر دیا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے [illegible] اس پیر تسمہ پا کی طرح ہے جو مسافر کا سہارا لیتا تھا اسے اپنے چمڑے کے پیروں سے [illegible] ورڈزورتھ اور کیٹس کو شکایت یہ تھی کہ سائنس نے دھنک سے اس کا حسن چرا لیا ہے۔

ڈی۔ ایچ لارنس کہتا ہے کہ اس نے انسان سے اس کے خون کی گرمی، اس کا ولولۂ حیات، اس کی فطری صلاحیتیں چھین لی ہیں اور اسے بے روح کر دیا ہے۔ تا اڈس ہکسلے اپنے ناولوں میں اس کی تباہ کاریوں پر بڑی طنز کرتا ہے۔ اس نے (APPET ESSACSE) میں ایسی دنیا کے جو انسان کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں انسانوں سے نفرت اور کراہیت کی بو آتی ہے۔ یہ سب لوگ انسانوں سے بالاتر نظر آتے ہیں حالانکہ در اصل یہ سارا قصور سرمایہ داری کا ہے جس نے انسانیت سے اس کی روح چھین کر اسے روپیہ اور ذاتی مفاد کا غلام بنا دیا ہے۔ کاڈویل نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ بورژوا تمدن نے سائنس سے اس کی پسندیدگی اور فن سے اس کی حقیقت چھین لی ہے جو حقیقی ہے وہ اب اس کے اثر سے حسین نہیں رہا ہے کیونکہ بورژوا تہذیب کے مطابق حقیقت غیر انسانی ہے حسن بھی اسی طرح اب حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ بورژوا تہذیب میں حسین ہونا خیالی چیز ہے بورژوا اسی لئے آرٹ کے مقابلہ میں سائنس کا قائل ہے کہ وہ سائنس سے اپنے من مانے کام لے سکتا ہے مگر آرٹ اور فن، ادب اور دوسرے فنون لطیفہ انسانیت کی روح کی آواز ہیں اور وہ اس کے غلام صرف ایک محدود پیمانے میں ہو سکتے ہیں اسی لئے وہ آرٹ کو اس بلندی سے گرا کر تجارتی آرٹ کی بنیاد ڈالتا ہے موسیقی کو جاز تک محدود رکھتا ہے۔ ادب سے وہ سنسنی خیزی یا سستے پروپیگنڈے کا کام لیتا ہے فلم سے وہ قتل، خون، زنا، ڈاکہ، سماجی اکھیڑ پچھاڑ کی تلقین کرتا ہے ریڈیو کو وہ اپنے تجارتی اور سیاسی مفاد کے لیے کھلونا بناتا ہے آرٹ کی قدریں بازار کی قدریں ہیں نہیں انسانی مفاد کی قدریں ہیں۔ آرٹ سستی اور عام چیزوں کو قیمتی بناتا ہے اور رنگوں کے چند دھبوں میں روح کی تصویریں اتار سکتا ہے۔ شہابِ ثاقب، جام جم کی عظمت اور مٹی کے کھلونوں میں دیو یوں دیوتاؤں کا جلال دکھا سکتا ہے۔ اسی لئے بازار آرٹ کا سب سے بڑا دشمن ہے بازار کا بے رحم قانون حسن کو فنا کر دیتا ہے۔ گھریلو ضروریات کی چیزیں کپڑے مکان سب بازار کے قانون کے شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے بنانے والے اجتماعی مفاد کا خیال نہیں رکھتے بلکہ ان کی ضرورت پورا کرنے کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتے ہیں یہ سلسلہ یہاں تک چلتا ہے کہ جو چیزیں انسانی زندگی کو توازن ترتیب معنی اور مقصد دیتی ہیں یعنی تصویریں، فلم، ناول، شاعری اور موسیقی سب بازار کے قانون کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ڈھاکے کی ململ اس لئے نہیں بنتی کہ سستی ململ بازار میں مل سکتی ہے مینا کاری اس لئے نہیں ہوتا کہ ولایت سے سستی چیزیں اس کے بدلے میں مل سکتی ہیں چونکہ سرمایہ دار حسن اور سماجی خیر کے دشمن

کو نہیں سمجھتے اس لئے وہ اسے بھی اپنی فتوحات میں شامل کر لیتے ہیں ہمارا تجارتی آرٹ دراصل ایک
قسم کی بھنگ ہے۔ بقول اقبال کے "یہ روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرتا ہے"۔ یہ جذبات کو ہیجان
میں لاتا ہے مگر اس ہیجان سے کوئی مفید اور حسین مقصد حاصل نہیں کرتا۔ یہ ہمیں حقیقتوں سے خوابوں
کی طرف لے جا کر خوابوں کو حقیقت بنانے کا جذبہ پیدا نہیں کرتا، خواب کے بعد زہر سلا دیتا ہے۔ یہ
ایک قسم کی افیم ہے جو ہم دنیا میں لے جاتا ہے اس میں صرف سوتی ہیجان کی تسکین ایک بے معنی سی پہیلی
ہی سب کچھ ہے انسان اور اس کے ماحول کے درمیان جو ازلی کشمکش ہے اسے نہ یہ ظاہر کرتا ہے نہ اس کے لئے
کوئی حل ڈھونڈھتا ہے۔ اس لئے یہ ایسے ناول تیار کرتا ہے جو جذبات کو بھڑکائیں جو جسم کی آنچ کو تیز
کر دیں اور پھر ٹھنڈا کر دیں۔ جاسوسی ناول کا حیرت انگیز فروغ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ جاسوسی ناول
پرانی داستانوں کی ایک نئی شکل ہے اول تو اس سے کوئی قیمتی انسانی تجربہ حاصل نہیں ہوتا۔ انسانی کردار
اور سیرت کا کوئی گہرا علم نہیں ہوتا۔ انسانی بصیرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا زندگی کے متعلق کوئی اچھا تصور
نہیں بنتا دوسرے یہ ایک نشہ بن کر علم و عمل کی دوسری صلاحیتوں کو مجروح کرتا ہے یہاں مطالعہ یا ذہنی
توجہ ضروری نہیں۔ صرف واقفیت یا سرسری نظر کافی ہے۔ بعض فن کار اس ابتری اور پستی سے گھبرا کر رومانی
ذاتی اور رمزی آرٹ میں پناہ لیتے ہیں جہاں فرد، ذات شخص سب کچھ ہوتا ہے جہاں سب سے اچھا نغمہ
وہ ہے جس کو مغنی کے سوا کوئی نہ سنے جہاں چیزوں کے من مانے نام ہیں جہاں ابلاغ اور ترسیل کی کوئی
اہمیت نہیں ہے تخئیل کی بے اعتدالی مرض بن جاتی ہے یا اجتماعیت سے گھبرا کر یہ ذاتی دنیا
کا کھونا بن جاتی ہے یہ دونوں سرے عدم توازن کی مثال ہیں اور دونوں بورژوا تہذیب کی بنیادوں
کے اندرونی تضاد سے پیدا ہوتے ہیں ہمارے فلموں کی بازاریت اور عامیانہ پن، اور میرا جی کی لذت پرست
آزاد نظم دونوں کو اسی نقطہ نظر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرانس کا انتہائیت پرست، ڈی۔ ایچ لارنس، پچھلے
جوائس اور ڈیوژنسٹ سیریلسٹ ہالی وڈ کے فلم ساز اور جیمس کی بکواس والے ناول سب ایک ہی مرض کے دو پہلو
ہیں۔ لاسکی نے اپنے ایک مشہور مضمون میں بورژوا تہذیب کی اس غارت گری کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے
بورژوا تہذیب نے انسان اور انسان کے درمیان تجارتی ذاتی مفاد کے سوا یا اجرت کے سوا دوسرا رشتہ
نہیں رکھا۔ اس نے ان تمام پیشوں سے ان کا تقدس اور حسن چھین لیا ہے جو اب تک احترام اور اعزاز
سے دیکھے جاتے تھے اس نے ڈاکٹر، وکیل، پادری، شاعر، سائنس داں کو اپنا مزدور بنا لیا ہے۔ اس نے

خاندان سے اس کا خذ باتی غلاف اتار پھینکا ہے اور خاندانی رشتوں کو صرف مالی رشتہ بنا دیا ہے"

سطور بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسانوں کی اور ان کے بہترین انکاسکی کیا حالت ہو جاتی ہے اور کیوں لوگوں کی ذہنیتیں مسخ اور ان کی روحیں مریض ہو جاتی ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ تہذیب کا ایک حقیقی مفہوم ہمارے سامنے ہو تاکہ تہذیبی دنیا میں اس کی غارت گری اور تہذیبی اور انسانی نقطۂ نظر سے اس کا زوال ہمارے نزدیک ناگزیر ہو جائے۔

تہذیب کا جو عام تصور ہے وہ در اصل بڑا ناقص اور محدود ہے ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہمارا یہ تصور در اصل بعض پچھلی روایات کا عطیہ ہے اور چونکہ بدلتی ہوئی زندگی میں کوئی روایت پوری طرح کارآمد نہیں رہتی اس لئے ہمیں بھی حقیقت کو چھوڑ کر سراب کی جستجو نہیں کرنا چاہیئے۔ اب تک ہم تہذیب کو شرافت، شائستگی، متانت، نفاست، لطافت، جذبات پر قابو، ایک رچا ہوا شعور، ایک ذوقِ جمال، ایک نرم اور شیریں معقولیت سمجھتے ہیں مہذب انسان وہ ہے جو علم کی برکتوں سے مالا مال ہے جسے اپنے جذبات پر قابو ہے جو بازار میں جھگڑتا نہیں جو عزت کی خاطر جان دے دیتا ہے جو روپیہ کی زیادہ پروا نہیں کرتا، جو علم طبعی کا ماہر ہے جو روایات و آداب سے واقف ہے جو حسن اور تناسب کا راز جانتا ہے جو ایک ظرافت کی حس رکھتا ہے، جو اپنے اوپر بھی ہنس سکتا ہے جو کسی قسم کے گرد و غبار سے آلودہ نہیں چاہے وہ مادی ہو یا ذہنی اسی اخلاق کو بعض لوگ شیریں معقولیت SWEET REASONABLE کہتے ہیں۔ فاشٹ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ "کلچر یا تہذیب کے لئے اخلاق کا ایک تصور ضروری ہے" میتھیو آرنلڈ کے نزدیک کلچر تکمیل کی سعی ہے یہ نرمی اور روشنی کی تلاش ہے وہ کہتا ہے کہ "تہذیب انسان ذہن اور روح کی ایک اندرونی خاصیت پر زور دیتا ہے وہ خارجی حالات، یا بیرونی حوادث کی پروا نہیں کرتا" ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا بھی تصور کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ تصور سرے سے غلط نہیں ہے اس میں تہذیب کی بعض قدریں آجاتی ہیں مگر ایک خاص افتادِ ذہنی پر یہ زور بلکہ ذہن پر یہ سارا زور ایک جاگیردارانہ نظام کی یادگار ہے یہ اس فارغ البال طبقے کی پیداوار ہے جو مالی مشکلات کی فکر سے آزاد ہے اور جس میں شرافت اور ذاتی وجاہت کی بڑی اہمیت ہے۔ "تاریخ میں بارہا دیکھا ہوا ہے کہ بالائی طبقے نے قدریں بنائی ہیں اور متوسط طبقہ ان کا سب سے بڑا محافظ اور علمبردار رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بالائی طبقہ کو ان قدروں سے کام لینا ہوتا ہے ان پر یقین رکھنے اور انہیں ماننے کی

ضرورت نہیں۔ مذہب، قانون، اخلاق سب سے وہ بالاتر ہے۔ متوسط طبقہ ان پر یقین رکھتا ہے اور اس کے عمل میں یقین کی پختگی اور استواری ہوتی ہے عوام صرف اس خوبصورتی کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اس تک پہنچنے کی ان میں ہمت ہوتی ہے نہ فرصت ہمارے شعرا میں سے اکثر متوسط طبقے کے افراد تھے مگر انھوں نے جن قدروں پر زور دیا ہے وہ اسی بالائی طبقے کی بنائی ہوئی اور اس کے مفاد کے مطابق تھیں مگر آصف الدولہ کو باز زیر تیر سے باتیں کرنے میں عار نہ تھا ...... میر کو عار تھا۔ مصحفی نے جا بجا اپنے کلام میں اشراف اور اجلاف کا ذکر کیا ہے۔

تنبیہ الجہال میں لکھتے ہیں:۔

جہل اس فن میں نہ تھا اسلاف کو	کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو
جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار	شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازوں سے اجلافوں کو کیا	شعر سے بزازوں، نداؤں کو کیا

غالب کی پنشن کی جستجو صرف مالی فائدے کے لئے نہیں تھی۔ عزت، وقار اور تہذیب کے اس معیار کو باقی رکھنے کی وجہ سے بھی تھی جو انھیں عزیز تھا۔ جب وہ جیل خانے گئے تھے تو انھیں رسوائی کا غم زیادہ تھا اپنے گناہ کا احساس نہ تھا۔ شیفتہ نے اس تبدیلی معیار سے نظیر کو پرکھا تھا کہ چونکہ ان کا کلام سوقیوں کی زبان پر ہے اس لئے انتخاب کے لائق نہیں۔ اکبر کو پردے میں، ایک جاہ و تمکنت نظر آتی تھی۔ انھیں غم اس بات کا تھا:۔

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں	زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں	نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیبِ رقم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی	لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے

اقبال کے ہاں روحِ شریف اور نگاہِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف کا جو ذکر ملتا ہے وہ سب اس تصور کا پرتو ہے مطلب یہ ہے کہ اردو زبان کے ایک خاص اسلوب سے محبت بھی اسی تہذیبی تصور کا مظہر ہے جس میں وقت اور حالات کی قدرتی تبدیلیوں کا احساس نہیں ہے اور پچھلے قدیم اور فن پر اس قدر اصرار اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس میں جاگیردارانہ نظام کی کتنی قدریں شامل ہیں۔ لطافت، نزاکت، پختگی اور ایک ہلکی سی انسان دوستی کا یہ تصور در اصل ایک محدود سماجی شعور کا نتیجہ ہے۔

تہذیب کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لئے ہمیں جدید علوم خصوصاً علم الاقوام اور عمرانیات کی مدد لینی پڑے گی ان ہی علوم نے تہذیب یا کلچر کی تعریف کی ہے اور اس کی وسعتوں کا احاطہ کیا ہے۔ ان کی معلومات کے مطابق کلچر در اصل ایک اجتماعی میراث ہے۔ بدن کی ساخت اور اعضائے جسمانی کی خصوصیات کے علاوہ انسان کو یہ اجتماعی میراث دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ اس میں زبان، عادات، خیالات، عقائد، تنظیم اور پس منظر سب آجاتے ہیں۔ تمدن یا سولیزیشن زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں کی ایک خاص شکل ہے۔ تہذیب میں حدود دستکاریاں صنعتی طریقے پیداوار کے ذرائع اور قدریں شامل ہیں۔ ان قدروں کی بنا پر جب شہری زندگی ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور اسے کچھ استحکام اور روایت مل جاتی ہے تو وہ تمدن کہلاتی ہے۔

انسان زندہ رہنے کے لئے برابر اپنے ماحول سے جنگ کرتا اور اسے بدلتا رہتا ہے ماحول سے جب وہ دوچار ہوتا ہے تو اس سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ایک دوسرا مصنوعی اور ذیلی ماحول بنا لیتا ہے یہ اس کی زرہ، اس کی ڈھال اس کی تلوار ہے جس کے برتے پر وہ آگے بڑھتا ہے، روزی کماتا ہے، اجتماعی کاموں میں شریک ہوتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ہم نے اب تک زندگی میں خیالات کو بڑی اہمیت دی تھی تہذیب کو قدروں کے تعین اور اخلاق کے شعور سے پہچانا تھا حالانکہ تہذیب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بنیادی حیثیت اقتصادی رشتوں یا پیداوار کے ذرائع کی ہے اسی بنیاد پر ذیلی عمارتیں بنتی ہیں ادب فلسفہ اخلاق مذہب کے سربفلک میناروں کی بنیاد مادی ضروریات کی زمین پر ہے۔ ابتدائی دور میں بنیادی ضروریات سادی اور واضح اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی شکل میں تھیں جوں جوں زندگی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے اور یہ پیچیدگی تقسیم عمل کی وجہ سے ہے زندگی ترقی کرتی جاتی ہے اور بہت سی قوتوں کے ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے انسان کے اوزار اس کی عمارتیں اس کی کشتیاں سحر اور مذہب کے قوانین اس کی تہذیب کے مظاہر ہیں اگرچہ تہذیب صرف مادی وسائل کا نام نہیں ہے مگر مادی وسائل کے پورا کرنے کے لئے ہی یہ عمارت بنتی ہے۔ ان ہی وسائل کے لئے علم کی ضرورت ہے تاکہ اوزاروں اور دستکاریوں کو فراہم کیا جا سکے اور ان کی سماجی ضروریات کے مطابق تنظیم ہو سکے اس تنظیم میں ذہنی اور اخلاقی ذرائع کام کرتے ہیں۔ اشیاء پر قدرت اور ان کے استعمال سے ہی ان کی قدر قیمت کی پہچان اور ان کی پرکھ شروع ہوتی ہے جس کے لئے مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے میل ملاپ کے یہ رشتے اجتماعی نظام وجود میں لاتے ہیں اور اجتماعی شعور کا آغاز ہوتا ہے ان میں زبان کی حیثیت بہت اہم ہے۔ زبان کوئی وجدانی اور الہامی چیز نہیں ہے یہ انسان کی مخصوص ضروریات کی ایجاد ہے اس کی زندگی کے

اخلاقیات ایک قسم کی رسم ہے" یہ تہذیب یا کلچر کا ایک لازمی جز ہے اور کوئی آلہ نہیں ہے اور نہ زینت بلکہ سبھوں کا
ایک صوتی اظہار ہے اس طرح یہ عالموں اور پنڈتوں کی جاگیر نہیں۔ عوام کی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ
ہے جس کے ذریعہ سے بچوں کو بہت جلد اس فضا سے مانوس کر دیا جاتا ہے جو ان کے پیش رووں نے برسوں
میں پیدا کی تھیں۔ اسی طرح ضمیر، مذہب اور اخلاق کے تصور کی پابندی بھی سماج یا اجتماعی روح کی
ضروریات کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اسی لئے جذبات اور قدروں کی تعمیر سوسائٹی کے تہذیبی سانچے کی مرہون منت ہے

اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ تہذیب کی روح کو سمجھنے کے لئے مختلف نسلوں کے ذرائع پیداوار
کو سمجھنا چاہئے۔ تہذیب جو ادارے بناتی ہے وہ اسی ذریعہ پیداوار کے دائرہ اثر میں ہوتے ہیں۔ تہذیب
کو تفریح کے ذرائع تک محدود کرنا غلطی ہے۔ پہلے غذا فراہم کرنے کا مسئلہ آتا ہے کام کے بعد تفریح کا مسئلہ
ابھرتا ہے تاکہ کام بہتر طریقے سے انجام دیا جا سکے۔ تفریح کے ذرائع بھی کام کے ذرائع سے متاثر ہوتے ہیں یہی
سے فارغ البال طبقے کے ذرائع تفریح کو بھی پورے سماج کے کام کے طریقوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے
خاندان، جنس، نشوونما اور تحفظ اور بقا کے جتنے رشتے ہیں وہ اسی پیداوار اور کام کے بنیادی رشتے کے
گرد گھومتے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے گرد جو مخصوص جذبات بن گئے ہیں وہ
پیداوار اور کام کے رشتے میں خلل انداز یا خارج ہوں۔ تضاد یا کشمکش اس طرح وجود میں آتی ہے اور اس
کشمکش کے گرد شعر و ادب اور فنون لطیفہ نے بڑے بڑے رنگ محل تیار کئے ہیں۔

تہذیب کے عمل میں اور ارتقا میں چار لازمی پہلو ہیں۔ اقتصادی تنظیم، قانون اور تعلیم اور آرٹ۔ تعلیم
اقتصادی تنظیم میں مدد دیتی ہے اور اس طرح ایک میز ہے مگر اس کے علاوہ یہ شخصیت کے جوہر کو چمکاتی
ہے اسے قطرے سے سمندر ذرے سے صحرا اور ایک فرد سے ایک پوری انجمن میں تبدیل کر دیتی ہے
قانون اسی سماج کے رشتوں کو اس کے مفاد کے مطابق قائم رکھتا ہے اور دوسرے متضاد باتوں کو مائل یا
خارج نہیں ہونے دیتا۔ فن کی حیثیت ان سب سے بلند اور مخصوص ہے اول تو یہ انسانی تنظیم کی بنیادی
ضروریات کو پورا کرتا ہے، یہ اسے سوسائٹی کے حقائق سے بہتر طور پر دوچار ہونے میں مدد دیتا ہے پھر جب
اقتصادی رشتے قانون کی سختیاں انسان اور افراد کے رجحانات پر دباؤ ڈالنے لگتی ہیں تو ان کے
خوابوں، خیالوں، ان کی امنگوں اور آرزوؤں کی عکاسی کرکے انھیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ فرسودہ
اقتصادی رشتوں کا مقابلہ کر سکیں یا انھیں بدل سکیں اسی طرح تہذیب جو اجتماعی انسان کی تخلیق ہے

افراد کی صلاحیت کا دائرہ وسیع کرتی ہے اور اس کے عمل کی طاقت کو بڑھاتی ہے وہ خیالات کی ایک
ایسی گہرائی اور نظر کی ایک ایسی وسعت عطا کرتی ہے جو حیوانوں میں کبھی پائی نہ گئی۔ تہذیب افراد کو
باقاعدہ جماعتوں میں منظم کرتی ہے اور انھیں ایک لاانتہا تسلسل عنایت کرتی ہے۔ انسان اپنی کوئی
ضرورت اس طرح پوری نہیں کرتا جس طرح جانور کرتا ہے بلکہ تقسیم عمل اور مستقبل کے لئے مناسب انتظامات
کر کے وہ رنگ، صورت، موسیقی اور شاعری سے لطف اٹھاتا ہے اور تفریح کے ذریعے سے زندگی کے
لئے تازہ دم ہوتا ہے۔

جس طرح سرمایہ داروں نے انسان کی طاقت اور اقتدار میں اضافہ کر دیا ہے اسی طرح اس نے
تہذیب کو بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ مگر اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ اپنے نظام کے اندرونی تضاد
کی وجہ سے یہ اس سانپ کی طرح ہے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے اسی لئے تعلیم، فن اور اخلاق کے
زرین اصولوں کو جن کے سہارے ایک زمانے میں اس نے ترقی کی تھی، یہ خود ہی کچلتا ہے۔ تعلیم سے شخصیت
کو ابھارنے اور اس کے خوابیدہ جوہر کو چمکانے کے بجائے یہ محض منشی کا کام لیتا ہے۔ فن کو حقیقت آفریں
خواب بنانے کے بجائے بے معنی خواب یا سستے نشے یا دیوانے کا خواب بنا دیتا ہے۔ سائنس سے عقلیت
توازن اور سماجی شعور حاصل کرنے کے بجائے یہ صنعتی ترقی اور تباہ کاری کا کام لیتا ہے۔ اخلاق کے
معیاروں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور صرف روپیہ کی پرستش کا درس دیتا ہے موجودہ، تہذیبی زندگی میں
تعلیمی اداروں، اخباروں اور رسالوں، فلم اور ریڈیو کی جو اہمیت ہے ظاہر ہے، مگر سرمایہ داری ان کے حقیقی
مقصد کی پروا نہیں کرتی۔ انھیں اپنے اغراض کی اشاعت کے لئے استعمال کرتی ہے۔ روشنی کے
فرشتے سے جب تاریکی کے فرشتے کا کام لیا جائے تو نتیجہ ایک دھندلکا ہوتا ہے اور موجودہ دور کے جس
بحران کی طرف تمام مفکروں ادیبوں، فن کاروں اور دانش وروں نے اشارہ کیا ہے وہ اسی دھندلکے
کی وجہ سے ہے۔ ہنڈرسن اور ہکسلے نے حال میں اپنے مضامین میں اسی پر زور دیا ہے کہ موجودہ بحران
کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی غذا اس رفتار سے نہیں بڑھی جس رفتار سے اس کی آبادی بڑھی ہے۔ غذا ایک
خاص حد تک بڑھ سکتی ہے۔ اس لئے آبادی کا کم ہونا ضروری ہے یہ ویسی ہی بات ہے کہ ہندوستان
میں غذا کی کمی کی وجہ سے لوگوں کو ہفتے میں ایک دن کھانا چھوڑ دینا چاہیئے۔ مثبت پہلوؤں سے یہ گریز
اور منفی پہلوؤں پر یہ اصرار اس دور کے دانشوروں کی ذہنی کم مائگی کو خوب ظاہر کرتا ہے۔ ہکسلے کہتا ہے

کہ سائنس نے انسانوں کو جانور بنا دیا ہے اس لئے سائنس دانوں اور دانش وروں کا فرض ہے کہ وہ سیاست دانوں کے چنگل سے دنیا کو نجات دلائیں ہمارے خیالات محض سطحی ہیں ان میں حقائق سے جان بوجھ کر چشم پوشی کی گئی ہے موجودہ بحران کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت ترقی کر چکی ہے اور وہ سرمایہ داری اور اجارہ داری اور اس کی اولاد فسطائیت سے بیزار ہے مگر ابھی تک روس اور چین کے علاوہ اپنے آپ کو اس جنگل سے آزاد نہیں کرا سکی* دنیا کی روح کی فریاد۔ مریض کی بڑبڑاہٹ اور ہذیان نہیں بلکہ گرفتار بلا کی چیخ ہے جو کبھی زندان کی دیواروں میں گھٹ کر رہ جاتی ہے اور کبھی ان دیواروں کو توڑ کر فضا میں سما جاتی ہے۔

امریکہ کے تعلیمی اداروں میں مناعی کے کمال پر زور دیا جاتا ہے روپیہ کی فراوانی کی وجہ سے علم کی طرف بھی توجہ ہے، مگر ان تعلیمی اداروں کا سیاسی زندگی میں کوئی فیصلہ کن حصہ نہیں ہے ہاں اخبارات اور رسائل کا اثر بہت ہے یہ تو سب جانتے ہیں کہ امریکہ کے بڑے بڑے اخبار وہاں کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں اور عوام کو وہی درس دیتے ہیں جو ان کے مالکوں کے مقصد کو پورا کرتا ہے جارج سیلڈس نے وہاں کے رسائل کے متعلق بڑی حیرت انگیز معلومات مہیا کی ہیں وہ لکھتا ہے کہ وہاں کا سب سے کثیر الاشاعت رسالہ "ریڈرز ڈائجسٹ" (READERS DIGEST) جس کے خریدار ایک کروڑ دس لاکھ اور جس کے پڑھنے والے پانچ کروڑ ہیں (DIGEST) یا مختلف رسالوں کا مجموعہ اور آئینہ ہیں۔ اگرچہ اس پر وہاں کے سرمایہ داروں کا براہ راست قبضہ نہیں ہے مگر یہ اپنے مضامین میں حکمران طبقے کی حمایت کرتا ہے وہاں کے انگریزی کے استادوں کی قومی کونسل نے اس سلسلہ میں تحقیق کی تھی اور اس نتیجہ پہ پہنچے کہ اس کے مضامین یا تو اس کے اڈیٹروں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں یا اس کے اڈیٹر دوسرے رسالوں میں چھپوا کر انہیں اپنے یہاں شائع کرتے ہیں یہ یہودیوں کے حبشیوں کے مزدوروں کے خلاف ہے یہاں تک کہ روزویلٹ کے خلاف بھی رہا ہے اس کے علاوہ LADIES HOME JOURNAL, WOMENS HOME COMPANION, MECATT, GOOD HOUSE KEEPING, AMERICAN COSMOPORITON, RED BOOK, FORM JOURNAL LIFE, SATURDAY EVENING POST,

---

نوٹ:۔ روس اور چین کی فہرست میں مشرق اور وسطی یورپ کی عوامی جمہوریتیں مثلاً پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہنگری وغیرہ بھی شامل ہیں (ادارہ)

جیسے ماہنامے اور جیسے ہفتہ وار اخبار جن میں سے سب سے کم اشاعت چھ لاکھ ہے اور سب سے زیادہ اکتالیس لاکھ ہے۔ مارگن ہارسٹ وارنر لوپے (ce) کروڑ پتی وغیرہ کے ہیں اور مارگن ان میں سے بیشتر میں بڑا حصہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی اخبار اور رسالے تفریحات پر زور دیتے ہیں، اشتہار کو اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ اسے ایک فن بنا دیا ہے جسم کی پیاس کو اتنا ابھارتے ہیں اور روح کو اس قدر تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہالی وڈ کی فلمیں اگرچہ ٹکنیک اور ساز و سامان کے لحاظ سے اتنی شاندار ہوتی ہیں۔ مگر دنیا کے ادبی اور علمی خزانے سے روز بروز بیگانہ ہوتی جا رہی ہیں اور دہشت پسندی، سنسنی خیزی، قتل و خون، نفسیاتی الجھنوں اور آزاد محبت کے پرچار میں مصروف ہیں۔ ٹالسٹائی کے اینا کرینینا کو ہالی وڈ نے فلمایا اور ایک انگریز کمپنی نے انگریزوں نے تالسٹائی کے ساتھ زیادہ انصاف کیا۔ ہالی وڈ نے روپیہ کا لالچ دے کر بہت سے انگریز مصنفین کو اپنی طرف مائل کر لیا مگر فن کے صحت مند معیار، بلکہ تخلیق کی مسلمہ قدروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے صرف خون جگر کو مال تجارت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ریڈیو کو تجارتی کمپنیوں کے ہاتھ میں دے کر انھوں نے عوام کے لئے وہ تفریحی غذا مہیا کی جو سرمایہ داروں کے مفاد کے مطابق ہو۔ کتابوں کے چھاپنے میں انھوں نے بازار کی مانگ کو سب سے بڑا معیار دیا اور بازار کی مانگ کے اتار چڑھاؤ کو اپنی کتابوں کی جنبش کا مرہون منت بنایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اچھے اچھے ادیبوں کے کارنامے کم بکتے ہیں لیکن جاسوسی کے ناول ذہنی پستی اور جنسی بے راہی کے رنگین مرقعے زیادہ کامیاب ہیں۔ جنس بازار کی ایک شے (COMMODITY) بنا دی گئی ہے۔

ہندوستان میں موجودہ آزادی کے بعد جو رجحانات نمایاں ہیں وہ امریکہ کے رجحانات سے زیادہ مختلف نہیں۔ بنیادی طور پر وہی تاریخی چکر یہاں بھی کام کر رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے، شخصیت کی تربیت، اخلاق کے معیار اور انسان دوستی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہماری زندگی ان پر پابندیاں عائد کرتی ہے اور تعلیمی اداروں میں جو چیزیں حسین اور نیک ہیں۔ زندگی میں ان کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ استادوں اور شاگردوں میں ایک عجیب بے یقینی ہے۔ انھیں خود ان چیزوں پر اعتماد اور بھروسہ نہیں جو وہ بتاتے ہیں۔ علم انسانی روح کی خلش نہیں ایک ذریعہ ہے روپیہ کمانے اور موجودہ زندگی کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کا اور چونکہ یہ نعمتیں گراں ہوتی جا رہی ہیں اس لئے

لوگ روپے کے پیچھے دوڑتے ہیں وہ مڑ مڑ کر زندگی کی اچھی قدروں کی طرف دیکھتے جاتے ہیں۔ پھر یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول سب دفتری نظام کے پرزے بن گئے ہیں یہ ہرن پر گھاس لادتے ہیں اور بازار کی مانگ کے مطابق انسانی مال مہیا کرتے ہیں یہ پرانی تہذیب اور سبھیتا کے ترانے گا کر موجودہ زندگی کے حقائق سے گریز سکھاتے ہیں۔ ان میں استادوں کی عزت بھلی ہے مگر ان کی ضروریات زندگی کا خیال نہیں کیا جاتا۔ ان کے لئے یہ تسلی کافی ہے کہ وہ ایک آسمانی مخلوق ہیں جو علم و ادب کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں اور مالی ضروریات سے بے نیاز ہیں۔ موجودہ نظام میں علم و ادب کی حقیقی قدر معین نہیں ہے۔ صرف جلسوں اور تقریروں میں اس کا اعتراف کافی ہے۔ سائنس پر زور اس لئے نہیں کہ تجرباتی طریقہ عقلیت اور استدلال بڑی چیزیں ہیں بلکہ اس لئے ہے کہ ان سے کارخانوں کے بنانے اور حکومتوں کے لئے طاقت مہیا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ سائنس کی تعلیم میکانکی ہے، اسے موجودہ اجتماعی علوم کی بنیاد نہیں دی گئی اور سائنس کے ایسے خانے بنا دئے گئے ہیں کہ دوسرے کا گزر نہیں۔ آرٹ شعر و ادب اسی سے ذلیل ہے کہ یا تو دھنک چاندنی اور سبزہ زار کے حسن سکھاتا ہے یا بغاوت پھیلاتا ہے۔ طالب علموں کے لئے طلب علم کی مدت ایک زبردستی کی قید ہے۔ ان کے نزدیک ڈگری کی شہزادی زیادہ اہم ہے جس کے حصول کے لئے انھیں کتابوں پروفیسروں اور درسگاہوں میں دماغ بھی کرنا پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی ادارے اب ایسے ذہنی قلعے نہیں رہے جن میں لوگ باہر کے فتنوں سے محفوظ رہیں اور گھریلو ہنگاموں کو باہر نہ جانے دیں۔ ان کی کچی دیواروں میں جو رخنے ہیں وہ موجودہ بحران کا نتیجہ ہیں۔

ہمارے اخبار اور رسالے علم و تہذیب کی کس قدر خدمت کرتے ہیں اور ہماری معلومات میں کتنا اضافہ کرتے ہیں بے شبہ بعض امریکن سیاحوں کے نزدیک وہ امریکہ کے پرچوں سے زیادہ سنجیدہ ہیں کیونکہ ہندوستان ابھی امریکہ نہیں بنا ہے مگر اتنا سرمایہ داروں کا جو شکنجہ بڑھ رہا ہے اس کے نتیجے کے متعلق پیشین گوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آج ملک کے بیشتر اخبارات بڑے سرمایہ داروں کے قبضے میں یا ان کے اثر میں ہیں۔ آزاد اخباروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ رسالوں میں علمی و ادبی پہلو سے زیادہ سستی جذباتیت، چاشنی اور چٹخارا ہے۔ میں نے دہلی کانپور، لکھنؤ، بنارس، علیگڈھ کے اسٹیشن پر ویلر بک اسٹال پر نظر ڈالی اردو کے تقریباً ایک درجن رسالے دیکھے مگر ان میں "آج کل" کے علاوہ کوئی ایسا

پہچانا تھا جو کچھ بھی سنجیدگی کا دعویٰ کرتا ہو اور آج کل بھی آپ جانتے ہیں اس سنجیدگی کا نقاب کس مقصد کے لئے اوڑھے ہوئے ہے۔

ہماری زندگی میں دیکھتے دیکھتے ایک فلمی تہذیب وجود میں آ رہی ہے۔ امریکہ کے بعد ہندوستان سب سے زیادہ فلمیں بناتا ہے۔ فلموں کے گانے، ستاروں کے لباس، فلموں کے قصے ہماری زندگی میں دیکھتے دیکھتے داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارے اخلاق پر فلموں کا اثر پڑ رہا ہے۔ نوجوان فلمی دنیا کے خواب دیکھتے ہیں لڑکیاں ستاروں کی جگمگاہٹ کی طرف للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتی ہیں۔ یہاں فلمی دنیا کے وجود اس کی اہمیت اور اس کے مفید پہلوؤں سے بحث نہیں۔ یہاں کہنا یہ ہے کہ موجودہ فلمی دنیا کا میاب سرمایہ داروں کا بنایا ہوا ہے جس کا مقصد ہماری تفریحی ضروریات کو کھلونا بنا کر ان سے روپیہ حاصل کرنا ہے فلم چاشنی اور چٹخارے اور جنسی آزادی کے راستے سے گزرتا ہوا اس منزل تک لے جاتا ہے جو پرانے سماجی رشتوں کو باقی رکھتا ہے۔ فلم کا انجام مروجہ معیاروں کو قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے اس کا آغاز مروجہ معیاروں سے بغاوت سکھاتا ہے۔ سرمایہ صرف جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔ وہ اس آنچ سے کوئی قیامت اٹھانا نہیں چاہتا اس لئے اس پر آخر میں نہایت بھونڈے اور بھدے طریقے سے پانی ڈال دیتا ہے وہ عام فہم زبان استعمال کرتا ہے کیونکہ اسے لوگوں کے دلوں تک پہنچنا ہے۔ گرو جدید تکنیک برتتا ہے کیونکہ اس سے وہ اپنے اثر کو بڑھا سکتا ہے مگر وہ قدیم قدروں کو نہیں چھوتا۔ اس معجون مرکب کی وجہ سے اس نے ہماری زندگی کے تہذیبی انتشار میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ فلم ایک تلوار ہے مگر ہم اس سے ترکاری چھیلتے ہیں۔ اس سے ہم کسی محاذ پر لڑنے کی بجائے محرم میں ہاتھ کی صفائی دکھانے پر قناعت کرتے ہیں۔

ریڈیو ایک سرکاری ادارہ ہے سرکار پر سرمایہ داروں کا اثر ہے سرمایہ داروں کو عوام کے جذبات سے کھیلنا آتا ہے اس لئے ریڈیو کی زبان چلن اور رواج کے بجائے قدامت پرستی کی طرف لے جاتی ہے اس کی تفریح اور تعلیم میں کوئی واضح شعور اور کوئی منصوبہ نہیں ہے اس کے اپنے آرٹ فن اور شعر و ادب کے کوئی اصول نہیں ہیں وہ ایک سرکاری ادارہ زیادہ ہے ایک تہذیبی ادارہ کم۔ اس میں تفریح کے ذرائع کو علم کے ذرائع سے زیادہ قدر ہے۔ اسی لئے یہ سستے فلمی گانوں اور عام فہم گیتوں کو وہ اچھی اور مفید تقریروں سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ایک عالم کے مقابلے میں اس کے نزدیک ایک گویئے کی زیادہ قدر ہے اور گویئے بھی وہ جو عوام کو بہلا سکیں انہیں بیدار نہ کریں۔

ہندوستان کی تہذیب پر اب بھی جاگیرداری کا گہرا اثر ہے، گو سرمایہ دار طبقہ اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ دنیا اب اس منزل پر پہونچ گئی ہے کہ ایک ملک کے عوام دوسرے ملکوں کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے نئی عوام دوست قوتوں کا اثر بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ یہ تینوں اثرات ہماری موجودہ تہذیب کی کشمکش اور اس کی سراسیمگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک اچھی تہذیب کا شعور سماجی ضروریات اور عوام کی فلاح سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتا اور نہ وہ تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز کر سکتا ہے اسی لئے ضرورت ہے کہ تہذیب کے موجودہ محدود تصور کو وسیع کر کے اسے ذرائع پیداوار، تقسیم عمل اور اشتراک باہمی کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے اور فارغ البال طبقے کی میراث پر پہچانی ہوئی نظریں ڈالنے کے بجائے عوام کے معیار زندگی کو بڑھانے کا مقصد متعین کیا جائے۔ اور کام کرنے والوں کی قدر کرنے پر زور دیا جائے اسی لئے انسان پر مشین کی حکومت سے زیادہ مشین پر انسان کی حکومت ہونا چاہئے اور تہذیب کے تاج محل کو عوامی جد و جہد اور اجتماعی حسن کاری کا ایک روشن مینار بنانا چاہئے اسی لئے امن اور عوام کی حکومت پر اصرار کرنا چاہئے تاکہ سارے انسان دنیا کے تہذیبی سرمائے سے یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکیں اور ہر فرد اپنی عقل کی اس بلندی اور شخصیت کی اس تکمیل تک پہونچ سکے جو اس کا حق ہے۔ کلچر کے تحفظ کے لئے مجرد اخلاقی تصورات اور موہوم انسان دوستی کے بجائے کام کا مفید، مقصدی اور اجتماعی ہونا ضروری ہے اور کام اور توزیع میں ایک صحت مند رشتہ پایا جانا ضروری ہے اس کے لئے اندھی ماضی پرستی کے بجائے ماضی و حال کا ایک صالح تصور لازمی ہے اس کے لئے انسانیت پر یقین اور اس کی اچھی صلاحیتوں پر ایمان ضروری ہے۔ اچھی تہذیب چند افراد کی جاگیر نہیں ہو سکتی، وہ صرف فارغ البالی اور فرصت کا کھلونا نہیں بن سکتی۔ اس کی چمن بندی کے لئے باخبر اور روشن خیال عوام کے پسینے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے۔

خونِ دلِ معمار کی گرمی سے ہے قائم — میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

(انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کے جلسے میں پڑھا گیا)

سید سجاد ظہیر

غلط رُجحان

کوئی سال بھر ہوا میں نے محاذ (بمبئی) میں راجندر سنگھ بیدی کا ایک خطبۂ صدارت پڑھا جس میں انھوں نے میر تقی میر کی شاعری کے متعلق ایک دو جملوں میں یہ کہا تھا کہ ہم اس سے سوائے زبان اور سادگی کے اب اور کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس وقت میرے پاس محاذ کا وہ نمبر نہیں ہے کہ میں بیدی کے الفاظ کا اقتباس نقل کروں لیکن ان کا مفہوم یہی تھا۔ اتفاق سے میں ان دنوں میر کے کلیات کا ایک بار پھر مطالعہ کر رہا تھا اس لئے کہ میر میرے محبوب ترین شاعروں میں سے ہے بیدی کے اس جملے کو پڑھ کر میرے دل کو سخت چوٹ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی خود ایک سنجیدہ اور اعلیٰ درجہ کے ادیب ہیں اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں وہ اور میں رفیق کار ہیں اس لئے میرے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کی رائے کو اہمیت دوں اور سوچوں کہ غلطی پر کون ہے، وہ یا میں۔ میں چاہتا تھا کہ محاذ میں اس مسئلے کے متعلق کچھ لکھوں لیکن اس کی فرصت نہیں ملی اور معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

چند دن ہوئے شاہراہ (دہلی) کا نومبر ۵۸ء کا شمارہ میری نظر سے گزرا۔ اس میں میں نے اپنے دوست ہنس راج رہبر کی تنقید خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "مرزا شوق لکھنوی" پر پڑھی۔ بدقسمتی سے یہ کتاب مجھے دستیاب نہیں ہو سکی۔ رہبر نے اپنی تنقید میں مرزا شوق کی مثنویوں "زہر عشق" اور "بہار عشق" پر ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے :-

"مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی تیرہ جانی ہی کی ہے، اسے بلند نہیں کیا، کیا ان کی پستی میں عفونت ہی عفونت ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس پستی میں عفونت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانیاں بیان کر کے زندگی کو بلند کرنے کی بات کہنا زندگی کا منہ چڑانا ہے۔ فاروقی صاحب معاف فرمائیں گے انھوں نے گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ادب میں اس دور کی عفونت ہی کچھ کم نہیں کہ مرزا شوق کی فحش نگاریوں کو دہرایا جائے"

میں نے شوق کی "بہار عشق" نہیں پڑھی ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن رہبر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تبصرہ شوق کی دونوں مثنویوں پر ہے یعنی وہ زہر عشق کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس میں سیہ کاری عیش کوشی کی کہانی بیان کی گئی ہے اس میں زندگی کو بلند نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں فحش نگاری اور عفونت ہے اور بہتر یہ ہے کہ شوق کی مثنوی کو شائع کر کے گڑے مردے نہ اکھیڑے جائیں۔

مجھے زہر عشق کے اس تجزئے سے قطعی اختلاف ہے۔

زہر عشق میں ایک بہت سیدھا سادا اور نہایت دردناک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک نوجوان مرد اور ایک خوبصورت لڑکی جو پاس کے گھروں میں رہتے ہیں اتفاق سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں وہ دل و جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ان میں خط و کتابت شروع ہوتی ہے۔ بعد میں چوری چھپے ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں کچھ دنوں کے بعد لڑکی دو مہینے تک لڑکے سے ملنے نہیں آتی۔ آخر ایک رات جب وہ آتی ہے تو کہتی ہے کہ اس کے گھر والوں کو اس محبت کا پتہ چل گیا ہے۔ لوگ اس پر آوازے کستے ہیں اس کے والدین میں:

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں بھیجتے ہیں ہمیں بنارس میں

اب وہ نہ تو یہ روز روز کی ذلت برداشت کر سکتی ہے اور نہ اس سے جدائی کا ہی الم اٹھایا جائیگا

وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں جبر کیوں کر یہ اختیار کریں

اس لئے اب وہ زہر کھا کر مرجانا ہی بہتر سمجھتی ہے۔ لڑکی اپنے عاشق کو سمجھاتی ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ

بوئے الفت تمام پھیلی ہے　　　باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے

موت اور زیست کی چند باقی گھڑیوں میں وہ تمنا ظاہر کرتی ہے کہ :-

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو　　　آج دل کھول کر گلے مل لو

حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں　　　ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں

نوجوان کو ان باتوں کا یقین نہیں آتا تھا لیکن دوسرے دن جب پاس کے گھر سے بین و رونے کی آواز اٹھی تو اسے یقین آ گیا کہ واقعی اس کی محبوبہ زہر کھا کر مر گئی کہ بعد بے بسی کے عالم میں نوجوان نے بھی زہر کھا لیا لیکن خواب میں اسے اپنی محبوبہ نظر آئی اور اس نے اسے یاد دلایا کہ میں نے تم سے وصیت کی تھی کہ میری وجہ سے تم اپنی جان نہ دینا۔ اب یہ تم کیا کر رہے ہو ؟

دل سے میرا بھلا دیا کہنا　　　ہاں یہی چاہیئے تھا کیا کہنا

اس خواب کے بعد گویا وہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ مثنوی اس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی　　　دل دیا غم سے آشنائی کی

مرزا شوق کی یہ مثنوی تاثر، سلاست، شیریں بیانی، حقیقت نگاری اور گہری المناکی کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس المیہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ فی الحقیقت عورت کا المیہ ہے جسے جاگیری سماج میں محبت کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ شوق کی ہیروئن تو زہر کھا کر مر جاتی ہے لیکن وہ جو زہر نہیں کھاتیں ان کا کیا حال ہوتا ہے ؟ جاگیری مذہبی عقیدہ رواج، اخلاق انھیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ آزادی سے محبت کر کے اپنی مرضی سے اپنا شریک زندگی چننا شریف بہو بیٹیوں کا شیوہ نہیں ہے۔ شادی ایک فرض ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں مرد کی خدمت کریں اور اولاد پیدا کریں۔ ایک طرف جاگیری نظام کے مذہبی اور اخلاقی تصورات دوسری طرف مرد کی معاشی محکومی عورتوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ سماجی نظام اور اسی مرد کی تابع اور فرمانبردار رہیں جو کہ دوسروں نے ان کے لیے چن دیا ہے اب ان کی محبت کوئی اختیاری چیز نہیں جاگیری سماج میں مردوں کے بھی یہی فرائض تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مردوں نے اپنے لیے آزاد محبت کی دوسری راہیں نکال لی تھیں۔ انھیں اس کا اختیار تھا کہ وہ طوائفوں، لونڈیوں وغیرہ سے عشق کریں اس فعل کو "گناہ" کہنے کے بعد بھی سماج مردوں کو اس کی اجازت دیتا تھا یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی لیکن

سماج کے ان فرسودہ اخلاقی اصول اور رسوم کے خلاف ہمیشہ بغاوت ہوتی رہتی تھی۔ سماج کے معاشی نظام کی سطح پر اگر ہم دیکھیں تو غلامی کے عہد میں غلاموں نے آقاؤں کے خلاف بڑی بڑی بغاوتیں کیں، جاگیری عہد میں کاشتکار نیم غلاموں نے مسلسل بغاوتیں کیں۔ یہی بغاوتیں تاریخ کا ارتقائی عمل تھیں۔ بادی النظر میں اور بورژوا مورخین کے نزدیک یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغاوتیں ناکام ہوئیں اور آقا اور جاگیردار دوبارہ اپنا قانونی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ان ناکام بغاوتوں کے بعد مظلوم محنت کش طبقہ پہلے کے مقابلے میں اپنے لئے زیادہ حقوق حاصل کر لیتا تھا۔ اگرچہ اس کا استحصال جاری رہتا تھا لیکن اس کی پوزیشن پہلے کے مقابلے میں معاشی اور اخلاقی اور نظریاتی طور پر پہلے سے بہتر ہو جاتی تھی۔ سماج ایک زیادہ اونچی سطح پر پہونچ جاتا تھا۔

بالکل یہی طرح اگر ہم انسانی سماج میں جنسی محبت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عہد وحشت (جب کہ قدیم اشتراکی نظام قائم تھا)، عہد غلامی، عہد جاگیری، عہد سرمایہ داری اور اب عہد اشتراکیت کے آغاز میں جنسی محبت کا بھی ارتقا ہوا ہے اور اس ارتقا میں جدلیت کا اصول کار فرما رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو جنسی جبلت ہے اور دوسری طرف سماج کا معاشی سیاسی اور اخلاقی نظام ہے۔ ہر مخصوص عہد اور سماجی نظام میں جنس کی بنیادی جبلت کو پورا کرنے کے لئے ایسے قانون اور رسوم وضع کئے جاتے ہیں جو اس سماج کی ضروریات کو پورا کریں اور ان کے مطابق ہوں۔ لیکن یہ قوانین اور رسوم آسمان سے نازل نہیں ہوتے یا کسی بڑے آدمی کی طرف سے سماج پر مسلط نہیں کئے جاتے بلکہ انسان اجتماعی طور پر اپنے زندگی کے تجربے سے یعنی مختلف طبقوں کے تصادم اور ان سے پیدا ہونے والے اخلاقی یا مذہبی خیالات کے تصادم اور جدل کے نتیجے کے طور پر رفتہ رفتہ وضع ہوتے ہیں اور سارے سماج پر چھا جاتے ہیں۔ سماج کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبہ کا بھی ارتقا ہوا ہے۔ اس میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی، انفرادیت اور نزاکت پیدا ہوئی ہے۔ مختلف عہدوں کی عشقیہ شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ اس تبدیلی کی شاہد ہیں۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے متعلق جذبات، تصورات، رسوم و رواج (جو مختلف دوروں میں مختلف رہے ہیں) ایک طرف جنسی جبلت اور دوسری طرف سماجی ضرورتوں کے تقاضوں کا اظہار کرتے ہیں۔ عشقیہ شاعری اس ضروری اور لازمی سماجی واقعے کے اظہار کا ایک پہلو اور ایک مخصوص

فنی طریقہ ہے ہم اچھی اور بہترین عشقیہ شاعری اس شاعری کو کہیں گے جو ایک خاص عہد اور دور میں سماج کے بہترین اور بلند ترین جنسی محبت کے جذبے کا اظہار کرے جس کی وجہ سے مرد اور عورت کے جنسی تعلق زیادہ لطیف، حسین، نرم، متوازن اور گہرے ہوں جس کی وجہ سے جنسی معاملات میں سماج کے ترقی پسند تقاضے پورے ہوں اور جو محبت کے جبلی جذبے کو اس کی جنسی سطح سے پھیلا کر سماج میں عام طور سے انسان دوستی، شرافت، خلوص، مروت اور تہذیب کے جذبات پیدا کرے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جنسی محبت کا جذبہ ایک عظیم تہذیبی قوت بھی ہے اور اس کا اظہار صرف بالغ مرد اور عورت کے مخصوص تعلقات اور افزائش نسل کی شکل میں ہی نہیں ہوتا بلکہ تمام فنون لطیفہ کی تخلیق اور اس سے آگے بڑھ کر والدین اور ان کی اولاد، بھائی بہن، بھائی بھائی، دوستوں اور رفیقوں میں باہمی التفات، ہر انسان میں ہمدردی اور انسانیت، ترحم، مدارات اور شائستگی پیدا کرنے میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں تصوف یا بھگتی کے فلسفے میں عقیدہ رکھنے والے مخلص بزرگ جب عشق مجازی اور عشق حقیقی میں قریبی تعلق بتلاتے تھے تب وہ دراصل اسی سچائی کا اظہار ایک غیر سائنسی اور ابتدائی طریقے سے کرتے تھے اور اسی سبب سے رجعت پرست کٹر مذہبی قسم کے لوگ ان سے ناراض رہتے تھے۔

یہی وہ اصلی اسباب جن کی وجہ سے ہر دور اور ہر عہد میں بہترین انسانوں اور فنکاروں نے عشق اور محبت کے موضوع پر عظیم ترین فن کی تخلیق کی ہے اور اس کے وسیلے سے انسانی دل میں حرارت، رقت اور اپنی روح میں حلاوت اور تازگی پیدا کی ہے۔

اس کا کیا سبب ہے کہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، ہیر رانجھا کی محبت کی داستانوں کو اور اسی قسم کی اور داستانوں اور ان کے منظوم تذکرے کو پوری پوری قوم اور کروڑوں عوام نے صدیوں تک اپنے سینے سے لگایا؟ یہی کہ ان داستانوں اور نظموں کے مصنفوں نے اپنی تخلیقوں میں نہ صرف اپنے عہد کے بلند ترین اخلاقی اور انسانی جذبات کا فنکارانہ اظہار کیا، انھوں نے ان المیوں کے ذریعے سے انسانوں کے محبت کرنے کے حق کے لئے بھی جد و جہد کی اور ان فرسودہ سماجی بندھنوں کے خلاف سخت احتجاج کیا جو معمولی اختلافوں سے مذہب، رسم و رواج یا طبقہ داری تفریق کی بنا پر اس حق کو پیروں سے کچل دیتے

تھے یہ عوام کی انفرادی آزادی کی جدوجہد کا ایک حصہ تھا جو کہ طبقہ داری سماج میں مسلسل جاری ہے۔
یہی نہیں ان داستانوں اور نظموں میں ان کے قبیلہ داری یا جاگیرداری خول کے باوجود اس بات کے باوجود کہ آج ہم بہت سے ان مذہبی یا اخلاقی تصورات کو مسترد کر دیتے ہیں جو کہ ان میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود کہ موجودہ سماجی اور معاشرتی ماحول اس سے بہت مختلف ہے جن کا ان میں ذکر کیا گیا ہے پھر بھی یہ نظمیں، داستانیں اور اشعار ہمارے لئے آج بھی اہمیت رکھتے ہیں عشق و محبت کا لازوال شعلہ جب تک انسانی قلب میں فروزاں ہے جب تک فطرت یا سماج کے ناساعد حالات کے خلاف انسان کی جدوکاوش جاری ہے اور جب تک انسانی شعور ارتقا کی نئی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی زندگی اور احساسات کو ہر دم نئی اور بہتر اور زیادہ حسین ترتیب دیتا ہے اور ہر لحظہ پہلے سے زیادہ حسین خواب دیکھتا ہے اور اپنے ان احساسات اور خوابوں سے حسن کی تخلیق کرتا ہے اس وقت ہم کو ماضی کی یہ فنی تخلیق متاثر کرے گی اور ہماری زندگی کو زیادہ مہذب اور حسین بنائے گی جن میں اس قسم کی خواہشات، جذبات اس طرح کے خوابوں اور خیالوں کا کامیابی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے۔
میری اور میر معلوم ہوتا ہے ایسا نہیں سمجھنے ان کی منطق غالباً یہ ہے کہ چونکہ میر اور شوق جاگیری عہد کے شاعر تھے چونکہ وہ شعوری طور پر اس عہد کے فلسفے اور عقیدے اور اخلاق کو مانتے تھے اور چونکہ جاگیری عہد کے محبت کے متعلق خیالات رجعت پسند تھے، اس لئے ان کی شاعری ہمارے لئے فضول اور بے کار ہے ہمیں ان سے کچھ نہیں مل سکتا ایسا سمجھنا گمراہ کن ہے۔
یہ صحیح ہے کہ میر اور شوق کے فلسفیانہ اخلاقی تصورات جاگیری عہد کے تھے اس لئے ہم ان کو قبول نہیں کر سکتے لیکن ان کی فن کارانہ تخلیق صرف یہی نہیں ہے اس میں اس سے بہت زیادہ اور اہم چیزیں ہیں۔
مثنوی زہر عشق میں محبت کے گہرے جذبات کا اظہار سچائی، درد اور بڑی انسانیت کے ساتھ کیا گیا ہے اس میں ایسی محبت کے گہرے المیہ کا بڑی سادگی اور ہمدردی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے جس کے پاسا اور پھلنے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا تھا زہر عشق میں ایک طرف تو سماج کے رسوم و تصورات کا تذکرہ ہے دوسری طرف اس میں دو معمولی انسانوں کی سچی محبت کا بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں ہمیں ان دونوں سے ہمدردی اور جاگیری سماج کے ظالمانہ قوانین اور رسوم سے نفرت ہوتی ہے مثنوی ہرگز پست قسم کے فحش جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی، اسے پڑھ کر لوگ زیادہ

پاک اور زیادہ گہری محبت کرنا چاہیں گے ان کا تزکیۂ نفس ہوگا، ان میں دردمندی اور انسانیت کے جذبات ابھریں گے، ان کی زندگی کسی قدر زیادہ مہذب ہوگی۔

پچھلے زمانہ کی بہترین عشقیہ شاعری (جس میں میر کے اچھے اشعار اور غزلیات شامل ہیں) چونکہ گہرے انسانی جذبات کا سچا اور حسین اظہار کرتی ہے، چونکہ وہ تنگ دلی کے بجائے دردمندی، ظلم و ستم کی جگہ مہر و وفا کی تلقین کرتی ہے، چونکہ وہ زندگی، فطرت اور سماج میں حسن کی متلاشی ہوتی ہے، اس لئے وہ ہمارے لئے ایک بیش بہا تہذیبی جوہر ہے۔ آج زوال پذیر طبقے (جاگیردار اور سرمایہ دار) اور ان کے رجعت پرست اور بدتہذیب نمائندے عوام کی اس دولت کو ان سے چھین لینے کے درپے ہیں۔ وہ محنت کشوں اور دانشوروں کو بھوکا ہی نہیں مارتے، ان کو مہذب زندگی کے تمام ضروری مادی وسائل سے بھی محروم نہیں کرتے، انھوں نے محبت کو بھی جنس بازاری بنا دیا ہے۔ عوام کو محبت کرنے کے حق سے محروم کر دیا ہے اور سماجی رشتوں میں سے ہمدردی اور انسانیت کو بالکل خارج کر دیا ہے ان کی درسگاہوں، کتابوں اور رسالوں میں انسان دوستی اور حیات آفرینی کا نہیں، انسانوں سے نفرت اور زندگی سے گریز کا سبق دیا جاتا ہے ان کا منتہائے کمال ایٹمی طاقت اور سپاہیانی شعاعوں کو استعمال کر کے تمام بنی نوع انسان کو ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنانا ہے اور یہی بات انسانیت کو یہ بشارت دیتی ہے کہ انسانیت نہیں بلکہ اس کے بدخواہوں کے خاتمے کی آخری گھڑیاں قریب آ گئی ہیں۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بیدی اور تیسر جیسے حساس اور انسان دوست ادیب آج ترقی پسندوں کے پلیٹ فارم سے ایسے مضمون لکھیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ماضی کی زندگی اور انسانیت سے بھرپور عشقیہ شاعری کو پسند نہیں کرتے اس سے متاثر اور مستفید نہیں ہوتے اس کو بیکار اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ بالکل یہی برطانوی سامراجی اور لکھنؤ کے نوابین بھی سمجھتے تھے جنھوں نے مثنوی زہر عشق کی اشاعت اور طباعت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ بالکل یہی رویہ آج ہمارے ملک کے ان غیر مہذب رئیسوں اور امیروں اور ان کے خوشہ چینوں کا ہے جو اسعد اور ستہدی کی نرالی لونا تو خوب جانتے ہیں، لیکن جن میں تیر یا غالب، سعدی یا رس کھان کی ایک سطر بھی سمجھنے یا محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان کا رویہ تو ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے، اس لئے کہ وہ تو جہالت اور تنزل کے علمبردار ہی ہیں ترقی پسندوں میں اس قسم کے رجحانات اس بات کی

غمازی کرتے ہیں کہ مردہ طبقوں کے زوال پذیر نظریئے اور خیالات کبھی کبھی غیر شعوری طور پر ہمارے اندر بھی سرایت کر جاتے ہیں، بظاہر وہ بڑے "انقلابی" طور سے پیش کئے جاتے ہیں، مثلاً کہا یہ جاتا ہے کہ "ہم تو انقلابی ہیں، ترقی پسند ہیں، ہمیں عشق و محبت کی شاعری سے دور رہنا چاہیئے" لیکن ان کا مطلب یہ ہوتا ہے: "ہم دشمن طبقوں کے غیر انسانی اور غیر مہذب رویئے اور نظریئے کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ ہم ماضی کے عظیم انسانی ورثے کو مسترد کرتے ہیں۔ ہم نامکمل، بے حس اور مجہول رکھے جانے پر قانع ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر غلط ہے اور ترقی پسند اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے ہمیں اس قسم کے تمام رجحانات کے خلاف جد و جہد کرنا چاہیئے۔ ●

شاہدرہ - دہلی

ڈاکٹر سلامت اللہ

ترقی پسندی

ترقی پسند ادب کی تحریک پر ہمارے دیس میں اور بعض دوسرے دیسوں میں بھی طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور اس کے خلاف انواع و اقسام کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ترقی پسند ادب انسان دوستی کی بنیادی قدار اور روایات سے بے نیازی برتتا ہے اور عملی اعتبار سے ان کی مخالفت کرتا ہے عام طور پر اس پروپیگنڈے میں دانشوروں کا وہ گروہ پیش پیش ہے جو قدامت پرست ہے اور موجودہ نامنصفانہ سماج کو بالواسطہ یا بلاواسطہ قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ترقی پسند ادیب طبقاتی تضاد اور تصادم میں عقیدت رکھتے ہیں اس لئے وہ صحیح معنوں میں انسان دوست نہیں ہو سکتے۔ اس معاملہ میں شاید کسی حد تک ہمارے ان نادان دوستوں کا بھی ہاتھ ہے جو شعور کی کمی یا جذباتی توازن کے فقدان کی وجہ سے اکثر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو ادب میں انسان دوستی کی روایات کے منافی ہے بہرکیف اس سے ادب کی ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا اس مضمون میں مختصر طور پر اس بات سے بحث کی جائے گی کہ ترقی پسند ادب میں انسان دوستی کا کیا مقام ہے۔

تاریخی لحاظ سے دیکھئے تو ہر زمانے میں اور ہر زبان میں ترقی پسند ادب پر انسان دوستی کی [illegible] رہی ہے جس نے انسان کے دکھ درد کی عکاسی بھی کی ہے اور اس کی [illegible] اور تمناؤں کو جلا دی [illegible]

جس نے ہمیں کے دل کو نئے حوصلوں اور نئی امنگوں کی تڑپ بھی بخشی ہے اور اسے ایک شاداب اور
بھرپور زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کے لئے بھی اکسایا ہے لیکن موجودہ ادب میں جب انسان دوستی
کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے وہ مخصوص تحریک مراد ہے جو یورپ میں پندرہویں صدی کے لگ بھگ
(HUMANISM) ہیومنیزم کے نام سے رونما ہوئی یہ تحریک جن حالات کی پیداوار ہے وہ خود بھی
انسان دوستی کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مدد دیں گے ہیومنیزم کی تحریک دراصل جاگیردارانہ نظام
کی ان فرسودہ روایات کے خلاف ایک رد عمل تھی جن کی رو سے کلیسا نے انسان کو مجہول بنا رکھا تھا
عقبیٰ کی محبت جاودانی کے سبز باغ کی خاطر اپنی مادی زندگی کی روح فرسا ویرانی پر صابر رہتا اگر مطلقاً
تھا کلیسا کا یہ جادو جاگیرداری کی نحوست کو عرصہ تک قائم رکھنے میں کامیاب رہا اور انسان کی انقلابی
اور تخلیقی صلاحیتوں کے سرچشمے ابلنے سے محروم رہے لیکن اس دوران میں اس طلسم سامری کو توڑنے
کے لئے ایک عنصر موسیقی بھی نمودار ہو رہا تھا۔ یہ تھی ایک نئی سماجی طاقت۔ صنعت و حرفت اور تجارت
میں ترقی کے ساتھ ساتھ کارخانہ داروں کاریگروں اور تاجروں کا ایک نیا طبقہ عروج حاصل کر رہا تھا
اس نئے نظام پیداوار کی نشو و نما کے لئے ضروری تھا کہ انسان کو دائمی عقبیٰ کی خواب آور گھٹی ہوئی
[illegible] سے نکال کر اس "دنیائے فانی" کے کھلے ہوئے ماحول میں حرکت کرنے کا موقع دیا جائے
[illegible] کے لامحدود امکانات سے آشنا کیا جائے اس کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھولی جائیں
[illegible] کی تشکیل [illegible] عمل پیہم سے مسلح کرکے نئی منزل کی طرف بڑھایا جائے۔
[illegible] کی تحریک کا اساس جوہر یہی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے ترقی پسند یورپی ادب میں اس نئی
[illegible] ہے جس میں انسانی آزادی اور مساوات کا پیغام ہے جس میں اس بات کی تلقین
[illegible] زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" اور جو اس چیز کا درس دیتا ہے کہ انسان اپنی قسمت
[illegible] اور اپنی سنسار کا خود ہی مختار ہے۔

[illegible] کے ادب میں انسان دوستی کی روایات بہت پرانی ہیں۔ یہاں کلاسیکی ادب میں
[illegible] انسان دوستی کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ
[illegible] رہا ہے ہر دور کے سماجی حالات کے مطابق ادب میں انسان دوستی
[illegible] پیدا کرتا ہے اور مہابھارت میں اس کا اظہار کسی رام کی صفات

پیدا ہوئی خدا ترسی اور فیاضی کے ذریعہ ہوتا ہے تو موجودہ زمانے میں یہ چیز ہمیں پریم چند جیسے ادیبوں کی ان کہانیوں میں ملتی ہے جہاں وہ زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ کے مظالم کی تصویر کھینچتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ کسان اور مزدور کس طرح دکھ بھری زندگی گزار رہے ہیں یا اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے تو انسان دوستی کے رنگ روپ میں کچھ اور ہی نکھار پیدا ہوجاتا ہے اور کرشن چندر جیسے مصنفین کے ہاں انسانیت اپنی پوری توانائی کے ساتھ ظلم و تشدد کے خلاف برسرپیکار نظر آتی ہے۔

ترقی پسند ادب انسان دوستی کی ان تمام روایات کا صحیح معنوں میں وارث اور امین ہے جنھوں نے انسانی زندگی کو چار چاند لگائے ہیں اور اس کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کیا ہے آج ترقی پسند ادیب جس قسم کے سماجی نظام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ کسی قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ انسان ہے۔ اس سرمایہ کو فروغ دینے کے لئے ہمیں انسان دوستی کی تمام دیرینہ صفات کو اپنے فن میں سمونا ہوگا۔ لیکن اس فرض سے ہم اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم ان صفات کے مفہوم کو موجودہ حالات کے پس منظر میں متعین نہ کریں۔

آج سائنس نے اس حد تک ترقی کرلی ہے اور ٹیکنولوجی نے اس قدر فروغ حاصل کرلیا ہے کہ دنیا کے سارے وسائل میں توسیع کے لامحدود امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ آج تمام دنیا کے انسان بہ آسانی خوشحال اور مہذب زندگی بسر کرسکتے ہیں اور انسانیت ستاروں سے آگے اور جہانوں کے افق کو چھو سکتی ہے لیکن موجودہ سماجی نظام میں یہ چیز اس لئے ممکن نہیں ہے کہ بیشتر ملکوں میں سائنس اور اس کے عمل کو صرف مٹھی بھر لوگ غصب کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ذرائع پیداوار یعنی کارخانہ جات اور زمین پر ان کا قبضہ ہے اور جو لوگ دراصل پیداوار کے خالق ہیں ان کو محض اتنی اجرت ملتی ہے کہ وہ بمشکل تمام اپنے جسم اور روح کو ایک ساتھ رکھ سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج محنت کش انسانوں کی اکثریت غیر ضروری طور پہ مادی اور تہذیبی دونوں لحاظ سے بھوکی اور ننگی رہنے پر مجبور ہے۔

اپنے دیس کو لیجئے تو یہاں اب بھی جاگیردارانہ نظام کی خباثتیں باقی ہیں۔ گو کہ اب یہ نظام اتنا بوڑھا ہوگیا ہے کہ اس میں اپنے طور پر سانس لینے کی سکت باقی نہیں رہی ہے پھر بھی یہ ہمارے

ہاں آہنی سنگینوں کے بل بوتے پر سنبھالا ہے۔ رہا ہے اس کھوسٹ کو زندہ رکھنے کے لئے کسانوں کا گرم خون اس کے جسم میں سرکاری ضابطوں کے ذریعہ داخل کیا جا رہا ہے۔ "زمینداری کا خاتمہ" جیسے قانون زمینداری کی لعنتوں کو نئی شکل میں برقرار رکھنے کے لئے پاس کئے جا رہے ہیں یا الفاظ کو ان کے متضاد معنوں میں استعمال کرنے کی کیا ہی دلفریب مثال ہے! ہمارے دیس کی بیشتر آبادی کسان ہے۔ ایسی حالت میں زمینداری کی سنستھا کا قائم رہنا ہندوستان کی انسانیت کا گلا گھونٹنا ہے۔ اس نظام میں انسان دوستی کی تمام شکلیں مسخ ہو گئی ہیں۔ اس صورت حال میں انسان دوستی کی روایات کا ذکر کرنا بڑی خود فریبی کی بات ہے آج ہمارے کتنے شاعر اور ادیب ایسے ہیں جو خوبصورت الفاظ کے پردہ میں رجعت پسندی اوہام پرستی اور بزدلی کا پرچار کر رہے ہیں۔ حقیقت کا دامن چھوڑ کر مجرد تصورات میں پناہ لینے کا یہی حشر ہوتا ہے۔

آج حقیقت یہ ہے کہ ہمارا کسان قصہ کہانیوں کا وہ خیالی کریکٹر نہیں ہے جو اپنی غلامی کی زنجیروں کو سونے کا ہار سمجھ رہا ہے۔ تسلیم و رضا جس کا شیوہ ہے اور جو جہالت میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد سے بے خبر ہے۔ آج کا کسان طبقاتی شعور سے لیس ہو کر جاگیردارانہ نظام کے خلاف صف آرا ہو رہا ہے۔ اس کا رہنما آج تلنگانہ کا مجاہد ہے وہ دلیری کا مظہر ہے نہ کہ بزدلی کا، وہ رجائیت کا نمائندہ ہے نہ کہ یاسیت کا۔ اس حقیقت کی ترجمانی کرنا آج سچی انسان دوستی ہے۔

لیکن ہندوستان میں جاگیردارانہ اثرات قوی ہونے کے باوجود اب سرمایہ دار طبقہ کا اقتدار بڑھ رہا ہے اور یہ طبقہ یہاں بھی انسان دوستی کی روایات کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو دوسرے سرمایہ دار ملکوں کا چلن ہے۔ انسان دوستی کی قدریں اس کی یورش کی تاب نہیں لا سکتیں سرمایہ دارانہ نظام میں انسانی لوٹ کھسوٹ ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں آج بے روزگاری اور بھوک کا ڈر ہر لمحہ انسان کے ہوش و حواس اور خودداری پر چھاپہ مارا کرتا ہے، جہاں ہر قسم کی انسانی تخلیق۔ چاہے وہ جسمانی محنت کا نتیجہ ہو، یا ذہنی کاوش کا کرشمہ یا جمالیاتی ذوق کا شاہکار —— صرف ایک ہی مقصد کو پورا کرتی ہے یعنی وہ اپنے خالق کے علاوہ کسی اور کے لئے منافع کا ذریعہ بنتی ہے، جہاں بازار میں کھانے پینے اور دوسری استعمال کی چیزوں کے ساتھ ساتھ عزت وعصمت

شرافت، دیانت، حیاتِ انسانی کا کس بل، اس کی پاکیزگی اور حسن و جمال، اس کا نغمہ اور موسیقی غرض ہر چیز چند سکوں کے عوض بِک جاتی ہے وہاں انسان دوستی کا محض راگ الاپتے رہنا "اقدارِ عالیہ" مطلقاً مثلاً آزادی و مساوات، عدل و انصاف، صداقت و دیانت وغیرہ کا قصیدہ پڑھتے رہنا اور حقیقت کو بے نقاب نہ کرنا اصل انسان دوستی کا مضحکہ اڑانا ہے۔ اس دور میں تمام انسانی قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ادب میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یاسیت، ہیجڑا پن، تاریک اندیشی، فراریت انفرادیت، تنہا پسندی وغیرہ ہمارے ادب میں گھر کرتی جا رہی ہیں۔

ہمارے ادب میں یہ رجحان نہ صرف انسان دوستی کی بہترین روایات کے منافی ہے بلکہ حقیقت ہی کے خلاف ہے جہاں سرمایہ داری اجارہ کی شکل میں منظم ہو کر بھیانک روپ دھارن کر رہی ہے وہاں محنت کش عوام اپنی بیداری اور قوت کا ثبوت اپنی متحدہ جد و جہد کے ذریعے دے رہے ہیں انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ اس جمہوری جد و جہد کو آگے بڑھایا جائے کہ انسانیت کے روشن مستقبل کی یہی ضمانت ہے

گر آج انسانیت کو جو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ ہے تیسری عالمگیر جنگ کا جو تمام انسانی قدروں کو بھسم کر ڈالے گی۔ آج دنیا کی سامراجی قوتوں نے جن کی رہنمائی امریکہ کر رہا ہے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ غلام اور نیم آزاد ممالک کی جنتا سامراجی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد سے تنگ آ کر منظم ہو رہی ہے اور اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے مسلسل جد و جہد میں مصروف ہے۔ سامراجی طاقتیں اس آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لئے جنگ کا کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہیں تاکہ وہ اپنے لوٹ کھسوٹ کے سلسلہ کو جاری رکھ سکیں۔ آج کوریا میں امریکی سامراج کی یہ ناپاک سازش بے نقاب ہو چکی ہے وہاں سامراجی درندے فوجیوں کے بھیس میں ناموس انسانی کے ساتھ کھل کھیل رہے ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ میں جنگ کی ہسٹریا زدہ جنتا بھی ان انسانیت سوز واقعات سے چیخ اٹھی ہے جو وہاں کے بڑے سے بڑے رجعت پسند اخباروں میں چھپتے ہیں۔ ابھی حال میں اسی قسم کے ایک رسالہ نیوز ویک میں امریکہ کی چند عورتوں نے ایک خاص واقعہ کے متعلق سخت احتجاجی خطوط لکھے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تھوڑے دن ہوئے امریکہ کے بعض اخباروں میں ایک تصویر شائع ہوئی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ امریکی سپاہی کوریا کی چند گرفتار شدہ لڑکیوں کو برہنہ کر رہے ہیں۔

آج سامراج نے اپنا مصنوعی بھیڑ کا لباس اتار پھینکا ہے اور وہ اپنے اصلی بھیڑیے کے روپ میں

دنیا کے سامنے آ گیا ہے وہ فاشسٹ وحشیوں کی انسانیت سوز داستانوں کو پھر دہرانا چاہتا ہے جو یورپ کے چپہ چپہ پر لکھی ہوئی ہیں اور جن کی گواہی متعدد شہروں کے کھنڈرات دے رہے ہیں۔ ابھی تک شورز اور بوخن والد کے کیمپوں کی یاد بیشتر ذہنوں سے محو نہ ہوئی ہوگی جہاں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا یا انگلیں چمڑوں کے میوزیم کی زینت بنا دیا گیا تھا۔ لیکن آج پھر سامراج جرمنی میں اسی ہٹلر کے روحانی بیٹوں کو مسلح کر رہا ہے جو خون آلود قیدیوں کو مینڈک کو دکرا کے محظوظ ہوتا تھا۔ آج پھر امریکی جنگ باز اسی الزی کوخ کی روحانی اولاد کو منظم کر رہے ہیں، جو ننگ انسانیت ہے جس نے زندہ انسانی جلد سے لیمپ شیڈ بنانا ایک تفریحی مشغلہ تھا۔ آج پھر امریکی سامراج کا بدترین دلال میک آرتھر توجو کے بھائی بندوں کو جاپان میں برسر اقتدار لانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ دنیا کو غلام بنانے میں ان کی سمورائی روایات اور ان کے وحشیانہ آداب سپہ گری سے فائدہ اٹھایا جا سکے

اس صورت حال میں انسان دوستی کی جو گت بن رہی ہے وہ خطرناک بھی ہے اور غصہ آور بھی لیکن افسوس ہے کہ سامراج کے معذرت خواں دانش ور ایک طرف تو اس تلخ حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں اور بے فکری کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہماری جمہوریت اب بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے اور دوسری طرف یہی لوگ نہایت بے شرمی کے ساتھ جنگ کی موافقت میں ٹنوں کاغذ رنگ ڈالتے ہیں اور انسان دوستی کی دہائی دے کر نہتے اور بے بس انسانوں پر ایٹم بم کی قیامت توڑنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔

یوں تو ہمارے ملک کی حکومت جنگ کے معاملہ میں اینگلو امریکی سامراج کی حکمت عملی سے نااتفاقی کا اعلان کرتی ہے لیکن چونکہ سامراج کا خونی پنجہ تمام غلام اور نیم آزاد ملکوں کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور پھر ہمارا ملک تو براہ راست برطانوی کومن ویلتھ کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اس لئے ڈر ہے کہ کہیں ہماری امن دوستی کی پالیسی ایک بے معنی نقش بن کر نہ رہ جائے ہمارے ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کا گٹ بہرکیف اینگلو امریکی سامراجی کا دم چھلا ہے۔ اس لئے اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ گٹ سامراجی دباؤ کی وجہ سے حکومت پر ایسا زور ڈال سکتا ہے جو امن عالم کے منافی ہو اور اس طرح ہم بھی قانونی لحاظ سے منحوس سامراجی جنگ کے طرف داروں میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے عوام کے شدید امن پسندانہ جذبہ کی وجہ سے اور عالمگیر امن کی طاقتور تحریک کے باعث ایسا نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اس کا امکان ضرور ہے کہ ہم محض جذباتی طور پر امن کے نام لیوا بن کر رہ جائیں اور اپنی بے عملی کی وجہ سے

سامراجیوں کو پھر ایک بار تمام دنیا میں جنگ کے شعلے بھڑکانے کا موقع دے دیں اور اس طرح ہم بھی انسانیت
کو جہنم کے حوالے کر دینے کے مجرم ہوں۔

موجودہ صورت حال میں ہمارے نزدیک انسان دوستی کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا
کہ انسانیت کو جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھا جائے اور اس کے لئے سامراجیوں اور ان کے نیاز
مندوں کی سازشوں کا طشت از بام کیا جائے۔ اور ان سے نجات حاصل کرنے کی منظم جد و جہد کی جائے
قومی سرمایہ داروں کی ہوس ناکیوں کو بے لگام چھوڑنے کے بجائے ان کو عوام کے مشترکہ مفاد کا مطیع بنایا
جائے اور جاگیرداری کے بچے کھچے اثرات کو ختم کیا جائے یہ اس جمہوری انقلاب کی بنیادی شرطیں ہیں جو ہمارے
لئے صحیح معنوں میں انسان دوستی کا ضامن ہے کیونکہ ہمارے ہاں صرف اسی صورت میں مادی اور تہذیبی
وسائل میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے اور عوام کی زندگی کو خوش حال اور ان کے کلچر کو مالا مال کیا جا سکتا ہے
انسان دوستی کا یہی تقاضا ہے۔

ترقی پسند ادیب کے ناتے آج ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسان دوستی کے اس نئے مفہوم کو اپنائیں
اور اسے اپنی تخلیقات میں سمو کر انسانیت کے رنگ روپ کو نکھارنے میں تمام ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیں

> ہماری جگہ مزدور طبقے میں ہے، ہم ان کے گوشت اور
> پوست کا ایک حصہ ہیں۔ اس طبقے کی آزادی اور طاقت
> ہماری آزادی اور طاقت ہے۔ یہ طبقہ ایک ایسا
> چشمہ ہے جس میں سے سائنس، ادب اور فن کے
> دھارے پھوٹتے ہیں، اگر یہ چشمہ خشک ہو گیا تو ادب
> اور فن کے دھارے بھی خشک ہو جائیں گے، وہ
> دانشور جو عہدوں آسائشوں اور دولت کے لئے
> مزدور طبقہ کے مفاد سے غداری کر کے حکمراں طبقہ
> کے سامنے جھک جاتے ہیں، وہ ایک ایسا پھول ہیں
> جسے شاخ سے علیحدہ کر کے کوڑا کرکٹ میں پھینک
> دیا جائے۔ رومن رولاں

میرے نزدیک انسانیت سے آگے خیالات
کا کوئی وجود نہیں میرے نزدیک انسان اور صرف
انسان ہی تمام چیزوں اور تمام خیالات کا خالق ہے
اس کے ہاتھوں میں جادو ہے اور مستقبل میں وہ
فطرت کی تمام قوتوں کا مالک ہوگا۔

میں انسان کے سامنے سر جھکاتا ہوں کیونکہ انسان
کی فکر اور تخیل کی زندہ اور مجسم تصویروں کے سوا دنیا
میں مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔" میکسم گورکی

ڈاکٹر عبادت بریلوی

غزل کے جمالیاتی پہلو پر چند خیالات

ارسطو کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک شاعری اس کی ضرورت و اہمیت اس کے لوازم و عناصر اس کے مسائل و مقتضیات پر مختلف دور اور مختلف زمانوں میں مختلف افراد نے مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اور ان میں سے کم و بیش ہر ایک اس بات پر متفق رہا ہے کہ فنون لطیفہ کی اور اصناف کی طرح شاعری بھی مواد اور ہیئت معانی اور صورت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہوتی ہے جس کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ایک کے بغیر دوسرے کا وجود لایعنی معلوم ہوتا ہے اسی امتزاج میں اس کے حسن کا راز مضمر ہے۔ اسی پر اس کی اچھائی اور برائی بلندی اور پستی کا انحصار ہے۔ فن کا جمالیاتی پہلو اس حسین امتزاج کا دوسرا نام ہے۔

مواد اور ہیئت معانی اور صورت کے اسی حسین امتزاج کے ہاتھوں شاعری کو قوس قزح کی سی دلکشی اور لطافت نصیب ہوتی ہے شفق کی سی رنگینی و رعنائی ملتی ہے۔ کسی پیکر رنگ و بو کی جلوہ سامانیاں اس میں مجسم ہو جاتی ہیں اور اس طرح خود اس کا وجود کسی نغمہ مجسم اور آہنگ نور کی عشوہ طرازیوں کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

شاعری کے بارے میں یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں جن لوگوں نے اس حقیقت کی یہ وضاحت نہیں کی ہے وہ بھی اس کا شعور رکھتے ہیں اور جن کے ہاتھوں اس حقیقت

کی وضاحت فلسفیانہ اور منطقی انداز میں ہوئی ہے۔ انھوں نے تنقیدی اعتبار سے بڑا کام کیا ہے۔
"مختلف لکھنے والوں نے مختلف انداز اور مختلف زاویوں سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے
موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان میں سے اکثر نے اپنے بیان میں تفصیل اور گہرائی سے کام لیا ہے
اور فلسفیانہ تحلیل اور منطقی تجزیے میں انھوں نے افکار و خیالات کے نئے نئے میدان پیدا کئے ہیں،
نئے نئے راستے تلاش کئے ہیں اور اس طرح وہ نئی نئی منزلوں تک پہنچے بھی ہیں لیکن ان تمام باتوں کے
باوجود ان سب کو پھر اسی منزل پر لوٹ کر آنا پڑا ہے جہاں سے وہ چلے تھے ان سب کے راستے جدا نظر
آتے ہیں لیکن منزل ایک معلوم ہوتی ہے ـــ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ شاعری کی بنیادی خصوصیات یعنی
مواد اور ہیئت کی ضرورت، اہمیت اور ان دونوں کی ہم آہنگی پر باوجود ان مباحث کے جو اس سلسلے
میں چلتے رہے ہیں سب ہی متفق ہیں۔ اختلاف صرف جزئیات اور تفصیل میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ویسے
سب کے خیال میں شاعری انھیں دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔

کولرج نے ایک جگہ شاعری کے متعلق اس بنیادی خیال کی بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے اور
اس سلسلے میں بڑا بلیغ انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اس کے خیال میں شاعری نام ہے "بہترین الفاظ کے
استعمال کا بہترین انداز میں" POETRY THE BEST WORDS IN THE BEST ORDER
یہ تعریف بڑی جامع اور مکمل ہے اس میں جو ہمہ گیری ہے وہ دوسری تعریفوں میں ذرا مشکل ہی سے ملیگی
بادی النظر میں اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کولرج صرف الفاظ اور ان کے استعمال ہی کو شاعری
سمجھتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے وہ مواد کا بھی قائل ہے لیکن اس مواد کو پیش کرنے کے سلسلے میں جو
اسلوب، انداز بیان اور طرز ادا اختیار کیا جاتا ہے اس کو وہ بڑی اہمیت دیتا ہے۔ کیونکہ شعر کسی تجربے
کے جذباتی اظہار کا نام ہے۔ اگر یہ تجربہ مکمل نہیں ہوتا اگر شدت احساس شاعر کے تجربے کو پیش کرنے
کی محرک نہیں ہوتی تو وہ اس کو اچھی طرح پیش بھی نہیں کر سکتا یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ جو لوگ ان
دونوں کو جدا کرتے ہیں وہ گویا ناخن کو گوشت سے جدا کرتے ہیں ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ اسی پر شعر
کے حسن کا انحصار ہے۔

یہ باتیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ شاعری صرف مواد کا نام نہیں ہے صرف خیال سے عبارت
نہیں ہے۔ شاعری کے لئے الفاظ بھی اسی قدر ضروری ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہیں۔ کیونکہ

بغیر الفاظ کے وہ تجربہ وہ جذبہ وہ خیال جو شاعر پیش کرنا چاہتا ہے کوئی صورت اختیار نہیں کر سکتا گویا الفاظ خیال اور جذبہ کو ایک صورت دیتے ہیں اس ہیولے میں جان ڈالتے ہیں اسے زندگی بخشتے ہیں --- اور تنقید شعر میں الفاظ کا مفہوم صرف الفاظ نہیں ہے الفاظ کا استعمال ہے اور الفاظ کے استعمال کا مطلب اسلوب اور انداز بیان ہے۔ اسلوب اور انداز بیان سے مراد صورت اور ہیئت ہوتی ہے جس سے شاعری میں وہ "تاثر" پیدا ہوتا ہے جس کو جمالیاتی "تاثر" کہتے ہیں اور جس سے احساس جمال کو سکون ملتا ہے لذت کی وہ دولت نصیب ہوتی ہے جو لافانی و لازوال ہوتی ہے۔

ہیئت اور صورت کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے ان الفاظ سے مراد صرف زبان کا استعمال اور انداز بیان نہیں ہے۔ یہ تنقیدی اور فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں اور جب تک فن تنقید اور فلسفہ جمال کو سامنے رکھ کر ان کا مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک ان کی اہمیت ذہن نشین نہیں ہوتی جہاں تک فن تنقید کا تعلق ہے ہیئت اپنے وسیع مفہوم میں ایک طرف تو وہ طریق اظہار ہے جو فن کار استعمال کرتا ہے اور دوسری جانب جذبات سے بھرا ہوا وہ پر اثر اور کسی حد تک مانوس اظہار بیان ہے جو شاعر اور سامع کے درمیان رابطہ اور رشتہ کا کام دیتا ہے۔ اس میں زبان، زبان کی تمام آرائش انشا اندازی کے تمام طریقے، مواد کے تمام سانچے حسن اور لطافت پیدا کرنے کے تمام ذریعے اور ان سب سے بڑھ کر مواد کے ساتھ ہم آہنگی کا احساس دلا کر ایک مکمل فنی نمونہ پیش کرنا بھی کچھ شامل ہیں اور فلسفۂ جمال میں ہیئت اور صورت ایک نظم و ترتیب کا نام ہے۔ چند چیزوں کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کر دینے کو صورت یا ہیئت کہتے ہیں۔ انسان خارجی مظاہرات سے متاثر ہوتا ہے ان خارجی مظاہرات کے رد عمل کے طور پر اس کے دل میں کچھ لہریں اٹھتی ہیں ان لہروں سے جذبات کی تخلیق ہوتی ہے یہ جذبات ظاہر ہونا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہونے کے لئے انھیں کوئی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے فن کار جب ان کو ترتیب اور نظم کے ساتھ پیش کرتا ہے تو اس صورت اور ہیئت میں ایک جمالیاتی اثر پیدا ہوتا ہے اور یہی خصوصیت فن کو فن ادب کو ادب اور شاعری کو شاعری بناتی ہے۔ موجودہ دور میں تنقید اور جمالیات کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ٹھیک نہیں اس لئے مذکورہ بالا تمام باتیں ہیئت اور صورت کے لئے ضروری ہیں۔ گویا ہیئت یا صورت فن ادب اور شعر کا ایسا جزو ہے جس کے بغیر ان کے تخلیق کرنے والوں کو کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی ان کی تخلیقات میں تاثر کا جادو نہیں پیدا ہو سکتا وہ جمالیاتی

اعتبار سے باعثِ مسرت نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ جن خیالات کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں جن جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں جن کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کرنی چاہتے ہیں۔ بغیر ہیئت یا صورت کے ان کا اظہار ہی ناممکن ہے۔ ہر چیز اس دنیا میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی پیکر اختیار کرتی ہے کسی نہ کسی طرف کو تلاش کرتی ہے کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرتی ہے فن ادب اور شعر پر بھی اس کلیہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

اظہار جذبات کا نام شاعری ہے بشرطیکہ ان جذبات کو مناسب بلکہ متناسب الفاظ میں پیش کیا جائے۔ یہ جذبات شاعر کے لئے تجربہ ہوتے ہیں ان کا وجود زندگی کے تجربے کے طور پر ہوتا ہے خارجی حالات شاعر پر اثر انداز ہوتے ہیں گویا وہ زندگی اور حالات کا تجربہ کرتا ہے اور اس تجربے اور تاثر کو جس کی نوعیت انسانی ہوتی ہے اپنی زبان میں بیان کرتا ہے۔

بظاہر شاعر کا یہ تخلیقی فعل ایک جذباتی ہیجان کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے لیکن شاعر صرف جذبے کی ہیجانی کیفیت کو پیش نہیں کرتا شعر کی تخلیق کوئی اضطراری فعل نہیں ہے بلکہ شعور کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے یہی شعور شعر کی صورت اختیار کر لینے سے قبل جذباتی ہیجان میں تناسب و توازن پیدا کرتا ہے۔ نظم و ترتیب سے کام لیتا ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے شعر کی جو صورت سامنے آئے گی اس میں ہیجان و انتشار کی بجائے ایک ٹھہراؤ کا ہونا یقینی ہے ایک ہی سنوری ہوئی کیفیت کا پایا جانا لازمی اور ضروری ہے شاعری اگر ان منزلوں سے نہ گزرے اور موضوع کو پیش کرنے کے سلسلے میں تناسب اور توازن نظم اور ترتیب کا شعور اس میں کار فرما نہ ہو تو شاعری کی صورت یا ہیئت میں جمالیاتی اثر کا خون ہو جاتا ہے اور اس کو اعلیٰ اور بلند مرتبہ شاعری نہیں کہا جا سکتا۔

(۲)

یہ ہیئت اور صورت خیال اور مواد سے براہ راست تعلق رکھتی ہے اور جو باتیں خیال اور مواد کے لئے ضروری ہیں وہ ہیئت اور صورت پر بھی صادق آتی ہیں جس طرح مواد اپنے زمانے کے سماجی حالات تاریخی واقعات، افراد کے ذہنی رجحانات، جذباتی کیفیات اور افکار و خیالات سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح ہیئت اور صورت بھی ان تمام چیزوں سے متاثر ہوتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں جغرافیائی حالات، ملکی و قومی خصوصیات اور مخصوص فنی و ادبی روایات کا بھی اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ

ہر قوم اور ہر ملک ہر زمانے اور ہر دور کی شاعری کی ہیئت ان حالات سے متاثر ہوتی رہی ہے انھیں کے پس منظر میں اس کی تشکیل ہوئی ہے اور اس وقت تک اس کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے جب تک اس کی بنیادی خصوصیات کو ان حالات کے پس منظر میں نہ دیکھا جائے۔

اردو شاعری اور اس کے مختلف اصناف کی ہیئت بھی اپنے وقت کے سماجی حالات ملکی و قومی خصوصیات اور ذہنی و جذباتی کیفیات کے زیر اثر صورت پذیر ہوئی ہے بلکہ ان سب کا عکس اس کے مختلف اصناف کی ہیئت میں نظر آتا ہے وہ سب کی سب مخصوص جغرافیائی قومی اور نسلی خصوصیات نے پیدا کیا ہے ان میں آپس میں تنوع ہے لیکن یہ تنوع زندگی کے تنوع کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اصناف آپس میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں لیکن ویسے وہ سب کی سب مخصوص تہذیبی روایات کے ہاتھوں پیدا ہوئی ہیں — غزل، مثنوی، قصیدہ، مستزاد، رباعی، قطعہ، مسدس، مخمس، مربع، مثلث اردو شاعری کی ان تمام اصناف کو حالات نے پیدا کیا ہے اور یہ سب کی سب کسی نہ کسی مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض میں خارجیت ہے، بعض میں داخلیت، بعض میں تفصیل و وضاحت کی زیادہ گنجائش ہے، بعض اجمال و اختصار کے لئے وقف ہیں۔ گویا ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر مخصوص خیالات اور مخصوص مواد کو پیش کرنے کے لئے وضع کی گئی ہے اور ان میں سے ہر ایک نے ہر دور میں اپنا اپنا کام کیا ہے۔ ماحول نے جس وقت جس صنف کو ضروری سمجھا ہے اس کو فروغ دیا ہے جس زمانے میں جس طرح کے مواد کو پیش کیا گیا ہے اسی کی مناسبت سے اصناف سخن کو بھی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ گویا یہ اصناف ہمیشہ ہمیشہ اپنے اپنے زمانے کے مواد سے ہم آہنگ رہی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ہر دور میں اپنی بنیادی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے زندگی اور ادب میں انھوں نے اہمیت اختیار کی ہے کیونکہ بہر حال وہ جمالیاتی اثر پیدا کرنے کا ذریعہ رہی ہیں۔

یہ اصناف اور ان میں سے ہر ایک ہیئت جو مختلف زمانوں میں اپنا کام کرتی رہی ہے اس پر ایرانی اثرات خاصے گہرے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں آکر انھوں نے باعتبار ہیئت کوئی خاص تبدیلی اختیار نہیں کی ہے۔ ہو بہو ان کی صورت وہی رہی ہے جو فارسی میں تھی۔ پیش کرنے کے انداز میں کہیں کہیں تھوڑا سا فرق ضرور ہو گیا ہے لیکن ویسے مجموعی اعتبار سے یہ اصناف فارسی اصناف کی ہیئت سے مختلف نہیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ یہ خصوصیت اردو شاعری کے اصناف کی

ہیئت میں پیدا ہونی ہی چاہیے تھی کیونکہ اردو شاعری اور اس کے مختلف اصناف جس تہذیب میں پیدا
ہوئے اس پر ایرانی رنگ کا گہرا اثر تھا۔ اس لیے تمام تر ایرانی خصوصیات اس کے اندر پیدا ہو گئیں ایرانی
مزاج کا رنگ اس میں رچا ہوا معلوم ہوتا ہے ایرانی خصوصیات میں وہ ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہیں
ان ایرانی خصوصیات میں جذباتیت اور رومانیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ بلکہ غزل کی صنف
کی ہیئت کے مقبول ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے فارسی اور اردو دونوں میں غزل کی ہیئت کا چرچا
دوسرے اصناف کی ہیئت کے مقابلے میں زیادہ نظر آتا ہے اور وہ افراد کے مزاج ان کی ذہنی
کیفیات اور ان کی افتادِ طبع سے مناسبت بھی رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کا ایسا جزو بن گئی
ہے جس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے وہ تہذیب کا حصہ ہے۔ تہذیبی روایات نے اس کو پیدا کیا ہے
اور اس کے ہاتھوں بعض تہذیبی روایات پیدا ہوئی ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں میں اس کا ایک
مستقل اور مسلسل ارتقا ہے۔ اس کی ایک تاریخ ہے۔ لیکن اس ارتقا میں وہ اپنے آپ کو ہیئت کے
اعتبار سے بدلتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

(۳)

غزل کی ہیئت اور خصوصاً اردو ...... ہیئت کو انھیں بنیادی باتوں کو سامنے رکھ کر دیکھنا
چاہیے اس کو اردو نے پیدا نہیں کیا بلکہ وہ فارسی کے اثر سے ہمارے یہاں آئی اور ہماری شاعری
کا سب سے بڑا سرمایہ بن گئی اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس میں اعلیٰ قسم
کی شاعری کی گئی ہے اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس میں انسانی جذبات و احساسات اور
واردات و کیفیات کی جو مختلف اور گوناگوں تصویریں ملتی ہیں ان میں حقیقت و واقعیت کا ایک ایسا
رنگ ہے جو کسی ملک کی شاعری کے سامنے پھیکا نہیں پڑ سکتا۔ اس میں بڑا رس ہے۔ بڑی رعنائی ہے
بڑی دور رس رہ جانے والی کیفیت ہے اس نے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ بڑے بڑوں کو رجھایا ہے مخالفین
تک اس کے بہار ناز کے کوچے میں پروانہ وار آئے ہیں۔ اس نے نہ صرف خواص کا دل لبھایا ہے
بلکہ عوام کو بھی اپنی مشوہ گری سے گھائل کیا ہے واعظ و صوفی بھی اس پر سر دھنتے رہے ہیں اور رندوں
اور سرمستوں نے بھی اس شمع پر اپنے آپ کو پروانہ وار فدا کیا ہے۔ غرض ہر زمانے میں ہر طبقے اور ہر
حلقے پر غزل کی سحرکاری اپنا اثر کرتی رہی ہے یہ وہ جادو ہے جو سر پہ چڑھ کے بولتا ہے۔

صنف غزل کی یہ مقبولیت، اس کی یہ سحرکاری، یہ انداز دلبری، یہ طرز دلربائی بڑی حد تک اس
میں شک نہیں کہ اس کے معنوی پہلو کی مرہون منت ہے۔ اس کے موضوعات بہ ذات خود اپنے اند
ایک انداز دلکشی اور طرز دلربائی رکھتے ہیں ان موضوعات کو انسانی زندگی سے مناسبت ہے غزل کا
سب سے اہم موضوع عشق ہے عشقیہ جذبات واحساسات اور اس کی مختلف کیفیات کو انسانی
زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کون ایسا کافر ہوگا جو اس کی اہمیت سے منکر ہو شاید ہی کوئی
پاک دامن ایسا ملے جس نے اس کوچے کی خاک نہ چھانی ہو۔ یہ جذبات واحساسات مرتے دم تک انسان
کے دم کے ساتھ رہتے ہیں غزل کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کا یہی موضوع ہے۔ لیکن غزل نے اپنے
آپ کو صرف اسی موضوع تک محدود نہیں رکھا ہے وہ اس دائرے سے باہر بھی نکلی ہے وہ رندوں
اور شاہد بازوں ہی کی ترجمان نہیں رہی ہے۔ اس نے تقدس اور پاکیزگی تفکر اور فلسفہ سے بھی اپنا
رشتہ جوڑا ہے۔ اس کے موضوعات متنوع رہے ہیں اور اس تنوع نے اسے زندگی سے ہم آہنگ
کیا ہے۔ اس میں زندگی کی وسعت رنگا رنگی اور بوقلمونی عطا کی ہے لیکن اس کی مقبولیت صرف اسی
وجہ سے نہیں ہے اس نے دلوں میں صرف اسی وجہ سے جگہ نہیں بنائی ہے۔ اس کی اس مقبولیت کا
باعث اور دلوں میں گھر کر لینے کی وجہ اس کی ہیئت اور صورت بھی ہے غزل کی اگر ایک مخصوص ہیئت
نہ ہوتی اور اگر اس ہیئت میں اتنا لوچ نہ ہوتا۔ اتنی لچک نہ ہوتی اتنی رنگینی نہ ہوتی یا اتنی رعنائی نہ ہوتی
دلوں میں کھپ جانے والی خصوصیت نہ ہوتی تو اس کے اثرات اتنے عالمگیر نہ ہوتے اس کی سب سے
بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع کو اپنے دامن میں جگہ دے سکتی ہے اور اس طرح دے سکتی ہے کہ وہ
اس کا اپنا معلوم ہو موضوع اور مواد میں ہم آہنگی ہی کو کہتے ہیں غزل کی ہیئت میں یہ ہم آہنگی اور مناسبت اپنے شباب
پر نظر آتی ہے جب غزل کا موضوع بدلتا ہے اس کی ہیئت بھی بدلتی ہے۔ موضوع اور مواد کا تنوع
غزل کی بڑی اہم خصوصیت ہے لیکن جب موضوعات معیار سے گرے ہیں تو غزل کی ہیئت بھی معیار
سے گر گئی ہے۔ جب موضوعات میں پستی آئی ہے تو غزل کا پہلو بھی پستی میں گر گیا ہے غزل کی تاریخ
اس بات کی شاہد ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غزل میں جو بعض زمانوں میں موضوعات کی پستی
رونما ہوتی ہے اس کو ہیئت کی پستی نہیں سمجھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہیئت اور صورت کا کوئی
صحیح شعور ہمارے یہاں موجود نہیں تھا شعر و شاعری کے بڑے سے بڑے نباض بھی اگر اس سے

غافل نہیں تھے تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ وہ اس کا صحیح شعور نہیں رکھتے تھے۔

حالی ہماری شاعری کے بڑے اچھے نباض تھے ان کی ایسی شخصیت کے نقاد ہمارے یہاں کم پیدا ہوئے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں کہ ان سے بڑا نقاد ہمارے یہاں پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے غزل کی اصلاح کرنی چاہی ہے۔ لیکن جس اصلاح کو انھوں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے وہ معنوی اصلاح ہے، ہیئت کی اصلاح نہیں ہے۔ حالی غزل کو شاعری کی بڑی اہم صنف سمجھتے تھے اپنے وقت میں اگرچہ یہ صنف سخن انھیں بے وقت کی راگنی محسوس ہوتی تھی اور انھیں اس بے وقت کی راگنی کا گانا اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے تھے لیکن غزل کی ہمہ گیری اس کی آفاقیت اس کی جذباتی اثر اندازی کا انھیں احساس تھا۔ اس لئے وہ شعر کے ناپاک دفتر کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر سمجھنے کے بعد بھی اس میں معنوی اصلاح کرنی چاہتے تھے غزل کی معنوی اصلاح کے سلسلے میں انھوں نے جو تجویزیں پیش کی ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حالی نے غزل کی ہیئت اور صورت کے پہلو کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا اس موضوع کی طرف وہ پوری توجہ نہ کر سکے وہ اس حقیقت تک بھی نہیں پہونچ سکے کہ غزل میں جو تاثر کی کیفیت مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے لکھنے والوں نے اس کی ہیئت سے صورت سے یا جمالیاتی پہلو سے چشم پوشی اختیار کر لی ہے اور انھیں اس کا شعور باقی نہیں رہا ہے۔ اور غزل کی پستی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے وہ ایک جگہ حالی نے غزل کی ہیئت کے دو ایک پہلوؤں کی طرف اشارے ضرور کئے ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے اس طرف توجہ نہیں کی ہے اور چونکہ غزل کی ہیئت کو مجموعی طور پر اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے اس لئے بعض غلط نتائج نکالنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کی ہیئت کے بارے میں لکھتے ہوئے یا تو انھوں نے اس کی زبان پر اظہار خیال کیا ہے یا غزل کے مختلف اشعار کے بارے میں ان کو غزل کی مجموعی ہیئت سے علیحدہ کر کے چند باتوں کی وضاحت کی ہے یا پھر ردیف و قوافی کے بارے میں چند باتیں پیش کر دی ہیں لیکن ہیئت کے مجموعی تاثر اور اس کی بنیادی خصوصیات کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے غزل اور اس کی اصلاح پر اظہار خیال کرتے ہوئے غزل کی زبان ** وہ کو تسلیم کیا ہے وہ غزل کے لئے مخصوص الفاظ کے استعمال کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان

الفاظ کے ساتھ طبائع کی جذباتی مناسبت معنوی اعتبار سے ایک وسعت پیدا کر دیتی ہے حالی کے خیال میں غزل کی صنف الفاظ کی غرابت اور اجنبیت کو برداشت نہیں کر سکتی انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غزل میں اگر ایک لفظ بھی غیر مانوس ہو تو برا معلوم ہوتا ہے گلاب کے تختے میں کانٹے بھی پھول کے ساتھ نبھ جاتے ہیں مگر گلدستے میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے اسی واسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے ان کو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے کہ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر استعمال کئے جاتے تھے انھیں الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ و تمثیل میں اپنے اعلیٰ خیالات ظاہر کئے ہیں پس غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی ہے وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین سمجھا ہے غزل کی ہیئت کے سلسلے میں الفاظ اور زبان کا استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے اور حالی نے غزل کی زبان کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں وہ اپنی جگہ پر اہم ہیں اور ان سے کسی قسم کے اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن غزل کی زبان کے اس مسئلے کو حالی نے غزل کی مجموعی ہیئت کے پس منظر میں نہیں دیکھا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ انھیں اس بات کا احساس نہیں تھا اور اس کے علاوہ غزل کی ہیئت کو مجموعی طور پر دیکھنے کا شعور بھی نہیں رکھتے تھے

زبان کے علاوہ غزل کے مختلف اشعار کے بارے میں بھی حالی نے اظہار خیال کیا ہے لیکن یہ خیالات بھی غزل کی مجموعی ہیئت کو سامنے رکھ کر پیش نہیں کئے گئے ہیں۔ حالی نے غزل کے مختلف اشعار کے جمالیاتی پہلو اور ان کی ہیئت و صورت کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں بعض بڑے کام کی باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے ان غزل گو شعراء کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا ہے جو اس غزل میں بھرتی کے اشعار صرف غزل کو پورا کر دینے کی غرض سے جمع کر دیتے تھے۔ انھوں نے بعض شعراء کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ غزل میں دو ایک شعر سے زیادہ اچھے شعر نہیں کہے جا سکتے۔ مومن، غالب اور شیفتہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "یہ لوگ بھی اعلیٰ درجے کا شعر اس کو سمجھتے تھے جس میں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اردو کے محاورے میں ادا ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا۔ باقی بھرتی ہے۔ اگلے شعراء تسر

ان کے درمیان کسی منطقی ربط اور تسلسل کو قائم نہیں رکھ سکے ہیں۔ انھوں نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے انفرادی رنگ میں دیکھا ہے اگر وہ ان کو مجموعی اور منطقی طور پر دیکھتے تو شاید نتائج کچھ اور نکلتے۔ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ انھوں نے غزل کے ردیف و قوافی پر بھی روشنی ڈالی ہے غزل کی ہیئت میں قوافی و ردیف کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اس کو بھی انھوں نے علیحدہ کر کے دیکھا ہے غزل کی مجموعی ہیئت کو سامنے رکھ کر اس طرف توجہ نہیں کی ہے وہ قوافی اور ردیف کے مخالف ہیں ان کا بس چلتا تو قوافی اور ردیف دونوں کو غزل کی ہیئت سے خارج کر دیتے۔ انھوں نے قافیہ اور ردیف دونوں کو بیکار قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ موضوع کو پیش کرنے میں حائل ہوتے ہیں انھوں نے اس کی جمالیاتی حیثیت کو محسوس نہیں کیا۔ قافیے کو ختم کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے انھوں نے غزلوں سے ردیف کو ختم کرنے کا مشورہ دیا اور قافیے کے استعمال میں بہت سی شرطیں لگا دیں۔ غزل میں قافیے اور ردیف کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "ہمارے ہاں قافیے کے پیچھے ایک ردیف کا دم چھلا اور لگا دیا گیا ہے اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اردو دیوانوں میں غیر مردف غزلیں تلاش کی جائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں گی جبکہ ردیف اور قافیے کی گھاٹی خود دشوار گزار ہو تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابل گزر بنانا انھیں لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کا کمال محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور پھر اس بحث کے بعد یہ مشورہ دیا ہے کہ پس شاعر کو چاہیئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیے سے میل کھاتی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں۔ بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سردست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیئے قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیئے جس کے لئے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے الفاظ موجود ہوں ورنہ مضمون کو قافیے کا تابع کرنا پڑے گا قافیہ مضمون کے تابع نہ ہوں گے"۔ حالی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر معنویت تھی اور یہ خیال ان کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ قافیے اور ردیف موضوع کو پیش کرنے میں حائل ہوتے ہیں اور قافیہ معنویت کو پس پشت ڈال کر شاعری کو قافیہ پیمائی بنا دیتا ہے۔ ان کا یہ خیال کسی حد تک ٹھیک بھی ہے اردو کی غزلوں میں اس حقیقت کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن حالی اس بات کو نظر انداز کر دیتے

ہیں کہ مجموعی حیثیت سے اگر غزل کی ہیئت کو دیکھا جائے تو قافیہ اور ردیف اس میں ایک جمالیاتی اثر پیدا کرتے ہیں یہ احساس حالی کو اسی وقت ہو سکتا تھا جب غزل کی مجموعی ہیئت ان کے پیش نظر ہوتی اس کو انھوں نے سامنے نہیں رکھا اسی وجہ سے ردیف و قافیے کے متعلق جمالیاتی اعتبار سے منطقی انداز میں وہ بحث نہ کر سکے اور ان کا یہ مطالعہ نہایت سرسری سا ہو کر رہ گیا۔ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ غلط نہیں ہے لیکن وہ غزل کا ایک پہلو ہے انھوں نے اسی ایک پہلو کو سامنے رکھا اس لئے ان کی بحث میں ہمہ گیری نظر نہیں آتی۔

غزل کی معنوی اصلاح کے جوش میں حالی نے غزل کے جمالیاتی پہلو اور خصوصاً اس کی ہیئت کو نظر انداز کر دیا۔ اور اگر اس بحث میں کہیں جمالیاتی پہلو آیا بھی اور اس کا موقع بھی ملا کہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تو وہ اس سے پہلو تہی کر گئے کیونکہ معنویت کے شدید احساس نے انھیں ایسا کرنے ہی نہیں دیا۔ حالی نے جس زاویے سے غزل کا مطالعہ کیا وہ اصلاحی ہے اور اصلاحی بھی ایسا جس کی نوعیت معنوی ہے۔ چنانچہ غزل کے سلسلے میں انھوں نے موضوع اور مواد ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور وہ اس دائرے سے ایک لمحے کو بھی باہر نہیں نکلے۔ موضوع اور مواد کی اہمیت کے شدید احساس نے نہ صرف یہ کہ حالی کو غزل کے جمالیاتی پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کرنے دی بلکہ انھوں نے غزل کو موضوع اور خیال کے اعتبار سے بہتر بنانے کے جوش میں تنقید شعر کی اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ موضوع و مواد اور ہیئت و صورت دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ایک کا انحطاط دوسرے کا انحطاط ہے ایک کا زوال دوسرے کا زوال ہے۔ ایک کی بلندی دوسرے کی بلندی ہے۔ ایک کی اصلاح دوسرے کی اصلاح ہے اس لئے حالی نے جو غزل میں اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے وہ ادھورا اور غیر مکمل ہے حالی نے جس کو غزل کا معنوی زوال سمجھا ہے وہ اس کا صوری اور جمالیاتی زوال بھی ہے جن حالات سے اردو غزل کو گزرنا پڑا۔ انھوں نے ہیئت اور صورت کے اعتبار سے غزل کو دھکوسلہ بنا دیا۔ غزل بے وقت کی راگنی خود حالی کو اس وجہ سے نظر آئی کہ جہاں تک جمالیاتی اور فنی پہلو کا تعلق ہے وہ بنیادی تقاضوں کو پورا نہ کر سکی اور اس کے تعمیر والے اس کو برتنے والے ہیں نہ کہ صنف غزل! حالی کے وقت تک آتے آتے غزل یقیناً بے وقت کی راگنی ہو گئی تھی لیکن

حالی سے قبل کے تمام غزل گو شاعروں کو اس سلسلے میں مجرم اور گردن زدنی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ان کے زمانے میں خود غالب اور مومن نے غزل کو معراج کمال تک پہنچایا تھا۔ معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے غالب، مومن نے غزل کو چار چاند لگائے تھے۔ حالی کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حالی نے غزل کی زبونِ حالی کا شکوہ کیا، اس کو معنوی اعتبار سے سنوارنے اور نکھارنے کی طرف توجہ دلائی لیکن اس کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ حالی سے قبل اردو غزل پر ایسے دور گزر چکے ہیں جس کی وجہ سے اس میں وہ خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں جو زوال و انحطاط کے زمانے کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ حالی کے سامنے لکھنوی شاعری کا وہ پورا دور تھا جس میں غزل کو لفظی بازی گری، مبالغہ آرائی، تکلف اور تصنع سے عبارت سمجھ لیا گیا تھا۔ معنوی و لفظی ابتذال کی خصوصیات لکھنوی غزل گوئی میں آ گئی تھیں۔ صورت حال نے پیدا کیں۔ موضوعات اتنے محدود ہو گئے تھے کہ انتہا پسندی نے نہ صرف اس میں معنوی ابتذال پیدا کر دیا تھا بلکہ ہیئت و صورت میں صنعت گری کی خصوصیت غالب آ گئی تھی۔ غزل جمالیاتی اور صوری اعتبار سے صرف چند الفاظ کا مجموعہ رہ گئی تھی۔ لا یعنی صنعت گری نے شعراء کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ مبالغہ آرائی فن کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ انحطاط و زوال کے زمانے میں یہی ہوتا ہے۔ غزل ہی پر منحصر نہیں سماجی و معاشرتی انحطاط ہر جگہ اصناف شعر و ادب پر کچھ اسی طرح کا اثر کرتے ہیں۔ جب موضوعات محدود ہو جاتے ہیں، شاعروں کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہوتا نہیں تو ان کی توجہ تمام تر صنعت گری کی طرف ہو جاتی ہے اور اس جوش میں وہ اپنے فن کو لفظی بازیگری اور قافیہ پیمائی بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس میں صوری و جمالیاتی پہلو کا صحیح اور متوازن احساس ان سے ایسا نہیں کراتا۔ بلکہ موضوع اور مواد کی تہی دامانی ان سے ایسا کراتی ہے۔

اردو غزل پر ایسا دور گزر چکا تھا۔ لکھنوی شاعری اس کی نمائندگی کرتی تھی۔ لکھنوی شاعری کے یہ اثرات دلی تک پہنچ رہے تھے۔ شاہ نصیر، ذوق اور بہادر شاہ ظفر، غالب اور مومن کے ہمعصر تھے لیکن ان کی غزلوں میں یہ صنعت گری نمایاں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان شاعروں نے مواد و ہیئت دونوں اعتبار سے اچھی غزلیں کہی ہی نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے اچھی اور کامیاب غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کا فن صنعت گری سے زیادہ قریب نظر آئے گا۔ اس طرح گویا حالی سے قبل غزل کے فنی اور جمالیاتی پہلو، اس کی ہیئت اور صورت کے سر پر موج

صورت اس انداز میں گزر چکی تھی وجہ اس کی صرف موضوعات اور مواد کی تنگ دامانی ہی نہیں تھی بلکہ زندگی کو خارجی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا انداز بھی تھا جس کو غزل کی صنف کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ غزل داخلیت سے عبارت ہے۔ داخلیت ہی اس کے اندر سوز و گداز کو پیدا کرتی ہے اور اسی داخلیت اور سوز و گداز سے رمزیت اور ایمائیت موسیقی اور غنائیت اور وہ ساری خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جن کے باعث غزل کی جمالیاتی ہیئت کا وجود ہوتا ہے۔ لکھنوی شاعری نے ان ساری خصوصیات کا خون کر دیا۔ گویا یوں کہہ سکتے ہیں کہ سماجی اور معاشرتی انحطاط نے مواد اور موضوع کو تعمیر ذلت میں گرایا اور مواد و موضوع کی اس انحطاطی کیفیت نے غزل کی ہیئت اور صورت میں انحطاط و زوال کی ایسی کیفیت پیدا کی ہے کہ اس میں کوئی دلکشی باقی ہی نہیں رہ گئی۔ پس حالی نے جس کو صرف موضوع اور مواد کا انحطاط سمجھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنی تمام رعنائی سے، اپنی تمام رنگینی اور اپنی تمام دلکشی سے محروم ہو گئی تھی۔ لوگ اسے باعثِ شرم سمجھتے تھے

حالی نے غزل کے انحطاط و زوال کو اس منطقی زاویہ نظر سے نہیں دیکھا۔ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا اگر وہ اس کی تہہ تک اس طرح پہنچے ہوتے تو شاید غزل کی ہیئت اور اس کے جمالیاتی پہلو کا مسئلہ ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتا اور جس طرح انھوں نے غزل کی اصلاح کے سلسلے میں اس کے موضوع اور مواد پر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ نظر ڈالی ہے اسی طرح وہ غزل کے جمالیاتی پہلو اس کی ہیئت اور صورت پر بھی اس طرح بحث کرتے کہ اس سلسلے میں بہت سی ضروری اور اہم باتیں ہمارے سامنے آجاتیں اور اس پر نظریاتی بحث کا سلسلہ شروع ہوتا۔ غزل کی نظریاتی تنقید کا سلسلہ ہمارے ہاں حالی سے شروع ہوتا ہے۔ حالی سے قبل یہ بحث کسی منظم اور مربوط شکل میں نظر نہیں آتی چونکہ حالی نے غزل کے جمالیاتی پہلو، اس کی ہیئت اور صورت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اس لیے ان کے بعد بھی اس موضوع پر کسی کو غور کرنے اور اس پر نظریاتی بحث کرنے کا خیال نہیں آیا اور یہ اہم موضوع اس طرح بے توجہی اور بے اعتنائی کے عالم میں پڑا رہا، جیسے اس کی کوئی وقعت ہی نہیں۔

(۴)

غزل کی ہیئت پر اس بحث کے بعد جو سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر غزل کی ہیئت اور اس کا جمالیاتی پہلو ہے کیا؟ آیا اس کی ہیئت کا کوئی تعین ہے بھی یا نہیں اس کا جمالیاتی پہلو کوئی اہمیت

رکھتا بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی ماہیت کیا ہے؟ ادب اور فن میں فلسفہ اور جمالیات میں اسے کیا رتبہ ملنا چاہیئے؟ آیا غزل کی ہیئت کی جمالیاتی نوعیت ہے بھی یا نہیں؟ وہ ذہنوں پر کوئی ایسا اثر چھوڑتی بھی ہے جس کو جمالیاتی اثر سے تعبیر کیا جا سکے؟

صنف غزل کی ایک مخصوص ہیئت ہے اس ہیئت کے ساتھ صدیوں کی روایات وابستہ ہیں غزل کی ہیئت میں جس چیز پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے وہ مطلع ہے۔ مطلع کبھی ایک ہوتا ہے کبھی دو کبھی تین ــــ اس کے بعد کچھ منتشر اشعار ہوتے ہیں۔ ان اشعار کے موضوعات مختلف ہوتے ہیں اس مطلع اور اشعار کی کوئی مخصوص بحر ہوتی ہے۔ ہر بحر کا خاص آہنگ ہوتا ہے جس سے مختلف حالات میں مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غزل کی ہر بحر میں قافیے اور ردیف کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخری الفاظ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ردیف بھی موجود رہتی ہے مطلع غزل کے دوسرے اشعار کے مقابلے میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ الفاظ پر ختم ہوتے ہیں ہر شعر بذات خود مکمل ہوتا ہے اس لئے معنوی تسلسل غزل کے مختلف اشعار میں ضروری نہیں۔ ان میں سے ہر شعر کے مفاہیم اور معانی مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس انتشار کے باوجود غزل کی صنف اس بات کی متقاضی ہے کہ کم از کم میرے خیال میں کہ وقتی جذبے کا ایک ایسا تسلسل جو ایک خاص موڈ کو ظاہر کرے اس کا ہونا غزل کے اشعار میں لازمی ہے اگر ایسا نہ ہو تو اشعار کا انتشار لکھنے والے کے ذہنی اور جذباتی تضاد کو ظاہر کرے گا اور اس لئے مجموعی اعتبار سے غزل کی صورت میں جمع کئے ہوئے یہ اشعار کوئی ایسا تاثر نہیں پیدا کر سکیں گے جس کا اثر پڑھنے والے پر دیرپا ہو۔ اشعار علیحدہ علیحدہ اثر کریں گے۔ غزل کی ہیئت مجموعی اعتبار سے کوئی اثر نہیں ڈال سکے گی۔

بظاہر دیکھنے میں غزل کی ہیئت انھیں عناصر اور لوازم پر مشتمل نظر آتی ہے لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا صحیح استعمال، انداز بیان، طرز ادا، تشبیہیں اور استعارے، ایمائیت اور نغمیت موسیقی اور رعنائیت، داخلیت اور جذباتی رنگ کا اور ان سے متعلق تمام باتیں غزل کی ہیئت سے تعلق رکھتی ہیں ــــ ان سب کا مجموعی تاثر وہ کیفیت ہے جو غزل کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہے اور جس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں ہر فرد پر ہوتا ہے۔

غزل کی یہ ہیئت محض تفننِ طبع کے طور پر رائج نہیں کر دی گئی یہ عناصر جن پر غزل کی ہیئت مشتمل ہے اپنی اپنی جگہ نفسیاتی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک عنصر بھی بیکار نہیں۔ بلکہ ہر ایک غزل کے تاثر کو گہرا کرنے میں اپنا کام کرتا ہے۔

مطلع بظاہر دیکھنے میں ایک ادنیٰ سی چیز ہے۔ لیکن اگر اس کو پورا دیکھا جائے کہ وہ ایک نقطۂ آغاز ہے، اور اس کے دونوں مصرعوں میں قوافی و ردیف کی جو پابندی ہوتی ہے اس سے ذہن فوراً اس غزل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کی توجہ اس غزل کے فارم، اس کی تکنیک، اس کی ہیئت، اس میں کھوئے ہوئے خیالات، وہ مخصوص ذہنی و جذباتی کیفیت جو غزل کو لکھتے وقت شاعر کے اوپر طاری تھی۔ ان سب کی طرف مطلع کے ذریعے پڑھنے والے کی توجہ مبذول ہوتی ہے۔ مطلع گویا انسانی طبائع کو وقتی طور پر حرکت میں لاتا ہے انھیں یکایک تیار کر دیتا ہے۔ اس غزل کو سمجھنے کے لئے اس کو محسوس کرنے کے لئے اس سے متاثر ہونے کے لئے مطلع انسان کی ذہنی و جذباتی کیفیت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک حرکت پیدا کرتا ہے اس حرکت سے ذہن اور جذبات میں ایک توجہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس طرح پڑھنے والا اس غزل کے استقبال کے لئے تیار ہو جاتا ہے مطلع گویا غزل کا نقیب ہے پھر اس کے دونوں مصرعوں میں قافیے کی ہم آہنگی اور اس کا صوتی تاثر غزل کی مخصوص موسیقی اور غنائیت کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں بہرحال مطلع غزل کی ہیئت میں ایک مخصوص مقصد رکھتا ہے۔ اسے بیکار نہیں کہا جا سکتا اس کا سب سے بڑا اور اہم مقصد یہ ہے کہ وہ غزل کے مجموعی اور بھرپور تاثر کے لئے زمین تیار کرتا ہے۔ اسی لئے بعض غزل گو شعرا کبھی کبھی ایک کے بجائے دو یا تین مطلعے بھی اپنی بعض بعض غزلوں میں کہتے ہیں۔

غزل کی ہیئت اور اس کے جمالیاتی پہلو میں کسی مخصوص بحر کے انتخاب کو بڑا دخل ہے فارسی اور اردو میں جتنی بحریں بھی رائج ہیں ان سب کا آہنگ مختلف ہے اور ان میں سے ہر ایک انسانی ذہن کی بعض مخصوص کیفیات سے مناسبت اور مطابقت رکھتی ہے بعضوں کی موسیقی پرشور ہوتی ہے۔ ایسی بحروں کے اندر پہاڑوں کے دامن میں بہتی ہوئی ندیوں کا سا خروش ہوتا ہے یہ بحریں انسان کے جذبات کی شدت، اس کے ذہنی ہیجان اس کی طبیعت کی پرشور کیفیت اور اس کے

راج کی شورش کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض بحروں کے اندر میدانوں میں بہتی ہوئی سبک خرام
ے روں کا سا ترنم ہوتا ہے ان میں ایک آہستہ روی اور نرمی کی خصوصیت پائی جاتی ہے یہ بحریں
ن کے انتخاب کرنے والے کے مزاج کے دھیمے پن، طبیعت کی بجھی ہوئی کیفیت، جذبات میں ایک
نم کے ٹھہراؤ کو ظاہر کرتی ہیں اسی طرح بعض بحریں چھوٹی ہوتی ہیں، بعض طویل، بعض آسان ہوتی ہیں
اور بعض مشکل اور سنگلاخ ــــ ان بحروں میں سے مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیات کو غزل کے سانچے
میں ڈھالنے کے لیے مخصوص بحروں کا انتخاب غزل گو شاعر کے شعور پر دلالت کرتا ہے اور جتنا زیادہ وہ
دونوں کے درمیان ہم آہنگی قائم رکھنے کا شعور رکھتا ہے اتنی ہی اس کی غزل کامیاب ہوتی ہے کیونکہ اس طرح
غزل کی موسیقی اور غنائیت اُفتادِ طبع اور مزاج سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کا
تاثر گہرا اور بھرپور ہوتا ہے اس لیے ظاہر ہے غزل کی ہیئت اور اس کے جمالیاتی پہلو میں مخصوص اور
متناسب بحروں کے انتخاب کی بڑی اہمیت ہے۔ بڑی حد تک اس انتخاب پر غزل کے تاثر کا انحصار ہوتا ہے

بحروں کے انتخاب کے علاوہ غزل کے اشعار میں کسی معنوی تسلسل کا فقدان اور ان کی ایک
انتشاری کیفیت بظاہر دیکھنے میں بہت عجیب لگتی ہے لیکن اس انتشار سے غزل گو شاعر کی ذہنی
اور جذباتی کیفیت اور اس کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے اس لیے یہ انتشار کی کیفیت بذاتِ خود غزل
کے جمالیاتی تاثر میں گہرائی اور شدت کا باعث بنتی ہے لیکن اشعار کے اس انتشار میں بھی اپنا تسلسل
اور آہنگ ہوتا ہے اور یہ تسلسل اور آہنگ اس وقتی ذہنی و جذباتی کیفیت اور موڈ کی ہم آہنگی اور
وحدت کو پیش کرتا ہے جو شاعر پر غزل کہتے وقت طاری رہتی ہے ــــ بلکہ جس کی وجہ سے وہ کوئی غزل
کہتا ہے یہ کیفیت اس کے توسنِ فکر کو مہمیز کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود اس انتشار کے جو غزل کے مختلف
اشعار میں پایا جاتا ہے اس میں موڈ کی وحدت اور ــــ ہم آہنگی ایک ایسا تسلسل پیدا کرتی ہے جو غزل
کی ہیئت کا بڑا اہم جزو ہے اس خصوصیت کو بہت کم شاعر برت سکے ہیں لیکن شاعروں کا اس کو اچھی
طرح نہ برتنا یا اس حقیقت کا شعور نہ رکھنا اس بات کی دلیل نہیں کہ غزل کی ہیئت میں اس کی کوئی جمالیاتی اہمیت
نہیں۔ غزل کی یہ خصوصیت اس کی ہیئت کا ایک اہم جزو ہے اور یہ جزو اپنے اندر جمالیاتی کیفیت کو
پیدا کرنے کا پورا سامان رکھتا ہے۔

قوافی و ردیف کی پابندی غزل کی ہیئت کا ایک لازمی جزو ہے قوافی و ردیف کی ہم آہنگی

اور تکرار غزل کی موسیقی اور ان کی غنائی کیفیت میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ ان کی صوتی ہم آہنگی یکسانی و ہم رنگی شاعر کی ذہنی و جذباتی کیفیت اور اس کے موڈ کی ہم آہنگی کا احساس دلاتی ہے اور ان کی وجہ سے غزل کا وہ تسلسل صورت اختیار کرتا ہے جس کو غزل کا مخفی تسلسل کہہ سکتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ بعضوں نے قوافی اور ردیف کے سہارے شاعری کی ہے۔ ظاہر ہے ایسے شاعروں کی شاعری میں قافیہ پیمائی کی خصوصیت پیدا ہونی چاہیئے چنانچہ بہت سے ایسے غزل گو شاعر ملیں گے جو نہ صرف قافیے کے سہارے بلکہ قافیے کی وجہ سے شاعری کرتے ہیں۔ لیکن ایسے شاعروں کی ظاہر ہے کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔ قوافی و ردیف غزل کی ہیئت کے حسن کو بڑھاتے ہیں اگر کوئی شخص ان کی اس خصوصیت کو نظرانداز کر کے ان کو شاعری کرنے کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو اس میں ان کے جمالیاتی پہلو کی کوئی خامی نہیں خامی اس شاعر کے انداز شعر گوئی میں ہے اس کے معیار شعر گوئی میں ہے یہ خامی اس کے ذہنی و جذباتی افلاس کو ظاہر کرتی ہے بہرحال قوافی و ردیف کا صحیح استعمال غزل کے جمالیاتی حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے اس کو غزل کی ہیئت میں دوسرے عناصر کی طرح ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

غزل میں مقطع اگرچہ غزل کی ہیئت میں بظاہر بڑی معمولی سی چیز معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی بھی خاصی اہمیت ہے۔ غزل کے آخری شعر میں اپنے تخلص کو لانا اس بات پر دلالت کرتا ہے شاعر کچھ اپنے متعلق کہنا چاہتا ہے۔ غزل کے دوسرے اشعار میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کی نوعیت آفاقی ہوتی ہے وہ آپ بیتی ہونے کے باوجود جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ مقطع ایک ایسا نقطہ ہے جہاں شاعر کی وہ جذباتی و ذہنی کیفیت جن کو وہ غزل میں پیش کرتا ہے مکمل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے تخلص کا یہ استعمال پڑھنے والے کو شاعر سے زیادہ قریب کر دیتا ہے اور اس شاعر کی شخصیت کی خصوصیات اس پر بے نقاب ہو جاتی ہیں گویا مقطع غزل کی وحدت کو ذہن نشین کرتا ہے۔ اس کے مکمل ہونے کا احساس دلاتا ہے اور پڑھنے والے اور شاعر کے درمیان ایک ایسے [illegible] کا کام دیتا ہے جس سے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ بعض شاعروں نے غزل کے پہلے مصرعے میں تخلص کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کو مقطع نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ایسے اشعار مقطع کا کام نہیں دیتے اور پھر ایسی صورت غزلوں میں کم ہی پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے۔ جو بعض الفاظ اپنے تمثیلی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جن کی ایک روایتی اہمیت

[illegible] ہے ایسے جذبات و احساسات وابستہ ہوتے ہیں جن کی تشکیل مخصوص روایات
نشو و نما ہوتی ہے وہ بھی غزل کی ہیئت کا ایک اہم عنصر ہیں ان سے اختصار میں وسعت اور
اجمال میں تفصیل پیدا ہوتی ہے یا الفاظ اشاروں اور تمثیلوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں ان کے
باعث غزل کی ہیئت میں رمزیت اور ایمائیت کی خصوصیات بھی پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں کی وجہ سے
مشاہدۂ حق کی گفتگو "بادہ و ساغر" کہے بغیر نہیں بنتی۔ اور "ناز و غمزہ" کو "دشنہ و خنجر" کہے بغیر کام نہیں
چلتا۔ بڑی حد تک غزل کی ہیئت اور اس کے جمالیاتی پہلو کا انحصار ان اشاروں اور تمثیلوں کے
صحیح استعمال پر ہے۔ غزل کی ہیئت میں یہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی وجہ غزل کی ہیئت
کی مخصوص خصوصیات مثلاً رمزیت اور ایمائیت، اشاراتی اور کنایاتی رنگ کا وجود ہوتا ہے اور یہ
سب مل کر غزل کو ایک منفرد جمالیاتی حیثیت بخشتے ہیں۔

زبان و بیان کا بھی غزل کی ہیئت کی تشکیل و تعمیر میں بڑا حصہ ہے۔ زبان کا صحیح استعمال
اور اس کے استعمال کا صحیح شعور، موضوع سے اس کو ہم آہنگ کرنے کا احساس، بیان کی سادگی و
صفائی اس کی نرمی اور ایمائی کیفیت، ہیئت کے اعتبار سے غزل کے حسن کو دوبالا کرنے میں بڑی
اہمیت رکھتے ہیں جمالیاتی تاثر جو غزل کی ہیئت سے پیدا ہوتا ہے اس میں زبان و بیان کو نمایاں
حیثیت حاصل ہے۔

یہ تمام باتیں مل کر غزل کو ہیئت کے اعتبار سے ایک مستقل شکل دیتی ہیں غزل کی یہ مستقل شکل اپنے اندر جمالیاتی تاثر کو پیدا
کرنے کی خصوصیت رکھتی ہے اس ہیئت کو برتنا آسان نہیں ہے خاصا مشکل ہے یہ درحقیقت کارِ
شیشہ گری ہے کم شاعر اس کو پوری طرح برت سکتے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات جو غزل کی ہیئت کے لئے
لازمی اور ضروری ہیں گنتی کے چند شاعروں کے یہاں اور وہ بھی ان کی چند غزلوں میں نمایاں ہوتی
ہیں۔ ان تمام خصوصیات کو مجموعی طور پر پیدا کرنا بڑے بڑوں کے لئے مشکل ہو گیا ہے اور اس کی سب
سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان خصوصیات کے مجموعی تاثر کا شعور بہت کم شاعروں کو تھا اور اگر یہ شعور
ان کے یہاں تھا تو وہ اپنے فن میں مجموعی طور پر ان خصوصیات کو یکجا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے
سب سے زیادہ جو چیز اس راہ میں حائل ہوئی وہ یہ خیال تھا یا اس خیال سے چشم پوشی تھی کہ غزل
کی ہیئت کا مجموعی اعتبار سے کوئی جمالیاتی تاثر نہیں مختلف اشعار کی ہیئت اپنی اپنی جگہ اہمیت

کھتی ہے۔ انتشار کی ہیئت کا اپنا ایک جمالیاتی تاثر ہے۔ چنانچہ اسی پہلو کی طرف توجہ عام رہی۔ یہی وجہ
ہے کہ غزلوں میں باوجود انتشار کے موڈ کا جو ایک تسلسل ہوتا ہے وہ بہت کم — شاعروں کی بہت کم
غزلیات میں پیدا ہو سکا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام مشکل تھا لیکن اس مشکل کام کو سر انجام کرنے ہی
میں غزل گو شاعر کی بڑائی ہے۔ غزل کا آرٹ بڑا مشکل آرٹ ہے۔ وہ تکمیل چاہتا ہے۔ میکائیل انجلو
(Michael Angelo) نے ایک جگہ آرٹ کو تکمیل (Perfection) سے تعبیر کیا ہے
غزل کے آرٹ پر اس کی ہیئت پر اور خصوصاً اس کے جمالیاتی پہلو پر یہ بات صادق آتی ہے۔ غزل
[illegible] ہیئت تکمیل کی منزل تک پہونچنے کے لئے محنت چاہتی ہے۔ جد و جہد اور کاوش کا تقاضا کرتی ہے
غزل گو شاعر مشق کو اسی وجہ سے اہمیت دیتے ہیں — استادی اور شاگردی کی رسم اور اصلاح کا
طریقہ غزل کی دنیا میں اسی وجہ سے ایک ادارے کی شکل اختیار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہوریس نے شاعروں
کو نو برس تک جو اپنی نظموں کو اپنے پاس احتیاط سے رکھنے کی تلقین کی تھی اس کا مقصد یہی تھا کہ
جب اتنے عرصے کے بعد وہ سامنے آئیں تو زیادہ ترشی ہوئی نکھری ہوئی اور مکمل صورت میں ہوں
غزل کی ہیئت کو بھی تکمیل سے ہم کنار کرنے کے لئے اسی صبر ایوبی کی ضرورت ہوتی ہے محنت کے
بغیر تکمیل کی خصوصیت پیدا نہیں ہو سکتی اور تکمیل کے بغیر غزل کی ہیئت میں جمالیاتی تاثر پیدا ہو نہیں سکتا

[illegible] کی ہیئت پر یہ بحث ایک اور سوال کو پیدا کرتی ہے۔ وہ یہ کہ آخر یہ مخصوص ہیئت غزل
[illegible] نے کیوں اختیار کی؟ اس سوال کا جواب تو اسی بنیادی خیال میں مضمر ہے کہ مواد اور موضوع
[illegible] ہیئت بھی نسلی و قومی، ملکی و ملی، تاریخی و عمرانی، معاشی و معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی روایات
کی [illegible] پیدا ہوتی، پلتی بڑھتی اور پروان چڑھتی ہے۔ جغرافیائی خصوصیات اور آب و ہوا کے
[illegible] اس کی تخلیق و تشکیل میں نمایاں حصہ لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مختلف ملکوں اور مختلف
[illegible] اصناف ادب میں ہیئت اور صورت کا اختلاف واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ ان میں
[illegible] اپنی خصوصیات ہوتی ہیں جو اس ملک اور قوم کے افراد کی افتاد طبع اور ذہنی رجحانات
[illegible] ہم آہنگ ہوتی ہے۔

غزل اور اس خصوصیت کے ساتھ اس کی ہیئت ایک مخصوص ملک ایک مخصوص
[illegible] کی پیداوار ہے۔ اس کی جنم بھومی ایران ہے رودکی نے سب سے پہلے اسکو

قصیدے سے الگ کر کے ایک شکل دی' ورنہ وہ قصیدہ کی تشبیب کا محض ایک حصہ تھی اس لیے
عربی کے بجائے ایرانی روایات غزل میں زیادہ نمایاں ہوئیں ان روایات میں ایک رچا ہوا تہذیبی
شعور اور ایک نفاست اور لطافت کا احساس تھا۔ غزل کی ہیئت انھیں کا مجموعہ ہے وہ طبقاتی
سماج جس میں یہ روایات پیدا ہوئی تھیں اس کا اثر بھی غزل پر خاصا گہرا ہے اس پر طبقاتی سماج
میں جو اونچا طبقہ تھا اور ادب و فن کو جس نے اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ عوام کے لیے جس نے کوئی چیز چھوڑی
ہی نہیں تھی بلکہ عوام بھی اپنی انفرادیت کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اور انھوں نے بھی اپنے آپ کو
بڑی حد تک اس رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اس کے مزاج اور ذہنی کیفیت میں تلون اور تنوع کی خصوصیات
ہوتی ہیں یہ تلون اور تنوع کی خصوصیات غزل کی ہیئت کا بھی حصہ ہیں۔ جذباتیت اور رومانیت
اور ایران کی تہذیبی روایات میں داخل ہیں گویا ایرانیوں اور ایرانیوں ہی پر کیا منحصر ہے مشرق
کے سارے رہنے والے افراد کی گھٹی میں پڑی ہیں تکلم اور تنوع کا اعلیٰ معیار بھی مشرق اور خصوصاً
ایران کی تہذیبی و تمدنی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ کچھ نہ کہہ کر بہت کچھ کہنے کی
خصوصیات یہاں کے افراد کی فطرت میں داخل ہے شدتِ احساس سے یہاں کا ایک فرد بھی
بیگانہ نہیں۔ غزل کی ہیئت انھیں مخصوص حالات اور خصوصیات کی پیداوار ہے۔ اس کی ہیئت
میں داخلیت' انتشار اور انتشار کے باوجود ایک عظیم و مرتب موسیقی اور ترنم نغمگی ایک غنائی
کیفیت' اجمال و اختصار' رمزیت و ایمائیت' نفاست و لطافت' سب کی سب ایران کی تہذیبی
و تمدنی روایات کی پیدا کردہ ہیں یہ روایات و خصوصیات ایران سے نکل کر دور دراز ملکوں کی حدود
کو چھوتی ہیں اور پھر آفاقیت کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہیں۔

(۵)

غزل کی ہیئت میں بے شک ایک آفاقیت کی خصوصیت ہے اس کا اثر ہر دور میں ہر فرد پر
یکساں ہوتا ہے۔ جمالیاتی اثر وہ ہر جگہ کرتی ہے اور جہاں یہ جمالیاتی اثر پیدا نہیں ہوتا وہاں غزل
کی ہیئت کا تصور نہیں ہے اس موضوع اور اس کے پیش کرنے والے کا تصور ہوتا ہے غزل کی
ہیئت کے جمالیاتی پہلو کو برقرار رکھنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ موضوع اور مواد
اس کی ہیئت اس کے جمالیاتی مقتضیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے

کہ غزل کا فن کار ان تمام باتوں کا شعور رکھتا ہو — کہیں کہیں ایسا نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں غزل
کی ہیئت اپنے مرتبے سے گر جاتی ہے اور خاطر خواہ اثر نہیں کرتی۔ اردو غزل کی تاریخ ہی میں اس کی
متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ کسی خاص زمانے میں بعض مخصوص غزل گو شاعروں نے اس کو اچھی طرح
برتا ہے اور کسی زمانے کے غزل گو اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے اس کی ہیئت کو اچھی طرح
نہیں برت سکے ہیں۔

اردو شاعری میں جس زمانے اور جس دور کو دلی اسکول سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے غزل گو شعرا
میں ہمیں غزل کی ہیئت کا شعور دوسرے غزل گو شاعروں کے مقابلے میں زیادہ نظر آتا ہے اور
اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں کا موضوع اور مواد غزل کی ہیئت کے جمالیاتی
مقتضیات سے مناسبت رکھتا ہے۔ انھوں نے ان دونوں کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کی ہے
اور اسی ہم آہنگی نے ان کی غزلوں میں جمالیاتی تاثر کی خصوصیت کو بدرجۂ اتم پیدا کیا ہے۔ دہلوی
شعرا کے فن کی بنیادیں جذباتی واردات اور قلبی کیفیات پر استوار ہیں۔ ان کے یہاں ہر بات
میں ایک داخلی انداز ملتا ہے وہ ہر چیز کو اپنی شخصیت کا جزو بنا کر اور ہر واقعے کو اپنی ذات میں حل
کر کے پیش کرتے ہیں۔ حالات اور ماحول نے یہ خصوصیت ان کے ہاں پیدا کی ہے اس لئے اس زاویہ
نظر سے زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں انھیں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ غزل کا فن ان سے اسی بات کا
تقاضا کرتا ہے اور ان کی غزلیں اس اعتبار سے مقتضیات فن پر پوری اترتی ہیں۔ اس کا مطلب
یہ نہیں کہ دبستان دلی سے متعلق کسی شاعر کے یہاں غزل کی ہیئت اور اس کا فن مجروح ہی
نہیں ہوتا اور ہر شاعر کی ہر غزل اس پر پوری ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بعض شاعر ان میں بھی ایسے
گزرے ہیں جو غزل کی ہیئت کو اچھی طرح برت نہیں سکے ہیں لیکن ویسے مجموعی اعتبار سے ان کی
غزلوں میں ہیئت کا شعور بدرجۂ اتم ملتا ہے۔ اس دور کی غزلوں میں داخلی انداز زیادہ ہے۔ وہ زیادہ
منظم اور مربوط نظر آتی ہیں۔ ان کے انتشار میں بھی تسلسل ہے۔ ان میں اختصار اور اجمال کی رمزیت
اور ایمائیت اپنے شباب پر ہیں۔ ان میں خیالات کو پیش کرنے کا انداز اچھوتا ہے۔ ان کے طرز
ادا میں ایک لوچ اور بانکپن ہے۔ ان کی سادگی میں ایک پرکاری ہے وہ زیادہ مترنم ہیں ان
میں ایک نغمگی ہے ایک غنائی کیفیت ہے —— غرض یہ کہ غزل کی ہیئت کے جو بھی مقتضیات

ہیں جو بھی ان کی بنیادی خصوصیات ہیں وہ سب مجموعی اعتبار سے دبستان دلی کی غزلوں میں نمایاں ہیں اور یہ کیفیت جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے موضوع اور مواد ہی نے پیدا کی ہے۔

میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ دبستان دلی کے ابتدائی دور کے نمائندہ شاعر ہیں — یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے غزل کی ہیئت کو سو فی صدی مکمل طور پر صحیح برتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ غزل میں موڈ کی ہم آہنگی اور وحدت سے جو ایک قسم کا ربط و تسلسل پیدا ہوتا ہے اس کا شعور پوری طرح نہیں تھا اسی وجہ سے بعض غزلوں میں ان کے یہاں کے مختلف موضوعات ملے جلے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی اکثر و بیشتر غزلوں میں موڈ کی ہم آہنگی اور وحدت سے پیدا ہونے والا تسلسل پایا جاتا ہے اور خصوصاً ان کی ایسی غزلیں جو کم اشعار پر مشتمل ہیں وہ تو اس خصوصیت کا مرقع ہیں — غزل کی ہیئت کے دوسرے لوازم کو جس خوبی سے انھوں نے برتا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہیں

میر صاحب کی ایک غزل ہے ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمین — تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

اس غزل کا ہر شعر باوجود مختلف ہونے کے ایک دوسرے سے ایک ربط رکھتا ہے جو شاعر کے موڈ کی ہم آہنگی اور وحدت کا نتیجہ ہے پھر اس کا رچا ہوا داخلی انداز اس کی رمزیت و ایمائیت اس کی نغمگی اور فضائیت اس کی لطافت اور نفاست اس کی سادگی اور صفائی۔ اس کی جدت اور اچھوتا پن تمام خصوصیات اسے غزل کی مجموعی ہیئت کا شاہکار بنا کر پیش کرتی ہیں اور صرف اسی غزل پر منحصر نہیں میرؔ کے کلیات میں بے شمار ایسی غزلیں ملتی ہیں جو انھیں خصوصیات کی حامل ہیں۔

خواجہ میر دردؔ کی ایک غزل ہے ؎

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اسے آہ نے اثر نہ کیا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا
کیوں مجھے یوں ہی تم مانتے ہو بندہ نواز — سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
آپ سے ہم گزر گئے کب کے — کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

اس غزل میں اشعار میر صاحب کی غزل کی نسبت زیادہ ہیں۔ لیکن باوجود ان اشعار کی فراوانی کے غزل میں وہی جذبے اور موڈ کی ہم آہنگی و وحدت کا خون نہیں ہوتا۔ اس غزل کے اشعار معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں ان میں ایک انتشار کی کیفیت ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس غزل کے مختلف اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر پر ناکامی کا احساس طاری ہے اس ناکامی کے احساس کو محبوب کی بے اعتنائی اور بے رخی نے پیدا کیا ہے اور اس کو عشق میں بہت کچھ کرنے کے باوجود کچھ نہ کرنے کا احساس بڑا شدید ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بے ہنر سمجھتا ہے۔ اس خصوصیت کے علاوہ تغزل کی بنیادی خصوصیات بھی اس غزل اور اس کے اشعار میں موجود ہیں۔

یوں تو یہ خصوصیت دبستان دلی سے تعلق رکھنے والے تقریباً تمام شعراء کے یہاں موجود ہے میر اور میر درد کے علاوہ حاتم، مظہر جان جاناں، سودا، میر سوز، میر حسن، مصحفی غرض یہ کہ تمام شاعروں کے یہاں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں سب کی مثالیں دے کر ان پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ متاخرین میں غالب اور مومن، حالی اور شیفتہ کے یہاں یہ شعور اور بھی زیادہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے ان کی ایسی غزلیں جن میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں وہ ہم سب کے ذہنوں میں ہیں اس لئے ان کو نقل کرنا یہاں تحصیل حاصل ہے۔

دبستانِ دہلی نے شعور نے اس میں کمال حاصل کیا۔ لیکن —— دبستانِ لکھنؤ کے شعراء غزل کی ہیئت کو برتنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے حالات اور ماحول نے ان کے موضوع میں خارجیت زیادہ پیدا کی۔ وہ عشقیہ موضوعات کو اپنی شخصیت کا جزو نہ بنا سکے۔ ان کے یہاں واردات قلبیہ کا بیان نہیں۔ صرف ایسے موضوعات کی ترجمانی ہے جن کی نوعیت خارجی ہے۔ پھر سماجی اور معاشرتی انحطاط و زوال نے ان کے یہاں ہیئت کے جمالیاتی پہلو سے زیادہ لفظی بازیگری کے خیال کو زیادہ نمایاں کیا جو ان میں سے تقریباً ہر ایک کے یہاں صنعت گری کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اور وہ سب کے سب اسی دلدل میں پھنس کے رہ جاتے ہیں۔ ان کے موضوع اور مواد کے جو حدود تھے وہ انھیں اس سے زیادہ آگے نہیں لے جا سکتے تھے خارجی موضوعات کو بہرحال ایسے ہی سانچوں میں ڈھلنا چاہیئے تھا اور اس کی تان یہیں پر جا کر ٹوٹنی چاہیئے تھی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لکھنوی شاعروں کے یہاں چونکہ جذباتی کیفیات مفقود ہیں۔ اس لئے ان کی غزلوں کی ہیئت میں جذبے اور موڈ کی ہم آہنگی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں معنوی انتشار ہے پراگندگی ہے۔ ربط و تسلسل اور نظم و ترتیب کی کمی ہے۔ ان کی غزلیں کسی طرح کا جمالیاتی اثر پیدا نہیں کرتیں —— برخلاف اس کے لفظی و معنوی انتشار ان کے یہاں جگہ جگہ ملتا ہے رمزیت اور ایمائیت، نغمگی اور غنائی کیفیت، سادگی اور صفائی، جدت اور اچھوتا پن۔ غرض یہ کہ ان ساری خصوصیات کا ان کی غزلوں میں فقدان ہے اگر ان کے پاس غزل کے لئے مناسب مواد ہوتا تو شاید ان کی غزل کی ہیئت میں یہ خصوصیات مفقود نہ ہوتیں اور وہ بھی اس کو اچھی طرح فن کارانہ انداز میں برت سکتے۔

غزل کی ہیئت کو برتنے کے سلسلے میں مواد اور موضوع کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے اگر دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں سے ذرا ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو صرف سید انشاء کی اس غزل کی مثال کافی ہوگی ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر — غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں — نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک — نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے — میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا کچھ عجب حال ہے اس دور میں یارو — جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ!
غنیمت ہے کہ ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اس غزل کا موضوع عشق نہیں ہے — اس میں غم جاناں سے زیادہ غم دوراں کا ذکر ہے — لیکن اس میں معنوی معنوں میں تغزل نہ ہونے کے باوجود غزل کی ہیئت کا شباب ہے۔ جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی تاثر کی شدت اور اس میں خلوص اور صداقت جو اس کا موضوع ہے اس نے اس غزل کو غزل کی مقتضیات سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا ہے۔ سید انشا بڑے شوخ مزاج تھے لیکن اس میں شوخی نہیں ہے اُنھوں نے کبھی شاعری کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں کی شیفتہ نے ان کے متعلق یہ غلط نہیں لکھا تھا کہ "ہیچ صنف را بطریقہ راسخہ شعرانہ گفتہ" لیکن آخر عمر میں جو بپتا ان پر پڑی تھی اس نے انھیں نہ صرف اپنے آس پاس سے بلکہ خود اپنے آپ سے بیزار کر دیا تھا اس غزل میں اسی ذہنی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہ غزل مسلسل نہیں ہے — اس میں کوئی تاریخ نہیں بیان کی گئی ہے۔ صرف چند کیفیات کا اظہار ہے لیکن ان کیفیات میں وحدت اور ہم آہنگی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کے زیر اثر لکھی گئی ہے غزل کی دوسری خصوصیات بھی اس میں اس طرح سموئی ہیں جس کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور مل سکتی ہے

(۶)

حالیؔ کے بعد سے ہیئت کی ان خصوصیات کا احساس اردو غزل میں عام ہوا۔ حالیؔ کو خود اگرچہ اس کا پورا شعور نہیں تھا لیکن غزل کو معنوی اعتبار سے ایک نئے راستے پر ڈالنے کی جو کوشش انھوں نے کی اس کی وجہ سے ایک ایسی فضا پیدا ہوئی جس نے غزل میں ہیئت کے شعور کو بھی عام کیا چنانچہ موجودہ دور میں جو غزلیں لکھی گئیں ان میں یہ شعور اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ حالیؔ کے بعد اقبالؔ، چکبستؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، یاسؔ، یگانہؔ، شاد عارفیؔ، اثرؔ اور فراقؔ وغیرہ نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا

ان سب کی غزلوں میں بڑا تنوع ہے ان میں سے بعض نے نئے موضوعات کو بھی غزل میں داخل کیا ہے۔ لیکن ان کا کمال صرف اس موضوع اور مواد کے تنوع اور رنگا رنگی ہی میں نہیں ہے بلکہ اس تنوع اور رنگا رنگی کو پیش کرنے کے انداز میں ہے ان کے یہاں موضوع اور مواد ہیئت اور صورت کی جو ہم آہنگی ملتی ہے اور غزل کو برتنے کے سلسلے میں جمالیاتی تاثر کا جو شدید احساس نظر آتا ہے اس میں انکی بڑائی ہے اس اعتبار سے ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ منفرد ہے۔

اردو غزل کا مستقبل بعض لوگوں کو تاریک نظر آتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اب یہ صنف سخن ترقی نہیں کر سکتی —— لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو غزل کی ترقی کے لئے اب جا کر راہیں کھلی ہیں کیونکہ وہ جمالیاتی شعور، وہ ہیئت اور تکنیک کا احساس جو آج ہمارے ادب میں عام ہو رہا ہے اس نے غزل کو اس کی صحیح جمالیاتی اہمیت کا احساس دلایا ہے اور اس کے نتیجے میں غزل نے خود اپنے آپ کو پانے کی کوشش کی ہے۔

حمید اختر

ادب اور فن کے بنیادی فرائض

چین کی عوامی جمہوریت کے صدر "ماؤزے تنگ" نے ادب اور فن کے بنیادی فرائض پر یہ خیالات تہذیبی محاذ پہ کام کرنے والوں کی ایک کانفرنس میں پیش کئے تھے یہ کانفرنس ۱۹۴۲ء میں ۲ مئی سے ۲۳ مئی تک ینیان کے مقام پر منعقد ہوئی تھی اس تقریر کے بعض اقتباسات دو تین رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر مکمل تقریر اردو میں پہلی مرتبہ ادب لطیف کے صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔
ماؤزے تنگ کے ان خیالات نے چین کی ادبی اور ذہنی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے اور ایک نئے انداز فکر کی بنیاد رکھی ہے۔

(ایڈیٹر)

رفیقو! آپ کو آج اس مباحثہ میں اس لئے مدعو کیا گیا ہے کہ ہم ادیبوں، فن کاروں اور عام انقلابی تحریک کے درمیان صحیح رشتہ قائم کرنے کے بارے میں تبادلہ خیال کریں تاکہ ہمارا انقلابی ادب اور زیادہ فروغ پائے اور ادب کو ہماری دوسری انقلابی سرگرمیوں میں زیادہ موثر طور پہ کام میں لایا جا سکے ان طریقوں سے ہم اپنے قومی دشمنوں کو شکست دے کر قومی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔
چین کی آزادی کی جدوجہد میں بہت سے محاذ ہیں جن میں دو یعنی (۱) تہذیبی محاذ اور

(۲) فوجی محاذ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ دشمن پر فتح حاصل کرنے کا انحصار زیادہ تر ان سپاہیوں پر ہی ہے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں ہوں لیکن اس کام کے لئے محض فوجی دستے ہی کافی نہیں ان فوجی دستوں کے علاوہ ہمارے پاس ایک خاص فوجی تہذیب کا ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ اپنی صفوں میں اتحاد کرنے اور دشمن کو شکست دینے کے کام میں ایسے تہذیبی دستوں کا ہونا نہایت ضروری ہے
۴ مئی کی تحریک نے چین میں ایک تہذیبی فوج کو جنم دیا اس طاقت نے چینی انقلاب میں بےحد مدد دی اور چین پر سامراجیوں کی مسلط کی ہوئی غلامانہ اور جاگیردارانہ تہذیب کے اثرات کو آہستہ آہستہ کم کیا اب تک رجعت پرست گٹھ جوڑ اس نئی تہذیب کو ختم کرنے کے لئے معیار کے مقابلے میں صرف مقدار سے حملہ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ چونکہ رجعت پسندوں کے پاس دولت ہے اس لئے وہ فن بکثرت تخلیق کر سکتے ہیں۔ خواہ فن کے یہ نمونے کتنے ہی گھٹیا کیوں نہ ہوں۔

تحریک ۴ مئی کے بعد سے ادب و فن کا شمار تہذیبی محاذ کی اہم شاخوں میں ہوتا ہے اور ان کے کارنامے کافی شاندار ہیں ادب و فن کی انقلابی تحریک نے خانہ جنگی کے زمانے میں خاص طور پر ترقی کی لیکن جہاں اس تہذیبی تحریک اور سرخ فوج کی سرگرمیوں نے ایک ہی رخ میں ترقی کی ہے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں محاذوں میں گہرا ربط قائم نہیں ہوا ہے۔ یہ دونوں محاذ ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر اپنی اپنی لڑائی لڑتے رہے شروع شروع میں تو رجعت پسندوں نے ان دونوں حلیف فوجوں کو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے دور رکھا لیکن بعد میں جاپان کے خلاف جنگِ مدافعت کا ایک اچھا اثر یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے بہت سے ادیب اور فن کار ییناں اور دوسرے جمہوری محاذوں پر جمع ہو گئے ان تہذیبی کارکنوں کا ہمارے علاقے میں آ جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ـــــ عوامی تحریک کا جزو بنا لیں گے تاہم اگر ہم اپنے انقلابی کام میں ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں کسی نہ کسی طرح ان گروہوں کو اپنے ساتھ لانا پڑے گا۔

یہ آج کی میٹنگ ہم نے اسی مقصد کے لئے بلائی ہے کہ ہم ادیبوں اور فن کاروں کو اپنے انقلابی کارناموں میں حصہ دار بنا لیں۔ صرف ان طریقوں ہی سے ہم اپنے لوگوں میں اتحاد اور تنظیم پیدا کر سکتے ہیں۔ دشمن کو للکار سکتے ہیں۔ اس کے ہتھیاروں کو بے اثر بنا سکتے ہیں اور لوگوں کو دشمن کا مقابلہ

کرنے کے کام میں یک جان اور یک دل بنا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کی راہ میں بہت سے
ایسے مسائل ہیں جن کو حل کرنا پڑے گا۔ یہ مسائل پوزیشن، رویے، قارئین اور خود اپنی تعلیم کے ہیں

پوزیشن کا مسئلہ۔

ہم اپنی پوزیشن کا تعین مزدور طبقے اور عام لوگوں کے پہلو بہ پہلو کرتے ہیں ہم میں سے جو
کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں۔ انھیں تو پارٹی کے اصولوں اور پارٹی کی پالیسی کو سامنے رکھتے ہوئے
پارٹی کے ساتھ چلنا ہوگا۔ لیکن ہمارے تخلیقی کارکنوں کی بڑی بھاری اکثریت نے ابھی تک صحیح
نظر حاصل نہیں کی ہے۔ میرے خیال میں بہت سے ایسے رفیق بھی ہیں جنھیں ابھی تک یہ بھی معلوم
نہیں کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔

رویہ کا مسئلہ۔

پوزیشن کے اس مسئلے کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے رویّے کا مسئلہ بھی ہے جو ہمیں ان
مسائل کے سلسلے میں اختیار کرنا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ ہمیں کس وقت تعریف کرنی چاہیئے اور کس وقت
مذمت ہمیں کس قسم کا انداز اختیار کرنا چاہیئے؟ میرے خیال میں ہمیں دونوں قسم کے رویے اختیار
کرنے پڑیں گے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کن لوگوں کے بارے میں کون سا رویہ اختیار کیا جاتا ہے
ہمارے سامنے لوگوں کی تین مختلف قسمیں ہیں۔

(۱) دشمن (۲) وہ لوگ جن سے ہمارا اتحاد قائم ہے اور (۳) خود ہم لوگ یعنی مزدور طبقہ اس کا
ہراول دستہ کمیونسٹ پارٹی ان تین قسم کے لوگوں کی طرف ہمارے تین مختلف رویّے ہونے چاہئیں
کیا ہمیں دشمنوں (جاپانی فاشسٹ اور عوام کے دوسرے تمام دشمنوں) کی تعریف کرنی چاہیئے
ہرگز نہیں کیونکہ یہ لوگ بدترین رجعت پسند ہیں۔ اصلاحی زبان میں تو ہم یہ کہیں گے کہ وہ ہم سے
زیادہ طاقت ور ہیں مثال کے طور پر ان کے پاس بہترین رائفلیں اور دوسرا سامانِ حرب موجود ہے
لیکن ان کے ہاتھوں میں اچھے ہتھیار بھی رجعت پسندی کی قوت بن جاتے ہیں۔ ہماری فوج کا کام
یہ ہے کہ وہ ان ہتھیاروں پر قبضہ کرکے ان کا رخ دشمن کی طرف موڑ دے۔ اس کے ساتھ
ہی ہماری تہذیبی فوج کو دشمن کی سفاکیوں اور بمباریوں کو بے نقاب کرنے کا کام بھی اپنے ذمہ لینا
چاہیئے اور یہ بتانا چاہیئے کہ آخرکار ان کی شکست کیوں یقینی ہے انھیں ترقی پسند قوتوں کے

یک جان اور یک دل ہو کر فتح کو قریب سے قریب تر لانے کے کام کی حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیئے۔ دوسرے ان لوگوں کے سلسلے میں جن کے ساتھ ہمارا اتحاد ہے ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ان گروہوں کو متحد کریں اور ان کی غلطیوں کو تنقید کے ذریعہ سے درست کریں۔ دشمن کے خلاف مدافعت میں جو خوبیاں اور کمال وہ حاصل کریں ہمیں ان کی تعریف کرنی چاہیئے لیکن ان کی صفوں میں ایسے لوگوں کو جو کمیونسٹوں اور عوام کے مخالف ہیں اور جو روز بروز رجعت پسندی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں ہمیں بے نقاب کرنا چاہیئے سرمزدور اس کی پارٹی عوامی فوج اور اس کی جدوجہد کے سلسلے میں قدرتی طور پر ہمارا رویہ تعریفی ہوگا عوام میں بھی خامیاں ہوتی ہیں اور محنت کش طبقے میں ایسے افراد بھی ہیں جن پر متوسط طبقے کے افکار کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسان اور متوسط طبقہ اپنے سوچنے کے انداز میں کافی پریشان بھی ہے یہ چیز ہماری جدوجہد کے کندھے پر ایک بوجھ بھی ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کی وقت طلب تعلیم کے لئے دل وجان سے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیئے اور انکی پشت پر سے اس بوجھ کو ہٹانے میں ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنے کام میں تیزی سے ترقی کریں اس جدوجہد کے دوران میں انھوں نے پہلے ہی سے اپنے آپ کو بدلنا شروع کر رکھا ہے ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ فاصلے پر کھڑے ہو کر ان کی طرف دیکھنے بلکہ معاندانہ نظروں سے دیکھنے اور ان کی غلطیوں کی ہنسی اڑانے کی بجائے ان کی تبدیلی کے اس عمل کو بیان کریں اس طرح عوام کو متحد کرنے میں مدد ملے گی اور اس طرح وہ نئے میدان ماریں گے اور انقلابی جدوجہد میں داخل ہو کر اپنی درماندگی کو دور کریں گے اس کے ساتھ ساتھ عوام کے اندر جو انقلابی رجحانات موجود ہیں ان کی تربیت بھی ہو سکے گی۔

قارئین کا مسئلہ

اس سلسلے میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ادب وفن کی تخلیق کس کے لئے کی جانی چاہیئے شن کن ننگ کے سرحدی، شمالی اور وسطی چین کے جمہوری علاقوں میں اس مسئلے کی نوعیت کومن تانگ اور جنگ کے پہلے کے شنگھائی کے علاقوں سے مختلف ہے شنگھائی پر جاپانیوں کے قبضے سے پہلے وہاں پڑھنے لکھنے والے طبقے میں زیادہ تر طلبا، پیشہ ور اور ملازم لوگ ہی تھے۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد سے کومن تانگ کے علاقوں میں پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک

اس میں زیادہ وہی لوگ ہیں یہ صورت حال اس وجہ سے موجود رہی ہے کیونکہ حکومت مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کو انقلابی ادب و فن سے محروم رکھتی ہے۔

ہمارے علاقوں میں حالات بالکل مختلف ہیں۔ یہاں انقلابی ادب و فن مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کی بھاری اکثریت تک پہنچ چکا ہے۔ ہمارے علاقوں میں طلبا بھی ہیں لیکن اب یہ پرانے قسم کے طلبا نہیں ہیں اب وہ یا تو ہمارے کارکنوں میں شامل ہو چکے ہیں یا مستقبل قریب میں شریک ہو جائیں گے۔ تمام قسم کے ہمدرد یعنی فوج کے سپاہی فیکٹری کے مزدور اور دیہات کے کسانوں نے حروف پہچاننے کا شعور حاصل کر کے کتابیں پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو حروف تک بھی نہیں پہچان سکتے ڈرامے اور تصویریں دیکھنے اور موسیقی وغیرہ سے آشنا ہونے کے خواہش مند ہیں اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے ہم ادب و فن کی تخلیق کرتے ہیں۔

یہ مت سمجھئے کہ ان ہمدردوں کی تعداد آبادی کے ایک چھوٹے سے حصہ پر مشتمل ہے ان لوگوں کی تعداد گومن تانگ کے علاقے سے جہاں کتاب کا ایڈیشن دو ہزار تک پہونچ جائے تو غنیمت سمجھا جاتا ہے کہیں زیادہ ہے وہاں تین ایڈیشنوں کی مجموعی تعداد بھی چھ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی مگر مثال کے طور پر ینیان جیسے علاقوں میں ہمارے ادب کے ہمدردوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچتی ہے۔ پھر ہمارے بہت سے کارکن ایسے انقلابی ہیں جنھوں نے سخت مصیبتیں جھیلی ہیں وہ پورے ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہیں اور چین کے ہر حصے میں واپس جائیں گے۔ اس لئے ان لوگوں کی تعلیم کا کام بہت اہم ہے اور ہمارے تہذیبی کارکنوں کو ان کو تعلیم دینے میں سرتوڑ کوشش کرنی چاہیے چونکہ ہمارا فن مزدوروں، کسانوں، سپاہیوں اور ہمدردوں کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن کو کیونکر سمجھا جائے۔ اور اس تک رسائی کیسے ہو۔ اس کے لئے حکومت اور پارٹی کے سالوان فیکٹری اور فوجوں میں بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے تاکہ ہم میں ہر قسم کے لوگوں کے سمجھنے کا شعور پیدا ہو۔

آپ ادیبوں اور فن کاروں نے زمانہ ماضی میں اس سلسلے میں کیا کام کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ان دونوں سے اپنے قارئین سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ آپ ایسے سورما سپاہی ہیں جنھوں نے میدان جنگ کی شکل ہی نہ دیکھی ہو۔ آپ کسی چیز سے بھی اچھی طرح واقف نہیں ہیں نہ ان کرداروں سے

جنھیں آپ پیش کرتے ہیں نہ ان حالات سے جنھیں آپ بیان کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں سے جن کے لئے آپ لکھتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ ان کی زبان ہی نہیں سمجھتے آپ دانشوروں کی زبان استعمال کرتے ہیں اور وہ عام آدمیوں کی۔ میں نے اپنے بہت سے رفیقوں کو اکثر فن کو مقبول بنانے کے متعلق گفتگو کرنے کا بہت مشتاق پایا ہے لیکن فن کو مقبول بنانے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تہذیبی کارکنوں کے جذبات اور افکار کو مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کے جذبات اور افکار میں پوری طرح مل جانا چاہیئے۔ اس ملاپ کے لئے ہمیں سب سے پہلے عوام کی زبان سیکھنا چاہیئے۔ اگر ہم عوام کی زبان ہی سمجھ نہ پائیں گے تو ادب و فن تخلیق کرنے کے سلسلہ میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ جب میں نے آپ کو ایسے سورما سپاہیوں سے تعبیر کیا تھا جنھوں نے میدان جنگ کی صورت ہی نہ دیکھی ہو تو میرا مطلب یہی تھا کہ عوام کی اکثریت آپ کے بتائے ہوئے اصولوں کو نہیں پسند کرے گی۔ آپ اپنے آپ کو باکمال ادیب اور فنکار بنا کر پیش کرنے کا جس قدر مظاہرہ کریں گے اور اپنے آپ کو چوٹی کا آدمی بنا کر عوام میں اپنے افکار کو پھیلانے کی جس قدر کوشش کریں گے اتنی ہی شدت سے لوگ آپ کے کام کو رد کر دیں گے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ عوام آپ کو سمجھیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ عوام کا ایک جزو بنیں تو آپ کو آگ میں سے تپ کر نکھرنا ہو گا اور یہ ایک لمبا اور تکلیف دہ کام ہے۔

یہاں عوام کے بارے میں میرے احساسات میں جو تبدیلی ہوئی اس کے بارے میں میں خود اپنا تجربہ بھی بیان کرتا ہوں۔ جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو میں نے بھی دوسرے طلبا کے طور طریقے سیکھے تھے۔ میں اپنے ہاتھوں سے کوئی کام کرنے میں سبکی محسوس کرتا تھا مثلاً دوسرے طلبا کے سامنے جو اپنے کندھوں پر ذرا سا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے جب مجھے بانس کے ذریعے پول پر اپنا سامان اٹھا کر لے جانا پڑتا تو میں بہت شرم محسوس کرتا اس وقت مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ دانشور لوگ دنیا میں سب سے زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں اور مزدور کسان، سپاہی وغیرہ تو ہمیشہ غلیظ رہتے ہیں لہٰذا میں دانشوروں سے کپڑے وغیرہ مانگ کر پہننے کے لئے تیار رہتا۔ کیونکہ میں ان کو صاف ستھرا سمجھتا تھا اور مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کے کپڑے پہننے کو تیار نہیں

تھا کیونکہ ان کو میں گندا اور غلیظ سمجھتا تھا۔

انقلاب کے بعد میں مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کے ساتھ رہا اور آہستہ آہستہ میں انھیں
در وہ مجھے جاننے لگے۔ صرف اس وقت میں ان بورژوائی اور متوسط طبقے کے بنیادی احساسات
ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہو سکا جو مجھ میں بورژوا اسکولوں میں پیدا ہو گئے تھے اب ان غیر اصلاح شدہ
دانشوروں کا موازنہ مزدوروں کسانوں اور فوجی سپاہیوں سے کرنے سے مجھے محسوس ہوا کہ ان
دانشوروں کے دماغوں ہی میں نہیں بلکہ جسموں کے اکثر حصوں پر بھی غلاظت ہے اور یہ کہ دنیا میں
سب سے زیادہ صاف ستھرے لوگ مزدور اور کسان ہیں ان کے ہاتھ سیاہ ہو سکتے ہیں ان کی ٹانگیں
گائے کے گوبر سے لتھڑی جا سکتی ہیں۔ پھر بھی وہ بورژوائی اور متوسط طبقے کے لوگوں سے زیادہ صاف
ستھرے ہوتے ہیں یہی وہ چیز ہے جسے میں محسوسات کی تبدیلی ——— ایک طبقے سے دوسرے
طبقے کی طرف تبدیلی سے تعبیر کرتا ہوں۔

ہمارے تہذیبی کارکنوں کو جن کی تربیت دانشورانہ ماحول میں ہوئی ہے اپنے احساسات
اور خیالات میں ضروری طور پر ایسی تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے انھیں اس قسم کی ذہنی تبدیلی کا تجربہ کرنا
چاہیئے تبھی عوام ان کی تخلیقات کو خوش آمدید کہیں گے۔ ایسی تبدیلی اور ایسے تغیر کے بغیر ادیب
اور فن کار کچھ نہیں کر سکتے اور نہ اس حالت میں ان کے افکار عوام میں پسند کئے جا سکتے ہیں۔

اپنی تعلیم کا مسئلہ۔

اس اصطلاح سے میری مراد مارکسزم لینزم کی تعلیم اور سماجی تبدیلیوں کی تعلیم حاصل کرنے
سے ہے۔ ان لوگوں کو بھی جو انقلابی ادیب بننا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو کمیونسٹ
پارٹی کے ادیب بننا چاہتے ہیں۔ پہلے مارکسی۔ لینی فلسفے کی مبادیات سے واقف ہونا چاہیئے اس
وقت ہمارے بہت سے ساتھی مارکسزم لینزم کے بنیادی تصورات سے بھی واقف نہیں ہیں۔
مثال کے طور پر مارکسزم لینزم کا یہ ایک بنیادی تصور ہے کہ خارجی حالات داخلی تصورات کا تعین
کرتے ہیں اس لئے خارجی حالات ہی ہمارے خیالات اور جذبات کا تعین کرتے ہیں لیکن ہمارے
اکثر رفیق اس اصول کو بالکل اس کے الٹ دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر ترقی کے پیچھے محبت کا
جذبہ کار فرما ہے جہاں تک محبت کا تعلق ہے طبقاتی سماج میں محبت بھی طبقاتی ہوتی ہے بہت

سے ساتھی سمجھتے ہیں کہ محبت طبقاتی امتیازات سے ماورا ہوتی ہے وہ ماورائی محبت مجرّد محبت مجرد سچائی اور مجرد انسانی فطرت وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھیوں پر سرمایہ دار طبقے کی چھاپ کتنی گہری ہے ہمیں اس اثر کو جڑ سے اکھاڑ کر مارکسزم اور لینزم کو شعوری طور پر اپنانا ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ تمام تہذیبی کارکنوں کو تخلیقی پیداوار کے طریقوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے لیکن مارکسزم اور لینزم ایسا موضوع ہے جس کا مطالعہ ہر انقلابی کارکن کے لئے لازمی ہے اور ادب کے میدان کے کارکنوں کو اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ آپ ادیبوں کو اس کے ساتھ ساتھ سماج کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے یعنی سماج کے طبقوں اور ان کے باہمی تعلقات اور ہر طبقے کے اندر افراد کی حالت کا مطالعہ ان کے چہروں اور ان کے دماغوں کا مطالعہ ان چیزوں کو سمجھنے ہی سے ہمارے ادب اور فن میں صحیح معانی پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کے صحیح رخ کا تعین بھی صرف اسی طریقے سے ہو سکتا ہے۔

آج کے اجلاس میں صرف انھیں تعارفی مسائل کو آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ ان پر اور دوسری متعلقہ باتوں پر بحث کریں گے۔

۲۳ مئی کے آخری اجلاس کی تقریر

اس مہینے میں ہم نے تین دفعہ عام اجلاس طلب کیا ہے۔ تاکہ چین کے انقلاب میں چینی ادب و فن کے فرائض کا صحیح تعین کر سکیں۔ ہم سب پارٹی ممبروں اور غیر پارٹی ممبروں نے ان مسائل پر جی کھول کر بحث کی ہے اور ان پر ہر پہلو سے سوچ بچار کیا ہے اور اس طریقے پر ہم نے ان مسائل کی پوری طرح چھان پھٹک کی ہے مجھے یقین ہے کہ یہ کام ہماری پوری تہذیبی زندگی کے لئے سودمند ثابت ہوگا کسی موضوع پر سوچ بچار کرتے وقت ہمیں ہمیشہ صحیح حالات اور حقائق سے ابتدا کرنی چاہیئے نہ کہ موضوع کی تعریف سے اگر ہم ادب و فن کا تجزیہ درسی کتابوں میں لکھی ہوئی تعریف کی روشنی میں کریں اور اسی روشنی میں آج کل کی تہذیبی تحریک اس کی راہیں متعین کریں اور ان جلسوں میں جو مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں ان کو اسی تعریف کے پیمانے سے ناپیں تو ہمارا یہ طریقہ غلط ہوگا ہم مارکس اور لینن کے اصولوں پر چلتے ہیں مارکس نے ہمیں متنبہ کیا ہے کہ کسی مسئلہ پر بحث کی بنیاد اس کی خالی

ذہنی مجرد تعریف پر نہ رکھو بلکہ ٹھوس واقعات اور نامی حقائق پر رکھو تبھی صحیح پالیسی اور پروگرام مرتب کرنے کا طریقہ بھی صرف یہی ہے لہذا تہذیبی تحریک کے متعلق بات چیت کرتے وقت بھی ہمیں یہی طریقہ کار استعمال کرنا چاہیئے۔

موجودہ حالات میں کیا کیا حقیقتیں ہمارے سامنے ہیں وہ یہ ہیں: چین جاپان کے خلاف ۸ سال سے لڑ رہا ہے فاشزم کے خلاف عالمگیر جنگ جاری ہے اور جاپان کے خلاف اس لڑائی میں بڑے بڑے جاگیردار اور بڑے بڑے سرمایہ دار کوئی عملی حصہ نہیں لے رہے بلکہ خاموش بیٹھے ہیں اندرونی طور پر وہ عوام کو دبانے کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں ہم ۴ مئی ۱۹۱۹ء کی تحریک کے بعد سے ہماری تہذیبی تحریک کی ایک روایت قائم ہو گئی ہے اس تحریک نے پچھلے ۲۳ سال میں انقلاب کے سلسلہ میں بڑی اہم خدمات سرانجام دی ہیں لیکن ابھی تک اس میں بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں۔ آٹھویں روٹ اور نئی چوتھی جمہوری فوجوں نے بہت سے جمہوری . . . .

. . مرکز قائم کر لئے ہیں اور تہذیبی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ان مرکزوں سے متعلق ہو چکی ہے ہمارے مرکزوں میں رہنے والے تہذیبی کارکن — ان علاقوں کے کارکنوں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں جو ابھی کومن تانگ کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے علاقہ کے ادیب اور فن کار تہذیبی مسئلوں پر کافی دیر سے سوچ بچار کر رہے ہیں یہ ہیں صحیح حقائق جنھیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

ہمیں اپنے مسائل پر ان حقائق و واقعات کی بنیاد پر غور کرنا چاہیئے۔ تبھی ہم اپنی دشواریوں کی تہ تک پہونچ سکتے ہیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ بنیادی مسئلہ تو عوام کے لئے کام کرنے کا ہے اور یہ جاننے کا ہے کہ ان کے لئے کیسے کام کیا جائے۔ اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا یا صحیح طور سے حل نہیں ہوتا تو ہمارے تہذیبی کارکن اپنے حالات اور اپنے کاموں میں ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتے اور انھیں اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے بے شمار تضادوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میری آج کی بات چیت کی بنیاد اسی بنیادی مسئلے اور اس سے متعلقہ دوسری باتوں پر ہوگی

(۱) پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم ادب و فن کس کے لئے تخلیق کرتے ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ سمجھ لیا جائے کہ ہمارے اکثر ساتھیوں نے جو ہمارے جمہوری مرکزوں میں تہذیبی کاموں پر لگے ہوئے ہیں قارئین کے مسئلے کو حل کر لیا ہے اور اب اس پر زیادہ سوچ بچار کی ضرورت

یں ہے ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

ہمارے اکثر رفیقوں نے اس سوال کا کوئی واضح حل ابھی تک نہیں سوچا ہے اس لئے لازمی
بیان رفیقوں کی تخلیقات ان کے جذبات اور ان کے عمل اور ادب وفن کے بارے میں ان کے
یے اور عوام کی ضروریات میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔

دانشوروں ادیبوں فنکاروں اور ایسے دوسرے تہذیبی کارکنوں کی صفوں میں جو کمیونسٹ
ٹی اور عوامی فوج کے ساتھ مل کر آزادی کی اس عظیم جدوجہد میں حصہ لے رہے ہیں بلاشبہ
ت سے موقعہ پرست اور جاپانیوں اور کومن تانگ کی خفیہ پولس کے بھیجے ہوئے جاسوس بھی ہونگے
غدار ایجنٹوں کے علاوہ ہم سب لوگ ایک مشترکہ مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں۔

ان رفیقوں کی کوششوں ہی سے ہمارے ادب ڈراما فن اور موسیقی نے بہت سے میدان
ے ہیں ان تہذیبی کارکنوں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے لڑائی چھڑنے کے بعد اپنی
رمیاں شروع کیں ایسے بھی ہیں جنھوں نے لڑائی شروع ہونے سے بہت پہلے انقلابی کام شروع
کیا تھا۔ یہ سب بہت تلخ اور اذیت ناک تجربوں میں سے گزرے ہیں اور ان کی تخلیقات نے
م پر بہت گہرا اثر کیا ہے ...... تو پھر ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ ایسے آزمودہ کار رفیقوں میں سے
تک بعض رفیق ایسے بھی ہیں جنھوں نے عوام کے لئے کام کرنے کے سلسلے میں کوئی واضح حل دریافت
یں کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان میں سے بعض کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ انقلابی ادب وفن عوام
ے لئے نہیں بلکہ لوٹنے اور ظلم کرنے والے طبقوں کے لئے پیدا کیا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ چین میں لوٹنے اور ظلم کرنے والے طبقوں کی بھی ایک اپنی تہذیب
ہے۔ وہ فن جو جاگیرداروں کی خدمت کرتا ہے جاگیرداری تہذیب کا حصہ ہے اور چین سے
گیرداری عہد کی نشانی ہے اس تہذیب کا ابھی تک یہاں کافی اثر ہے۔ یہاں ایک ایسا فن بھی ہے
سرمایہ دارانہ طبقہ کا مقصد پورا کرتا ہے یہ فن سرمایہ دار تہذیب کا حصہ ہے مثال کے طور پر
لیانگ سی چیو جیسے ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ فن طبقاتی امتیاز سے بالاتر ہوتا ہے (چین کے سب سے
ے ادیب لوہسون نے اس پر کڑی تنقید کی ہے) حقیقت میں ایسے لوگ مزدوروں کے مقابلے
سرمایہ داروں کی تہذیب کی وکالت کرتے ہیں۔ پھر ایک ایسا فن بھی ہے جو سامراجیوں کے

مفاد کو ترقی دیتا ہے مثال کے طور پر چاوزے چین اور چانگ زے پنگ جیسے فنکار غلامانہ تہذیب کو فروغ دے رہے ہیں۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اپنا ادب وفن اوپر بیان کئے ہوئے کسی بھی گروہ کے لئے نہیں بلکہ عام آدمیوں کے لئے تخلیق کرتے ہیں جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں چین کی نئی تہذیب اپنی ترقی کی موجودہ شکل میں مزدور طبقے کی رہنمائی میں عوام کی سامراج دشمن اور جاگیرداری دشمن تہذیب ہے۔ نیا ادب وفن بھی جو نئی تہذیب کا ترکیبی جزو ہے اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ ہم سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے زمانے کی پرانی ہیئت کو استعمال کرنے سے انکار نہیں کرتے لیکن جب یہ ہمارے ہاتھوں میں آتی ہے تو اس کی نئی شکل بن جاتی ہے اور اس میں نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ انقلاب اور عوام کی خدمت گزار ہو جاتی ہے۔ مگر عوام کون ہیں؟ عوام کی اکثریت جو ہمارے ملک کی آبادی کے ۹۰ فی صدی حصہ سے زیادہ ہے۔ مزدوروں کسانوں سپاہیوں اور متوسط طبقہ پر مشتمل ہے اس لئے ہمارا ادب وفن سب سے پہلے مزدور طبقہ کی خدمت کرتا ہے وہ طبقہ جو انقلاب کی رہنمائی کرتا ہے دوسرے نمبر پر کسانوں کی جو انقلاب کے طاقتور اور مستقل حلیف ہیں۔ تیسرے یہ مسلح مزدوروں اور کسانوں کی خدمت کرتا ہے یعنی آٹھویں روٹ اور نئی چوتھی فوج اور دوسرے مقبول فوجی دستوں کی جو ہمارے انقلاب کی خاص طاقت ہیں اور چوتھے متوسط طبقہ کی جو انقلاب میں ہمارے ساتھ ہیں اور ایک عرصہ تک ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔ یہی چار قسم کے لوگ چینیوں کی اکثریت پر مشتمل ہیں اور یہی چینی عوام ہیں۔

ہمیں جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کے ایسے عناصر سے بھی تعاون کرنا چاہیئے جو ابھی تک جاپانیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ چینی عوام اور وسیع جمہوریت کے مخالف ہیں۔ ان کی اپنی تہذیب ہے اور ان کی اصلاح کرنا ہمارا مقصد نہیں کیونکہ وہ ہمارے مشوروں پر عمل نہیں کریں گے۔

ہمارا ادب وفن ان چار قسم کے لوگوں کے لئے ہی ہونا چاہیئے جن کا ذکر اوپر آیا ہے بلاشبہ ہمیں پہلی تین قسموں کو ترجیح دینی چاہیئے کیونکہ متوسط طبقے کا تہذیبی معیار اگرچہ کافی اونچا ہے لیکن یہ سب سے کمزور گروہ ہے تعداد کے لحاظ سے بھی اور انقلابی عزم کے لحاظ

سے بھی اس لیے ہمیں متوسط طبقے کو اپنے قارئین کی صف اول میں جگہ دے کر مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کو دوسرے درجے پر رکھنے کی غلطی ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے اکثر رفیقوں نے قارئین کے مسئلہ کا کوئی واضح حل معلوم نہیں کیا تو میرا اشارہ ان چار دوں عناصر کی طرف ہوتا ہے اور جب میں یہ الزام لگاتا ہوں تو وہ منطریاتی نہیں ہوتا اصولی طور پر اور زبانی حد تک تو ہمارے کیمپ میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کو متوسط طبقے سے کم اہمیت دیتا ہو۔ لیکن کیا عملی طور پر بعض رفیقوں نے اپنے قارئین میں متوسط طبقے کو سب سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے میرا خیال ہے کہ ایسا ہوا ہے۔

بہت سے رفیقوں نے دانشوروں کا مطالعہ کرنے ان کے خیالات کا تجزیہ کرنے اور انھیں تفصیل سے بیان کرنے پر زیادہ زور دیا ہے لہذا ان کی خامیوں پر پردہ ڈالا ہے اور ان خامیوں کے لیے جواز بھی پیدا کیا ہے اور یہ بات دانشوروں کو جن کی تربیت متوسط طبقے کے مخصوص حالات میں ہوئی ہے راہنمائی کرنے کی غرض سے یا اصل جدوجہد میں انھیں مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں سے قریب لانے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ اس لیے کی گئی کہ یہ رفیق خود بھی اسی متوسط طبقے کے ماحول سے آئے ہیں اور دانشوروں کے کیمپ سے ربط ضبط میں انھیں مزا آتا ہے اگر دانشوروں کا یہ مطالعہ مزدوروں کے نقطہ نظر سے ہوتا تو مفید ہو سکتا تھا مگر ایسی تحریریں محض متوسط طبقہ کی خود نمائی کا کام پورا کرتی ہیں اور بس۔

ایسے رفیقوں کا عام طور پر مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں سے اتنا کم تعلق ہوتا ہے اور ان لوگوں میں سے ان کے قریبی دوست اتنے کم ہوتے ہیں کہ یہ ادیب عام طور پر ایک عام انسان کی کردار نگاری بھی اچھی طرح نہیں کر پاتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو ان کرداروں کا لباس مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کا سا ہوتا ہے مگر چہرے ہمیشہ متوسط طبقے کے سے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے رفیق مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کے لیے محبت بھرے جذبات کا اظہار بھی کر سکتے ہیں لیکن دوسرے موقعوں پر وہ ان کو ناپسند بھی کرتے ہیں بعض اوقات وہ عام لوگوں کے جذبات حرکات یا ان کے ادب فن کی پرانی اور ابتدائی شکلوں (دیواری اخبار، دیواری تصویریں، لوک گیت، لوک کہانیاں اور لوک تقریریں وغیرہ) کو ناپسند کرتے ہیں کبھی کبھی وہ ان چیزوں سے شناسائی اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کریں لیکن اس

دلچسپی میں حیرت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس میں یہ خواہش بھی شامل ہوتی ہے کہ عوام کے اس تعدیم فن کو
۔۔ اپنی نخالفات کو سجانے کا کام لیں یا پھر یوں ہی ان کے ہر اسنے پن میں جو دلکشی ہے صرف اس کی
وجہ سے بہت شیق ہوتا ہے بعض اوقات یہ رفیق عوام کی نقشہ کشی کو نفرت سے دیکھتے ہیں اور کھلم کھلا
اس کو رد کر دیتے ہیں اور اس کی بجائے دانشوروں کی تعریف و توصیف بیان کرنے لگتے ہیں یا پھر
جو باتیں متوسط طبقے سے منسوب کی جاتی ہیں ان پر سر دھنتے ہیں۔ یہ ساتھی اپنی مجبوروں پہ بیٹھ کر متوسط
طبقے کے ہمرکاب چلتے ہیں۔ اس بات کو ذرا بہتر لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ان کی روحیں متوسط
طبقے کی دانشوں ہستیوں میں رہتی ہیں۔

اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان رفیقوں کے سامنے قارئین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے اور
واضح حل تو بڑی بات ہے میرے یہ کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ خامی صرف ان لوگوں میں ہے
جو ابھی ینان سے آئے ہیں نہیں بلکہ یہ بات بعض ان رفیقوں پر بھی صادق آتی ہے جو سالہا سال سے
ہمارے فوجی مرکزوں میں اس محاذ پر کام کر رہے ہیں۔

اس کمزوری پر غالب آنے کے لئے ہم کو ایک عرصہ آٹھ دس برس کا عرصہ درکار ہے۔ لیکن خواہ
کتنا ہی وقت کیوں نہ لگے اس مسئلے کو ہمیں بہرحال حل کرنا ہے اور پوری طرح سے حل کرنا ہے
یہ کام ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کا ہے ان میں فیصلہ کن انداز سے اپنا رخ اس طرف سے
دوسری طرف موڑنا ہوگا ان کو مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کی صفوں میں جانا پڑے گا ان کی عملی جدوجہد
میں شریک ہونا پڑے گا۔ مارکسزم لینینزم پر عبور حاصل کرنے اور سماجی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کو
عوام کے ہمراہ چلنا پڑے گا۔ مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے ادب و فن کی تخلیق کا صرف یہی ایک
طریقہ ہے۔

قارئین کا مسئلہ بنیادی اور اصلی مسئلہ ہے اور ہمارے بہت سے رفیقوں میں اختلاف اتنا
اور بحث و مباحثہ اس اصولی مسئلہ پر نہیں ہے بلکہ بعض ایسے دوسرے مسائل پر ہے جن کی اہمیت
نسبتاً کم ہے اس بنیادی اصول پر ان میں آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے کیونکہ دونوں طرف کے
بحث کرنے والوں نے مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے لئے ایک قسم کی کراہت کا ایک خاص حد تک
اظہار کیا ہے اور اپنے آپ کو عوام سے علیحدہ رکھنے کا رجحان ظاہر کیا ہے میں نے خاص حد

جو کہا ہے اس سے میری مراد کومن تانگ گروپ کی علیحدگی پسندانہ سرگرمیاں ہیں۔ بہرحال یہ رجحان پایا ضرور جاتا ہے اور جب تک اس بنیادی مسئلے کو حل نہیں کر لیا جاتا ہمارے دوسرے مسائل بھی آسانی سے حل نہیں ہو سکتے۔

ہمارے ادب و فن میں گروہ بندی کا مسئلہ بھی ایک بنیادی اور اصولی مسئلہ بن گیا ہے۔ اگر ہم اس گروہ بندی کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مزدوروں، کسانوں، آٹھویں روٹ اور نئی چوتھی فوج کے لئے کام کرنے اور عوام میں جانے کا نعرہ بلند کرنا چاہیئے۔ اس پالیسی پر عمل کرنے ہی سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں ورنہ اس گروہ بندی کے سوال کو کبھی حل نہ کر سکیں گے

لوہسون نے کہا ہے کہ انقلابی تہذیبی محاذ میں پھوٹ مشترکہ مقصد سامنے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مشترکہ مقصد عوام کے لئے کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ خاص طور پر شنگھائی اور اس وقت کے پیکنگ میں ہر جگہ موجود ہے۔ بعض جگہ اس کو حل کرنا زیادہ مشکل ہے کیونکہ وہاں انقلابی ادیبوں اور فن کاروں کو دبایا جاتا ہے نتیجہ کے طور پر انھیں عوام میں جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ ہمارے علاقوں میں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ ہم انقلابی ادیبوں اور فن کاروں کو مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کی صفوں میں جانے، ان لوگوں سے ملنے اور صحیح ادب و فن پیدا کرنے کی پوری آزادی دیتے ہیں اس لئے یہ مسئلہ ہمارے علاقوں میں حل ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حل ہو چکا ہے۔

مارکسزم لینینزم پر عبور اور سماج کا مطالعہ اس کو حل کرنے میں مدد دے گا۔ مارکسزم لینینزم سے ہماری مراد وہی مارکسزم لینینزم نہیں جو کتابوں کی بڑی بڑی جلد وں میں محفوظ ہے بلکہ وہ زندہ مارکسزم اور لینینزم ہے جسے عوام کی زندگی اور ان کی جدوجہد پر لاگو کیا جا سکے۔

اگر ہم مارکسزم لینینزم کو کتابوں سے نکال کر لوگوں تک پہنچا سکیں اور اس طرح اسے جاندار مارکسزم اور لینینزم میں تبدیل کر دیں تو ہم میں کوئی تفریق باقی نہ رہے گی اور اس طرح نہ صرف تفریق پرستی کا مسئلہ بلکہ ہمارے دوسرے تمام مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔

(۲)

پبلک کا مسئلہ طے کرنے کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ہم عوام کے لئے کیسے کام

کرسکتے ہیں؟ ہمارے رفقاء کے نقطۂ نظر سے اس چیز کا عوام کی تعلیم یا ان کے تہذیبی معیار کو بلند کرنا ہے۔ اس سے پہلے ہمارے بعض رفیقوں نے عوام کی تعلیم کے کام سے بے پروائی برتی ہے اور ان کا معیار بلند کرنے کی ضرورت پر زیادہ زور دیا ہے معیار بلند کرنے کی کوشش تو ہمیں یقیناً کرنا چاہیئے لیکن اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔

جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو اس کا واضح حل سامنے نہ ہونے کی صورت میں پبلک کا مسئلہ پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم واضح طور پر یہ نہیں سمجھتے کہ ہم کس کے لئے کام کرتے ہیں تو پھر معیار بلند کرنے یا پروپیگنڈا کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ اس طرح تو ان دونوں چیزوں میں صحیح رشتہ قائم کرنا بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

چونکہ ہمارا ادب و فن مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہماری تعلیمی مہم بھی انہی کے اندر ہونی چاہیئے اور معیار بلند کرنے کا مطلب ان کے معیار بلند کرنے سے ہی ہونا چاہیئے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں ان کی صفوں میں جا کر کس چیز کا پروپیگنڈا کرنا ہے؟ جاگیرداری نظریوں کا، بورژوائی نظریوں کا؟ یا متوسط طبقے کے نظریات کا؟ ان میں سے کسی کا نہیں بلکہ ہمیں تو یقینی طور پر مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے نظریوں کی تبلیغ کرنا ہوگی اس لئے مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کے نظریوں کی تبلیغ کرنے سے پہلے ہمیں ان کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

معیار بلند کرنے کے معاملہ میں بھی بالکل یہی چیز سامنے آتی ہے عمارت بلند کرنے کے لئے ایک خاص بنیاد کی ضرورت ہے پانی کی ایک بالٹی کی مثال لیجیئے اس بالٹی کو آپ اس وقت تک ہوا میں نہیں اٹھا سکتے جب تک آپ اسے زمین سے اوپر نہ اٹھائیں اسی طرح اگر ہمیں ادب و فن کا معیار بلند کرنا ہے تو یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ معیار بلند کرنے کے لئے ہم کس بنیاد سے کام شروع کریں۔ کیا جاگیرداری بورژوائی یا پھر متوسط طبقے کی بنیاد سے؟ ان میں سے کسی بھی بنیاد سے یہ کام شروع نہیں ہوگا بلکہ یہ شروع ہوگا مزدوروں سپاہیوں اور کسانوں کے موجودہ تہذیبی معیار اور ان کے ادب و فن کی قدیم صورتوں کی بنیاد سے ہم ان کے تہذیبی معیار کو جاگیرداری، بورژوائی یا متوسط طبقے کے معیار تک لانے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ ہم اپنی ترقی کے راستے پر ان کی مدد کریں گے۔ اس طرح ہمارا کام یہ ہے کہ ہم مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کا مطالعہ کریں اس نکتہ کو سمجھنے ہی سے ہم پبلک تعلیم

اور معیار بلند کرنے کے مسائل کو سمجھ سکتے ہیں اور اس صورت سے ان کے باہمی رشتوں کی صحیح نوعیت بھی معلوم کر سکتے ہیں لیکن ہم ان کی تعلیم کے لئے کام کریں یا معیار بلند کرنے کے لئے ہمیں ہر صورت میں ان کے لئے ایک سرچشمہ ڈھونڈنا ہوگا۔ ادب و فن کے شہ پارے خواہ وہ کسی سطح پر ہوں انسانی دماغ کی قیمتی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ان میں عوام کی زندگی عکس پذیر ہے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ انقلابی ادب و فن عوام کی زندگی کی تصویر کشی ہے اور یہ ان کی زندگی کی وہ تصویریں ہیں جو انقلابی ادیبوں اور فن کاروں کے دماغ میں ڈھلیں ——— ادب و فن کے لئے عوام کی زندگی خام مواد کا زبردست سرچشمہ ہے یہ خام مواد ہے تو اپنی فطری اور ناتراشیدہ حالت میں لیکن یہ ایک زندہ بھرپور اور بنیادی چیز ہے اور اس خام مواد کے سامنے تصنع آمیز ادب بہت معمولی اور گھٹیا معلوم ہوتا ہے۔

عوام کی زندگی ہی ادب و فن کا ایسا سرچشمہ ہے جو تخلیقی ادب و فن کے لئے کبھی نہ ختم ہونیوالا مواد مہیا کرتا ہے اور چونکہ یہی ایک سرچشمہ ہے لہٰذا ادب و فن کے لئے اور کوئی منبع ہو ہی نہیں سکتا

بعض لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کیا ادب و فن کی پرانی مطبوعہ کتابیں، کلاسیکی ادب اور غیر ملکی ادب و فن کا سرچشمہ نہیں ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان سے ادب و فن کے لئے مواد تو مہیا ہو سکتا ہے مگر یہ مواد استعمال شدہ اور دوسرے درجہ کا ہوگا اول درجہ کا نہیں اگر آپ اس کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اوپر کی چیزوں کو نیچے رکھ رہے ہیں کتابیں اور دوسری مطبوعہ چیزیں سرچشمہ نہیں ہیں بلکہ سرچشمہ سے نکلنے والے مائع کا بہاؤ ہیں ان کو ہمارے آباؤ اجداد اور دوسرے غیر ملکی ادیبوں اور فن کاروں نے اپنے زمانے کے لوگوں اور اپنے زمانے کے سماج سے انتخاب کر کے یہ شکل دی تھی ہم انھیں استعمال تو کر سکتے ہیں لیکن تھوڑا چوکس ہو کر۔ مثلاً ان کے ادب و فن کی تکنیک ہی کی بات لیجئے اگر ہم اس کے ذریعے اپنے زمانے کے لوگوں کی زندگی پیش کریں تو یہ درست نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس زمانے کی مثالوں کو استعمال کریں تو یقینی طور پر اس سے فرق پڑے گا اور یہ مہذب اور غیر مہذب تراشیدہ اور ناتراشیدہ ترقی یافتہ اور ناترقی یافتہ اور تیز رفتاری اور سست روی کا فرق ہوگا یہ تو ظاہر ہے کہ ہم قدما اور غیر ملکی لکھنے والوں کی مثالیں استعمال کرنے سے انکار نہیں کر سکتے خواہ ان کا تعلق جاگیرداری اور بورژوا طبقوں سے کیوں نہ ہو لیکن ان کی اہمیت مثالوں سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے

کیونکہ اس مواد کو عوام کی زندگی کا بدل تو یقینی طور پر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کلاسیکی ادب اور غیر ملکی ادب
وفن کو بغیر تنقید کی کسوٹی پر پرکھے یا انھیں اصل مواد کا بدل سمجھنے سے قومی سیاسی، فلسفیانہ
اقتصادی معاملات کی طرح ادب وفن میں بھی نہایت بڑا اور نقصان دہ انتشار پیدا ہو جائے گا
لہٰذا ہمیں گے انقلابی اور صحیح معنوں میں سچے دار ادیبوں اور فنکاروں کو عوام کے درمیان جانا
چاہیے۔ انھیں عوام کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر اور پورے دل کے ساتھ وقف
کرنا چاہیے اور خاص لمبی مدت تک ان کے درمیان رہنا چاہیے۔ انھیں جدوجہد کے بھڑکتے ہوئے
شعلوں میں عوام کا ساتھ دینا چاہیے اور انھیں موجودہ اور کبھی نہ ختم ہونے والے اس سرچشمہ کے
ذریعہ اکر ہی تحقیق مشاہدہ اور مطالعہ کرنا چاہیے۔ مختلف شخصیتوں مختلف طبقوں مختلف سماجی
گروہوں اور زندگی اور جدوجہد کی مختلف شکلوں کا تجزیہ کرنا چاہیے کیونکہ ادب وفن کا فطری مواد
یہی چیزیں ہیں صرف اسی صورت میں وہ تخلیقی اور تعمیری کام شروع کر سکتے ہیں اور [illegible] وہ خام
مواد کو اپنے تعمیری کام میں صرف کر سکیں گے اگر وہ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے تو
اپنے مقصد سے پیچھے ہٹ جائیں گے کیونکہ خام اور ناتراشیدہ مواد کے بغیر ایسے کوئی چیز تخلیق کی
[illegible] سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ خالی دماغ ادیب اور فنکار ہوں گے جن کے خلاف یہ [illegible]
[illegible] میں اپنے بیٹے [illegible] کی قوت سے ہوشیار رہنے کے لئے کہا تھا۔ ادب وفن کے لئے صرف
[illegible] خام مواد مہیا کرتی ہے۔
[illegible] اور زندہ لینن یقینی طور پر کسی ناول ڈرامے یا فلم کے لینن سے زیادہ جوشیلا اور دلچسپ
[illegible] زندہ لینن کو صبح سے شام تک ہمارے سکھانے کے لئے بہت کام کرنے پڑتے تھے ان میں سے
[illegible] سے بھی تھے جو دوسرے لوگوں کے کاموں سے مختلف نہیں تھے اس کے علاوہ لینن سے جب
[illegible] سے ملنے کا موقع بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوا اور اب جب وہ زندہ نہیں ہے تو اسے
[illegible] ہی نہیں سکتا۔ ثابت ہوا کہ ناول ڈرامے یا فلم کے لینن کو زندہ اور گوشت پوست کے
[illegible] طرح سے فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان میں لینن ہمیشہ رہے گا۔
[illegible] کی رفتار کو آگے بڑھانے اور لوگوں کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے انقلابی ناولوں ڈراموں
[illegible] قسم کے کردار تخلیق کئے جا سکتے ہیں جو زندگی سے لئے گئے ہوں۔ مثال کے طور

بے شمار ایسے آدمی ہیں جو بھوکوں مرتے ہیں اور ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے بھی آدمی ہیں جو اپنے ساتھ کے دوسرے آدمیوں کو لوٹتے کھسوٹتے انسان پر ظلم کرتے ہیں یہ واقعات اتنے عام ہیں کہ لوگوں نے ان کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے اب یہ کام ادب و فن کا ہے کہ وہ روزانہ زندگی کے ان مسایل کی منظم اور باقاعدہ چھان پھٹک کرے۔ ایسا ادب و فن لوگوں کو عمل پر مجبور کر سکتا ہے انھیں جگا سکتا ہے اور ایسی منظم جد و جہد کر سکتا ہے جس کے ذریعہ عوام اپنی قسمت کا فیصلہ خود اپنے ہاتھوں کر سکیں۔ اگر ادب و فن تخلیقی صورت کی بجائے فطرت کی گود میں پڑے رہیں گے تو یہ اپنا مقصد پورا نہیں کر سکیں گے اور اس طرح اگر ہم اپنے مقاصد میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو بھی جائیں تو یہ کامیابی موثر اور تھوڑے عرصہ میں ممکن نہیں ہوگی۔

تعلیمی مقاصد پورا کرنے اور لوگوں کا معیار بلند کرنے والے دونوں ہی قسم کے ادب و فن قابیتی ہیں ان دونوں میں صرف ڈگری کا فرق ہے۔ تعلیمی مقاصد کے پیش نظر تخلیق کئے جانے والے ادب و فن کی نوک پلک درست کرنے پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی جاتی بلکہ اس میں ایک قسم کا اکھڑپن ہوتا ہے اس لئے موجودہ حالات میں اس قسم کا ادب و فن عوام کی بہت بڑی اکثریت کی سمجھ میں نہایت آسانی سے آجاتا ہے معیار بلند کرنے والے ادب و فن کی نوک پلک درست کرنے پر چونکہ زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے اس لئے ایسا ادب و فن موجودہ حالات میں عوام کی اکثریت کے پوری طرح پلے نہیں پڑتا۔

موجودہ حالات میں ایسے وقت میں جب کہ انھیں پوری تندہی سے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے سامنے فوری اور اہم ترین مسئلہ تعلیم کی کمی کو دور کرنے کا ہے کافی لمبے عرصہ کے جاگیرداری اور بورژوائی تسلط کے نتیجے کے طور پر وہ غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب ہیں ــــــ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان کے لئے ایسی تہذیبی تحریک شروع کی جائے جس میں ایک قسم کی تہذیبی تعلیم اور ایسی ادبی اور فنی کاوشیں شامل ہوں جو ان کی فوری ضروریات کو پورا کر سکیں اور جنھیں وہ آسانی سے سمجھ بھی سکیں ایسی تحریک سے جد و جہد میں ان کا حوصلہ بلند ہوگا اور اپنی آخری فتح میں ان کا اعتماد بھی بڑھ جائے گا اس تحریک سے ان میں مضبوط یک جہتی بھی پیدا ہوگی اور وہ ایک دل اور یک جان ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

ان کے لئے ہمارا اولین فرض "کشیدہ کاری" کے پھول میں ایک پھول کا اضافہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ برف پگھلانے کے لئے کوئلہ بھیجنے کا ہے اس لئے ان کا معیار بلند کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے ہمارا پہلا اور اہم ترین کام ان کو تعلیم دینا ہے تعلیم کے کام کو نظر انداز کرنا ہماری بہت بھاری غلطی ہوگی۔

بہرحال تعلیم دینے اور تہذیبی معیار بلند کرنے کے کاموں میں کوئی فیصلہ کن خط نہیں کھینچ سکتے اگر تعلیم دینے کا کام کرنے والوں کا تہذیبی معیار اپنے پڑھنے والوں کے مقابلے پر بلند نہیں ہوگا تو تعلیمی مہم بالکل بے معنی ہوگی۔ اگر تعلیمی مہم مہینوں اور سالوں تک مستقلاً ایک ہی معیار پر رہے اور زندہ دیا دیہ "چھوٹے گڈریئے"[5] کی سطح سے آگے نہ بڑھے یا پھر چاؤ تو "آدمی، ہاتھ، منہ اور بکری"[6] کی سطح تک ہی رہ جائے تو ظاہر ہے کہ تعلیم دینے اور تعلیم حاصل کرنے والے دونوں ایک ہی سطح پر رہیں گے اور اس تعلیم کی کوئی خصوصیت نہ ہوگی۔ لوگ تعلیم حاصل کرنا تو چاہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنا معیار بھی بلند کرنا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کا معیار ماہ بماہ اور سال بسال بلند ہوتا رہے۔ لوگوں کو جب تعلیم دی جاتی ہے تو ان کا تہذیبی معیار بھی بلند ہوتا ہے اور یہ چیز دور دراز سے سب کرکے وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اس بنیاد پر ہوتی ہے جس بنیاد کو تعلیمی کام نے متعین کیا ہوتا ہے تعلیم کے ذریعے سے لوگوں کا معیار ہی بلند نہیں ہوتا بلکہ اس دوران میں تعلیمی کام کو جو رخ اختیار کرنا ہوتا ہے اس کا تعین بھی ہو جاتا ہے

چین میں ——— انقلاب اور انقلابی تہذیب نے ایک دم سے ترقی نہیں کی بلکہ یہ کام درجہ بدرجہ پھیلتا رہا ہے۔ بعض مقامات پر تعلیمی کام ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ لوگوں کا معیار بھی اونچا ہو رہا ہے۔ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں تعلیمی کام ابھی شروع تک نہیں ہوا اس لئے ہمیں اس خاص کام کے تجربہ کو جو کسی ایک جگہ پر حاصل ہوا ہو دوسرے مقامات پر بھی لاگو کر لینا چاہیئے تاکہ اس کی مدد سے ہم راستے میں گمراہ ہونے سے بچ رہیں۔ اسی طرح تعلیمی معیار بلند کرنے کے کام میں سوویت یونین کے بہت سے تجربات ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ معیار بلند کرنے کا کام تعلیم کی بنیاد پر ہوتا ہے اور تعلیم معیار بلند کرنے کے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہونی چاہیئے لیکن ہمیں معیار بلند کرنے کے اہم ترین کام کو جو اس سارے کام کی اصل بنیاد ہے بالکل ہی دوسروں کے تجربات پر نہیں چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ اس سے صرف تخریبی نتائج برآمد ہوں گے

---

[5] شانسی کا عوامی ڈرامہ ہے جس میں ایک گڈریئے کے رومان کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور جو آج سے سینکڑوں سال پہلے لکھا گیا تھا

[6] ... کے قاعدے کے صفحہ اول کا سبق ہے۔

عوام کے معیار کو بلند کرنے کا کام براہ راست ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ بالواسطہ یعنی کارکنوں کا معیار بلند کرنے سے بھی ان کا معیار بلند ہوتا ہے۔ کارکن عوام کا سب سے ترقی یافتہ حصہ ہیں وہ اس قسم کی تعلیم پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں جو ہم اب عوام کو دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور چونکہ وہ زیادہ ترقی یافتہ لوگ ہیں اس لیے عوام کی سطح پر دی جانے والی تعلیم سے ان کی تسلی نہیں ہوتی "ننھے گڈریے" وغیرہ سے بھی وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے لیے ایسا ادب و فن مہیا کیا جائے جو نسبتاً بلند معیار ہو۔ اس نکتہ کو نظر انداز کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ بہرحال موجودہ وقت میں اس قسم کی ضرورت صرف ہمارے کارکنوں ہی کے لیے ہے اور عام طور پر عوام کے لیے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس ضرورت کو پورا کرنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ لیکن یہی ہمارا پروگرام نہیں ہے یہ تو ہمارے موجودہ پروگرام کا کوئی بہت اہم حصہ بھی نہیں ہے ہمیں اس چیز کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اپنے کارکنوں کے لیے جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی عوام کے مفاد ہی کے لیے ہوتا ہے صرف اسی صورت میں کارکن عوام کی تعلیم اور ان کی رہنمائی کا کام کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس اصول کو توڑیں اور عوام کی تعلیم اور ان کی رہنمائی میں کارکنوں سے مدد نہ لیں تو پھر ہمارا معیار بلند کرنے کا کام نشانہ کئے بغیر تیر کو چھوڑ دینے کی طرح بے مقصد ہوگا اور یہ چیز عوام کے لیے کام کرنے کے معاملہ میں ہمارے بنیادی اصول سے دور ہوگی۔ مختصراً ہم دیکھتے ہیں کہ ادب و فن کے اس خام مواد کو جو عوام کی زندگی سے ملتا ہے، ہمارے انقلابی ادیب اور فن کار کانٹ چھانٹ کر کے عوام کے لیے تخلیقی ادب و فن بنا لیتے ہیں اس ادب و فن کا ایک حصہ کافی حد تک بلند معیار ہوتا ہے کیونکہ عوامی ادب و فن نسبتاً کم معیاری ادب و فن سے آگے بڑھا ہوا ہوتا ہے اور یہ ان لوگوں کے کام آتا ہے جو تھوڑی سی ترقی کر چکے ہوتے ہیں خاص طور پر کارکن قسم کے لوگ جو عوام کے درمیان کام کر رہے ہوتے ہیں اور نچلے درجہ کا عوامی ادب و فن، کم معیاری ادب و فن کی عوام کی اکثریت کی ضرورتوں کے مطابق رہنمائی کرتا ہے بہرحال ہمارا ادب و فن بہت بلند معیار ہو یا کم معیار ہو اس کا مقصد ہر حالت میں عوام اور خصوصیت کے ساتھ مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کی خدمت کرنا ہوتا ہے ہمارا ادب و فن عوام کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سے استفادہ کریں چونکہ ہم معیار بلند کرنے اور تعلیم کے باہمی رشتوں کا مسئلہ حل کر چکے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اب ہم ایک طرف ادیبوں اور فن کاروں اور دوسری طرف تعلیم دینے والوں کے باہمی رشتوں کے مسئلہ کو بھی حل کریں۔

ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کا مقصد عوام کے لئے کام کرنا ہے نہ کہ صرف کارکنوں کے لئے
میکسم گورکی نے فیکٹریوں کی تاریخ مرتب کی دیہاتی اخباروں کے نامہ نگاروں کے دستوں کی راہنمائی
اور نوجوانوں کو بہت کچھ سکھلایا۔ اسی طرح لوسون نے بھی نوجوان طالب علموں سے خط وکتابت
کرنے میں کافی وقت گزارا۔

ہمارے ادبی ماہروں کو لوگوں کے دیواری اخباروں اور فوجی اور دیہاتی علاقوں میں چھوٹے
چھوٹے تھیٹریکل گروپوں پر توجہ صرف کرنی چاہیئے اسی طرح میوزک کے ماہروں کو عوامی سنگیت
اور فن کے ماہروں کو عوامی فن پر پوری توجہ دینی چاہیئے ان تمام ماہروں کو ہمارے ان رفیقوں کے
ساتھ بہت قریبی رابطہ رکھنا چاہیئے جو عوام میں کم معیار ادب وفن کی ترویج اور پروپیگنڈا کا کام کر رہے
ہیں ان ماہروں کو ان رفیقوں کی مدد اور راہ نمائی ہی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ساتھ ساتھ انہیں ان
سے کچھ سیکھنا اور ان سے عوام کے متعلق مواد بھی فراہم کرنا چاہیئے۔ تاکہ ان کے تجربات میں اضافہ ہو
اور وہ خود بھی ترقی کرتے رہیں اس صورت میں ان کا یہ کام ہاتھی دانت کے گنبد میں بیٹھنے والوں کی
طرح عوام اور حقیقت سے ہٹا ہوا نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ موضوع اور قوت سے محروم ہوگا۔

ہمیں ان ماہروں کی عزت کرنی چاہیئے کیونکہ ان کا کام ہمارے لئے فائدہ مند ہے لیکن ہمیں
ان کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتے رہنا چاہیئے کہ انقلابی ادیب اور فن کار صرف اسی صورت میں بڑے کارنامے سرانجام
دے سکتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو عوام کے ساتھ شامل سمجھیں جب وہ عوام کے خیالات اور احساسات کو اظہار
بخشیں اور جب وہ صحیح معنوں میں عوام کی نمائندگی کریں۔ عوام کی نمائندگی کرکے ہی آپ ان کی تعلیم کا کام
کرسکتے ہیں اور ان کے شاگرد بن کر ہی آپ انہیں کچھ سکھلا سکتے ہیں اگر آپ اپنے آپ کو عوام کے مالک اور
اس چھوٹی مخلوق سے بالا سمجھیں گے تو ان کے لئے آپ کسی صورت میں بھی مفید نہ ہو سکیں گے اور خواہ آپکی
ذہانت اور آپ کا کام کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اس کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ کیا اس صورت حال کو کسی طرح
بھی مفید کہا جا سکتا ہے؟

مادہ پر یقین رکھنے والے افادیت کی مخالفت نہیں کرتے لیکن وہ جاگیرداری' بورژائی اور
درمیانے طبقے کی افادیت کی سخت مخالفت کرتے ہیں وہ ان سبھی لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو زبان
سے تو افادیت کی مخالفت کرتے ہیں مگر دل سے بہت خود غرض اور کم نظر افادیت پرست ہوتے ہیں۔

طبقاتی مفادات سے بالا کسی افادیت کا وجود نہیں ہے طبقاتی سماج میں افادیت ایک طبقے کی ہو سکتی ہے یا دوسرے کی۔ ہم پرولتاریہ کے انقلابی افادہ پرست ہیں۔ ہمارا ابتدائی کام یہ ہے کہ ہم عوام یعنی چینی آبادی کے نوّے فیصد حصے کے موجودہ اور آئندہ کے مفادات کا تعین اور حفاظت کریں اس لئے ہماری انقلابی افادیت کا مقصد بہت وسیع اور دیرطلب ہے ہم ایسے افادہ پرست نہیں ہیں جو صرف فوری ضرورتوں کے ایک حصے سے تعلق رکھتے ہوں۔

ایک ایسے فن پارے کے متعلق غور کیجئے جو صرف مصنف اس کے بعض دوستوں اور اس کے قریبی حلقے کے بعض عام لوگوں کے پلے پڑتا ہو اور وہی اس کی تعریف بھی کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے عوام کو اس فن پارے کی ضرورت نہ ہو یا ہو سکتا ہے کہ یہ عوام کے لئے نقصان دہ بھی ہو۔ لیکن اگر مصنف اسے زبردستی پبلک پر مسلط کرتا ہے یا اپنے اور اپنے چھوٹے گروپ کے مفاد کے لئے اس کا پروپیگنڈا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو افادیت سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ بھی دیتا ہے تو وہ نہ صرف عوام کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ بلاشبہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اسے اپنے متعلق بھی کچھ صحیح اندازہ نہیں ہے۔

جو چیز بھی عوام کی بڑی اکثریت کے لئے سودمند ہوگی۔ ظاہر ہے ہم اسی کو بہتر سمجھیں گے۔ آپ کا ادب پارہ۔ "یانگ چوٗن پائی زبہہ" کی طرح کا بھی ہو سکتا ہے جس سے صرف اشرافیہ ہی محظوظ ہو سکیں ایسی صورت میں جب کہ عوام "زیالی یاچین" گا رہے ہوں۔ اگر آپ عوام کا تہذیبی معیار بلند کرنے کے لئے تو کچھ کرتے نہیں بلکہ انھیں ان کی جہالت کا طعنہ دیتے ہیں تو آپ خطرناک قسم کی تنقید میں پڑ گئے ہیں

ہمارا کام اپنی تعلیم اور تہذیبی معیار بلند کرنے کے کام میں یک جہتی پیدا کرنا ہے اس یک جہتی کے بغیر اونچے معیار پر پیدا کئے جانے والا ادب وفن آخر کار بہت محدود افادیت کا شکار ہو جائے گا اور آپ لاکھ یہ دعویٰ کریں کہ آپ کی تخلیقات خالص اور اعلیٰ قسم کی ہیں لیکن حقیقت میں یہ بات خودستائی پر مبنی ہوگی اور عوام اسے ہرگز قبول نہیں کریں گے۔

لہ۔ ہزار سال پہلے لکھا ہوا ایک گیت جس میں موسم بہار کی برف کا منظر پیش کیا گیا ہے۔
کہ اتنا ہی پہانا ایک لوک گیت جو نیچے کے گاؤں میں رہنے والے زی چو آن کے ایک آدمی کے متعلق ہے۔

بنیادی پالیسی اور مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے لیے کام کرنے کے طریقے کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے اپنی پوزیشن، اپنے رویئے، پبلک، موضوع، روشن اور تاریک پہلو پیش کرنے، اتحاد برقرار رکھنے اور ادب کے مسائل بھی حل کر لیے ہیں۔

اگر ہم اس بنیادی پالیسی سے متفق ہیں تو ہمارے تہذیبی کارکنوں، ہماری ادبی اور فنی درسگاہوں، مطبوعات، تہذیبی اداروں اور ادب و فن کے میدان میں کام کرنے والے تمام کارکنوں کو یہ پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔ اس پالیسی سے انحراف سخت خطرناک ہوگا۔

(۳)

یہ تو طے ہوگیا کہ ادب عوام کے لئے ہونا چاہیئے اب ہم ایک قدم آگے بڑھ کر (۱) پارٹی کے ادب اور پارٹی کے مجموعی کام کے مسئلے پر غور کرسکتے ہیں اور (۲) اور ان لوگوں کے مسائل پر بھی غور کرسکتے ہیں جو پارٹی سے باہر ہیں یعنی پارٹی کے ادیبوں اور پارٹی کے باہر کے ادیبوں یعنی دوسرے لفظوں میں ادب و فن کے متحدہ محاذ کے مسائل پر غور کرسکتے ہیں۔

آیئے سب سے پہلے اول الذکر مسئلے پر غور کریں۔ دور حاضرہ کا کلچر اور ادب کسی نہ کسی طبقے، جماعت یا سیاسی نظریے سے منسلک ہے آج ادب برائے ادب کوئی چیز نہیں اور کسی قسم کا ادب و فن طبقات سے بے نیاز یا ایک طرف مفاد سے بلند نہیں ہے آج کوئی ایسا ادب موجود نہیں ہے جو سیاست کے متوازی ہو یا سیاسیات سے آزاد ہو۔

موجودہ سماج میں طبقات اور جماعتیں موجود ہیں، اس لئے ادب بھی کسی نہ کسی طبقے یا جماعت سے وابستہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب کوئی نہ کوئی سیاسی مقصد بجا لاتا ہے ساتھ ہی وہ ایک مخصوص انقلابی دور میں انقلابی ادب بھی پیدا کرتا ہے۔ جب ادب اور فن اس اصول سے انحراف کرتے ہیں تو ادیب عوام کے بنیادی مسائل سے ہٹ جاتے ہیں۔

پرولتاری طبقے کا ادب، مکمل مزدور طبقے کے انقلابی پروگرام کا ایک جزو ہے۔ لینن کے قول کے مطابق "وہ ایک مشین کا پرزہ ہے" اس لئے پارٹی کے ادب و فن کے رول کا تعین پارٹی کے مجموعی انقلابی پروگرام کے ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے اس اصول سے ہٹنے کا نتیجہ دوغلا پن اور غیر وحدت فکر کی صورت میں عیاں ہوتا ہے اور بالآخر ٹراٹسکی کے ایسے خیالات کا ترجمان بن جاتا ہے یعنی

یا کسی خیالات اور اونچے طبقے کا ادب۔

ہم ادب کی غیر ضروری اہمیت جتانے کے حامی نہیں۔ لیکن ہمیں اس کی اہمیت کو کم کر کے بھی نہیں دکھانا چاہیئے۔ ادب اور فن یقیناً سیاست کے تابع ہیں لیکن وہ سیاسیات پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ انقلابی ادب اور آرٹ یقیناً انقلابی پروگرام کا جزو ہیں وہ مذکورہ بالا مشین کا پرزہ ہیں۔ چاہے ان کی اہمیت کم یا زیادہ اور مشین کے دوسرے پرزوں کے مقابلے میں وہ ابتدائی اور ضمنی حیثیت رکھتے ہوں لیکن بہر حال وہ مشین کا ایک لازمی جزو ہیں۔ وہ ساری انقلابی تحریک کا ایک ناگزیر حصہ ہیں۔ اگر ہمارے پاس ادب و فن نہ ہو، چاہے وہ عام قسم کا ہی کیوں نہ ہو تو ہم انقلابی مہم چلانے اور فتح حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہونا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ادب اور آرٹ سیاسیات کے تابع ہیں تو ہمارا مطلب طبقاتی اور عوامی سیاست سے ہوتا ہے نہ کہ چند گنے چنے سیاست والوں کی سیاست سے۔ سیاست چاہے وہ انقلابی ہو یا انقلاب دشمن، وہ مخالف طبقوں کی جدوجہد کی ترجمان ہوتی ہے اور چند الگ تھلگ افراد کا طرزِ عمل نہیں۔ نظریاتی جنگ اور ادب و فن کی جنگ خصوصاً انقلابی جدوجہد اور انقلابی ادب کی لڑائی سیاسی جنگ کی تابع ہونی چاہیئے۔ کیونکہ عوام کی ضروریات صرف سیاسیات ہی میں پوری طرح بیان کی جاسکتی ہیں۔ انقلابی سیاست کے ماہرین جنہوں نے انقلابی سیاسیات کی سائنس یا فن میں مہارت حاصل کر لی ہو وہ محض عوام کے ان لاکھوں سیاسی ماہرین کے رہنما ہوتے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ سیاسی ماہرین کے خیالات کو مجتمع کر کے انہیں عوام تک پہنچائیں اور پھر انہیں عمل میں لائیں۔ انہیں سرمایہ دار سیاست والوں کی طرح نہیں ہونا چاہیئے جو ایک بند کمرے میں اپنی سیاست کے تانے بانے بنتے ہیں۔ اپنے آپ کو علم و دانش کا منبع تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا میں کسی مخصوص شے کے اجارہ دار ہیں۔ پرولتاری سیاست اور سرمایہ دار طبقے کی سیاست میں یہ بنیادی فرق ہے۔ اس تفاوت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اسی طرح پرولتاری سیاسی ماہرین کو تنگ نظر اور اوچھا سمجھنا بھی غلطی ہے۔

آیئے ہم ادب اور فن کے متحدہ محاذ کے مسائل پر غور کریں۔

یہ تو طے ہو چکا کہ ادب اور آرٹ سیاست کے تابع ہیں اس وقت چینی سیاست کا سب سے

اہم مسئلہ جاپانیوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہے اس لئے پارٹی کے ادیب کارکنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ باہر کے ادیبوں سے مل کر جاپان دشمن متحدہ محاذ قائم کریں۔ اس محاذ میں پارٹی کے ہمدرد متوسط طبقے کے ادیبوں سے لے کر سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کے ادیبوں تک شامل ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ہمیں جمہوریت کے مسئلے پر بھی متحد ہونا چاہیئے۔

متذکرہ بالا محاذ میں شریک ہونے والے بعض ادیب اس مسئلے پر ہمارا ساتھ نہیں دیں گے اس لئے یہ اتحاد قدرے محدود ہو گا اس کے علاوہ ہمیں ادیبوں اور فن کاروں کے مسائل پر بھی اتحاد قائم کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر اس متحدہ محاذ میں محض اتحاد یا محض جدوجہد رہی تو یہ ایک غلطی ہو گی۔ ماضی میں چند رفیق اس غلطی کے مرتکب ہو چکے ہیں مثلاً دائیں بازو کی مصالحت پسندی اور تقلید یا بائیں بازو کی تنگ نظری اور علیحدگی — لینن نے اسے بے ڈھنگی پالیسی کا نام دیا تھا۔ یہ قومی سیاسیات کی طرح ادب اور فن پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

متوسط طبقے کے ادیب اور فنکار ادب اور فن کے متحدہ محاذ کا ایک اہم حصہ ہیں وہ سوچنے اور لکھنے میں یقیناً بہت سی کمزوریوں کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن دوسرے طبقوں کے مقابلے میں انقلاب کے زیادہ ہمدرد اور مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں ہمیں ان کی کمزوریاں دور کرنے میں ان کی مدد کرنی چاہیئے اور ان سے مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے لئے لکھوانے کی کوشش کرنی چاہیئے یہ امور خاص طور سے اہم ہیں۔

(۴)

ادب و فن کے حلقوں میں جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لئے تنقید ایک بہت بڑا حربہ ہے۔ بہت سے ساتھیوں نے یہ درست کہا ہے کہ اس معاملے میں ہمارا پچھلا ادب بہت حد تک خام ہے۔ ادب و فن کی تنقید ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کا الگ جائزہ لینا چاہیئے لیکن میں یہاں صرف تنقید کے بنیادی اصولوں کا ذکر کروں گا ساتھ ہی میں ان مسائل پر بھی بحث کروں گا جو بعض ساتھیوں نے پیش کئے ہیں اور ان غلط نظریات کا بھی ذکر کروں گا جن کے بعض ساتھی مرتکب ہوئے ہیں۔

ادب و فن کی تنقید کے دو معیار ہیں ایک سیاسی اور دوسرا ادبی سب سے پہلے سیاسی معیار کو لیجئے سیاسی معیار کے مطابق وہ تخلیقات بہتر یا نسبتاً بہتر ہیں جو دفاعی جنگ میں ہماری مدد کرتی ہیں اور عوام کو

متحد کرنے کی ترغیب دیتی ہیں جو رجعت پسندی کے خلاف ہیں اور ترقی میں ممد ثابت ہوتی ہیں اس کے برعکس وہ ادب برا یا نسبتاً برا ہے جو عوام میں افتراق اور انتشار پیدا کرتا ہے، ترقی کی راہ روکتا ہے اور عوام کو پیچھے ہٹاتا ہے۔

آیا ہم اچھے یا برے کا معیار (نیت داخلی یا شعوری میلانات) کو ٹھہرائیں یا اس کے اثرات سماج میں اس کے ردعمل، کو معیار بنائیں تصور پرست نیت پر زور دیں گے لیکن میکانکی مادہ پرست اثرات کو بنیاد ٹھہرائیں گے مگر ہم ان دونوں کے خلاف ہیں۔ ہم جدلیاتی مادہ پرست ہیں اور ہم نیت اور افعال دونوں پر زور دیتے ہیں عوام کے لئے کام کرنے کی نیت کو عوام پر اس کے اثرات سے جدا نہیں کیا جاسکتا نیت اور اثرات کا امتزاج لازمی ہے۔ البتہ ذاتی مفاد یا ایک محدود گروہ کے مفاد کی نیت مکروہ ہے دوسری طرف عوام کے لئے کام کرنے کی نیت محض بے معنی ہے اگر وہ عوام پر اثر نہیں ڈالتی وہ عوام اس کا خیر مقدم نہیں کرتے اور وہ عوام کی بھلائی کے کام نہیں آتی جب ہم کسی ادیب کی نیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس کے لئے محض اس کے اپنے قول پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہم سماج اور عوام پر اس کی تخلیقات کا اثر دیکھتے ہیں نیت کی کسوٹی سماج پر اس کے اثرات ہیں اور داخلی خواہشات یا اعلانات کا معیار وہ تخلیقات ہیں جو ایک ادیب پیش کرتا ہے۔

ہماری تنقید میں کسی طرح بھی تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیئے تنقید کرتے وقت ہمیں داخلی جنگ اور قومی اتحاد کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے اور اس لئے ہمیں مختلف قسم کے سیاسی نظریات کے حامل ادب کو بھی برداشت کرنا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے اصولوں اور اپنی حیثیت پر ڈٹا رہنا چاہیئے اور ہر اس ادب پر کڑی نکتہ چینی کرنی چاہیئے جو قومی اور اشتراکی مفادات کے لئے نقصان دہ ہو کیونکہ اس نوعیت کا نام نہاد ادب ہماری جنگ آزادی کے لئے ضرر رساں ہے اور ہمارے قومی اتحاد کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔

ادبی معیار کے مطابق وہ تمام ادب بہتر یا نسبتاً برا ہے جو اعلیٰ فنی خوبیوں کا حامل ہے۔ اسی طرح وہ ادب برا یا نسبتاً برا ہے جس میں فنی خوبیاں موجود نہ ہوں لیکن اس اصول کا اطلاق بھی سماج پر اس ادب کے اثرات سے کیا جاتا ہے ہمارے ہاں بہت کم ایسے ادیب ہوں گے جو اپنی تخلیقات کو بہترین تصور نہیں کرتے۔

ہمیں مختلف اقسام اور مختلف نظریات کے ادب کو کھلے مقابلے کی اجازت دینی چاہیئے ساتھ ہی ہمیں ادب پر سائنٹیفک اور فنی نقطہ نظر سے تنقید کرنی چاہیئے تاکہ نچلے درجہ کا ادب بلند ہو سکے۔ اور اس ادب میں تبدیلی کرنے کی کوشش بھی کرتے رہنا چاہیئے جو عوام کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا تاکہ وہ عوام کی ضروریات کے مطابق ہو جائے (چاہے فنی لحاظ سے یہ ادب کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو)

اب ہم پر یہ واضح ہو گیا کہ ادب کے دو معیار ہیں یعنی سیاسی اور ادبی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں صحیح رشتہ کیا ہے؟ سیاسیات بعینہ ادب نہیں ہے تمام بین الاقوامی نقطہ ہائے نظر بھی بیک وقت ادبی تخلیقات کا ذریعہ نہیں۔ ہم صرف ترقی دشمن سیاست ہی کو مسترد نہیں کرتے بلکہ ہم ترقی دشمن ادبی معیاروں کو بھی مسترد کرتے ہیں۔ مختلف طبقات کے سماج میں مختلف سیاسی اور ادبی معیار ہوتے ہیں۔ اس طرح طبقاتی سماج میں ہر ایک طبقہ کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ لیکن ہر طبقاتی سماج اور سماج کے ہر طبقے میں سیاسی معیار کو ادبی معیار پر اولیت حاصل ہے۔

بورژوا طبقہ پرولتاری طبقہ کے ادب کو مسترد کر دیتا ہے خواہ اس میں کتنی ہی فنی خوبیاں کیوں نہ ہوں اس طرح پرولتاری طبقہ کو بھی بورژوا ادب کے رجعت پسندانہ نظریات مسترد کر دینا چاہئیں۔ لیکن اس کی فنی خوبیوں کو بڑی احتیاط سے اپنا لینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ضروری ہے کہ فاشسٹ رجعت پسندانہ ادب اور آرٹ یا فاشسٹ ادب بھی کسی حد تک فنی خوبیوں کا حامل ہو لیکن رجعت پسندانہ ادب جو عوام کے لئے صریحاً نقصان رساں ہو اسے یقیناً مسترد کر دینا چاہیئے۔ لوٹ کھسوٹ کرنے والے تمام طبقوں کے آخری دور کے ادب و فن میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ان کے رجعت پسندانہ سیاسی نظریات اور فنی خوبیوں کا تضاد ہے۔

ہم ادب اور سیاست میں ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ ہم فن اور مواد میں مماثلت کے خواہاں ہیں۔ یعنی ہم انقلابی مواد کے ساتھ اعلیٰ فنی خوبیوں کے حامی ہیں ادب اور فن کی تخلیقات اعلیٰ فنی خوبیوں کے بغیر موثر نہیں ہوتیں چاہے وہ کتنی ہی ترقی پسندانہ کیوں نہ ہوں اس لئے ہم صرف ایسے ادب و فن ہی کی مذمت نہیں کرتے جو رجعت پسندانہ مواد کا حامل ہو بلکہ پوسٹر اور نعرہ بازی کی قسم کے ادب کو بھی مسترد کر دیتے ہیں جس میں مواد کے مقابلے میں فنی اقدار کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے ادب اور فن کے میدان میں یہ وہ معیار ہیں جن کے لئے ہمیں جدوجہد کرنا ہے۔

ہمارے بیشتر ذہین دوستوں کے مریض ہیں بعض تو فنی قدروں کو بالکل نظرانداز کر رہے ہیں لیکن اس موقع پر سب سے زیادہ اہم چیز اس میں سیاسی سوجھ بوجھ کا فقدان ہے ——

بہت سے ساتھی تو سیاست کی ادنیٰ سوجھ بوجھ بھی نہیں رکھتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طرح طرح کے گڈمڈ نظریات پیش کرنے لگتے ہیں۔ میں اس کی چند مثالیں ینیان ہی کے بارے میں پیش کرتا ہوں۔

(۱) انسانی فطرت کا نظریہ — کیا واقعی انسانی فطرت کوئی شے ہے یقیناً مادی اور ٹھوس صورت میں ہے طبقاتی سماج میں انسانی فطرت طبقاتی امتیاز کی حامل ہوتی ہے کوئی بھی انسانی فطرت طبقات سے بالاتر نہیں ہوتی۔

ہم پرولتاری طبقہ کی فطرت کو پسند کرتے ہیں اس طرح سرمایہ دار تو سط طبقہ اپنی اپنی فطرتوں کا حامی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کا اظہار الفاظ کی صورت میں پیش نہ کر سکیں لیکن وہ اپنے طبقہ کی فطرت ہی کو انسانی فطرت تصور کرتے ہیں اس لئے ان کی نظر میں پرولتاری طبقہ کی فطرت انسانی فطرت کے متضاد ہے۔ ینیان میں ابھی تک بعض لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں وہ اپنی نام نہاد انسانی فطرت کو ادب و فن کی بنیاد بناتے ہیں یہ قطعاً غلط ہے۔

(۲) ادب و فن نے نوع انسانی کی محبت سے جنم لیا" محبت کو ایک نقطۂ آغاز کیا جا سکتا ہے لیکن اس نوع کے کئی اور بنیادی نقطے بھی ہیں محبت کا تصور خارجی تجربہ سے پیدا ہوتا ہے بنیادی طور پر ہمیں کسی تصور کی بجائے خارجی تجربہ کو نقطۂ آغاز بنانا چاہیئے۔ ہم ادیب اور فن کار پرولتاری طبقہ کو اس لئے محبت کرتے ہیں کیونکہ سماج نے ہم لوگوں کا مقصد بھی پرولتاری طبقہ سے وابستہ کر دیا ہے اور ہماری زندگیاں پرولتاری طبقہ سے منسلک ہو گئی ہیں اس کے برعکس جاپانی سامراجیوں سے ہماری نفرت جاپانیوں کے ظلم و تشدد کی بنا پر پیدا ہوئی اس دنیا میں محبت یا نفرت بغیر جواز کے پیدا نہیں ہوتی .... جہاں تک نوع انسانی سے محبت کا تعلق ہے

.... اس دنیا میں کسی مجموعی محبت کا وجود نہیں ....

...... کیونکہ نوع انسانی طبقات میں بٹ چکی ہے اونچا طبقہ تمام انسانوں سے محبت کی تلقین کرتا ہے کنفوشش اور ٹالسٹائی نے اسی محبت کا پرچار کیا ہے لیکن آج تک ایسی محبت پر عمل نہ ہو سکا

کیونکہ ایسی محبت طبقاتی سماج میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اس قسم کی سچی محبت کی جا سکتی ہے۔ لیکن صرف مستقبل میں جب ساری دنیا سے طبقات مٹ جائیں گے۔ طبقات انسانی سماج کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ جب یہ طبقات ختم ہو جائیں گے تو سماج خود بخود متحد ہو جائے گا۔ اس وقت یہ محبت پھل پھول سکتی ہے لیکن آج نہیں آج ہم فاشسٹوں سے محبت نہیں کر سکتے نہ ہی ہم اپنے دشمنوں سے پیار کر سکتے ہیں بھلا ہم سماج کی برائیوں سے کیسے محبت کر سکتے ہیں۔ ان برائیوں کو ختم کرنا ہی ہمارا مقصد ہے عوام اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کیا ہمارے ادیب اور فن کار اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکے۔

۳۔ ادب و فن نے ہمیشہ غیر جانب داری سے "تاریک اور روشن پہلو کو اجاگر کیا ہے اور کبھی ایک اور کبھی دوسرے پر پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ رائے غلط نظریات کے ایک پورے سلسلے کی عکاسی کرتی ہے ادب و فن تاریک اور روشن پہلوؤں کو ہمیشہ غیر جانب داری سے پیش نہیں کرتے متوسط طبقے کے بہت سے ادیبوں نے کبھی روشن پہلوؤں کا انکشاف ہی نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے کام کو انکشاف حقائق کا نام دینے کے لئے ہمیشہ تاریک پہلو ہی پیش کرتے رہتے ہیں ان کی تخلیقات ایسی بھی ہیں جن سے صرف قنوطیت اور شکست خوردگی پھیلانے کا ہی کام لیا جا سکتا ہے۔

سوشلزم کی تعمیر کے زمانے میں سوویت یونین کے ادب نے روشن پہلو بڑھ چڑھ کر پیش کیا۔ اگرچہ اس کی خامیاں بھی تسلیم کی گئیں۔ مگر یہ خامیاں تمام روشن پہلوؤں کے گرد ایک سایہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ وہاں بھی تاریک اور روشن پہلوؤں پر مساوی توجہ صرف نہیں کی گئی تھی۔

رجعت پرستی کے دور میں جو قنوطی ادیبوں اور فن کاروں نے ہمیشہ انقلابی عوام کو غنڈوں اور شرارت پسندوں کا نام دیا ہے اور اپنے آپ کو ہمیشہ دیوتاؤں کی طرح پیش کیا ہے اور اس طرح انھوں نے روشن اور تاریک دونوں ہی پہلوؤں کو بگاڑ کر پیش کیا۔ صرف سچے انقلابی ادیب اور فن کار ہی ان دونوں کے درمیان صحیح توازن قائم رکھ سکتے ہیں ہر ایسی تاریک قوت کو بے نقاب کرنا ضروری ہے جو عوام کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتی ہو اور عوام کی ہر انقلابی جد و جہد کی تعریف کرنا لازم ہے یہ کام انقلابی ادیبوں ۔ فن کاروں کا بنیادی کام ہے۔

۴۔ ادب و فن کا کام ہمیشہ حقیقتوں کو "عیاں کرنے کا رہا ہے"۔

اس قسم کی گفتگو بھی بالکل اوپر کی رائے کی طرح تاریخی سائنس اور تاریخی مادیت سے لاعلمی کے اظہار پر دلالت کرتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ادب و فن کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ جو کچھ برا ہے اسے ظاہر کر دیا جائے۔ انقلابی ادیبوں اور فن کاروں کو ظاہر کرنے اور بے نقاب کرنے کے کام کو ظالموں لوٹنے کھسوٹنے اور تشدد کرنے والوں کی حد تک محدود رکھنا چاہیئے قدرتی طور پر بہت سے لوگوں میں خامیاں موجود ہیں لیکن ان کی یہ برائیاں بہت بڑے پیمانے پر ظالموں کے لوٹنے کھسوٹنے اور تشدد کرنے والوں کے تسلط کی وجہ سے ہیں۔ ہمارے ادیبوں اور فن کاروں پر لازم ہے کہ وہ ان برائیوں اور خامیوں کا الزام ان ظالموں لوٹنے کھسوٹنے اور تشدد کرنے والوں پر لگائیں اور عوام کو ان کا ذمہ دار نہ ٹھہرائیں جہاں تک لوگوں کا تعلق ہے ہمارے سامنے ان کو تعلیم دینے اور ان کا معیار بلند کرنے کا مسئلہ ہے صرف انقلاب کے دشمن ادیب اور فن کار ہی عوام کو "پیدائشی احمق" اور ان کی انقلابی جدوجہد کو "سرپھرے کے گروہ" کا نام دے سکتے ہیں۔

۵۔ موجودہ حالات میں مضامین لکھنے اور صرف لوہسون کے طرز تحریر کو اختیار کرنے ہی سے کام چل سکتا ہے۔

لوہسون کے طنزیہ انداز کو صرف اسی صورت میں حل کرنے کے لئے صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جب سامنے عوام کے دشمن ہوں لوہسون اندھی طاقتوں کے تسلط میں زندہ رہا اسے بولنے کی آزادی نہ تھی وہ اس شکل پر اپنے طنزیہ مضامین کے ذریعہ غالب آیا اور اس میں وہ بالکل حق بجانب تھا۔

چین میں فاشست اور رجعت پسند گٹھ جوڑ پر بلاشبہ طنز سے بھرپور وار کرنے چاہئیں لیکن شن کنگ نل کے سرحدی علاقوں اور مخالف جاپان اڈوں پر جہاں پر سوائے انقلاب کے دشمنوں اور جاسوسوں کے سب کے سب لوگ مکمل آزادی اور جمہوریتوں کی نعمتوں سے مالا مال ہیں وہاں پر ادیبوں اور فن کاروں کو لوہسون کا طنزیہ انداز اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں پر تو آپ اپنی پوری قوت سے صاف سیدھی زبان میں اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں تاکہ عوام اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔

لوہسون جب عوام دشمنوں کی بجائے خود عوام کے لئے کام کر رہا تھا تو اس نے اپنے مضامین کے

۔ ا سلئے میں ابھی کبھی اس طنز کے ہتھیار کو انقلابی عوام اور انقلابی جماعتوں کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ اس کے وہ مضامین جو عوام سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے ان مضامین سے قطعاً مختلف ہیں جن میں وہ عوام کے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ہمیں لوگوں کی خامیوں پر اپنی لے نقطہ نظر سے تنقید کرنی چاہیئے اور یہ تنقید پورے خلوص اور عوام کی حفاظت اور ان کی تعلیم کے کام کو مدنظر رکھ کر ہونی چاہئے اگر آپ اپنے رفیقوں سے بھی بے رحمانہ سلوک کریں گے جو آپ اپنے دشمنوں سے روا رکھتے ہیں تو آپ کی حیثیت بھی دشمن کی سی ہوگی۔

تو کیا پھر ہم طنز کو بالکل بے فائدہ سی چیز سمجھ کر چھوڑ دیں۔ طنز کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ایک دشمن سے پورا اترنے کے لئے دوسری دوستوں کے سلسلے میں اور ایک تیسری قسم اپنے کیمپ کے لوگوں کے سلسلے میں بھی ہوتی ہے۔ طنز کی یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ لہذا ہم طنز کو مجموعی طور پر چھوڑنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اس کی برائیوں اور برے پہلوؤں کو ترک کر دیں۔

۶۔ میں یہاں پر نیکی اور خرافات کی تعریف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا — یہ ضروری نہیں کہ اچھے پہلو کو اجاگر کرنے سے عظیم اور برے پہلو کو بے نقاب کرنے سے گھٹیا فن پارے وجود میں آئینگے اگر آپ بورژوا ادیب یا فن کار ہیں تو قدرتی طور پر آپ محنت کشوں کی بجائے بورژوازی کی ترجمانی کریں گے اسی طرح اگر آپ پرولتاریہ کے ادیب یا فن کار ہیں تو آپ: محنت کشوں ہی کی ترجمانی کریں گے۔ لیکن بہرحال آپ کو ان دونوں میں سے ایک کی طرف ہونا ضرور پڑے گا۔

ضروری نہیں کہ بورژوا سماج کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کرنے والی تحریریں اعلیٰ درجہ کی ہوں نہ ہی یہ ضروری ہے کہ اس کے برے پہلوؤں کو نمایاں کرنے والی تحریریں معمولی ہوں لیکن پرولتاریہ کی نام نہاد "تاریکی" کو بیان کرنے کی ذمہ داری ان پر یقیناً ہوگی۔ کیا ادب و فن کی تاریخ نے اس حقیقت کو متعین نہیں کر دیا ہے تو پھر ہم کیوں نہ عوام کی تاریخ اور تہذیب کے ارتقاء کی ترجمانی کریں۔ کیوں ہم پرولتاریہ کمیونسٹ پارٹی عوامی جمہوریت اور سوشلزم کی ترجمانی نہ کریں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دل میں عوام کے بلند مقاصد کے لئے کوئی ولولہ نہیں ہے عوام اور ان کے ہراول کی جد و جہد اور ان کی فتوحات میں یہ لوگ بالکل ایک طرف راستے میں کھڑے نظر آتے

میں بنیادی طور پر یہ لوگ ایسے پسند کرنے والوں کی خود پسندی اور کچھ اور لوگوں کی جو ان کے چھوٹے سے گروہ سے تعلق رکھتے ہوں تعریف و توصیف کرتے رہتے ہیں۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے یہ انفرادیت پرست لوگ عوام کی شاندار کامیابیوں کی تعریف کرنے کے لئے تیار نہیں اور نہ ہی وہ جدوجہد اور آخری فتح میں اعتماد بڑھانے اور انقلابی عوام کا حوصلہ بڑھانے کے لئے تیار ہیں یہ لوگ انقلابیوں کی صفوں میں زبردست خطرہ ہیں اور ان سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔

(۷) مسئلہ صرف ہماری پوزیشن کا نہیں ہے کیونکہ ہماری پوزیشن تو صحیح ہے۔ ہماری نیت بھی نیک ہے۔ معاملہ بھی ہماری سمجھ میں آگیا ہے صرف ہمارے اظہار کا طریقہ صحیح نہیں ہے اور اسی لئے اس کا اثر بھی برا ہے۔

نیت اور اس کے اثر کے معاملہ میں پہلے ہی جدلی مادیت کی روشنی میں لکھ چکا ہوں جیسے ہم یہ بھی فیصلہ کریں کہ اثر کا مسئلہ پوزیشن کا مسئلہ بھی ہے یا نہیں جب کوئی آدمی محض نیت کی بنا پر کوئی کام شروع کرتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ اس کا اثر کیا ہوگا تو اس کی مثال بالکل ایسے ڈاکٹر کی مانند ہوگی جو بے سوچے بغیر نسخہ تجویز کر دیتا ہے کہ اس سے مریض کا علاج ہوگا یا خاتمہ۔ اسی طرح اس سیاسی جماعت پر بھی یہ مثال صادق آتی ہے جو اپنے منشور کا اعلان تو کر دیتی ہے اور یہ نہیں سوچتی کہ یہ قابل عمل بھی ہے کہ نہیں کیا اس کو آپ اچھی نیت کہہ سکتے ہیں۔ ہم اثرات کا اندازہ لگانے میں غلطی تو کر سکتے ہیں لیکن یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ان خاص طریقوں سے بہت ناخوشگوار نتیجے برآمد ہوتے ہیں ان پر زور دیتے ہیں تو کیا اس صورت میں اس کو نیک نیت کہا جا سکتا ہے۔

ہم کسی سیاسی جماعت یا ڈاکٹر کی قابلیت کا اندازہ صرف ان نتیجوں ہی سے لگا سکتے ہیں۔ جو ان کے عمل سے برآمد ہوتے ہیں اور ادیب اور فنکار کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔

جن لوگوں کے ارادے واقعی نیک ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے کام کے اثرات کے متعلق سوچیں۔ تمام پچھلے تجربات کو ذہن میں رکھیں اور اپنے طریقوں یا اظہار کے طریقے پر گہری نظر رکھیں اگر وہ واقعی نیک نیت ہیں تو انہیں اپنی خامیوں اور غلطیوں کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ خود تنقیدی کو پورا فروغ دینا چاہیئے اور اپنی غلطیوں کو درست کرنے کا پختہ ارادہ کرنا چاہیئے۔ اسی روشنی میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر خود تنقیدی پر زور دیتے ہیں اور صرف اسی طرح آپ کی پوزیشن کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے

ساتھ ہی ساتھ اس کام کی طرف بہت سنجیدہ اور ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنے اور صحیح پوزیشن کو سمجھنے اور صحیح نقطۂ نظر قبول کرنے پر بھی پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر کام کے دوران میں کام کا یہ رخ نہیں ہے بلکہ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی رائے ہمیشہ ہی ٹھیک ہوتی ہے تو پھر آپ کچھ نہیں سمجھتے کہ آپ خواہ کچھ ہی ہوں۔

۸۔ "مارکسزم لینن ازم کا مطالعہ جدلی مادیت کا میکانکی طور پر دہرانے کے برابر ہے جو تخلیقی روح کو بگاڑ دیتی ہے۔" مارکسزم اور لینن ازم کا مطالعہ خیالی سلوگن کے مشاہدہ اور ادب و فن کو جدلی اور تاریخی مادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں اس سے یہ قطعاً مراد نہیں کہ فلسفہ کو ادب و فن یا جمالیات میں پیش ہی کر دیا جائے۔ مارکسزم اور لینن ازم تخلیقی ادب و فن کو جلا دیتے ہیں جو ان کی جگہ نہیں لے لیتے بالکل اسی طرح جس طرح .... میں مارکسزم اور لینن ازم ایٹم اور الیکٹرون کے نظریات کی جگہ دینے کی بجائے ان کا بہتر طریقہ تلاش کرتے ہیں خالی اور بے مقصد کٹرپن یقیناً تخلیقی روح کو فنا کر دیتا ہے بلکہ یہ کٹرپن تو خود مارکسزم اور لینن ازم کو بھی مسخ کر دیتا ہے۔

تو پھر کیا مارکسزم اور لینن ازم تخلیقی روح کو برباد تو نہیں کر دیں گے؟ کریں گے تو ضرور لیکن یہ جاگیرداری، بورژوائی اور متوسط طبقے کی تخلیقی روح ہوگی جسے یہ برباد کریں گے یہ ایسی تخلیقی روح ہے جس کی جڑیں لبرل ازم، انفرادیت پسندی اور ابہام میں ہیں اور جو فن برائے فن، قنوطیت، شکست خوردگی اور اشرافیہ کے مقاصد کی حامی ہے یہ ہر اس تخلیقی روح کو ختم کر دیں گے جو عوام اور پرولتاریہ کی نہیں ہے۔ کیا اس کا خاتمہ کرنا ضروری ہے؟ میرے خیال میں یہ ضروری ہے اس کے لئے جگہ خالی کرنی ہوگی۔

ادب اور فن کے مذکورہ بالا مسائل ینان کے ادبی حلقوں میں پیش کئے گئے ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی حلقے پارٹی کے معاملات اور لٹریچر کو سمجھنے کے معاملہ میں بعض غلط عادتوں اور غلط خیالات کا شکار ہیں ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بعض ساتھی ابھی تک عینیت، غیر ملکی ادعائیت، اوہام خیالی خولی باتوں، جدوجہد کو کم کر کے دیکھنے اور عوام سے دور رہنے کے مریض ہیں۔ ہمارے لئے اپنے آپ کو درست کرنا انتہائی ضروری ہے۔

ہمارے بہت سے ساتھی ابھی تک پرولتاری اور متوسط طبقے میں تمیز نہیں کر پاتے ہمارے بعض ساتھیوں میں سے بعض نے تو ایک حد تک پارٹی کے فلسفہ کو اپنا لیا ہے اور بعض نے بالکل

ہی نہیں اپنایا۔ ان میں ابھی تک اونچے طبقے سے حاصل کی ہوئی برائیاں موجود ہیں۔ اس لئے وہ نچلے طبقے کے فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس فلسفہ پر قدرت حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر تو سچے کیونسٹوں سے شمہ برابر بھی مماثلت نہیں رکھتے۔ لیکن بعض کی حالت ان سے بھی خراب ہے۔ وہ کسی زمانے میں جاپانیوں کی آلہ کار جماعت وانگ جنگ وی کے رکن تھے یا بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی خفیہ پولیس میں ملازم تھے اور اب وہ کمیونسٹ پارٹی یا دوسری کمیونسٹ جماعتوں میں شامل ہو گئے ہیں اور اپنے سینے پر انقلابی بنے سجائے ہیں۔

اگرچہ ہماری پارٹی کی اکثریت سچی اور دیانت دار ہے لیکن ہماری جماعت کی تنظیمی اور نظریاتی صفائی ضروری ہے تاکہ ہماری انقلابی تحریک زیادہ ترقی کرے اور جلد اپنا مقصد حاصل کرے ۔۔۔۔۔ تنظیم نو کے لئے نظریاتی صفائی ضروری ہے تاکہ پرولتاری اور غیر پرولتاری فلسفہ کا امتیاز ختم ہو جائے اس لئے ینان کے ادبی حلقوں میں اس مقصد کے تحت جو مہم شروع ہوئی ہے وہ سب کے لئے ضروری ہے

وہ لوگ جن کا ماضی متوسط طبقے سے وابستہ رہا ہے وہ مختلف ذرائع سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ادب وفن بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ اپنے نظریات کی تشہیر کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی اور ساری دنیا متوسط طبقے کے اہل دانش کے نظریات میں ڈھل جائے ایسے لوگوں سے ہمیں یہ صاف صاف کہہ دینا چاہیئے۔ ساتھیو! ہم تمہارے نظریات قبول نہیں کر سکتے مزدور اور کسان تمہاری بتائی ہوئی راہ پر نہیں چل سکتے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ تمہاری بتائی راہ پر چل کر ہماری پارٹی نقصان اٹھائے گی۔ ہمارا ملک نقصان میں رہے گا۔ بلکہ اس سے شاید تمہاری اپنی جان پر بھی بن جائے۔ تو پھر سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر ہم کس کی راہ پر چلیں؟ ہمیں پرولتاری طبقہ اور اس کے ہراول دستے کی بتائی ہوئی راہ اپنانا چاہیئے۔ صرف یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر ہم پارٹی اور دنیا کی تعمیر نو کر سکتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ادبی حلقوں میں ہمارے ساتھیوں کو اس بحث کی اہمیت کا احساس ہو گا اور وہ دشمن کے خلاف جدوجہد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر حصہ لیں گے اس طرح پارٹی کے ارکان مضبوط ہوں گے اور ہماری صفیں تنظیمی اور نظریاتی طور پر متحد ہوں گی۔

بعض ساتھی چونکہ نظریاتی طور پر صاف نہیں اس لئے وہ ابھی تک جاپان کے خلاف مورچوں اور باقی چین میں امتیاز نہیں کرسکتے ان کی اس نظریاتی گڑبڑ سے بعض غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ آپ میں سے بہت سو ساتھی شنگھائی کی گلیوں سے آئے ہیں .... آپ جب شنگھائی کی گلیوں سے ہمارے مورچوں تک آئے تو آپ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف منتقل ہی نہیں ہوئے بلکہ آپ نے تاریخ کے ایک دور سے دوسرے دور میں قدم رکھا ہے آپ لوگ نیم جاگیردارانہ اور نیم نوآبادیاتی سماج سے جس پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا تسلط ہے انقلابی صفوں میں شامل ہوئے ہیں ہم سے متعلق لوگ بدل چکے ہیں، ہمارے سامعین بدل چکے ماضی کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا اس لئے ہمیں بلا پس و پیش نئے عوام کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر آج ہمارے بعض ساتھی نئے عوام میں رہتے سہتے انھیں پہچان نہیں سکتے تو وہ ایسے جانباز ہیں جنھیں میدانِ جنگ تک کا علم نہیں۔ ایسے ساتھیوں کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ فیصلہ ہی نہ کر پائیں گے کہ وہ دیہات میں جائیں یا فیکٹریوں میں کام کریں۔

بعض ادیب شاید یہ سوچیں کہ چلئے ہم تو ان لوگوں کے لئے لکھیں گے جو پچھلی صفوں میں ہیں کیونکہ ہم انھیں اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ہماری تحریریں قومی اہمیت کی مالک ہوں گی۔ سوچنے کا یہ ڈھنگ قطعاً غلط ہے کیونکہ پچھلی صفوں میں بھی حالات بدل رہے ہیں۔ جو قاری جاپان دشمن مورچوں میں مقیم ہیں وہ اب پرانی کہانیاں نہیں چاہتے وہ ادیبوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ انھیں نئے عوام اور نئی دنیا کے بارے میں کچھ بتائیں، اس لئے صرف وہی ادب قومی اہمیت کا مالک ہوگا جو جاپان دشمن مورچے میں سرگرم پیکار ہے۔ مثلاً چند بیت کی ایک کہانی "انھیں صرف ایک گوریلا دستے کے بارے میں ہے وہ پرانی دنیا کے قاری کے ذوق کے مطابق نہیں، لیکن اس کے باوجود اس کا اثر ساری دنیا نے لیا ہے۔

چین پیچھے نہیں ہٹ رہا ہے بلکہ اس کے قدم آگے بڑھ رہے ہیں اور پسماندہ اور ترقی دشمن طاقتوں کی بجائے یہ انقلابی چین کی رہنمائی کر رہے ہیں اس موقعہ پر میں لو ہسون کی ایک نظم کے دو مصرعے پیش کرتا ہوں "ہزاروں افراد کی انگشت نمائی سے بے پروا ہو کر لیکن جوانوں کے سامنے اپنا سر جھکا دو اور ایک بیل کی طرح ان کی اطاعت کرو"

یہ الفاظ ہمارا اصول ہونا چاہیئے۔ یہاں ہزاروں افراد سے مراد ہمارے دشمن ہیں اس لئے چاہیے

وہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں ہمیں ان کے سامنے نہیں جھکنا چاہیئے اور عوام سے کسان مزدور
طبقہ اور عوام مراد ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے تمام ارکان تمام انقلابیوں اور انقلابی ادیبوں کو وہ سون کا
یہ قول یاد رکھنا چاہیئے۔ انہیں پرولتاری طبقہ اور عوام کے لئے ایک بیل کی طرح صبر و تحمل اور بلا تکان
کام کرنا چاہیئے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنی کوشش مجتمع کرلو۔ اپنی صلاحیتوں کا ہر ذرہ اس
کے لئے وقف کردو اور جب تک زندہ رہو کام کرتے جاؤ۔ شاید ادیبوں کے لئے عوام سے منسوب ہونا
یا عوام کے لئے لکھنا اذیت کا باعث ہو۔ شاید تمہاری راہ میں بے شمار روڑے ہوں۔ لیکن اگر تم تہیہ
کرلو تو تم یہ مقصد حاصل کرسکتے ہو۔

میں نے صرف چند بنیادی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے کئی اور مسائل ابھی باقی ہیں جن پر برابر
غور کرتے رہنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے آپ میں سے ہر ایک ساتھی اس اصول پر چلے گا۔ مجھے یقین
ہے کہ آپ میں سے ہر ایک اپنے آپ اور اپنے ادب و فن میں تبدیلی پیدا کرے گا۔ پھر آپ ایسا خالص
ادب و فن پیش کریں گے، مزدور کسان اور سپاہی جس کا خیر مقدم کریں گے اور ادب و فن کی تحریک
نہ صرف جمہوری علاقوں میں بلکہ دوسرے صوبوں میں بھی ایک روشن دور میں داخل ہوگی۔

مجنوں گورکھپوری

حسرت کی شخصیت

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت گنتی کے ان اردو شاعروں میں سے تھے جن سے میں اپنی عمر کے اس دور میں واقف ہوا جس کو کسی نے "خواب طفلی و آرزوئے شباب" کہا ہے، اور جو بالاتفاق انسان کی زندگی کا سب سے زیادہ جمیل دور ہوتا ہے شاید اس لئے کہ یہ ہمارے انتباسات و تخیلات کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔

حسرت کی شخصیت اور شاعری نے مجھے بہت کم عمری میں متاثر کر کے میرے دل و دماغ کی تشکیل میں حصہ لیا۔ ان کے کردار اور ان کی شاعری پر کچھ لکھنے کا ارمان مجھے ایک مدت سے تھا۔ تقریباً بیس سال سے ہر سال ارادہ کرتا رہا کہ حسرت پر کچھ لکھوں لیکن برابر زندگی کی اور غلیظ مصروفیتوں کا جو میرے ارادے اور عمل کے درمیان اب تک برابر حائل رہیں۔ اور آج جب کہ میں واقعی حسرت پر کچھ لکھنے جا رہا ہوں تو حسرت اس دنیا میں نہیں ہیں یہ احساس میرے دل میں ایک کسک پیدا کر رہا ہے۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ میں ان پر یا ان کی شاعری پر خود ان کی زندگی میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکا۔ خیر تلافی مافات صحیح معنوں میں تو کبھی ممکن نہیں لیکن اگر میرا یہ مضمون مکمل ہو گیا تو کم سے کم میرے دل کو یہ تسکین ہو جائے گی کہ ایک دیرینہ ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکا چاہے اس میں کتنی ہی تاخیر کیوں نہ واقع ہوئی ہو۔ حسرت

کی شاعری پر تو پھر کسی وقت تبصرہ کروں گا اس وقت میں ان کی شخصیت اور کردار کی امتیازی خصوصیت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

میرا یہ دعویٰ شاید غلط نہ ہو کہ اردو شاعری کی دنیا میں حسرت ہی ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جو اگر شاعر نہ بھی ہوتا تو بھی ایک انفرادی حیثیت کا مالک ہوتا۔ حسرت کی شاعری یقیناً ان کی شخصیت کا بہت صحیح اور اپنے دائرے کے اندر نہایت مکمل عکس ہے لیکن یہی ان کی ساری شخصیت نہیں ہے۔ شاعری نے ان کی شخصیت نہیں بنائی بلکہ ان کی شخصیت کا تقاضا یہ ہوا کہ اپنے اظہار کا ایک ذریعہ شاعری کو بھی بنائے یہ وہ اثر تھا جو اب سے کوئی تیس سال پیشتر حسرت کے چند اشعار سن کر پہلے پہل مجھ پر ہوا تھا جب کہ میں نے حسرت کو دیکھا بھی نہیں تھا اور یہ اثر تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ آج تک قائم ہے جب کہ میں حسرت کو اچھی طرح جان پہچان چکا ہوں۔

حسرت کا نام اور ان کا تذکرہ میں اپنے گھر میں بچپن سے سنتا آیا تھا حسرت میرے والد کے دوست اور میرے چچا مولوی محمد اشفاق صاحب کے علی گڑھ میں ہم عصر تھے اور ان دونوں سے میں حسرت کا ذکر سنتا رہا حسرت کے فدائیانہ سیاسی کردار اور ان کے جاں بازانہ ذوق آزادی سے میں پہلے واقف ہوا اور ان کی شاعری سے بعد کو۔

حسرت کی سیرت اور ان کی زندگی پر اگر سطحی اور اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے تو کچھ تناقضات محسوس ہوں گے مثلاً وہ بچوں کی طرح معصوم اور بے یار تھے اور کسی قسم کے تصنع یا بناوٹ کا شائبہ ان کے مزاج میں نہیں تھا بچوں ہی کی طرح ان کا ذوق تماشا اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ ہر قسم کی چیزوں، ہر عنوان کے مواقع اور ہر رنگ کے اسباب و حالات سے حظ یا ہدایت قبول کر لیتے تھے ایک مرتبہ جب کہ حسرت اول اول علی گڑھ کی تعلیم گاہ میں داخل ہوئے تھے نمائش کے موقع پر انھوں نے دو آنہ یا دس پیسہ کی بانسری خریدی اور اپنی کچی بارک میں جب اپنا جی چاہا بجانا شروع کیا کچھ طلبا نے جو کتاب کے کیڑے تھے اور جن میں پنجابیوں کی تعداد زیادہ تھی شور مچایا کہ اس سے پڑھنے میں بڑا خلل پڑتا ہے حسرت نے اس احتجاج کی ضد میں جو رویہ اختیار کیا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل انوکھا تھا ان کو جب بانسری کی اشتہا ہوتی تو وہ پاخانے میں چلے جاتے اور وہاں بیٹھ کر بے دریغ بانسری بجانے لگتے۔ دوستوں نے پوچھا یہ حرکت ہے جواب دیا۔

"یہ پنجابی لوگ شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ میری بانسری سے ان کے پڑھنے میں خلل پڑتا ہے اس لئے جب میرا بانسری بجانے کا جی چاہتا ہے تو میں یہاں چلا آتا ہوں"

بادی النظر میں یہ ایک نہایت طفلانہ کھلنڈرا پن تھا لیکن حقیقتاً یہ حسرت کا بہت پُر طنز تھا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ کو اپنی زندگی کے مقصد میں واقعی انہماک ہے تو کسی قسم کے خارجی اور غیر متعلق واردات آپ کے انہماک میں خلل کیسے ڈال سکتے ہیں — یہ تھی ان کی طفلانہ معصومیت [illegible] حجابی جس کے اندر نہایت بالغ اور رچی ہوئی کار آگاہانہ عصبیت بھی کام کر رہی تھی لیکن جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عین اسی زمانے میں آزادی اور خود مختاری کا نہایت دور تک سوچا اور سمجھا ہوا باغیانہ تصور ایمان کی طرح ان کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا جس کی پرجوش تحریکات سے وہ بے چین رہا کرتے تھے تو ہم کو حسرت کی طبیعت واقعی ایک طرفہ تماشا معلوم ہوتی ہے۔ معصومیت اور ایسے راسخ باغیانہ میلان کا ایسا خوش آہنگ امتزاج بہت کم دیکھنے یا سننے میں آیا ہے [illegible] آزادی کی راہ میں اس معصوم اور بے باک بغاوت کا سب سے پہلا مظاہرہ علی گڑھ ہی میں ہوا سال ۱۹۰۳ء کے ابتدائی ایام تھے تدریسی مہینے ختم ہو چکے تھے اور طلبا امتحان کے لئے تیاریاں کر رہے تھے حسرت بھی بی اے کے امتحان میں شریک ہونے والے تھے اسی دوران میں انجمن اردوئے معلیٰ کی طرف سے جس کے محرک اور مہتمم حسرت تھے ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جو شاعری کے اعتبار سے یادگار ہے۔ ہندوستان کے تمام اکابر شعرا اس میں شریک ہوئے غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح جو کافی سن رسیدہ اور ضعیف ہو چکے تھے اس محفل میں سب سے [illegible] صورت تھے اس زمانے میں امیر مینائی کے مشہور شاگرد گستاخ رامپوری کی [illegible] کافی شہرت پکڑ چکی تھی علی گڑھ میں جیلر کے عہدہ پر مامور تھے یہ وہی گستاخ ہیں [illegible] پڑھے ہوئے ہیں :-

[illegible] ہے گستاخ [illegible] یا گستاخ — ایک سے ایک ہے سوا گستاخ
پیچھے [illegible] سیج وصال — اب ہے دل کا مدعا گستاخ
[illegible] تبسم — قیمتی ہے یار یا حیا گستاخ

ان کی صحبت میں اب وہ لطف نہیں ہو گئے جب سے پارسا گستاخ
صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی
نہ جانے کس نے بگاڑا اسے علی گڑھ میں کہ رام پور میں گستاخ یوں خراب نہ تھا

غرضکہ مشاعرہ بڑی دھوم دھام کا رہا اور بڑی چہل پہل رہی طرحی غزل میں گستاخ نے ایک مطلع سنایا تھا:۔

یہ مرض گستاخ کیسا تجھ کو پیدا ہو گیا جس کی صورت اچھی دیکھی اس پہ شیدا ہو گیا

مشاعرہ کی محفل بڑی کامیاب رہی۔ کالج کی تمام سربرآوردہ ہستیاں اور شہر کے منتخب اور ممتاز ارباب مشاعرہ میں موجود تھے اور سب اس یادگار بزم سخن کی تعریف ہی کرتے اٹھے۔ لیکن دوسرا دن حسرت کے لئے بڑی آزمائش کا دن تھا۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ زمانہ برطانوی قیصرت کے شباب کا زمانہ تھا مسٹر ماریسن کالج کے پرنسپل تھے اور نواب محسن الملک سکریٹری تھے۔ کالج کے ارباب حل و عقد پر سرکار برطانیہ کا رعب چھایا ہوا تھا اور کالج میں گھر کے بھیدی لنکا ڈھانے والوں کی بھی کمی نہیں تھی پیٹھ پیچھے برائی کرنے والوں نے جن کو حسرت کی آزادانہ اور مستغنی طبیعت سے روز اول ہی سے اختلاف تھا ماریسن سے جا کر کہہ دیا کہ مشاعرے میں تہذیب سے گرے ہوئے اور اخلاق کو بگاڑنے والے اشعار پڑھے گئے اور مثال کے طور پر گستاخ رامپوری کا وہ شعر پیش کیا جو اوپر حوالۂ قلم ہو چکا ہے اس اعتراض کرنے والے فرقے کے امام محمد علی مرحوم تھے جو اس وقت حال میں ولایت سے واپس آئے تھے اور نہایت خالص مسٹر محمد علی تھے۔ ان لوگوں نے مشاعرہ کو نہ جانے کس روشنی میں پیش کیا اور گستاخ رامپوری اور بے چارے کے شعر کی خدا معلوم کیا تشریح کی کہ ماریسن آگ بگولہ ہو گیا اور حسرت کو بلا کر نہایت خشونت کے لہجہ میں کہا کہ تمہارا مشاعرہ نہایت غیر مہذب اور مخرب اخلاق تھا۔ حسرت نے پہلے تو نرم لہجہ میں اختلاف کیا لیکن جب ماریسن کا غصہ کسی طرح دھیما نہ پڑا تو نہایت بیباکی کے ساتھ حسرت نے کہہ دیا کہ ممکن ہے کہ آپ کے معیار اخلاق سے ایسا ہی ہو ہمارے معیار اخلاق سے تو مشاعرہ میں کوئی خلاف تہذیب بات نہیں تھی۔ حسرت کا یہ کہنا تھا کہ ماریسن آپے سے باہر ہو گیا اور انتہائی غیظ و غضب میں چیخ چیخ کر کہنے لگا "کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں اخلاق و تہذیب کے دو معیار ہوں"۔ اس کے بعد فوراً اس نے کالج کے منتظمین کا ایک خاص اجلاس طلب کیا اور اس میں یہ تجویز پیش کی کہ حسرت کو کالج سے نکال دیا

جائے، اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ماریسن کی اس رائے سے اختلاف کرتا لیکن چونکہ حسرت کی شخصیت
کا رعب سب پر چھا چکا تھا یہاں تک کہ نواب محسن الملک ان کی قابلیت اور فضیلت کے معترف
تھے اس لیے اس تجویز میں اتنی ترمیم کر دی گئی کہ حسرت کو کالج سے تو نکال دیا جائے لیکن امتحان میں
شریک ہونے سے نہ روکا جائے ۔ اس رعایت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حسرت کی شخصیت کس
قدر مسلم و مقبول تھی یہاں یہ کہہ دینا شاید بے موقع نہ ہو کہ کالج کے جتنے اعزاز تھے وہ سب حسرت
کو حاصل تھے ۔ انجمن اردوئے معلیٰ کے معتمد وہ تھے ۔ یونین کے سکریٹری وہ تھے، اور نوڈ مانیٹر وہ تھے
اور نوڈ مانیٹر کی حیثیت سے انھوں نے جس دیانت داری اور بے لاگ فرض شناسی کا ثبوت دیا تھا
اس کا نقش ہر ایک کے دل پر تھا ۔ غرضکہ حسرت کالج سے نکال دیئے گئے ۔ تب انھوں نے کالج سے
باہر ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہنا شروع کیا اور دفتر اردوئے معلیٰ کو بھی اپنے ساتھ رکھا چونکہ روز
اول ہی سے اردو شعر و ادب کا نہایت مہذب مذاق رکھتے تھے اور اس کی ترویج اور اشاعت کو اپنی
زندگی کے نصاب کا ایک لازمی جزو قرار دے کر رکھا تھا اس لئے انھوں نے کالج سے باہر آتے ہی
اردوئے معلیٰ کے نام سے وہ رسالہ جاری کیا جو آخر وقت تک ان کی زندگی کا رفیق رہا ۔ یاد رہے یہ وہی
حسرت تھے جن کو ان کے انٹرنس کا امتیازی نتیجہ دیکھ کر ڈاکٹر ضیاء الدین نے بڑے ارمان اور تپاک
سے علی گڑھ بلایا تھا اور آج حسرت کو صرف اس لئے کہ وہ حریت کا شیدائی اور حقانیت کا پرستار
تھا آج علی گڑھ کی تعلیم گاہ سے نکال دیا گیا لیکن حسرت نہایت پختہ کردار اور راسخ عزم لے کر پیدا
ہوئے تھے وہ عقیدے کے پکے اور دھن کے پورے تھے بے باکی اور بے نیازی ان کے خمیر میں تھی
ہوا کے بڑے مخالف جھونکے ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکتے تھے ۔ وہ اپنے ارادے پر قائم اور اپنے
دستور العمل میں بڑے اعتماد اور استقامت کے ساتھ ثابت قدم رہے ۔
یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علی گڑھ کالج کا شہرہ سارے ملک میں تھا اور اس کی تعلیم و تربیت کا
سیاد مسلم تھا ۔ ان دنوں میں علی گڑھ کے کسی فارغ التحصیل کو بڑے سے بڑا سرکاری عہدہ دلانے
کے لئے ماریسن یا نواب محسن الملک کی ایک جنبش لب کافی ہوتی تھی ۔ خود حسرت کے کئی ہم جماعتوں کو ان
دنوں بہ آسانی ڈپٹی کلکٹری دلوا دی گئی ۔ حسرت اگر چاہتے تو اونچی سے اونچی سرکاری ملازمت ان کو مل جاتی لیکن انھوں
نے خدمت اردو اور اردو ادب کے فروغ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا جس پر آخر وقت تک ان کو انہماک رہا ۔

مجھے حسرت کی کوئی مربوط اور مسلسل سوانح عمری مرتب کرنا نہیں ہے۔ میں تو صرف حسرت کے کردار کی بعض نہایت غالب اور نمایاں خصوصیات کو پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس مقصد کی تائید اور توضیح میں اِدھر اُدھر سے ان کی زندگی کے چند واقعات اور سانحات سے بھی مدد لے رہا ہوں۔

حسرت نے کافی عمر پائی اور ان کی ساری عمر کے جس اہم ادبی، اجتماعی یا ذاتی واقعہ پر نظر ڈالیے اس سے یہی پتہ چلے گا کہ حسرت صداقت کے پرستار اور حریت کے شیدائی تھے۔ انھوں نے اپنی آزادی کی دھن میں نہ کسی کی مخالفت کی پروا کی اور نہ کسی کی موافقت کو خاطر میں لائے ان کو دنیا کے کہنے سننے کی کوئی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ ان کو لوگ "دیوانہ ملا" کہتے تھے اور ہنستے تھے ان ہنسنے والوں میں اکثر ایسے بھی تھے جو بعد کو حریت اور آزادی کی جدوجہد میں میر کارواں کہلائے لیکن حسرت کے پاس سچائی اور خلوص کا جو اعجاز تھا اس نے بالآخر بڑے سے بڑے منحرف کو بھی ان کا معترف اور ہم خیال بنا دیا۔ جو لوگ کہ ان کا مضحکہ اڑاتے تھے وہی ان کے گن گانے لگے اس جگہ ایک واقعہ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ حسرت جب پہلے پہل علی گڑھ پہونچے تو علی گڑھ والوں کے لیے وہ اپنی ہیئت اور اپنے انداز کے لحاظ سے ایک مضحکہ انگیز ہیولیٰ تھے۔ مشروع کا پائجامہ اور ایک بڑا پاندان ساتھ۔ بس کیا تھا علی گڑھ میں "خالہ اماں" مشہور ہو گئے اور ہر طرف سے "ہی ہی ہو ہو" ہونے لگی اور پھبتیاں پڑنے لگیں لیکن حسرت کے کان پر جوں تک نہ رینگی، وہ اپنی وضع پر قائم رہے اور اپنے طور طریقے میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ جب ان کی علمی استعداد اور ادبی قابلیت ان کے اصول اور عقائد کا خلوص اور ان کی شخصیت کی بے دریغ سچائی کے جوہر نمایاں ہوئے تو دھیرے دھیرے وہی لوگ جو ان پر تالیاں بجاتے تھے آکر ان کے حلقہ میں شامل ہونے لگے اور ان کی صحبت سے فیض اٹھانے لگے۔

حسرت اپنے ماحول اور اپنے دور کی نہایت سچی اور کھری پیداوار تھے اور اپنے زمانے کے ان اماموں میں سے تھے جن کی گنتی بارہ تک بھی نہیں پہونچتی۔ آزادی کی اس دیوانہ وار اور جانبازانہ کوشش کو جو برطانیہ کی سامراجی تواریخ میں غدر کے نام سے مشہور ہے ابھی پورے پچاس سال نہیں ہوئے تھے انگریزوں کے پاؤں اکھڑ کر اب کے دفعہ اچھی طرح جم چکے تھے اور ان کی ہیبت دلوں پر کچھ اس طرح طاری ہو گئی تھی کہ وطن کا بڑے سے بڑا ہوا خواہ اور آزادی کا مشہور سے مشہور

بیلغ جب ملک کی ابتر حالت کا ذکر کرتا تھا اور آزادی کا نام لیتا تھا تو اپنی زبان میں وہ لکنت اور جھجک پاتا تھا جو مذبذب سے نہیں بلکہ صرف خوف سے پیدا ہوتی ہے یہ لارڈ کرزن کا زمانہ تھا۔ یہ بنگال کی تقسیم کا زمانہ تھا۔ یہ گوکھلے۔ دادا بھائی نوروجی اور فیروز شاہ مہتا جیسے اعتدال پسندوں اور مصلحت کوشوں کی قیادت کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ راش بہاری گھوش جیسا شخص بھی دائیں طرف تھا یعنی امن پسند تھا اور دستوری جد و جہد کا قائل تھا صرف تین آدمی تھے جو آزادی کا سر فروشانہ ولولہ اپنے اندر رکھتے تھے اور جو "انتہا پسند" کے بدنام کرنے والے لقب سے یاد کئے جاتے تھے یعنی تلک اروندو گھوش اور شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے ۱۹۰۶ء کا کانگریس کا اجلاس جو کلکتہ میں ہوا یادگار اجلاس تھا۔ ایک طرف اعتدال پسندوں کی صف آرائی تھی۔ دوسری طرف تلک کے ساتھیوں کا پرشور مطالبہ تھا کہ ہندوستان کو اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرنا چاہیئے۔ اس کو اپنی سیاسی نجات کی صورت خود نکالنا چاہیئے۔ موجودہ نظام یعنی برطانوی سامراج کو تباہ کر دینے کے لئے وہ ذرائع اختیار کرنے چاہیئے جو ضروری ہوں اور جن کی تفصیل کو شائع کرنا خود اپنے مقصد کو غارت کرنا ہے۔ یہ لوگ زمین دوز یعنی پوشیدہ سازشوں اور شورشوں کے قائل تھے اور بھیانک سے بھیانک شدید سے شدید طریقہ اختیار کرنے کے لئے تیار تھے۔ کانگریس کا یہ اجلاس بڑا پرشور اور ہنگامہ آفریں اجلاس تھا۔ قریب تھا کہ کانگریس دو جماعتوں میں تقسیم ہو جائے لیکن بقول شخصے "یہ اس جلیل القدر پیرمرد" کی شخصیت کا اثر تھا جو اس وقت صدر تھا کہ ان دونوں جماعتوں میں مفاہمہ کرا دیا گیا۔ مراد دادا بھائی نوروجی سے ہے جو اجلاس کی صدارت کے لئے خاص طور پر ولایت سے بلائے گئے تھے۔ اسی اجلاس میں "سوراج" کے لفظ کو اہمیت دی گئی اور اس کے اغراض و مقاصد کا مبہم اور غیر واضح الفاظ میں اعلان کیا گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس وقت ان شخصیتوں کا کوسوں تک پتہ نہیں تھا جنھوں نے ضروری طریقے اختیار کر کے ملک کو وہ نام نہاد آزادی دلائی جو آج ہم کو حاصل ہے اور جو آکا بر قوم ملک کے خداوند ہیں ان میں سے بیشتر آزادی کا کوئی صحیح تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتے تھے۔ وہ زمانہ تھا جب کہ حسرت آزادی کی پہلی زمانشتی لڑائی علی گڑھ کالج کے خداوندوں سے لڑ چکے اور اس میں کامیاب رہے تھے۔ بی اے پاس کر گئے اور اردوئے معلیٰ کا ادارہ قائم کر چکے تھے حسرت

اور اردوئے معلیٰ دونوں سے ملک روشناس ہو چکا تھا اور دونوں وقعت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے۔ اگرچہ ملک کے اکثر سربرآوردہ اور ممتاز لوگ خاص کر مسلمان حسرت اور اردوئے معلیٰ سے کسی خیالی یا عملی تعلق کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے تھے اس لئے کہ اردوئے معلیٰ ہندوستان میں صحافت کی اس صنف میں تھا جہاں حکومت کے شدید انسدادی طریقوں کے باوجود اصرار و تکرار کے ساتھ یہ نعرہ لگایا جا رہا تھا کہ ملک کی تمام خرابیوں کا واحد علاج باہری حکومت سے آزادی ہے جس کو دلیرانہ مقابلے، قربانی اور شہادت کے ذریعے حاصل کرنا چاہیئے اور اس نعرہ میں حسرت کی آواز اپنی شدت اور وضاحت کی وجہ سے ایک ممتاز انفرادیت رکھتی تھی۔

حریت کا خروش اور صداقت کی تڑپ حسرت کے خمیر میں تھی اور بچپن ہی سے ان کو ملک کی سیاسی شورشوں کے ساتھ دلبستگی تھی۔ کالج سے فراغت پاتے ہی اردوئے معلیٰ کے اجرا کے ساتھ ہی انھوں نے سیاسیات میں انہماک کے ساتھ عملی حصہ لینا شروع کیا اور چونکہ اس وقت کانگریس کے سوا کوئی دوسری ایسی منظم جماعت نہ تھی جو خلوص اور استقلال کے ساتھ وطن کی آزادی اور خود مختاری کے لئے آواز بلند کرتی اس لئے حسرت نے کانگریس ہی سے اپنے کو وابستہ کیا اور حق شناس وحق پسند وحق یقین وحق سخن" تلک کو اپنا سیاسی مرشد تسلیم کیا جس کی پیروی پر ان کو ہمیشہ ناز رہا۔ سنہ ۱۹۰۴ء سے سنہ ۱۹۰۷ء تک کانگریس کے ہر اجلاس میں شریک ہوتے رہے لیکن سنہ ۱۹۰۷ء کے اجلاس کے بعد جو سورت میں ہوا اور جس میں امن پسند اعتدالیوں کا بول بالا رہا۔ تلک کی جماعت کے ساتھ حسرت بھی کانگریس سے کنارہ کش ہو گئے اور اب ان کو کانگریس سے اتنی ہی مایوسی تھی جتنی کہ مسلم لیگ سے جس کو وجود میں آئے سال بھر سے زیادہ نہیں ہوئے تھے اور جس کی قیادت اس وقت سر آغا خاں کے ہاتھ میں تھی۔ حسرت اپنے نظریات وعقائد میں راسخ، اپنے گفتار و کردار میں اٹل تھے جس راستہ کو انھوں نے ایک مرتبہ اختیار کیا اس سے وہ اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی ہٹے نہیں۔ پہلی قید فرنگ کی میعاد ختم ہونے کے بعد جب حسرت چھوٹے تو بعض مخلص اور نیک نیت دوستوں نے مشورہ دیا کہ اب آپ کو اور اردوئے معلیٰ کو سیاسیات سے الگ رہنا چاہیئے اور اگر سیاسیات سے واسطہ رکھنا ہی ہے تو بہتر ہوگا کہ مسلم لیگ کے مسلک و دستور العمل یا کانگریس کی نرم جماعت کا نصاب اختیار کیا جائے۔ اس پر حسرت نے اردوئے معلیٰ میں جواب دیا۔

"ہم پر ان تمام نیک نیت مشورہ اور مصلحت کوش صلاحوں کا شکریہ فرض ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔"

اسی سلسلہ میں حسرت نے کھلے الفاظ میں اعلان کر دیا کہ ہم سیاسیات میں "مقتدائے وطن پرستان" مسٹر تلک اور سرگروہِ احرار ارو بند گھوش" کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں اور نیز فرو شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی کہ امیری مسلم لیگ یا نو زائیدہ لال چندی کانفرنس سے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ حسرت کو اپنے عقائد اور طریقِ عمل میں کتنا غلو تھا اور وہ کیسے عزم و استقلال کے انسان تھے وہ اس وفاداری بشرطِ استواری" کے مکمل نمونہ تھے جس کو غالب نے "اصل ایمان" بتایا ہے۔

یہاں شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ اگر حسرت اپنے سیاسی عقیدہ اور دستور العمل کے پکے تھے تو اس کی تاویل کیا ہوگی کہ وہ چند سال بعد کانگریس میں داخل ہو گئے اور عدم تعاون اور ترک موالات کے زمانہ میں اس کے ایک نہایت سرگرم اور بلند آہنگ رکن بن گئے اور اس سے بھی زیادہ ان کی یہ روش ناقابلِ توجیہہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اکثر مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور پھر آخر میں وہ باضابطہ اور مستقل طور پر مسلم لیگ میں کیوں شامل ہو گئے۔ یہ تذبذب اور تزلزل کی علامتیں نہیں تو اور کیا ہیں؟ بظاہر یہ شکوک اور سوالات حق بجانب معلوم ہوتے ہیں اور بادی النظر میں ان کا جواب دشوار ہے لیکن اگر گہری نظر ڈالی جائے اور غور و فکر سے کام لیا جائے تو حسرت کی یہ روش آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ سکتی ہے۔

حسرت کا مسلک در اصل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے الگ تھا وہ خود ہندوستان کی سیاسی جماعت کے گرم سے گرم فرقے سے بھی زیادہ گرم تھے۔ وہ صحیح معنوں میں باغی تھے اور اس وقت تک بغاوت کرتے رہنا ان کا ایمان تھا جب تک کہ ملک میں ایسا فطری نظام رائج نہ ہو جائے جو انسانی ناموس کی صیانت کے لئے لازمی ہو اور جس سے سارے بندگانِ خدا کی فلاح ہو سکے

وہ فرنگی حکومت کو غیر طبعی نظام سمجھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ ایسا نظام زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکتا اور فرنگی حکومت حسرت کو اپنے لئے بڑا خطرہ تصور کرتی تھی۔ برطانوی سامراج کے دفتر میں حسرت کا نام نمبر ۳ تھا اور جب حسرت کی نقل و حرکت کی ایک جگہ کی پولس دوسری جگہ کی پولس کو خفیہ طور پر اطلاع دیتی تھی تو ان کو ۳ ہی کہتی تھی۔ قید فرنگ کی اذیتوں نے حسرت کے ولولوں کو اور بڑھا دیا تھا۔ چکی کی مشقت نے ان کے رنگ طبیعت کو اور چمکا دیا تھا۔ قید سے چھوٹنے کے بعد ان کے خیالات زیادہ مضبوط اور ان کے سیاسی عزائم زیادہ پختہ اور سنگین ہو گئے۔ اس کا ثبوت ان کا وہ سیاسی نصاب ہے جس کا اعلان انھوں نے قید سے چھوٹ کر اردوئے معلیٰ دوبارہ جاری کرتے ہوئے کیا اور جس کا حوالہ ابھی دیا جا چکا ہے۔

لیکن حسرت کوئی خیال پرست یا خواب پرداز نہیں تھے اگرچہ وہ انسانی زندگی کی ایک تخیل رکھتے تھے۔ وہ جہاں اور بہت کچھ تھے وہاں ایک ٹھوس عملی انسان بھی تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ محض خفیہ سازشوں سے مقصد حاصل ہونے میں دیر لگے گی اور تہہ خانوں میں رہ کر ہماری شورشیں نہ جانے کب بار آور ہوں اس لئے وہ ملک کی عوامی اور مسلم سیاسی جماعتوں میں شریک رہنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اس میں ایک راز اور بھی تھا حسرت ان سیاسی جماعتوں کی اعتدال پسندی یعنی بزدلی سے واقف تھے اور اس بزدلی کو سمجھاتے رہنا اور اس کی مخالفت کرتے رہنا وہ ہر لحاظ سے اپنا فرض سمجھتے تھے اس لئے جب کبھی ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت کسی حد تک بھی ان کے اپنے نصب العین کے قریب آتی دکھائی دی تو وہ اس کے ساتھ ہو لئے غالب کا ایک شعر ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

حسرت بغیر "راہبر" کے دھوکے میں پڑے ہوئے ہر ایک "تیز رو" کے ساتھ چلنے کے لئے تیار تھے کیونکہ "تیز روی" خود ان کا مزاج تھی چنانچہ حسرت اکثر ہم کو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں منبروں سے بولتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی آواز کی تیزی یا عزم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں جب سر آغا خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ کانپور کی مسجد کے معاملہ میں لارڈ ہارڈنگ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کا شکریہ ادا کیا جائے تو حسرت نے بڑی شدت کے ساتھ اختلاف کیا اور آخر وقت تک اپنی بات پر اڑے رہے کہ "جمہور مسلمانان ہند" کی موجودہ صورت حال ہرگز ایسی نہیں کہ اس اتفاق

انگیز فیصلہ پر شکریہ ادا کیا جائے اور ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس بمبئی میں ہوا اس میں بھی حسرت اپنی اختلافی تجویز کو پر زور اور بلند آہنگ لہجہ میں پیش کرنے سے باز نہیں رہے۔ کمابیکے سلطانی بدمعاشوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور حسرت کی اختلافی تجویز کے ساتھ ہی اجلاس کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ اس تمام شور و شر کا الزام حسرت کے سر تھوپا گیا لیکن حسرت کے ماتھے پر بل تک نہ آیا۔ انھوں نے "وہ کیا جو ان کے ایمان نے بتایا اور یہ ان کے لئے کافی تھا۔

اسی طرح مجھے یاد نہیں آتا کہ کانگریس کے کسی اجلاس میں حسرت حقیقت کا اظہار اور صداقت کا اعلان کرنے سے باز رہے ہوں۔ چوری چورا کے واقعہ کے بعد جب گاندھی جی نے تپسیا کے طور پر یا مصلحتاً قانون شکنی اور ستیاگرہ کے منصوبہ کو ترک کر دیا تو حسرت گنتی کے چند لوگوں میں تھے جنھوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی اس رائے پر اڑے رہے کہ قانون شکنی کی تحریک کو جاری رکھنا چاہیئے غرضکہ حسرت نے کبھی اپنے کردار کی تردید نہیں کی۔ ان کا اپنا سیاسی تصور کتنا ہی پیچیدہ اور غیر واضح کیوں نہ ہو لیکن انھوں نے اپنی رائے کے اظہار میں کبھی بھی مصلحت کو مخل انداز ہونے نہیں دیا۔ وہ تمام حالات اور مزاحم کے ہوتے ہوئے اور سخت سے سخت مصائب اور آزمائشوں کے سامنے بھی بڑی جرأت اور جانبازانہ خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار نہایت کھلے الفاظ میں کر دیتے تھے دنیا کی زبردست سے زبردست قوت شدید سے شدید خطروں کی دھمکی دے کر بھی حسرت کو ہراساں اور متزلزل نہیں کر سکتی تھی وہ تنہا اپنی ذات سے ایک سیاسی انجمن تھے اور ملک کی ہر سیاسی جماعت سے بالاتر تھے۔ لیکن جب کبھی وہ کسی جماعت کو کسی قدر اپنی تخیل کے قریب پاتے تھے۔ تو اس کو اپنے ساتھ لے لیتے تھے گویا وہ غالب کے اس شعر کے قائل تھے :-

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں   مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا جس کا تذکرہ شاید بے محل نہ ہو ۱۹۳۳ء میں حسرت مستقل طور پر مسلم لیگ میں آ چکے تھے۔ حسب معمول سالانہ حج کو گئے عین حرم میں ہندوستان کا مشہور باغی جلاوطن عبیداللہ سندھی موجود تھا۔ حسرت کو دیکھتے ہی اس نے ان کا گلا پکڑا اور اس طرح

دبایا کہ قریب تھا حسرت کا دم نکل جائے مطالبہ یہ تھا کہ حسرت جیسے باغی نے مسلم لیگ کی شرکت کیوں قبول کر لی۔ عبیداللہ سندھی خونخوارانہ لہجہ میں کہہ رہا ہے کہ آج حرم کے اندر تمہارا خون کردوں گا مگر حسرت کی پیشانی پر شکن تک نہیں ہے وہ یہی کہے جا رہے ہیں کہ "بھئی میری بات تو سن لے" بڑی بڑی مشکل سے حریف نے یہ کہتے ہوئے گلا چھوڑا کہ "اچھا کہو کیا کہتے ہو" حسرت نے کہا۔ میاں شیر اپنے راستہ جا رہا ہے اب اس راستہ پر جس کا جی چاہے آ پڑے اور جتنی دور تک توفیق اور ہمت ہو چلے۔ شیر اپنے راستہ سے ہٹا نہیں اور نہ اس نے کسی کو اپنے راستہ پر آنے سے روکا" یعنی بقول غالب :۔

منت کا کس کو برا ہے بدرقہ   رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

اس کے بعد عبیداللہ سندھی کو خاموش ہی ہو جانا پڑا اور یہ حقیقت ہے کہ حسرت اول سے آخر تک ضد کے ساتھ اپنے راستہ میں ثابت قدم رہے۔

اب یہاں بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر حسرت کا مسلک کیا تھا۔ میں نے حسرت کو باغی کہا ہے ان کا مسلک بغاوت تھا وہ اس وقت تک بغاوت کرتے رہنا بشریت کا فرض سمجھتے تھے جب تک کہ انسان کے فطری حقوق و مطالبات خاطر خواہ پورے نہ ہو جائیں اور جب تک انسانی برکتوں کو حاصل کرنے کے مواقع اور ذرائع عام نہ کر دئے جائیں۔ مگر حسرت چاہتے کیا تھے؟ اس سوال کا جواب ذرا مشکل ہے۔ حسرت کیا نہیں چاہتے تھے یہ تو بہت واضح اور صاف ہے انھوں نے ابتداءً تو کلی برطانوی سامراج کی مخالفت سے اور ۱۹۴۷ء تک ان کو صرف ایک دھن تھی اور وہ یہ کسی نہ کسی طرح انگریز کو ملک سے نکالا جائے وہ انگریز کو شکست دے کر نکالنے کے قائل تھے لیکن جب انگریز اس ملک کو چھوڑ کر چلا گیا تو اس کے بعد بھی حسرت رائج الوقت نظام سے ناآسودہ رہے اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس سے خلق اللہ کی اقتصادی فراغت اور تمدنی بہبود میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں مل سکتی یہ تو تھا ان کے سیاسی مسلک کا سلبی یا تخریبی رخ لیکن جن کا تعمیری تصور اتنا واضح نہیں۔ انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی اشتراکیت یا اشتمالیت چاہتے تھے جس کے لئے وہ شدید عملی بغاوت کو ضروری سمجھتے تھے۔ یہاں اس بات کو بھولنا نہ چاہیئے کہ کمیونزم، بالشویزم اور روس کے نئے نظام پر اردو میں سب سے پہلے حسرت

نے متاثر کن مضامین لکھے اور اپنے اردوئے معلیٰ میں شائع کئے جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حسرت اپنے کو ان اقتصادی تصورات اور سیاسی طریق عمل سے بہت مانوس اور قریب پاتے تھے لیکن حسرت نے اس نئے نظام فکر اور دستور العمل کا کوئی مفصل اور غائر مطالعہ نہیں کیا تھا اسی لئے ان کے تعمیری لائحہ عمل میں نہ تو وہ وضاحت پائی جاتی اور نہ وہ استقامت جو ان کی تخریبی شورشوں کی بہت نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حسرت کا سیاسی شعور اس منزل پر آکر کچھ رک سا گیا تھا جس کو میں نے "بغاوت" بتایا ہے اور جو در اصل تخریبی منزل ہے بالفاظ دیگر حسرت سیاسیات میں کچھ نراجی (ANANCHIST) سے ہو کر رہ گئے مگر ہم کو ان کی کوششوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

آزادی کی جد و جہد کے ابتدائی دور میں حسرت کے کارنامے ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں جس کو تسلیم نہ کرنا بڑی ناحق شناسی ہے انھوں نے آزادی کے لئے بغاوت کا جھنڈا اس وقت بلند کیا جب کہ بغاوت تو ایک طرف آزادی کا لفظ منہ سے نکالتے ہوئے بڑے بڑے سورماؤں کی زبانیں تھرتھرا جاتی تھیں۔ پھر جس سچائی بے باکی اور مستقل مزاجی کے ساتھ حسرت اپنا سر ہتھیلی پر لئے آگے آگے چلتے رہے اس کی داد نہ دینا صریح ظلم ہے ۱۹۰۶ء میں جب سودیشی تحریک شروع ہوئی تو حسرت ان پہلے چند لوگوں میں تھے جنھوں نے اس تحریک پر بآواز بلند لبیک کہا اور اس میں شریک ہوئے اس وقت سے لے کر آج تک سوا اپنے ملک کے بنے ہوئے گاڑھے گزی کے کوئی غیر ملکی کپڑا انھوں نے استعمال نہیں کیا۔

حسرت کو ان کی جانبازیوں کی جتنی داد ملنا چاہیے تھی نہیں ملی اور اہل وطن نے ان کی جتنی قدر کرنا چاہیے تھی نہیں کی۔ اس کا سب سے بڑا سبب خود حسرت کی بے نفسی اور بے ریائی ہے جمہور سے اپنی قدر کرانے اور اپنی قیادت منوانے کے لئے تھوڑی سی خود نمائی اور چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے اور حسرت کو خود نمائی اور چالاکی دونوں میں سے کسی سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا ہے حسرت کی سیاسیات بھی کچھ وجدانی عنوان کی چیز تھی اور شاعری اور تصوف کا انداز رکھتی تھی۔ اسی لئے عوام کے دلوں پر وہ اپنے گہرے اور مستقل نقوش چھوڑ سکے کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ حسرت نے سیاسیات کو بھی ایک قسم کی درویشی بنا دیا تھا

لیکن ان تمام باتوں کو مانتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑے گا کہ حسرت کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی اور ان کے نام اور اثر کو دبانے میں ہمارے ملک کے کچھ مذہبی اور کچھ سیاسی تعصبات اور ابنائے زمانہ کی کم بینی اور ناشناسی کو بھی بہت بڑا دخل ہے ورنہ آزادی کے ایسے پرستار اور اشتراکی جمہوریت کے ایسے فدائی ہمارے ملک میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں۔ حسرت واقعی اپنے راستے سے کبھی ہٹے نہیں ۱۹۴۲ء میں جب کہ تقسیم ہندوستان کی تجویز پر بڑی گرمجوشی کے ساتھ غور کیا جا رہا تھا حسرت نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ پاکستان کے مؤید ہیں لیکن پاکستان ڈومینین کو تسلیم نہیں کرتے وہ پاکستان جمہوریت کے قائل تھے۔ اسی کے ساتھ اردوئے معلیٰ میں انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنا مجوزہ دستور اتحادیہ ولایات ہند شائع کیا جو کسی شاعر یا دیوانہ کا کوئی محض ہوائی قلعہ نہیں تھا بلکہ اس قابل تھا کہ اہل ملک اس پر غور کرتے اور یہ دیکھتے کہ بجنسہ یا ضروری ترمیم کے ساتھ وہ کہاں تک قابل عمل ہے۔ مختصر یہ کہ حسرت اور ان کے سیاسی فکر و عمل ہرگز اس تجاہل یا بے اعتنائی کے سزاوار نہ تھے جو ان کے حق میں روا رکھی گئی۔

حسرت کی زندگی کا ایک رخ ہم کو ایک لاینحل عقدہ معلوم ہوتا ہے ایک طرف تو وہ بغاوت اور انقلاب کے علمبردار نظر آتے ہیں زندگی کے اکثر شعبوں میں وہ مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ نئی معاشرت کے نئے مطالبات کے قائل تھے اور اکثر ان کے مطالبات کے پورا کرنے کے لئے پہلا قدم خود انھیں نے اٹھایا اور روایت پرست اکثریت کے طعن اور طنز و تضحیک کی مطلق پروا نہ کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں وہ شدید انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے تھے جس کی وہ مطبع اور منبر سے برابر بڑے جوش و خروش کے ساتھ تبلیغ بھی کرتے رہے دوسری طرف بعض زاویوں سے وہ خود روایت پرست نظر آتے ہیں بالخصوص مذہبی اعتبار سے وہ ہم کو بڑے کٹر قدامت پرست دکھائی دیتے ہیں یہ سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ حسرت جیسا سرکش باغی اس حد تک مذہبی کیسے رہ سکا۔ جو شخص دنیا کے تمام مروجہ نظام فکر و عمل کو دفتر پارینہ سمجھ کر درہم کر دینے کے درپے ہو اس کو مذہب میں اس قدر غلو کیسے تھا؟ خود انھوں نے بارہا اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک قدامت پرست سنی اور صوفی تھے اور ان کی زندگی کے معمولات اس کی گواہی دیتے ہیں وہ نماز روزہ کے پابند تھے۔ تقریباً ہر سال حج کو جاتے تھے۔ اولیا اور اصفیا کے مزاروں سے ان کو

بڑی عقیدت تھی۔ مذہباً وہ اپنے کو حنفی اور مشرباً قادری کہا کرتے تھے یہی نہیں وہ باضابطہ مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی کے مرید تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر آج تک انھوں نے دوسروں سے مذہب کے متعلق تبلیغی انداز میں کبھی گفتگو نہیں کی۔ ان کو نجی طور پر اپنے مذہبی عقائد وظائف میں جتنا بھی غلو رہا ہو لیکن وہ مذہب کو عام ڈھنڈورے کی چیز نہیں سمجھتے تھے گویا وہ اس معاملہ میں بھی کچے اشتراکی تھے عبادت کے شخصی حق کو وہ تسلیم کرتے تھے مگر عبادت کے لئے وہ وعظ و تبلیغ کے قائل نہیں تھے شاید اسی لئے کہ وہ اس راز سے واقف تھے کہ مذہبی تبلیغ سے سماجی معاملات میں فائدہ سے زیادہ فساد اور نقصان کا ڈر ہے سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک مرتبہ میں نے حسرت سے ان کی مذہبیت کے بارے میں کئی سوالات کئے تھے اور انھوں نے غیر مربوط طریقہ پر جو چند جملے کہے تھے وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں مثلاً انھوں نے کہا تھا کہ :-

"بھئی میرے اپنے عقائد اور اعمال جو کچھ بھی ہوں۔ میں دوسروں کے عقائد اور اعمال کا بھی قائل ہوں بشرطیکہ ان میں خلوص و صداقت ہو"

اور اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک عجیب پرگداز لہجہ میں قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی "لکم دینکم ولی دین" میں نے کہا

"مولانا یہ تو کفار کی ہٹ دھرمی کا آخری جواب تھا"

کہنے لگے میاں سنو!

اپنے مذہب میں ہے اک شرط طریقِ اخلاص　　کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

میں نے کہا "یعنی

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بولے "خوب یاد آیا بالکل یہی بات ہے" اس کے بعد غالب کی شاعری پر بحث شروع ہو گئی۔ ایسا اور موقعہ پر میں نے ان کو پھر چھیڑا تو کہنے لگے "بھئی یہ سب تو ضبطِ نفس اور تزکیۂ اخلاق کے لئے ضروری رسوم و قیود ہیں" یعنی اپنی ذات کی تربیت کے لئے انھوں نے مذہبی فرائض کو بھی بہترین قرار دے رکھا تھا۔ میں اپنے دعوے کی تائید میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے بیک وقت حسرت کی طباعی اور ان کے اصلی میلان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اوائل شباب سے اکثر

دیکھا جاتا تھا کہ وہ نماز بہت جلد ختم کر دیتے تھے جتنی دیر میں دوسرے سورۂ فاتحہ پڑھتے اتنی دیر میں وہ حمد سے لے کر سلام تک تمام تر منزلوں سے فارغ ہو جاتے تھے۔ ان کے بے تکلف دوستوں نے ان سے حیرت کا اظہار کیا تو جواب دیا۔

"جس طرح سے ابجد کے قاعدہ سے لوگوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی عدد ۷۸۶ نکال لی ہے اسی طرح میں نے ان تمام سورتوں اور دعاؤں وغیرہ کے اعداد نکال لئے ہیں جن کی نماز میں ضرورت ہوتی ہے اور انہیں اعداد کو پڑھ دیتا ہوں"

اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب کو انسان کے لئے کس قدر ضروری اور کس قدر سہل سمجھتے تھے وہ بانیٔ اسلام کے قول "الدین یسر" کی مجسم تفسیر تھے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ حسرت کو حیاتِ انسانی کی سچی معرفت حاصل تھی اور یہی ان کا تصوف تھا ورنہ ان کے اندر اتنی فراخ دلی اور ہمہ گیری نہ آتی کہ ایک طرف تو وہ ارکان دین اسلام کے ایسے سخت پابند ہوتے اور دوسری طرف "سری کرشن" سے ان کو ایسی سچی عقیدت ہوتی کہ متھرا اور بندرابن کی زیارت کو وہ اپنی روحانی تقویت کے لئے ضروری سمجھتے۔ میں حسرت کی زندگی کے ان بظاہر متضاد اور متصادم پہلوؤں پر اکثر غور کرتا رہا ہوں اور میں صرف ایک نتیجہ پر پہونچا ہوں یعنی

عاشق ہم از اسلام خراب است وہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

حسرت نے اس شعر کو اپنا عملی نصاب بنایا اور اس کو برت کر دکھایا۔

حسرت نے اردو زبان اور اردو ادب کی جو خدمتیں کی ہیں اور بالخصوص اردو غزل کو انھوں نے جو نئی زندگی اور نیا وقار بخشا ہے اس پر میں اپنے ایک دوسرے مضمون میں اظہار خیال کر رہا ہوں جو صرف حسرت کی شاعری کے لئے وقف ہے۔ یہاں مجملاً اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر حسرت نہ ہوتے تو آج نہ جانے کتنے اردو شعراء کے کارنامے تلف ہو کر رہ جاتے اور ہم ان کے نام تک سے بے خبر رہتے۔ حسرت خود کیسے شاعر تھے؟ اس سے بحث تو دوسرے موقع پر ہوگی۔ یہاں صرف اتنا جتانا چاہتا ہوں کہ حسرت جہاں تک اردو اور فارسی شاعری کا تعلق ہے نہایت وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ انھوں نے متقدمین سے لے کر متاخرین تک تمام معروف اور غیر

معروف شاعروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور شاید ہی ایسا کوئی قابلِ اعتنا شاعر ہو جن کے کلام کا انتخاب انھوں نے اردوئے معلیٰ میں نہ شائع کیا ہو۔ اس وسعتِ مطالعہ نے خود ان کے نفسِ شعری کی تربیت اور تہذیب میں بہت بڑا حصہ لیا ہے میر اور غالب سے لے کر جرأت اور امانت تک سبھی کے کلام کو انھوں نے پڑھا اور سبھی کے انتخاب انھوں نے چھاپے جو کشادہ دلی اور وسعتِ نظر زندگی کے اور شعبوں میں ان کو حاصل تھی وہ ان کے مذاقِ شعری کی بھی عام خصوصیت نظر آتی ہے اور زندگی کے اور شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی یہی ان کی سب سے بڑی قوت اور سب سے بڑی کمزوری تھی۔

غرضکہ حسرت اپنے زمانہ میں اپنی نوعیت کے بالکل اکیلے انسان تھے۔ ایسی بالغ اور کھری شخصیت کا دوسرا انسان ہندوستان کے کسی فرقہ میں پیدا نہیں ہوا۔ حسرت کے خیالات اور ان کی عملی تجویزوں سے ہم کو جس قدر بھی اتفاق یا اختلاف ہو بہرحال ماننا پڑے گا کہ وہ بڑے مخلص اور پاک طینت انسان تھے۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

مجتبیٰ حسین

دورِ حاضر اور غزل

آج کل بعض حلقوں میں یہ بات بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ ہمارے شعرا غزل کی طرف پھر لوٹ رہے ہیں اور غالباً اس طرح اپنے گزشتہ گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں اس سے پہلے کہ ہم اس رجحان کا جائزہ لیں ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ بیان کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔

جہاں تک نظم نگار شعرا کا غزل کی طرف لوٹنے کا سوال ہے (کیونکہ غزل گو شعرا کا غزل کی طرف لوٹنا کوئی معنی نہیں رکھتا) یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ پرانے شعرا میں جوش ملیح آبادی اب بھی نظم ہی کہہ رہے ہیں نئے شعرا میں مجاز، فیض، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، معین احسن جذبی، روش صدیقی وغیرہ ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ اب تک نظم ہی کی صورت میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھار انھوں نے چند نرم گرم غزلیں کہہ ڈالیں ہیں بالکل نئی پود میں علی سردار جعفری (ان کی شاعری دراصل نئی دنیا کو سلام کے بعد سے شروع ہوتی ہے) کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، حامد عزیز مدنی اور بہت سے دوسرے شاعر بھی نظم ہی کہہ رہے ہیں اور ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیت نظم ہی کے ذریعہ سے جھلکتی ہے۔ ان نظم نگار شعرا کے علاوہ اور دوسرے شاعر بھی نظم ہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ باقی ماندہ شعرا ایسے ہیں کہ ان کا غزل کی طرف لوٹنا اور نظم کی طرف بڑھنا کوئی اہمیت مشکل ہی سے رکھتا ہے۔ غرضکہ وہ تمام شعرا جو نظم کہتے چلے آئے ہیں ان کی ادبی زندگی کی اہمیت نظم کی وجہ سے ہے

اور ان میں سے شاید ہی کوئی شاعر غزل کی طرف لوٹا ہے کہ اس کی نظم نگاری غزل گوئی کے مقابلے میں دب گئی ہے یا کم رتبہ ہو گئی ہے۔

اب رہ گیا پرانے غزل گو شعرا کا معاملہ تو ان کے ساتھ اس قسم کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا حسرتؔ یگانہؔ، فانیؔ، جگرؔ، فراقؔ۔ یہ تمام شاعر عمر بھر غزل ہی کہتے رہے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض شاعروں نے تو نظم کی طرف توجہ کی ہے۔ فراقؔ کبھی کبھی نظمیں بھی لکھتے رہے ہیں اور ادھر تو ان کی نظموں کے مقابلہ میں ان کی غزلیں پرانی معلوم ہونے لگی ہیں۔ جگرؔ جو کٹر غزل گو ہیں انھوں نے بھی نظم کا سہارا لیا ہے یہی نہیں انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ؎

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

یہ مصرع محض ایک شاعرانہ رو یا وقتی جذبہ کے ماتحت نہیں لکھا گیا ہے۔ اس میں سنہ ۴۷ء کے بعد کے واقعات کا وہ شدید کرب ہے جس نے جگرؔ کی دنیائے حسن و عشق کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ ایک طرح سے ان کی شاعری کی وفات ہے۔ تیس چالیس سال کی مشق پر جگرؔ نے جس طرح لکیر کھینچ دی وہ حالات کی سفاکی اور جگرؔ کی بے دریغ حقیقت شناسی کا پتہ دیتی ہے یہ ایک اضطراری عمل نہیں ہے اس کی پشت پر ان سماجی اور معاشی قوتوں کا ہاتھ ہے جو اجمال کی جگہ تفصیل اور تجزیے کا تقاضہ کر رہی تھیں نئے غزل گو شعرا بھی غزل ہی کہتے رہے وہ کبھی نظم کی طرف نہیں بڑھے چنانچہ "لوٹنے" کا سوال یہاں بھی نہیں پیدا ہوتا۔ یہی حال جدید ترین غزل گو شعرا کا ہے۔ انھوں نے بھی غزل کو اپنے مزاج اور خیالات کے اظہار کے لئے موزوں ترین صنعت سمجھ کر اپنایا۔ ان جدید ترین غزل گو شعرا میں بھی معدودے چند ایسے ہیں جن میں اچھی غزل کہنے کی صلاحیت مل سکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی حفیظ ہوشیارپوری اور عدمؔ سے لے کر مجروحؔ سلطان پوری اور سلیم احمد تک کسی بھی شاعر کی آواز ایسی نہیں ہے جو غزل کو اس مقام سے آگے بڑھا سکے جہاں فراقؔ نے اسے لاکر چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے کچھ تقریباً پختگی کو پہونچ چکے ہیں اور بعض ابھی ابتدائی مدارج سے گزر رہے ہیں۔

یہ تو ہوا اس بیان کا ایک مختصر سا جائزہ کہ ہمارے شعرا غزل کی طرف لوٹ رہے ہیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں بعض حضرات کی خوش فہمی یا "خود فہمی" کا حقیقت شناسی سے زیادہ دخل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیان کا مقصد یہ ہے کہ نظم کا دور ختم ہو چلا ہے اور غزل پھر حاوی ہوتی جا رہی ہے

اور جدید ترین شعرا بڑی تیزی سے غزل کی طرف بڑھ رہے ہیں یا لوٹ رہے ہیں، تو اس میں بھی "افسانہ طرازی" اور صورت حال سے بے خبری کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے کسی ادبی رسالے کو دیکھ لینے سے یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ یہ خیالات صحیح نہیں ہیں۔

ان تمام امور کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غزل اور نظم کے مسئلہ پر "موازنۂ انیس و دبیر" قسم کی کوئی بحث چھیڑی جائے یا غزل کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز کر دیا جائے۔ شاعری میں مختلف اصناف کا مختلف درجہ، نوعیت اور حصہ ہے ان کے تعاون سے پوری شاعری میں ہر جہتی ترقی اور متنوع فضا پیدا ہوتی ہے ایک صنف دوسرے کی حریف نہیں ہوتی اور نئے تجربات کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے تاکہ ان اصناف سے بہتر سے بہتر کام لیا جا سکے۔ قصیدہ سلاطین اور امرا کی بے سر و پا مدح خوانی کے لئے رفتہ رفتہ وقف ہو کر اپنی کشش اور صداقت کھو چکا تھا اس سے آج بالکل نیا کام لیا جا سکتا ہے اس میں عوام کی جد و جہد اور عوامی رہنماؤں کے کارناموں کا تذکرہ بڑی شان و شوکت اور طمطراق سے کیا جا سکتا ہے اس میں صداقت اور خلوص، نیا ادراک اور شعور ہوگا یہ شاعری کے لحاظ سے بھی جائز اور سچا کارنامہ ہوگا۔ اس میں عظمت آدم کی روح دوڑنے لگے گی۔ قصیدہ کا یہ نیا استعمال ہمارے ہاں شروع بھی ہو چکا ہے۔ جوش کی کئی نظموں میں ہمیں یہ احساس ملتا ہے۔ اسی طرح مثنوی سے بھی اس زمانہ میں بڑا اچھا کام لیا جا رہا ہے۔ اقبال۔ جوش اور بالخصوص کیفی اعظمی اور سردار جعفری نے اس صنف میں پائے کی شاعری کی ہے جن اور پریوں کی جگہ اب کارخانہ کے مزدور اور کھیت کے کسان آ گئے ہیں طلسمی فضائیں کارزار حیات میں بدل گئی ہیں۔ غرضکہ کوئی صنف ذاتی پسند یا ناپسندیدگی کی بنا پر رد نہیں کی جا سکتی۔ نہ خود بخود بیکار ہو جاتی ہے۔ شاعر اسے اپنی اپنی بساط کے مطابق بلندی و پستی کی طرف لے جاتے ہیں یہ بات دوسری ہے کہ بعض اصناف میں نسبتاً زیادہ ترقی کے امکانات اور خیالات کے اظہار کی قوت پائی جاتی ہے۔ اپنی ہیئت صنفی مطالبات زبان اور بیان کے اصول اور قواعد کے لحاظ سے ان اصناف کی حدیں ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں امتیاز باقی رہتا ہے اور یہی چیز انہیں "سکہ رائج الوقت" بنائے رہتی ہے ان کی مقبولیت زمانہ کے تغیرات کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ مختلف اصناف سخن کو بروئے کار لانے کی بحث کو توہمات اور تعصبات سے بری رکھیں ورنہ ہمارے ادبی سرمائے میں بھی اضافہ کے بجائے کمی ہوتی جائے گی۔ لہذا جب بعض حلقوں سے یہ آواز اٹھتی ہے وہ خود

اپنے ادب کی سمت اور اس کی رفتار سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی چونکہ یہ نہ صرف ہمارے ادب کے ایک موڑ، ایک رجحان کا مسئلہ ہے۔ بلکہ اس کا تعلق ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے ہے اس لئے کہ ادبی رجحانات اور میلانات بغیر خارجی اسباب کے پیدا نہیں ہوتے۔ ہمیں رجحانات کا جائزہ لینا چاہیئے اور تمام باتوں سے قطع نظر یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ آج غزل کس طرح آگے بڑھ سکتی ہے۔ خواہ شعراء غزل کی طرف لوٹ رہے ہوں یا نہ لوٹ رہے ہوں فی الحال ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ لوگوں کی توجہ غزل کی طرف بڑھ گئی ہے اور غزل اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر پا رہی ہے مگر یہ "خوش خبری" اسباب وعلل کے تذکرے کے بغیر سود مند نہیں ہو سکتی۔ اس سے کچھ غلط فہمیوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ . . . .

. . . . ازالہ ممکن نہیں! دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ رجحان پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے آیا یہ رجحان غزل کے امکانات اور زمانہ کے مطالبات کو اچھی طرح سمجھ کر پیدا ہوا ہے — یا یوں ہی۔ برائے غزل ہے اس میں صحت مندی کے آثار پائے جاتے ہیں — یا یہ زوال پرستی کی نشانی ہے۔ اگر اس رجحان میں وہ توانائی ہے جو معاشرے کی ناانصافیوں کو شعوری طور پر سمجھ کر دور کرنے میں کوشاں رہتی ہے۔ تو یہ غزل کے لئے فال نیک ہے اس لئے کہ عشقیہ شاعری ہو یا دوسری شاعری اگر اس میں معاشرے کی ترجمانی نہ ہو تو نحس اور بیمار ہو کر رہ جاتی ہے۔ آج کی دنیا میں یہ مطالبہ ناگزیر ہو جاتا ہے — اب محض ترجمانی سے شاعر اپنی شاعری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اسے اس طرف بھی بڑھنا پڑے گا — جہاں معاشرہ طبقاتی نزاع اور تضاد سے آگے بڑھ کر محنت اور عمل کی دنیا میں قدم رکھتا ہے اس کے برعکس اگر یہ رجحان زندگی کے حقائق سے گریز اور فرار کی بنا پر پیدا ہوا ہے تاکہ غزل کی خواب آور فضا میں شاعر کو پناہ مل سکے تو یہ غزل اور معاشرے دونوں کی بدقسمتی ہے۔ یہ شاعر کی شکست ہے۔ اس کے فن کی کمزوری۔ اس کی سہل نگاری ہے (حالانکہ غزل لکھنا بڑی مشکل چیز ہے) وہ غزل کی طرف اس واسطے آیا ہے کہ اس کے یکسر داخلی ہیجانات کی غزل کے ذریعہ جھوٹی سچی تسلی ہو جائے۔

درایں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

صراحیٔ مے ناب و سفینۂ غزل است

یہ گوشہ گیری ادب کے حق میں کبھی مفید نہ ہو سکی اور اس رجحان سے وہی لوگ خوش ہو سکتے ہیں جنکا

ذاتی سرمایۂ فکر کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ جنھیں نہ ادب سے واسطہ رہا نہ زندگی سے ؎

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین۔ اس نوعیت سے اگر ہم اس رجحان کا مطالعہ کریں جو جدید ترین شعرا میں نمایاں ہو رہا ہے تو ممکن ہے ہم کسی نتیجہ پر پہونچ سکیں۔ جدید ترین شعرا کا یہ گروہ تقسیم ہند کے بعد ہی سامنے آتا ہے دوسرے شاعروں کے سلسلہ میں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ان کی نظم گوئی یا غزل گوئی جیسی تھی ویسی ہے۔ ان شاعروں پر بحث کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ آن پڑی ہے کہ ابھی یہ بلوغ غزل تو درکنار "غزل" کی حد میں داخل نہیں ہو سکے ہیں۔ انھوں نے مشکل سے چار پانچ اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ابھی ان کے اشعار کی پسندیدگی چند مخصوص حلقوں سے نکل کر عام نہیں پہنچ سکتی ہے کہ ان کے اشعار کو خواہ آپ پسند کریں یا نہ کریں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ابھی تو ان سے قوی امید بھی وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ بہرصورت ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہمیں جدید ترین شعرا کے کلام میں اس قسم کے اشعار ملنے لگتے ہیں ؎

نہ زادِ راہ نہ رہبر نہ منزلِ مقصود
عجیب شان سے یاروں کا قافلہ نکلا
سلیم احمد

دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا! — شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو رہروؤں نے — رستے میں جما لئے ہیں ڈیرے
ناصر کاظمی

اس طرح کے اور بہت سے اشعار فساد سے متاثر ہیں۔ اس زمانہ میں نئے اور پرانے شاعر اسی موضوع پر لکھ رہے تھے جگر کی غزلوں سے لے کر ساحر لدھیانوی کی "دیوانوں پہ کیا گزری" والی غزل تک یہ اثرات شدید طور پر نمایاں ہیں ؎

میرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو اب بھی ہے — مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری
ساحر

جب فسادات کے اثرات کم ہونے لگے تو رفتہ رفتہ یہ شاعر اپنی اپنی غزل کی طرف لوٹ آئے۔ اور یہ حال ہو گیا ؎

دن بھر تو چلے اب ذرا دم لے کے چلیں گے
اے ہم سفرو! آج یہیں رات گزارو
ناصر کاظمی

یاس کے بارے تھک کر آخر بیٹھ گئے سستانے!
ڈھیے ہائے ٹوٹ نہ جائیں پریت کے تانے بانے — ڈاکٹر مسعود حسین

ان شاعروں کے علاوہ ان سے پہلے کے شعراء مثلاً عدمؔ اور سیفؔ وغیرہ "ساز و نیاز" اور بادہ ساغر میں پھنسے رہے ہے

شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آسکیں
وہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے

اور علامہ صاحب فرماتے ہیں ہے

صلائے عام لے کر آگئی ہیں
گھٹائیں جام لے کر آگئی ہیں

اِدھر تو گردشِ ایام کیسے آنکلی
یہ میکدہ ہے یہاں دورِ جام چلتا ہے

جدید اور جدید ترین دونوں قسم کے غزل گو ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں، شراب و شاہد کی بے جان تمناؤں سے آگے نہیں بڑھ سکے ـــــ یہی حال کم و بیش ان تمام شاعروں کا اب تک ہے ان میں سے بعض شاعر ایسے تھے جنہوں نے غزل سے کچھ نیا کام لینا چاہا تھا مگر وہ بھی بھاگ نکلے ہے

وہ فاقہ کش جو کبھی عقیدوں کی داستانوں سے دم بخود تھے
انہیں اس انداز کے فسانوں سے آج بہلا سکو تو جانیں — عارف عبدالمتین

یہ رنگ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ بسنہ ۱۹۵۱ء میں یہ رنگ ہے ہے

نظر نظر سے ملاؤ تو کوئی بات بنے
حجابِ ناز اٹھاؤ تو کوئی بات بنے

مجروح سلطان پوری تو ضرور آہستہ آہستہ غزل میں نئے خیالات اور علامتیں لانے کی کوشش میں مستقل مزاجی سے جٹے ہوئے ہیں مگر ابھی ان کا نیا رنگ قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکا ہے۔

اب ذرا چند نئے یا پرانے تجربات بھی دیکھتے چلئے ہے

پھر کوئی شعلہ کار گزرے ہے
جانے کیا دل کے پار گزرے ہے
بجلیاں آسماں سے گرتی ہیں
کون یہ بے قرار گذرے ہے
قیوم نظر

قافلے کتنے پیش و پس گذرے
میری واماندگی پہ ہنس گذرے
اب تو یاد ان کی دل میں آتی ہے
جیسے بجلی بہ نفسِ خس گذرے
مجید امجد

ان جدید ترین غزل گو شعراء کا کم و بیش یہی حال ہے، داخلی پسپائیاں، انفعالیت بے بسی حقایق سے چشم پوشی اور فرار ان کے موضوعات ہیں۔ فن کے اعتبار سے اکثر غزلیں ناقص، الجھی ہوئی اور غلط ہیں دو ایک شاعروں کو چھوڑ کر تمام تر نئے غزل گو غزل کے امکانات، غزل کے مزاج، زمانے کے مطالبات، اپنے ادب کے سرمائے سے غافل ہیں ـــ غزل اب تک ایک قدم ایسا نہ اٹھا سکی جو حسرت یگانہ، فانی، جگر اور فراق سے آگے ہو ایسی صورت میں یہ امر کہ غزل پھر زندہ ہو گئی ہے جسارت سے معلوم ہوتا ہے ـــ اور غزل کی طرف لوٹنے کا یہ رجحان جدید شعراء کی سہل پسندی مجہولیت اور معاشرہ کے حسن و قبح کو دریافت کرسکنے کی کاوش سے گریز کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ـــ اگر ایسا ہے تو یہ رجحان بہت مہلک ہے ـــ "یہ غزل اور ہمارے نئے شعور دونوں کے منافی ہے یہ غزل دوستی" ٹھیک معلوم ہوتی

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم
کہ با من کرد انچہ آشنا کرد

اگر جدید ترین غزل گوئی کا یہی عالم رہا تو ہمیں یقیناً غزل کے مستقبل سے مایوس ہونا پڑے گا یہ سوچ کر ہم مضمحل ہو جاتے ہیں لیکن غزل کی لچک اور سخت جانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل کو زمانہ کے ساتھ لے چلنا ناممکنات سے نہیں لیکن یہ ایک مشکل مرحلہ ہے اور ہمیں غزل اور دورِ حاضر کے تمام تقاضوں کو پرکھنا ہوگا اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ آج غزل کس حد تک ہمارا ساتھ دے سکتی ہے ـــ اصل مسئلہ یہی ہے

یہ نہیں کہ لوگ غزل کی طرف لوٹ رہے ہیں ۔ یا بڑھ رہے ہیں —— بغیر سوچے سمجھے اس رجحان کی طرف داری کرنا یا اسے قبول کرنا کوئی مستحسن فعل نہیں ہے ۔

بہتر ہوگا اگر ہم اس ردعمل کو ایک نظر دیکھ لیں جو حالی اور آزاد کے زمانہ میں غزل کی طرف سے ہوا تھا حالانکہ یہ ردعمل حالی اور آزاد سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور بعض شعرا غزل کی تنگ دامانی کو شدت سے محسوس کرنے لگے تھے — مگر غدر کے بعد جاگیرداری کے ضعف و اضمحلال اور غیر ملکی سرمایہ داری کی دخل اندازی سے غزل ملکی حالات اور تصورات کی ترجمانی کے لئے ناکافی ہو چکی تھی ۔ جاگیرداری کا زوال ہندوستان میں یک بیک اور قطعی طور پر نہیں ہو سکا ۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی اس عہد میں گھریلو اور قصباتی دستکاری کی وسعت اور گہرائی کے باوصف مشینی دور تک نہیں پہونچ چکی تھی اور ابھرنے سے قبل ہی غیر ملکی استحصال کا شکار ہو گئی ... —— چنانچہ یہ امر قابل غور ہے کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب لانے میں ہندوستان کی دولت کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے ۔ ہندوستان میں جاگیرداری کے زوال کے بعد کوئی صنعتی انقلاب اس لئے نہیں آسکا کہ غیر ملکی حکمرانوں نے اسے اپنا ایک مقبوضہ بنا لیا تھا —— اور جاگیرداری انگریزی سامراج کے سائے میں گھسٹتے گھسٹتے آج بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے —— آج بھی اس ملک کے بہت سے حصوں میں نیم مقبوضاتی اور نیم جاگیری ڈھانچہ برقرار ہے بہرحال غدر کے بعد جاگیری معاشرے کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا اور اس میں بہت سی نئی طاقتیں ابھرنے کی کوشش کرنے لگیں ، جو اب تک سوئی ہوئی تھیں ۔ نئی تعلیم نئے مسائل منتظم اور نوکری پیشہ طبقے نے ملک کو غور و فکر کی بالکل نئی راہ پر ڈال دیا تھا —— جاگیرداری نے جو حدیں قائم کر رکھی تھیں وہ ٹوٹ گئیں ۔ نوابوں اور جاگیرداروں کے علاوہ زیادہ اہم قسم کے آدمیوں کی جماعت سامنے آگئی —— یہ جماعت برطانوی سرکار اور یہاں کے عوام کے درمیان ایک رابطہ بن کر آئی یہ نظم و نسق قائم رکھنے میں مدد دیتی رہی اس طرح ایک محدود قسم کا (Mass Contact) رابطۂ عامہ شروع ہوا جو جاگیرداری عہد کے مقابلہ میں عوام کی طرف زیادہ بڑھا ۔ غزل (Mass Contact) کی تاب نہ لا سکی اور نہ نئے معنویات اور مسائل کی وہ متحمل ہو سکتی تھی اسی لئے اسے نئی شاعری کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی ۔ حالی اور آزاد کی کوششیں محض ایک جدت طرازی نہیں تھی —— یہ زمانے کی ضرورت تھی حالی نے مسدس لکھ کر ہمارے سامنے ایک قد آدم آئینہ رکھ دیا جس میں ہم اپنے خد و خال دیکھ

سکتے تھے اور جب لوگوں کو اپنی شکل بگڑی نظر آئی تو وہ بہت چراغ پا ہوئے ـــ مگر مسدس حالی کے آئینہ پر گرد و غبار نہ آسکا وہ اسی طرح حالات کی عکاسی کرتا رہا ـ شعرا دھیرے دھیرے نظم کی طرف بڑھنے لگے ـــ سیاسی شعور بڑھنے لگا۔ مغربی ادبیات کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے جمہوریت کا احساس اور معاشی انصاف کا تقاضا زور پکڑنے لگا ـــ اکبر۔ اقبال۔ جوش کے دور تک آتے آتے ـــ ایک نئی قسم کی نظم نگاری جو مغرب کے ادبی اصولوں سے بڑی حد تک متاثر ہوئی تھی وجود میں آگئی ـــ اس کے بعد کے حالات ہم سب جانتے ہیں، یہ نظم نگاری جو قطعاً جدید تقاضوں کی پیداوار تھی اگر برنائے حدت ہوتی تو زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی تھی ـــ یہ آج بھی ہمارے شعری ادب پر چھائی ہوئی ہے اس میں روز نئے تجربے ہو رہے ہیں اور یہ نئے تقاضوں کو جذب کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتی، ایسا نہیں ہے کہ اقبال اور جوش کے دور میں غزل خاموش ہو گئی تھی اس میں حسرت یگانہ۔ فانی اور فراق جیسے شاعر پیدا ہوئے ـــ زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ غزل بھی تغیرات سے دوچار ہوتی گئی ـــ اور حتی الامکان نئے عشقیہ مزاج اور سماجی حالات سے ہم آہنگ ہوتی رہی ـــ ہمارے یہاں کوئی ایسا صنعتی انقلاب نہیں آیا جس سے جاگیرداری یکسر ختم ہو جاتی ـــ اسی لئے شاعری کی قدروں میں بھی آہستہ آہستہ تغیر آتا گیا۔ اور غزل کو کسی ایسے دوراہے پر نہیں آنا پڑا جہاں وہ بالکل نئے انداز میں سامنے آسکتی یہ سست روی غزل کے حق میں کافی مفید تھی اس دوران میں اس نے سیاسی خیالات سے لے کر عشقیہ زندگی تک کی ترجمانی کی ـــ مگر اپنے رکھ رکھاؤ میں فرق نہ آنے دیا ـــ [60] اقبال نے جو غزلیں کہی ہیں وہ غزل کے مطالبات کے منافی نہیں ہیں، فراق نے غزل کو نئی زندگی سے ربط دینے کی جو کوشش کی ہے وہ غزل کے اتنے بڑے تعمیری امکانات کی حامل ہے کہ اس کے سامنے بڑے سے بڑے غزل گو شاعر کی تکمیل کبھی کبھی چھوٹی معلوم ہونے لگتی ہے مگر غزل کے یہ تمام تعمیری امکانات اور اس کو آگے بڑھانے کی کوششیں ایک منزل پر آکر جیسے رک گئی ہیں، آخر اس کی وجہ کیا ہے اس کے لئے ہمیں غزل کے مختلف امکانات کی طرف توجہ لازمی ہے تاکہ غزل کی تمام خامیاں اور خوبیاں ہمارے سامنے آسکیں ـــ اور ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ غزل ۵۰ء کے بعد سے اب تک نظم کے مقابلے میں کیوں پیچھے پیچھے چل رہی ہے جہاں تک غزل کی خوبیوں کا تعلق ہے ہمیں یہ ماننے میں مطلق

نال نہ کرنا چاہیئے کہ غزل ہمارے ادب کا آج بھی سب سے بیش بہا سرمایہ ہے جتنی طویل مدت تک
غزل نے ہمارے ادب کی خدمت کی ہے کسی اور صنف سخن نے مسلسل اتنی خدمت نہیں کی ہو
غزل نے ہمیں الفاظ کے جادو ان کے استعمال کے سلیقے ان کے مختلف مدارج اور ان کے معاشرتی
ربط سے آگاہ کیا۔ سینکڑوں ترکیبیں اسلوب بیان کے ہزاروں طرح ڈھلے ڈھلائے برجستہ مصرعوں
اشارات، کنایات، تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ اس نے ہمارے ادب کو وسعت دی اس میں
ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور ایک ایسی لازوال دولت چھوڑ گئی جو خرچ
کرنے پر بڑھتی ہی رہی احساسات اور جذبات کی انتہائی نازک منزلوں سے غزل جس سلامت روی
اور کامیابی کے ساتھ گذری ہے — یہ بات کسی اور صنف سخن میں بہت کم پائی جاتی ہے اس نے
مجموعی اور مرکزی تاثرات اور تصورات کو دو مصرعوں میں کامیاب ترین اور حسین ترین انداز میں سمیٹ
لینے کی کوشش کی ہے۔ اس نے ایجاز و تعمیم کے ایسے مظاہرے کئے ہیں جس کے سامنے بعض
اوقات اور اصناف سخن کی فنکاریاں پھیکی پڑ جاتی ہیں غزل آج بھی ہمارے شعری مزاج میں رچی
ہوئی ہے — اس لئے کہ اس نے ہمارے معاشرے کی کم و بیش ڈیڑھ صدی تک بھرپور اور نہایت
اہم ترجمانی کی ہے — غزل کی ان فتوحات سے انکار اپنے ادب کی تاریخ سے انکار ہوگا —
لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود غزل کی اپنی حدیں اور چند دقتیں ہیں۔ غزل نے احساس اور خیالات
کی ادائگی کے سلسلے میں اپنے ڈھلے ڈھلائے مصرعوں اور ترکیبوں — علامتوں اور روایتوں کے
توسل سے ہمیں جو آسانیاں فراہم کی ہیں وہ ہمارے حق میں بسا اوقات مضر بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔
ذرا سی توجہ کے بعد نوآموز شعرا بھی ایسی غزلیں اور اشعار کہہ سکتے ہیں جن پر اچھے اور پرخلوص اشعار
کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اس نے نئے تجربات اور نئے خیالات کو نہ صرف بڑی حد تک روکا ہے بلکہ اگر یہ
آئے بھی ہیں تو رسم و روایات کی نظر ہو کر رہ گئے ہیں۔ نظموں میں بھی اس سہل پسندی سے اب
کام لیا جاتا ہے اور لیا جا رہا ہے — مگر نظموں میں خیالات اور احساسات کی سطحیت اور نقالی فوراً نمایاں
ہو جاتی ہے۔ غزل کی طرح یہاں "حجابات" نہیں ہیں جو پردہ پوشی کر سکیں۔ اس کے علاوہ نظموں میں
...قت نئے تجربات کی گنجائش باقی رہتی ہے — غزل میں اس قسم کی لچک تقریباً مفقود ہے
...ت کرنا کہ کس حد تک غزل کے شاعر نے "سچ" سے کام لیا ہے اور کس حد تک اس نے اپنے

"جھوٹ" کو دوسرے غزل گو شعرائے "سچ" میں لپیٹ کر پیش کیا ہے۔ غزل کے سلسلے میں مشکل چیز ہے۔ غزل نے ایک ایسی عام عشقیہ فضا تیار کر دی ہے جس میں کافی عرصہ تک نقلی عشقیہ شاعری سانس لے سکتی ہے۔ اس میں جذبات کی نقالی یا غلط تعبیروں کا اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچھا غزل گو ان روایات اور علامات سے بالکل نیا کام لے سکتا ہے ان کی رگوں میں خون تازہ دوڑ سکتا ہے۔ ان علامات اور روایات کے سہارے شاعری بڑے بڑے مراحل آسانی سے طے کر سکتی ہے ـــ بعض مطالب جن کے لئے شرح و تفصیل کی ضرورت پڑتی ہے ان کے ذریعہ نہایت خوبی سے شعر میں "کھنچ" آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ روایتیں اور علامتیں قاری اور شاعر کے درمیان ایک قسم کا ربط ہوتی ہیں ان کی وجہ سے بہت سی یادیں جاگ اٹھتی ہیں اور ہمارے ذہن کی نئی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں ـــ یہ ہمارے ادبی تاریخ کی بھی ایک کڑی ہوتی ہیں ـــ یہ سب صحیح مگر غزل کا دائرہ بہت محدود ہے اور اس سے باہر قدم نکالنے کی وہ جرات نہیں کر سکی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ سیتا کی طرح راون کے دیس میں نہ پہونچ جائے وہ شے جسے تغزل کہتے ہیں اگر غزل میں نہ پایا جائے تو غزل غزل نہیں رہتی کچھ اور بن جاتی ہے اس کے علاوہ غزل پر روایات کا اتنا بوجھ ہے کہ نئے سے نیا لفظ نئے سے نئے خیالات اس کے نیچے آکر دب جاتے ہیں اور "کہنے کی" ہر بات غزل ہو کر رہ جاتی ہے۔

غزل نے خیالات اور احساسات کو پیش کرنے میں ایجاز اور تعمیم سے کام لیا ہے ـــ یہی وصف اس کا نقص بھی بن جاتا ہے ـــ یہ زندگی کی ایک رخی اور بڑی حد تک غیر واضح نقد یر کشی ہو کر رہ جاتی ہے۔ زندگی کے ہزار ہا مسائل ایسے ہیں جو دو مصرعوں میں نہیں بیان کئے جا سکتے ـــ زیادہ سے زیادہ ان کی طرف ایک اچٹتی سی توجہ دلائی جا سکتی ہے اور یہ توجہ بھی تعمیم کی وجہ سے "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا" بن جاتی ہے۔ غزل کی آفاقیت بڑی اہم سہی مگر اس سے حقایق کی شکل مسخ بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بہت سے اشعار اپنے اطلاق کے لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں مگر یہی وسعت ہمارے خیالات کو مختلف طرف بھٹکا سکتی ہے مثلاً غالب کا یہی مقطع لے لیجئے ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے   بے سبب ہوا دشمن، غالب آسماں اپنا

اس میں غالب یا کسی دوسرے فرد کی زندگی کے کسی مخصوص واقعہ اور سانحے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے اور اسے سیاسی معنوں میں بھی پھیلایا جا سکتا ہے "آسمان" ایک ظالم اور جابر حکومت کی علامت کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ غزل کی یہ تہہ گیری آج اصل واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کرتی رہتی ہے زندگی کی بے پایاں قوت کے سامنے اس کا جادو جھوٹا پڑ جاتا ہے۔ رزمیہ یا ڈرامائی شاعری جتنے بڑے پیمانے پر زندگی کی ہر کش مکش کو پیش کر سکتی غزل اس سے قاصر ہے اور نہ غزل سے اس کا تقاضا کیا جا سکتا ہے۔ غزل اپنی تکنیک اور ہیئت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ اپنا سروکار زندگی کے مختلف "زاویوں" ہی سے رکھے —— یہ زاویئے بہت دلکش، بڑے پُر اسرار اور روشن ہوتے ہیں۔ ان سے جو تصویریں بنتی ہیں ان کا حسن اور ان کی رنگ آمیزی مسلّم زندگی سے ہر لمحہ آگے بڑھتی ہی زندگی کو ہمیشہ ایک خانہ میں بند کرنے کی کوشش نہ سود مند ہو سکتی ہے نہ کامیاب اور یہاں پہونچ کر غزل اور دور حاضرہ کا سوال پوری طرح ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ہمیں اپنے زمانہ کے تقاضوں اور غزل کے امکانات کا پورا جائزہ لینا پڑتا ہے — ہماری زندگی میں معاشی اور سماجی تبدیلیوں کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے۔ نئے علوم و فنون نے ہمیں ایک سائنٹیفک نظریہ دیا ہے۔ آج ہمارے مزاج میں جذباتی ابہام کم ہے اور عقلی وضاحت زیادہ ہے۔ ہماری زندگی مشینی دور سے بے انتہا متاثر ہے۔ ریل، ڈاک، ہوائی جہاز، ٹرام، موٹر بس "ایکسرے" اور تجربہ گاہوں کی نلکیاں ہمارے لئے نہ صرف بڑی اہمیت رکھتی ہیں بلکہ ہماری زندگی کا اہم ترین جز بن گئی ہیں۔ شاعری اس دور میں اس جادو کے سہارے آگے نہیں بڑھ سکتی جو صنعتی دور میں ہمیں مسحور کر دیا کرتا تھا —— اب اسے "ورکشاپ" اور کھیتوں میں جانا ہوگا۔ عوامی جدوجہد میں شریک ہونا ہوگا۔ سائنس کی تجربہ گاہوں سے بھی صاحب سلامت کی ضرورت ہوگی۔ غزل کے حنائی ہاتھوں میں غالباً انجکشن کی سوئیاں ابھی نہ معلوم ہوں —— رہ گئی عشقیہ شاعری وہ بھی آج جاگیری اور سرمایہ داری اقتدار سے ہٹ ہی کر ہو سکتی ہے سماجی اور سیاسی حالات آج غیر واضح اور غیر یقینی نہیں۔ فراقؔ اور دوسرے غزل گو شعرا کے دور تک غزل اس حد تک پہونچ چکی تھی ؎

رُکی رکی سی شب ہجر ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
فراقؔ

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
فراقؔ

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرق ناز و نیاز بھی
کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہو
فراقؔ

یہ رات اندھیری ہے مگر اے غم فردا
سینوں میں ابھی شمع یقیں جاگ رہی ہے
فراقؔ

ہزاروں بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی
فراقؔ

اس قسم کے بہت سے اشعار اسی زندگی کی حرارت اور جستجو لیے ہوئے ہیں جو برطانوی سامراج سے سرگرم ستیز بھی. ان میں خر سودگی اور جمود نہیں ہے ان کی تعمیر میں جدید عشقیہ مزاج اور سماجی حالات کا ہاتھ ہے. لیکن اس قسم کی غزل گوئی اس وقت تک تو کامیابی سے چلتی رہی جب تک ہماری قومی جدوجہد دیوالیہ نہیں ہوگئی — اور اس میں عزم اور جذبۂ جہاد کے بدلے ضعف اور سرمایہ داری سے سازباز کی ذہنیت نہیں پیدا ہوگئی — یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ فراقؔ کا سیاسی شعور دوسرے غزل گو شعراء کے برخلاف بہت واضح اور صحیح سمت میں کام کرتا رہا۔ اس دور کی غزل حالات اور واقعات سے پیدا شدہ اثرات کہ جزوی طور پر پاپناتی رہی — اس میں معاملات اور مسائل کی نوعیت کی جگہ تصورات اور فکری رجحانات نہیں۔ اقبالؔ کی غزلوں میں ہمیں ایک مخصوص فکری رجحان ملتا ہے۔ اس میں فلسفۂ حیات کی مختلف تاویلیں اور تعبیریں پائی جاتی ہیں — ہمیں یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ "زمانہ دگرگوں ہے" اور "تاروں کی گردش تیز ہے" مگر ان طاقتوں کا پتہ نہیں چلتا جو اس انقلاب کا باعث ہیں تاوقتیکہ ہم ان کی نظموں سے استفادہ نہ کریں۔ غزل تصورات اور احساسات کی اجمالی عکاسی کے علاوہ ہمیں کچھ اور نہ دے سکی — یہ کارنامہ کچھ کم نہیں۔ مگر اب اس سے بھی کام چلتا نظر نہیں

آنا قطعیت کے بغیر آج تعزیت کے تمام پیچ وخم سامنے نہیں آسکتے۔ کہا جاتا ہے کہ غزل ہمارے مرکزی خیالات اور احساسات کی ترجمان ہے۔ حالانکہ ہم غزل کے بہت سے اشعار کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر کس مرکزی خیال یا جذبہ کا ترجمان ہے۔ غزل کے اشعار میں دراصل مرکزی جذبات اور خیالات کی جگہ ان کی شدت ہوتی ہے ــ یہاں ہم جس چیز سے آشنا ہوئے ہیں۔ وہ جذبہ کی کیفیت اور اس کے جدید اثرات ہوتے ہیں ــ

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو

اس میں "بے خودی" کی کارگذاری کے ذکر کے باوصف کوئی مرکزی خیال نہیں وارفتگی کی شدید کیفیت اور اس کا ایسا پرتو ہے جو شعر کو "بے خودی محض" کی منزل سے آگے لے گیا ہے۔ مختلف ملے جلے جذبات بھی شدت سے ہم پر چھا جاتے ہیں۔ ہم سے تجزیہ کی صلاحیت چھن جاتی ہے اور ہمیں ان پر مرکزی جذبہ یا مرکزی خیال کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ غزل کی یہ "پنہائی" ہمارے ادب کی بہت بڑی قوت ہے۔ لیکن اب اس کی بھی ضرورت ہے کہ بہت سی باتیں قطعیت کے ساتھ کہی جائیں تاکہ ان کی تعبیر میں غلط فہمی کی گنجائش نہ رہ جائے ــ یہ صحیح ہے کہ شاعری واقعات کی "کھتونی" نہیں ہے یہ مختلف عمل اور رد عمل سے پیدا شدہ جذبات اور خیالات کی ترجمانی کرتی ہے ــ لیکن اگر یہ ترجمانی گمراہ کرتی رہی تو بے کار ہو جاتی ہے ــ اس کے بکھیر غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب ایسا شاعر غزل کہہ رہا ہو جس کے شعری مزاج کی ابھی کوئی سمت واضح نہ ہو سکی ہو۔ غزل سے یہ مطالبہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نظم کی طرح مفصل ہر چیز کو بیان کرے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسے حالات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ غزل کی شاعری عموماً موضوعات کی شاعری نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب موضوعات سے سابقہ آپڑا ہے تو غزل جھجک رہی ہے یہ موضوعات بھی بالکل مختلف اور بدلے ہوئے ہیں ــ غزل کا مجلسی لب ولہجہ جب انھیں اپنانے کی کوشش کرتا ہے تو نہ موضوع برقرار رہتا ہے نہ شاعری۔ غزل ہمارے دور کی تاریخ مرتب نہیں کر سکتی۔ اگر ہم یہ پتہ لگانا چاہیں کہ گذشتہ پچاس سال میں ہماری زندگی کن راستوں سے گزری۔ کون کون سے انقلاب آئے۔ سماجی اور سیاسی تغیرات کس طرح ہوتے رہے اور یہ تمام چیزیں کس طرح ہماری شاعری پر اثر انداز ہوتی رہیں تو اس کے لئے ہمیں نظموں کو دیکھنا ہوگا ــ جو ہر سیاسی اور سماجی موڑ کو بیان کرتی رہی ہیں۔ غزلیں یہاں معذور

ہیں۔ فرض کیجیے جلیانوالا باغ کے خونی واقعے کو بیان کرنا ہے۔ نظم اس موقع پر پوری شدت اور تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو پیش کر سکتی ہے۔ مگر غزل کا یہ ردعمل کچھ اس قسم کا ہو سکتا ہے ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

یا پھر اس قسم کا شعر ہو سکتا ہے ؎

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اولاً تو یہ اشعار اس حادثہ پر لکھے نہیں گئے دوسرے اگر یہ اس سے متعلق بھی ہوتے تو بھی وثوق کے ساتھ اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا جب تک ان اشعار کے ساتھ تاریخ بھی درج نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ شعر اور بہت سے موقعوں پر چسپاں کیے جا سکتے ہیں یا یہ آج سے ہزار سال قبل کی زندگی کے بعض واقعات پر صادق آ سکتے ہیں۔ پہلے غزل سے قطعیت کا یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا تھا مگر آج اس سے پرہیز کرنے کی وجہ سے غزل پس پشت پڑ گئی ہے اس موقع پر غزل مسلسل کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ غزل مسلسل اگر مضمون کی طرح واقعات کی ترجمانی کرنے لگے تو اس میں اور نظموں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا غزل مسلسل بھی غزل کی زبان اس کے مخصوص اسلوب اور فنی تقاضوں کو نظرانداز نہیں کر سکتی۔ اس لیے غزل مسلسل اگر غزل کے دائرے میں رہ کر نہیں لکھی گئی تو وہ قصیدہ اور نظم سب کچھ بن سکتی۔ غزل نہیں ہو سکتی۔ جوش کی بہت سی نظمیں غزل مسلسل ہو جائیں گی اور اقبال کا یہ ترانہ بھی غزل مسلسل ہو سکتا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ہیئت کے اعتبار سے اس میں اور غزل میں کوئی فرق نہیں، مطلع بھی اور مقطع بھی لیکن اسے شاید غزل مسلسل کوئی نہ کہہ سکے یا جوش کی نظم "نظام نو" ؎

کھیل ہاں اے نوعِ انساں ان سیاہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بہ جولاں ہے تو کیا
مسکرانے کے لیے بے چین ہے صبحِ وطن

اور چندے ظلمت شام غریباں ہے تو کیا

بھی غزل مسلسل میں شمار کی جاسکتی ہے۔ پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسی نظموں اور غزل مسلسل میں فرق کیا ہے ان کی امتیازی خصوصیات کون کون سی ہیں! بات یہ ہے کہ غزل انداز بیان مطالب اور موضوعات کے انتخاب اور تغزل کی شرط کی بنا پر نظم سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ غزل کی یہی تمام حدیں ہمیں آج یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ دور حاضر سے غزل کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہے حسرت سے جو دور شروع ہوتا ہے اور فراق پر تقریباً ختم ہو جاتا ہے اس وقت تک غزل کسی نہ کسی طرح ہماری ترجمانی کرتی رہی۔ اس وقت تک سماج کی طبقاتی کشمکش اتنی واضح اور شدید نہیں ہو سکی تھی جتنی آج ہے — یہ طے کرنا اب دشوار نہیں ہے کہ کون سا طبقہ زندگی کو آگے بڑھا سکتا ہے اور کون پیچھے ہٹا سکتا ہے۔ عوام اور خواص کے مابین اب کوئی رشتہ اتحاد باقی نہیں رہ گیا ہے ایک طرف استحصال پسندوں کی جماعت ہے دوسری طرف وہ عوامی طاقتیں ہیں جو اپنے تمام جاہ و جلال کے ساتھ ابھر رہی ہیں۔ زندگی قومی اور ملکی حدیں توڑ کر تمام دنیا کے لوگوں کی داستان دہرا رہی ہے فرد کی داخلیت ایک سماجی داخلیت بن چکی ہے۔ خارجی اسباب ہماری زندگی کو ہر لمحہ آگے بڑھا رہے ہیں۔ فراق نے کہا تھا ؎

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گذر آئی!

غزل کے مسافر اس موڑ پر آکر رک گئے۔ جدید ترین شعرا کی داخلیت اور کچھ غزل کی داخلی ماہیت یہ گوارا نہ کر سکی کہ وہ حقایق کا سامنا کر سکے اور اس ہجوم میں شامل ہو جائے جو مغرب و مشرق میں نئی طاقتوں کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہے۔ ان میں سے بعض غزل کہنے والوں نے آگے بڑھنے کی کوشش ضرور کی ہے — مگر ابھی وہ ابتدائی مراحل سے بھی نہیں گذر سکے ہیں۔ مجروح سلطان پوری پہلے اس قسم کے اشعار کہتے تھے ؎

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

پستیٔ زمیں سے ہے رفعت فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کج کلاہی بھی

یہ اشعار نئے عشقیہ مزاج اور سماجی شعور کی خوشگوار نمائندگی کرتے ہیں۔ مگر کوئی امتیازی خصوصیت نہیں رکھتے اب وہ اس رنگ کے شعر کہہ رہے ہیں۔

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
نہیں ہے میرا کوئی نقش پا کہ چراغ راہگذر نہ ہو
شب ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

ان کی غزل گوئی یہاں ایک قدم اور آگے بڑھی ہے۔ مگر غزل کے لوازم کے ساتھ جب وہ مطالب کو اور صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں تو یہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے

کیا ہے ذکر آتش و آشیم کہ عنداران گل
مارتے ہیں ہاتھ انگاروں پہ گھبرائے ہوئے

یا

اب کسان گائیں گے ہل کے ساز پہ نغمے

یا

سرخ انقلاب آیا دور آفتاب آیا

یہ وضاحت اور صفائی بہت اہم ہے مگر شاعری نہ بن سکی یہ صرف ایک بیان ہے اور بس یہ لفظوں سے ہٹ کر جذبات میں منتقل نہ ہو سکی۔ غزل میں کسان اور ہل کا لفظ ابھی کھپ نہ سکا ممکن ہے یہ ہماری غزل کے مخصوص مزاج کے منافی ہو یا ابھی ہم اس طرح کے تغیرات کے عادی نہیں ہو سکے ہیں جو کچھ بھی ہو ایک بات بالکل صاف ہے۔ غزل گو شاعروں کی جدید ترین پود اس مہم کو سر انجام نہیں دے سکی ہے۔ یا تو وہ اپنے تجربے میں اٹ گئی ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی جذباتی غزلیں کہہ لیتی ہے یا مطالب و بیان کی الجھنوں میں مبتلا ہے۔ ان تمام مباحث کے بعد دو چیزیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ اگر غزل کو آج موجودہ زمانہ کے تقاضوں سے ربط دینا ہے تو ہمیں اس میں بالکل نئی روح دوڑانی

ہوگی نئی علامتوں کے علاوہ حالات کی سمت اور اس کے تجزیہ کو بھی جگہ دینا ہوگی ہل کسان۔ کھیت مزدور۔ کارخانے ان کی جد وجہد سائنس کی ترقیات ان تمام باتوں کو کسی نہ کسی طرح غزل کیلئے "گوارا" بنانا ہوگا۔ ورنہ غزل تنہائی کے "مشغلے" کے سوا اور کچھ نہ رہ جائے گی۔ اب یہ تمام عناصر کسطرح غزل میں کھپائے جائیں ——— یہ دوسرا مسئلہ جسے شاعروں کی جدید ترین پود کو حل کرنا ہوگا۔ یہی ان کی اور غزل دونوں کی صلاحیتوں کا امتحان ہے۔ محنت۔ تجربات اور نئے حوصلوں جرأت فکر، صحیح سماجی اور سیاسی شعور سے یہ "پہاڑ" کاٹا جا سکتا ہے اور غزل کی جوئے شیر نکالی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے ہم غزل کے نئے تجربات کو کچھ دنوں تک انگیز نہ کر سکیں لیکن شاعرانہ تکمیل کے ساتھ اگر یہ تجربات پیش کئے جاتے رہے تو ہم بہت جلد اس کے عادی ہو جائیں گے۔ اور یہ ہماری غزل کا رفتہ رفتہ نیا مزاج بن جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ غزل صرف عشقیہ شاعری تک محدود رکھی جائے اس طرح یہ بہت سے "غیر متغزلانہ" عناصر سے بچ جائے گی۔ مگر اس صورت میں بھی وہی عشقیہ شاعری قابل پذیرائی ہو سکے گی جو زمانے کے مطالبات اور مزاج سے بے اعتنائی نہ برتے۔ اس جاگیری اور سرمایہ داری عہد کی عشقیہ زندگی اب نہیں اپنائی جا سکتی —— یہ فرسودہ مجہول اور بے بنیاد ہو چکی ہے —— عشقیہ زندگی کی نئی اور صحت مند اقدار کے بغیر غزل میں دوبارہ جان نہیں پڑتی۔ چنانچہ غزل کے جدید شاعروں کو غزل کی طرف لوٹنے یا بڑھنے سے پہلے یہ سوچنا ضروری ہے کہ ——— وہ کس سماجی شعور کو لے کر غزل کی طرف بڑھ رہے ہیں؟ یہ سماجی شعور اگر شکست خوردہ ہے تو غزل جہاں تھی وہیں رہ جائے گی —— لیکن اگر اس میں حرکت اور زندگی ہے۔ جو معاشی ناہمواریوں اور بے انصافیوں کو دور کرنے کی قوت ہے تو یہی قوت، یہی زندگی اور حرکت غزل کو بھی متحرک اور زندہ بنا سکے گی۔ یہ "ہفت خوان" کیسے طے ہو ——— یہ ہمارے غزل گو شعرا کے سوچنے کی بات ہے۔

جائزہ۔ کراچی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

سرشار کا "فسانۂ آزاد"

(۱)

"فسانۂ آزاد" فسانہ ہی ہے جو اپنی چند اہم صفات کی بنا پر ناول کے دائرے میں آسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سرشار نے اسے فسانہ ہی کہا اور فسانے ہی کے ڈھنگ پر ترتیب دیا۔ اگر ہم دنیا بھر کے فسانوں کا جائزہ لیں تو ہمیں کچھ مخصوص صفات ملتی ہیں اور انھیں صفات کے مطابق ہمیں "فسانۂ آزاد" کی بھی ساخت نظر آتی ہے۔ ان تمام فسانوں میں ہمیں کسی بے مثل و بے نظیر اور ہر طرح مکمل فرد کے بابت گوناگوں قسم کے واقعات ملتے ہیں اور "فسانۂ آزاد" کے میاں آزاد بھی ہر علم میں طاق اور ہر فن میں مشاق" ہزاروں قسم کے واقعات و واردات سے گزرتے نظر آتے ہیں یہاں بھی نفسِ قصہ وہی ہے جو فسانوں کی جان ہوتا تھا یعنی ایک ہیرو کسی بے مثل و بے نظیر حسینہ کے عشق میں مبتلا ہو کر اس حسینہ کے حکم کے بموجب کسی بڑی مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوتا ہے قطع منازل اور طے مراحل کرتا ہے۔ گوناگوں قسم کے لوگوں سے ملتا ہے ہزاروں قسم کی بستیوں سے گزرتا ہے۔ بڑی بڑی مشکلات میں پڑ پڑ کر کامیاب نکلتا ہے اور آخر میں اس مہم کو سر کر کے واپس آتا ہے جس پر اس کی محبوبہ نے اسے بھیجا تھا اور اپنی محبوبہ سے نہایت دھوم دھام سے بیاہ رچاتا ہے۔ میاں آزاد کا قصہ بھی اسی نہج کے مطابق ہے اور اس میں بھی واقعات کا تنوع، کثرت، سنسنی خیزی اسی طرح کی ہے جیسی کہ ہمیں

پرانی داستانوں میں ملتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ فن کے لحاظ سے سرشار اسی راہ پر چل رہے تھے۔ جو داستان امیر حمزہ صاحبقران" اور قصۂ حاتم طائی" وغیرہ کی راہ تھی۔

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سرشار کن کن پرانے فسانوں سے کس کس حد تک متاثر تھے۔ مگر مرزا رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" کا اثر ان کے "فسانۂ آزاد" پر کافی گہرا اور بالکل نمایاں معلوم ہوتا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ سرشار کی طرز ادا ویسی ہی ہے جیسی کہ سرور کی وہی مقفیٰ و مسجع عبارت لکھنے کی کوشش وہی معمولی بات کو مبالغے کے رنگ میں رنگ کر بیان کرنے کا طریقہ۔ مگر اس ظاہری اثر سے زیادہ گہرا اور سچا اثر یہ ہے کہ ہر مقام پر سرشار سرور کی پیروی تو کرتے نظر آتے ہیں مگر اپنے بالکل نئے طریقہ پر اور ہر جگہ اپنی بالکل صاف نئی راہ نکال کر یہ امر ان کی طرز ادا ہی سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ یہ طرز بہت تو سرور کی طرز مگر اس میں وہ روانی ہے جو سرور کو نہ میسر ہوئی اور پھر اس پر ظرافت کا وہ رنگ کھلتا نظر آتا ہے جو اس کی بناوٹ اور آورد کو بالکل چھپا دیتا ہے۔ اسی طرح سرشار نے "فسانۂ عجائب" کے دیباچہ میں جو لکھنؤ کا بیان ہے اس کی خوشہ چینی ضرور کی ہے مگر اس معاملہ میں بھی اپنی خداداد قوت تجربہ اور قوت ظرافت سے فراوانی کے ساتھ کام لے کر انھوں نے لکھنؤ کی زندگی کے وہ وہ رنگ اجاگر کئے ہیں کہ انھیں کا حق ہے۔ سرور کی طرح انھیں بھی اپنے شہر سے محبت ہے اور اس کے حالات بیان کرنے میں دلچسپی ہے مگر ان کی فطرت قصیدہ گو کی نہیں بلکہ حقیقت بیں کی ہے۔ اسی لئے ان کے تمام بیانات شروع تو سرور کی طرح قصیدہ سے ہی ہوتے ہیں مگر حقیقت اور ظرافت کا رنگ ان پر اس قدر چڑھ جاتا ہے کہ وہ سرور کے بیانات کی ضد معلوم ہوتے ہیں۔ یہی صورت افراد کے بیان میں بھی ہمارے سامنے آتی ہے آزاد، خوجی حسن آرا وغیرہ کا جہاں سرشار تعارف کراتے ہیں، وہاں ان کا رنگ سرور کے بیانات اور مثنوی اور مرثیوں کے سراپا کا رنگ ہے مگر جب یہ لوگ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو ان میں انسانی اور انفرادی صفات نمایاں ہو جاتی ہیں۔ غرض یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شعوری طور پر سرشار "فسانۂ عجائب" ہی کی سی چیز لکھ رہے تھے مگر ان کی فطرت انھیں ایک نئے فن کی طرف لئے جا رہی تھی۔

تھا
ان کے فطری رجحان کی مدد ایک اور اثر بھی کر رہا تھا جو شعوری طور پر ضرور ان کے ذہن پر

یہ اثر اسپین کے مشہور مصنف سروانٹیز (CERVANTES) کی اس شہرۂ آفاق تصنیف
کا تھا جس کا نام ڈون کوئی زٹ (DON QUIXOTE) ہے اور جس کو یورپ کا سب سے
پہلا ناول مانا جاتا ہے۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمہ سے سرشار بہت کافی لطف اندوز ہوئے
تھے اس کی مزاح کی وہ اکثر تعریف کیا کرتے تھے اور اس کا انھوں نے "خدائی فوجدار" کے نام سے
ترجمہ بھی کیا۔ سروانٹیز نے "ڈون کوئی زوٹ" کو فسانہ نگاری کی پول کھول کر اس کا مذاق اڑانے
کے لئے لکھا تھا۔ اس کا ہیرو ایک ایسا شخص ہے جو کثرت سے فسانے پڑھتے پڑھتے اپنے تئیں
فسانوں کے ہیروز کے موافق سمجھنے لگتا ہے اور دنیا کو بالکل اسی طرح کا تصور کرنے لگتا ہے جیسا
کہ فسانوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ دنیا میں مہمات سر کرنے کے لئے نکلتا ہے اور مختلف
مقامات پر معمولی چیزوں کو عجائباتی دنیا کی چیزیں تعین کرکے ان سے الجھتا ہے اور ایسی پریشانیوں
میں پڑتا ہے کہ اس کی حالت حد سے زیادہ مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ اس تصنیف میں فسانہ نگاری
کے فن کا ہر ہر طریقہ برتا گیا ہے مگر اس خاص فرق کے ساتھ کہ یہاں کا پس منظر حقیقی دنیا ہے اور
مصنف کا مقصد اس فن کو حماقت ثابت کرنا ہے۔ اس طرح پر یہاں ایک حقیقی دنیا کا پورا نقش
کھینچتا ہے اور یہی صفت ناول نگاری کی بنیادی صفت ہے۔ سروانٹیز ایک پرانے فن کا مذاق
اڑانے چلا تھا مگر وہ ایک نئے فن کی بنیاد بھی ڈال گیا۔ دنیا کے ہر ملک کی ناول نگاری کی ابتدا
"ڈون کوئی زوٹ" کے اثر سے ہی ہوئی اور اس لئے اس تصنیف کو فن ناول نگاری کے سلسلہ
میں ایک عجیب حیثیت حاصل ہے۔ سرشار پر اس تصنیف کے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو
ناول کی ابتدا کو بھی اس تصنیف سے فیض ہوا۔ یہ ضروری نہیں کہ حقیقی دنیا کی طرف توجہ اور
اس دنیا کا مزاحیہ رنگ پیش کرنے کی جہت سرشار کی فطرت میں سروانٹیز کے اثر سے پیدا
ہوئی ہو، یہ سب فطری طور پر ان کے یہاں موجود تھا ہاں سروانٹیز کے اثر نے اس کو مستقل ضرور کیا اور
اس کو چلنے کی راہ ضرور دکھائی۔ "فسانۂ آزاد" میں خوجی تو بالکل سروانٹیز کا کردار ہے مگر اس کے اور
پوری تصنیف کا اثر سروانٹیز کے اثر سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سروانٹیز اور
سرشار کے مقاصد میں بعد المشرقین کا فرق ہے۔ یوں تو دونوں فن فسانہ نگاری کے عامل ہیں
اور دونوں کی تصنیفات کا پس منظر فسانوں کی محض توہماتی دنیا کے خلاف حقیقی دنیا ہے مگر سروانٹیز

کا صاف مقصد فسانہ نگاری کے فن کے پرزے اڑاتا ہے اور اس لئے اس کی تصنیف ہر طرح فسانہ نگاری کے طریقوں کو کاٹتی ہے جب کہ سرشار کا کوئی صاف فنی مقصد ہی نہیں ہے اور کبھی وہ فسانہ نگاری کی طرف ڈھلک جاتے ہیں اور کبھی بالکل حقیقت نگاری کی طرف۔ چنانچہ فسانۂ آزاد ہمیں تو ایک حقیقی دنیا کا قصہ اور اس میں واضح اور دلچسپ رنگ حقیقت و واقعیت کا جھلکتا ہے مگر پورے یقین کے ساتھ ہم اس کے بابت یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ فسانہ نہیں ناول ہے۔ ناول بھی فسانہ کا ایک ترقی یافتہ فارم ہے اس لئے یہ فسانہ سے بہت کچھ مناسب ہوتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ فسانے سے اس معنی میں متضاد بھی ہوتی ہے کہ وہ حقیقت اور واقعیت کی سخت طرف دار ہوتی ہے اور محض توہماتی تخئیل یا واقعات کی سخت مخالفت کرتی ہے۔ سروانٹیز کی کتاب پورے طور پر اسی ڈھب پر ہے۔ سرشار کی کتاب اس راہ تک نہیں پہنچتی ورنہ وہ بھی اردو میں ناول نگاری کے اسی حد تک موجد کہلائے جاتے جس حد تک سروانٹیز یورپ میں ناول نگاری کا موجد ٹھہرایا جاتا ہے۔

بادی النظر میں "فسانۂ آزاد" کو ناول تصور کرنا مشکل نہیں ہے۔ آخر وہ ایک حقیقی دنیا کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایک سوسائٹی ایک شہر اور ایک ماحول کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس میں واقعیت ہے مزاح ہے اور زندگی پر ایک خاص نظر ہے۔ اس کا فارم بھی اس قسم کی ناول کا ہے جسے پکارسک (PICARESQUE) کہتے ہیں اور سب سے زیادہ بات تو یہ کہ زندگی کو جس حسن و خوبی کے ساتھ زندہ کیا گیا ہے ویسا اردو کی کسی تصنیف میں ابھی نہیں کیا گیا۔ سرشار ناول نگار کی فطری قوت GENIUS رکھتے تھے اور فسانۂ آزاد ہی ایک ایسی تصنیف ہے جس میں یہ قوت تمام اردو کے فسانوں اور ناولوں سے زیادہ موجود نظر آتی ہے۔ یہی ایک وہ تصنیف ہے جس میں ہمیں خوجی کا ایسا کردار ملتا ہے جو اردو میں کردار نگاری کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے جو ہمارے ادب کے لافانی تصورات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے پھر کیوں نہ ہمیں چاہیے کہ اس کو اردو کا پہلا ناول کہہ دیا جائے اور سرشار کو بھی ناول کی تاریخ میں وہی حیثیت دیدی جائے جو سروانٹیز کو حاصل ہے یا کیوں نہ ان کو کچھ طرف داری سے فیلڈنگ کے درجہ پہ لے آیا جائے مگر ہمیں گہری نظر ہمیں ایسا کرنے سے روکتی ہے کیونکہ یہاں ناول کے عناصر تو ضرور دکھائی دیتے ہیں مگر سب ایک غیر مرئی (NASCENT) حالت میں ہیں یہ نہ تو پورا پورا افسانہ ہی ہے اور نہ پوری پوری ناول ہی، کوئی درمیانی سی چیز ہے۔ شاید سرشار کی لاپروائی

کی وجہ سے یا ان کی "فسانۂ عجائب" میں گہری دلچسپی کی وجہ سے یا ان کی ناول کے فن سے محض علمی واقفیت کی وجہ سے کسی نہ کسی وجہ سے یہ فسانہ پورے طور پر ناول نہیں ہو پایا۔

(۴)

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ "فسانۂ آزاد" نہایت ہی بے تکی اور بے تکان تصنیف ہے اور اس خرابی کی ذمہ دار دو باتیں ہیں ایک سرشار کی از حد لاپروائی اور دوسرے یہ بات کہ اس کے الگ الگ ٹکڑے الگ الگ اوقات پر چھپتے رہے اور اکثر ایسا ہوا کہ مصنف جو کچھ ایک پہلے ٹکڑے میں لکھ چکا تھا اس کو فراموش کر گیا اور بعد کے ٹکڑے میں اس کے خلاف کچھ لکھ گیا۔ ایک مربوط اور واضح ہیئت کی کمی اس تصنیف سے مزید محسوس ہوتی ہے۔ اس کمی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سرشار کا مذاق اس ادب کے مطابق بنا تھا جس کی نمایاں اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی وغیرہ تھے جن میں حد سے حد یہ ربط ہوتا تھا کہ مختلف قسم کے ٹکڑے جوں توں کر کے جوڑ دئے جاتے تھے۔ مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس ادب میں ایسی مربوط چیز بھی وجود میں آچکی تھی جیسی "توبۃ النصوح" ہمیں سرشار کی بے توجہی ہی کو الزام دینا پڑتا ہے۔ مصنف کے سامنے کسی قسم کی کوئی اسکیم نہ تھی اور جہاں اس کا جی چاہا اس نے جو معاملہ بھی اسے ملا وہ اس نے ٹھونس دیا اور جہاں جی چاہا اس معاملہ کو ختم کر دیا۔ اکثر ایسے باب ملتے ہیں جیسے "دوشالہ جمیل کا بیان یا ایک تاریخ وفات جو بالکل ہی الگ سے ہیں اور جن کا فسانہ سے ذرا سا بھی کوئی تعلق نہیں۔ پہلی جلد کے چوتھائی حصہ تک تو محض میاں آزاد اور ان کی جہاں گشتی سے سروکار ہے۔ حسن آرا اور آزاد کے عشق کا قصہ داخل فسانہ ہو جاتا ہے۔ سپہر آرا اور ہمایوں فر کے عشق کا قصہ ساتھ ساتھ چلتا ہے پھر عین برات میں ہمایوں فر کو خواہ مخواہ مروا ڈالا جاتا ہے اور پھر ان کو بھدے ہی بھونڈے طریقہ پر پھر زندہ کیا جاتا ہے وہ ہمایوں فر کے ہم شکل چھوٹے بھائی نکلتے ہیں اور ذوالفقار علی خاں مع اپنے مصاحبین کے سامنے لائے جاتے ہیں اور اپنے بٹیر صف شکن کی یاد میں سوگوار نظر آتے ہیں پھر یہ سب معاملات اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایک عورت اللہ رکھی کا قصہ شروع کیا جاتا ہے کئی عجیب بے تکی حالتوں سے گزرتا ہوا دکھایا جاتا ہے اور ختم تک پہونچایا جاتا ہے آزاد کی حسن پرستی سے ہر جگہ قصے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ حسن آرا اور آزاد کے عشق کا قصہ ہی ایک تار ہے جو آخر تک بندھا رہتا ہے اور اسی کو

اس فسانہ کا پلاٹ کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہاں سیکڑوں پلاٹ ہیں جن کو تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ملا جلا کر ایک مرکب پلاٹ کی ناول بن سکتی تھی مگر اس تصنیف میں ایسا کرنے کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دکھائی دیتی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ "فسانہ آزاد" ایک جنگل کا جنگل ہے جس میں ہر طرح کی پیداوار بکھری پڑی ہے۔ اس میں اگر کوئی رستہ نکالا جا سکتا ہے تو وہی شخص نکال سکتا ہے جو جنگلوں میں رستے نکالنے کا عادی ہو ورنہ مختلف قسم کے درخت کہیں اکا دکا کہیں گچھوں میں کہیں قطاروں میں ایسے نظر آئیں گے کہ جن میں انسان گم ہو جائے۔ اس جنگل میں جس جس طرح کی چیزیں نظر آتی ہیں ان میں کوئی ترتیب یا عدم ترتیب کا ذکر ہی مشکل معلوم ہوتا ہے مگر جیسے کسی جنگل میں ہر وہ بے ترتیبی نظر پڑتی ہے جس سے کسی باغبان کو نفرت ہونا لازمی ہے تو ساتھ ہی ساتھ ہر اس ترتیب کے اشارے بھی ملتے ہیں جن پر تمام فن باغبانی کا مدار ہو، اسی طرح اس تصنیف میں جہاں تعمیر پلاٹ کا ہر نقص موجود ہے وہاں اس فن کے برتنے والے کو ہر قسم کی خوبی کے رستے بھی دکھائی دے جاتے ہیں جس طرح اس تصنیف کے مختلف پلاٹوں کو ملا جلا کر اور ترتیب دے کر ایک مکمل و مرکب پلاٹ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے مختلف سینوں میں کاٹ چھانٹ کر کے بہت کافی حصے محض بیکار کئے جا سکتے ہیں۔ اکثر پورے پورے باب ہی بالکل بیکار ہیں خاص طور سے خوجی کو اکثر ایک ہی قسم کی حالت میں کئی کئی دفعہ دکھایا گیا ہے بیگمات کی بات چیت کے سین زیادہ تر محض لفاظی پر مبنی ہیں اور اکثر ایسی باتوں سے بھرے ہیں جو کوئی تک ہی نہیں رکھتیں مگر ان تمام الٹی سیدھی باتوں کے ساتھ ساتھ ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں سرشار کی پیدا ایشی ڈرامائی قوتوں پر پڑھنے والا عش عش کر جائے اس کی بہترین مثال جلد دوم میں جہاز کا سین ہے اور طوفان کی حالت میں لوگوں کی پریشانی آزاد کی کارگزاری اور خوجی کا بچانے والی کشتی میں بیٹھنے کے بعد اپنی افیم کی ڈبیا کو یاد کرنا یہ تمام تاثرات ایک ایسا مکمل ڈرامائی سین پیش کرتے ہیں جن کا مثل و نظیر اب تک کے اردو ادب میں کہیں نہیں ملتا۔ پھر حالانکہ اس تصنیف کا بہت کافی حصہ کاٹ دینے کے لائق ہے مگر کوئی باب ایسا نہیں جس میں کچھ نہ کچھ سطریں ایسی نہ ملیں جو اپنی جگہ بیش قیمت نہ ٹھہریں۔ میں نے ایک مرتبہ اس فسانہ کو مختصر کر کے قریب دو سو صفحوں کی ایک ایسی کتاب بنانے کی کوشش کی جس میں اس کتاب کا نچوڑ آ جائے اور اس عمل میں میرے سامنے وہ وہ مشکلات

آئیں کہ میں پریشان ہوکر اپنا ارادہ ترک کر بیٹھا ہیں اس نتیجہ پر پہونچا کہ یا تو اس جنگل کی صفائی کے لئے اسے پورے کا پورا جلا ہی دینا ہوگا اور یا اس کو اسی طرح رکھنا پڑے گا جیسا کہ وہ ہے۔

اس لئے "فسانۂ آزاد" کی بے ترتیبی پر زور دینا اس کو ناول کے اصول سے جانچنا ہوا جبکہ وہ ہے حقیقت میں فسانہ ہی۔ پرانے فسانہ میں ترتیب کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تھی نہ مصنفین کا اور نہ قارئین کا ذہن اس درجہ تک پہونچا تھا کہ مکمل تاثرات کو مربوط صورت میں پیش کریں یا مربوط تاثرات تصنیف میں تلاش کریں۔ ان فسانوں کی طرح "فسانۂ آزاد" میں بھی بس ایک اصول کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ جدھر بھی مصنف کا سینگ سمائے ادھر سے بے تکلف نکل جائے اور جہاں جی چاہے وہاں ٹھہر جائے یہی اس کی مخصوص صفت ہے۔ اس کے علاوہ اکثر مقامات پر ہمیں ایک صحافی اصول بھی کارفرما نظر آتا ہے کیونکہ اس کے ابواب تک پرچے میں چھپتے تھے اس لئے اس پرچے کے پڑھنے والوں کی پسند کا بھی اکثر سرشار نے لحاظ رکھا ہے۔ ہمایوں فر کو پھر زندہ کرنے کی جہت اسی وجہ سے کی کہ قارئین کو ان کا عین بات میں مارا جانا ناپسند ہوا۔ خوجی کو ایک ہی طرح کی حالت میں متعدد بار اس لئے دکھایا گیا کہ اس حالت میں خوجی کو دیکھ کر لوگ خوش ہوتے تھے۔ اکثر حصول میں بڑی بڑی تقریریں رقم کی گئی ہیں جن کو آج کل پڑھنا ہی نہایت گراں گزرتا ہے مگر اس زمانے میں جب کہ ہندوستان میں مقرروں کی تعداد بڑھ رہی تھی یہ تقریریں عوام کے لئے خاص طور سے دلچسپ ہوں گی۔ اسی قسم کی بہت سی اور باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ فسانہ نویس حالانکہ نہایت لاپروائی کے ساتھ پرانے فسانوں کے ڈھرے پر چل رہا ہے مگر وہ رنگ محفل کا بھی لحاظ رکھتا ہے اور اس معنی میں وہ عوامی ناول نگار کی حیثیت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

(۳)

"فسانۂ آزاد" کی سب سے اہم صفت اس کی واقعیت (REALISM) ہے یہی صفت اسے فسانوں سے ممتاز کرتی ہے اور ناول کے دائرے میں لے آتی ہے۔ اس صفت کی تعریف اور مذمت دونوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر اس کی تنقیدی تحلیل اب تک نہیں کی گئی اردو کے نقادوں میں یہ خیال عام ہے کہ ناول کو کسی زندگی کا نقشہ ہونا چاہیئے اور یہ نقشہ جتنا اصل کے مطابق ہوگا اتنا ہی بہتر ہوگا جیسے کہ ناول بھی کسی مقام یا طبقہ کے بابت سرکاری رپورٹ ہو۔ لیکن

ناول کا بھی ایک فن ہے اس فن میں جب تک فن کار کی تخیل اور اس کی انفرادی نظریہ شامل ہو۔
محض زندگی کے حالات ہی کی بنا پر اس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ لکھنؤ کی زندگی کے
لاکھوں پہلو ہیں اور اس کو لاکھوں تخیلی رنگوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ سرشار یا کسی بھی واقعیت
نگار کی اہمیت اس بات میں نہیں ہے کہ اس نے لکھنؤ کے حالات بیان کئے بلکہ اس میں ہے کہ
اس نے کیسے رنگ بھر کر ان حالات کو پیش کیا اور اس کی رنگ آمیزی کس قدر دلچسپ دیرپا آفاقی
اور گہری ہے۔ اس نظریہ کا خیال رکھتے ہوئے جب ہم "فسانۂ آزاد" کی واقعیت پر غور کرتے
ہیں تو حسب ذیل نتائج پر پہونچتے ہیں۔

اول یہ کہ یہاں واقعیت کا رنگ نہایت ناہموار طریقہ پر پھیلا ہوا ہے۔ شروع شروع
میں مقفیٰ و مسجع عبارت میں بیانات اکثر اس رنگ کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ آگے بڑھ کر واقعیت
اور علیت کا کھلا تضاد نظر آتا ہے حسن آرا اور سپہر آرا کو جن واقعات میں سیر کے لئے باہر گھومتے ہوئے
دکھایا گیا ہے اس کو واقعی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور یہاں مصنف ایک ایسی خیالی دنیا میں پہنچ
گیا ہے جو اس کے لئے ایک طرح پر عینی ہوسکتی تھی اگر وہ اس کو اسی طرح برتتا رہتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے
کہ زمانہ بیگمات کو ان حالات میں دیکھنے کے لئے تیار نہ تھا اور اس لئے پھر کہیں کبھی بھی ان بیگمات
کی اس قدر آزادانہ روش نہیں دکھائی گئی اس کے بعد واقعیت کا رنگ پختہ ہوجاتا ہے اور آخر
تک قائم رہتا ہے۔ اکثر لوگوں نے اس واقعیت کے پردہ پر جگہ جگہ دھبے بتائے ہیں مگر یہ سب
بہت معمولی ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنا تنقید کو جوئیں بیننے کا فن ٹھہراتا ہے۔ سرشار نے
واقعیت نگاری کا حق کافی کامیابی سے ادا کر دیا ہے۔

دوم ان کی واقعیت کا کوئی مخصوص دائرہ (RANGE) نہیں ہے ایک طرف یہ
نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے لکھنؤ کی زندگی کے تمام پہلو لے لئے ہیں اور نہ یہی کہا جاسکتا ہے
کہ کن مخصوص پہلوؤں پر وہ خاص طور سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ لکھنؤ کی زندگی کے چند
پہلوؤں پر یہاں روشنی پڑتی ہے مگر ہر پہلو پر یہ روشنی ایک ہی زور کے ساتھ نہیں پڑتی۔
یہاں ایک پہلو سڑک پر کی زندگی کا ہے یعنی میلے ٹھیلے جلوس، چہلم محرم وغیرہ یہ زندگی سرشار کا
خاص میدان ہے حالانکہ اس زندگی پر بھی وہ ایک معمولی سیلانی جیوڑے کی نگاہ ڈالتے چلے جاتے

ہیں مگر پھر بھی ان کی دلچسپی عام آدمی سے زیادہ گہری ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے اور ہمیشہ ایک خاص دلچسپی سے پڑھا جاتا رہے گا پھر انھوں نے یہاں کے نوابوں کی صحبتوں کا رنگ جما نا چاہا ہے۔ ایک عام نواب کی صحبت میں مصاحبین کی چہ میگوئیوں کو انھوں نے نہایت خوبی سے رقم کیا ہے اور نواب کی مخصوص دلچسپی یعنی بٹیر بازی اپنے بٹیر غلغلکن کے سوگ میں گریہ وزاری اور آخر میں اس بٹیر کا مزار بنوا کر صف شکن علی شاہ کی عظمت تک اس کو پہونچا دینا لکھنؤ کے نوابوں کی حالت کا ایک بڑا ہی دلچسپ اور پراثر نقشہ ہے حالانکہ یہاں نوابین کی زندگی کا ایک ہی پہلو ہمارے سامنے آتا ہے مگر یہ پہلو نہایت ہی زوردار اور حسین طریقہ پر نمایاں ہوا ہے پھر انھوں نے بیگمات کی زندگی کو بھی پیش کیا ہے اس زندگی سے انھیں دور ہی کی واقفیت نظر آتی ہے اور حالانکہ بیگمات کی زبان اور بات چیت سے انھوں نے کماحقہ واقفیت دکھائی ہے اور اکثر بیگمات کی حسن و ذکاوت کو نمایاں کیا ہے مگر اکثر باتیں یہ ایسی خلط ملط کر گئے ہیں کہ جو شخص ان بیگمات کے درمیان ہی پلا بڑھا ہو اسے سرشار کی ناواقفیت پر ترس آتا ہے اور یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا ہے کہ سرشار کی عکس کشی میں بناوٹ زیادہ ہے اور حقیقت کم۔ پھر انھوں نے لکھنؤ کی زندگی کے اس دائرے میں بھی داخل ہونے کی کوشش کی ہے جو یہاں کی عیاشی سے تعلق رکھتا ہے یعنی بھٹیاری جن کا نام بعد میں اکثر رکھی ہو جاتا ہے اور ان سے متعلق تمام واقعات کو اگر سرشار زور کے ساتھ واضح کرتے تو لکھنوی زندگی کے اس پہلو کی تصویر کھنچ جاتی جو رسوا نے "امراؤ جان ادا" میں نہایت عمدگی سے واضح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زندگی کے بابت زیادہ کچھ کہنا سرشار نے معیوب خیال سمجھا کچھ یہی ہو سرشار کا دائرہ صاف حدود نہیں رکھتا اور جو حدود یہاں ملتے ہیں وہ کہیں دھندلے ہیں اور کہیں صاف بھی ہیں تو نامکمل۔

تیسری صفت اس واقفیت کی یہ ہے کہ اس میں افراد پر زیادہ زور ہے اور ان افراد کو سامنے لانے کا ذریعہ بھی مکالمے ہیں شروع شروع میں سرشار نے اکثر لمبے لمبے بیانات لکھے ہیں اور اکثر یہ بیانات خاص قسم کی بناوٹی عبارت میں ہوئے ہیں مگر یہ بیانات اتنا زور نہیں رکھتے جتنا کہ وہ مکالمات جن پر وہ بہت جلدی اور بہت آسانی سے اتر آتے ہیں آگے بڑھ کر مکالمات ہی کو زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جاتا ہے اس معاملے میں ان کی خاص فطری قوت کردار نگاری ہمارے سامنے آتی ہے ہر موقع

کے بیان میں اس موقع سے تعلق رکھتے ہوئے (TYPICAL) افراد ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور اپنی موزوں باتوں سے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ جلد اول میں سے کوئی باب لے لیا جائے اور یہ کیفیت نمایاں ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کے چہلم کا مشہور بیان لیجئے یہ شروع تو ایک مقفیٰ عبارت سے ہوتا ہے چہلم سے وابستہ بھیڑ اور تعزیے کے جلوس کا بیان کافی طویل ہے۔ مگر آخر میں لوگوں کی مخصوص قسم کی آپس میں باتوں پر آجاتا ہے اور یہی پورے بیان کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ ہے پورے بیان میں بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو زیادہ تر جزئیات انسانوں اور ان کی حالتوں کے بیان میں ہے یہ صورت ان کے شروع شروع کے واقعاتی طریقہ کی ہے آگے کے بیانوں میں افراد اور ان کی باتیں بہت جلدی ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ سرشار کی قوت مکالمہ نگاری کمال کی ہے ان سے پہلے اردو میں کسی نے نفسیاتِ انسانی کو سمجھنے اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کرنے کی قابلیت نہیں دکھائی۔ ہر بات نہایت قدرتی اور بامحاورہ زبان میں ہے اور اپنے ادا کرنے والے کی انفرادیت کو بڑی خوبی سے نمایاں کرتی ہے۔ انفرادی فرق کو اردو کا کوئی ادیب ان سے پہلے اس کمال کے ساتھ نہ نمایاں کر سکا۔

چوتھے فسانۂ آزاد کی واقعیت میں بڑا تنوع ہے ہر جگہ کثرت سے جیتے جاگتے افراد امنڈ چلے آتے ہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک بڑی بھیڑ ہمارے سامنے ہے جس میں ہر شخص اپنی الگ نفسیات رکھتا ہے اور اپنے انفرادی طرز میں بات کرتا ہے۔ آزاد سیر سپاٹے کے آدمی ہر شخص میں دلچسپی لیتے ہیں اور سرشار کی قوت تخلیق ہر ایک کو دلچسپ بنا دیتی ہے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کس طرح کے لوگ سامنے آتے ہیں مگر کثرت اور عظیم کثرت کا تاثر اس طرح ہمارے دماغ پر قائم ہوتا ہے کہ اس بھیڑ میں کوئی دو آدمی بھی ایک سے نہیں معلوم ہوتے۔ سرشار کی یہ قوت واقعیت نگاری کا کمال ہے۔ ان کی قوت تخیل کا دامن اس قدر وسیع ہے جیسا کہ شکسپیر، فیلڈنگ، ٹولسٹائی اور ڈکنس کا جس میں تمام کائنات کے ایک ساتھ سما جانے کی گنجائش ہے وہ ان واقعیت کے بادشاہوں کی طرح ان مختلف قسم کے افراد کی گہرائی میں جانے کی قابلیت نہیں رکھتے اور اس لئے اس کے افراد ہمارے ذہن پر کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑ جاتے مگر فسانۂ آزاد کو پڑھتے وقت ان کی کثرت میں ان کی انفرادیت گم نہیں ہوتی اور نہایت دلچسپ طریقے پر ہم کو متاثر کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

پانچویں سرشار میں زندگی کو زندہ کرنے کی قابلیت بڑے کمال کے ساتھ موجود ہے۔ ہر اس فرد کی جس کو وہ سامنے لاتے ہیں نبض چلتی ہوئی اور خون دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی زندہ آدمی ہمارے سامنے آ گیا بیگمات کے محلوں کے جو سین انھوں نے دکھائے ہیں ان میں اکثر ایسی باتیں ملتی ہیں جو بالکل غلط یا محض ذہنی ہیں اور جو شخص ان محلات کی زندگی سے زیادہ اچھی طرح واقف ہوا سے فوراً احساس ہوتا ہے کہ سرشار کو مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی عورتوں کے عقائد سے صاف واقفیت نہیں تھی اکثر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان عورتوں کو کس فرقے سے وابستہ کریں مگر ہر عورت اپنی جگہ زندہ اور دلچسپ ہے اور اس کی بات چیت کا لہجہ اور طریقہ ایسا انوکھا ہے کہ ہمارا دل اسے زندہ مان لینے کو تیار ہو جاتا ہے زندگی کے دوسرے دائروں کی عکس کشی میں تو انھوں نے کوئی غلطی ہی نہیں کی اور اسی وجہ سے ان دائروں کی زندگی اور بھی زیادہ موثر ہے۔ غرض جس طرف بھی انھوں نے قلم اٹھایا ایک نئی روح پھونک دی ہے اور اس اعجازی قوت کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول نگاروں کی فطری قوت یا جینیس قدرت نے ان کو بخشی تھی۔

چھٹے یہاں زندگی اردو ادب میں پہلی دفعہ ایک غیر مذہبی (SECULAR) رنگ میں پیش ہوئی ہے۔ تمام اردو ادب پر مذہب کا دھواں دھار رنگ اسی طرح غالب ہے جیسے نشاۃ الثانیہ سے پہلے تمام دنیا کے ادب پر چھایا ہوا تھا۔ سرشار پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس دھوئیں کو بکھرا الگ کر کے زندگی کو زندگی کی حیثیت سے دیکھا۔ ان سے پہلے مولوی نذیر احمد تو خیر تبلیغ نگار تھے اور ان کی واقعیت کا اخلاقی اور مذہبی رنگ میں ڈوبا ہونا ضروری ہی تھا مگر ان کے بعد کے ناول نگار جو ناول کے فن سے زیادہ قریب آئے جیسے شرر اور رسوا وہ بھی زندگی سے اتنے قریب نہ آ سکے اور اس کو اتنے صاف طور پر نہ دیکھ سکے جتنے سرشار۔ شرر کے یہاں تو زندگی کے بجائے مذہبی طرفداریاں ہی بھری پڑی ہیں اور رسوا بھی امراؤ جان ادا کی عظمت کو بڑھانے کے لیے آخر میں مذہب ہی کی ٹیک لیتے ہیں۔ سرشار کو مذہب سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ جب وہ ان مواقع کا ذکر کرتے ہیں جن کو مذہب سے سروکار ہے جیسے محرم اور چہلم وغیرہ تب بھی ان کی نظر بجائے مذہبی جذبات کے بیان یا ان [illegible]

ساتھ ان مذہبی رسوم میں شریک ہے اگر وہ کوئی تعزیہ گذرتے ہوئے دکھاتے ہیں تو ان کا دھیان اس
تعزیہ کے ہمراہ مجمع پر ہے اور اگر ان کا دھیان ان بندوں کی طرف جاتا ہے جو کوئی مرثیہ خواں اس تعزیہ
کے ساتھ پڑھ رہا ہو تو وہ اس بند کے مصرعوں کو بھی یاد کر لیتے ہیں اور یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ رونے والوں
کے شور و شغب کی وجہ سے ایک یا دو مصرعے نہیں سنائی دیئے۔ ایک کٹر اور تنگ نظر شیعہ نے فسانہ
آزاد میں محرم کا بیان اور یہی شور میں مصرع نہ سنائی دینے کا جزو پڑھ کر بہت ہی پیچ و تاب میں آکر مجھ
سے یہ کہا کہ یہ ہندو ہیں اس لئے ہمارے مذہب کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ یہ
ان کی محض غلط فہمی ہے۔ سرشار محض ایک انسان کی حیثیت سے ایک حقیقت کو دیکھ رہے ہیں وہ
مزاح نگار ہیں اس لئے اس حقیقت کے بے تکے پن پر ان کی نگاہ ضرور جاتی ہے مگر آپ وہ سب
بیانات پڑھیں جن میں مذہبی باتوں کا ذکر ہے تو یقین ہو جائے گا کہ مذہب سے ان کو اچھا یا برا کسی
طرح کا سروکار نہیں ہے۔

ساتویں یہاں ہمیں ایک سچے ادیب اور سچے ناول نگار کا نظریۂ حیات ملتا ہے یہ اردو ادب
کی سخت بد قسمتی رہی کہ یہاں نظریہ حیات کے معنی کسی مذہب کی تبلیغ کے معنی لئے گئے۔ پھر اخلاق و عقول
کی خطیبانہ ٹھانس سے اسے تعبیر کیا گیا اور نئی زمانہ سے کسی سیاسی نظریہ کا پروپیگنڈا ہی ہونا ضروری
ٹھہرایا جاتا ہے جب سرشار شاہراہ عام پر آئے تو ادب کو اخلاق کا آلۂ کار سمجھا جاتا تھا اور چونکہ انھوں نے
کسی قسم کے اخلاق کے درس کی کوئی خاص کوشش نہیں کی ہے لہٰذا ان کی تصنیف کو خاص اہمیت
نہیں دی گئی۔ شاید سرشار کو خود اس کا احساس ہوا ہو کیونکہ چوتھی جلد میں انھوں نے کئی جگہ وعظ اور
تقریریں رقم کی ہیں جو نہایت درجے بے مزا اور بیکار ہیں لہٰذا جو لوگ سرشار کے "فسانۂ آزاد" کو اس
قسم کے نظریۂ حیات کے پانے کی غرض سے پڑھیں گے تو وہ ضرور پریشان ہی ہوں گے ان کا نظریۂ حیات
صاف اور واضح نہیں ہے اور نہ اس کو کسی زور اور اہمیت کے ساتھ پیش ہی کیا گیا ہے مگر یہ واضح
ہے کہ وہ مہذب اور ترقی کرنے والی زندگی کے حامی ہیں ان کا زمانہ اس طرح کا تھا کہ ہندوستانی
معاشرت تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہی تھی اور ان کے آزاد ہر جگہ تبدیلیوں کو نہایت خندہ پیشانی
کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہیں۔ ان پر خوجی ایسے رجعت کے بندے اپنے حماقت زدہ اعتراضات بھی
[illegible] زدہ ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ آزاد کا مزاج باوجود [illegible] کے ایک ایسا علیمی مزاج ہے

جیسا ہر فرد کا ہونا چاہیئے اگر وہ زندگی کو ہنسی خوشی اور انسانیت کے ساتھ بسر کرنا چاہتا ہے تھا ادب کا مقصد دلوں کو سہارا دے کر امید کی طرف لگا نا ہے اور فسانۂ آزاد کا مجموعی اثر یہ ہے اور یہ اثر اس سادگی کے ساتھ اور اس قدرتی طریقہ پر ہمارے دلوں پر قائم ہو جاتا ہے جو سچے ادب کے شایان شان ہے یہ ضرور ہے کہ جس طرح سرشار کے یہاں ہر چیز ایک ہیجانی کیفیت رکھتی ہے اور کسی صفت کے بھی پورے پورے نقش نہیں جمتے اسی طرح ان کے نظریۂ حیات کا تصور بھی دھندلا ہی رہ جاتا ہے مگر اس بات میں کہ وہ صحیح ادبی راستہ پر ہے ان کو ہر اس فرد پر فوقیت حاصل ہے جو ادب کو کسی فلسفہ کا غلام بنا کر ذلیل کرتا ہو۔

آٹھویں "فسانۂ آزاد" کی واقعیت اس مخصوص جذباتی (AESTHETIC) رنگ میں رنگی ہوئی ہے جس کو اگر دنیا کے ادب میں نہیں تو انگریزی ادب میں ضرور واقعیت کا ایک حد تک لازم سمجھا جاتا ہے یہ رنگ ان کی بے مثل مزاح کا ہے۔ مزاح کی کچھ معمولی قسمیں تو ہمیں قدما کے یہاں بھی ملتی ہیں مگر اس کو خاص اثر کے ساتھ برتنا سرشار ہی کا حق ہے اور قدرت نے اسے برتنے کے لئے ان کو اردو کے تمام ادیبوں سے زیادہ موزوں بنایا تھا۔ ان سے بڑا مزاحیہ نگار اب تک اردو میں نہیں ہوا۔

(۴)

"فسانۂ آزاد" کا مزاح ہی اس کی سب سے زیادہ زندہ اور زندہ رہنے والی صفت ہے اردو میں صحیح اور مزاح نگاری کی بنیاد ان ہی سے پڑتی ہے یوں تو ہمارے یہاں سودا کی ہجویں بھی ہیں مگر ان کی ایک حد صاف صاف گالی گلوج ہے اور بہترین حد یہ ہے کہ وہ (LAMPOON) کے دائرے میں آجاتی ہے غالب کے خطوط میں اور اکثر اشعار میں نہایت نفیس مزاح ہے مگر یہ مزاح حاضر جوابی یا بذلہ سنجی ہی پر مبنی ہے۔ اکبر اس قسم کے مزاح کو ریفارم کا آلہ کار بنا کر اسے طنز کے دائرے میں لے آتے ہیں سرشار کو ان سب پر فوقیت تین وجوہ سے حاصل ہے ایک یہ کہ فسانۂ آزاد میں ہر قسم کی مزاحیہ نگاری موجود ہے دوسرے سرشار اردو میں پہلے ادیب ہیں جن کا مزاج مزاح ہی کے لئے بنا تھا اور جن کا نقطۂ نظر بالکل مزاح سے رنگا ہوا ہے تیسرے ان کے یہاں خالص مزاح ملتا ہے یعنی ان کے مزاح پر وہ رنگ نہیں غالب ہونے پاتے جو عام طور پر مزاح پر چھا جایا کرتے ہیں۔

ہر قسم کے ظرافت کی مثالیں فسانۂ آزاد میں ملتی ہیں پہلے یہاں فراوانی کے ساتھ محض مذاق

(FUN) موجود ہے۔

بوا زعفران اور خوجی کے تعلقات خوجی کی معرکے میں ایک بونے سے کشتی یا ممبئی میں خوجی کی بہات وغیرہ وغیرہ اس خاص قسم کی مزاح کی مثالیں ہیں جن پر ہر فرد بشر ہنستے ہنستے لوٹ جائے گا دوسرے ہر جگہ مکالمہ میں بذلہ سنجی (WIT) کی مثالیں موجود۔ یہ صفت خاص طور پہ نہایت نزاکت کے ساتھ بیگمات کی بات چیت میں نمایاں ہے۔ جانی بیگم اور آسمان جاہ نازک ادا بیگم کی باتوں میں الفاظ اور خیالات کے الٹ پھیر کا خاص لطف ہے جو بذلہ سنجی کی جان ہے۔ تیسرے یہاں وہ اعلیٰ مزاح ہے جسے ہیومر (HUMOUR) کہتے ہیں جو خاص قسم کی ہمدردی پر مبنی ہوتا ہے اور بعینی اپنی چیز کے مکمل تاثر سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مزاح کی بہترین مثال خوجی کے مکمل تاثر سے ملتی ہے مگر نواب فدا علی خاں کی اپنے بٹیر صف شکن سے محبت میں یہ صفت موجود ہے۔ مصنف نے اس فرد نواب کی فطرت میں ایک خاص بے ہنگم بات (ODDITY) کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ نواب کی حرکات تو اپنی جگہ بہت ہی سنجیدہ ہیں مگر ان کا بیان پڑھنے والا اپنی جگہ پر لوٹ لوٹ جاتا ہے۔ سرشار کا ہیومر ہنسانے والا ہے یعنی اس قسم کا ہے جسے (BOISTEROUS) کہتے ہیں اور یہاں اس ہیومر کی ہی کمی نہیں بلکہ قریب قریب فقدان ہے جسے لطیف (SUBTLE) کہا جائے مگر یہ کوئی خاص کمی نہیں کیونکہ عام طور پہ دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں قسمیں مزاحیہ نگار کے مزاج سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک کا کامیابی سے برتنے والا عموماً دوسری کو نہیں برت سکتا ڈکنس (DICKENS) اور تھیکرے (THACKERAY) کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور سرشار کا ہیومر ڈکنس کا سا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرشار ایک خاص قسم کا مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے وہ عام لوگوں کی طرح نہیں رہتے بلکہ جینیس (GENIUS) کی طرح وہ دنیا کو ایک خاص نظر سے دیکھتے تھے اور یہ نظر ایک پیدائشی مزاحیہ نگار کی تھی۔ دنیا میں جو چیز بھی ان کو نظر پڑتی تھی اس کے بے ڈھنگے پن یا حماقت آمیزی اور لہٰذا مضحکہ خیزی پر ان کی نظر پہلے جاتی تھی۔ انھوں نے بعض چیزوں کو سنجیدگی کے ساتھ دیکھا مگر خاص طور پر ان کی دلچسپی انھیں چیزوں میں ہے جن میں کوئی بے تکا پن ہو اور اس بے تکے پن کو اپنے زور قلم سے سامنے لا کر ناظرین کو محظوظ کرنا ان کا خاص فن ہے۔ صبح کے وقت انکا جب مرغ سحر کی ککڑوں کوں کی طرف جاتا ہے اور وہ دنیا کی سیر کرنے آتے ہیں تو ان کو کسی کی چال کسی

کی ڈھال کسی کے حقہ گڑگڑانے کا طریقہ کسی کے چپکی لگانے کا انداز کسی کی حماقت زدہ باتیں تو
کبھی کسی بے تکے خیالات ایسے ہی سب معاملات متوجہ رکھتے ہیں دنیا کا ہر بے ڈھنگا اور بھونڈا
پہلو ہی ان کو نظر آتا ہے اور اسی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے وہ ایک بھدی کائنات تعمیر کرتے ہیں
ان کے مزاح پر طنز کا رنگ کبھی غالب نہیں آتا۔ عام طور پر مزاحیہ نگار کسی خاص نفرت کے
ماتحت مذاق اڑاتے ہیں یا کسی خاص درس اخلاق کی بنا پر اور انھیں وجوہات سے ان کے
مزاح پر طنز کا رنگ غالب ہو جاتا ہے۔ سرشار کو کسی چیز سے نفرت نہیں اور نہ وہ کوئی مخصوص
درس ہی دینا چاہتے ہیں اس لئے ان کے مزاح کا اثر محض شگفتہ کرنا ہے محض ہنسانا اور خوش
کرنا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ نہایت سطحی ہے اور اپنا گہرا اثر نہیں قائم کرتی کیونکہ
جب تک ہم "فسانۂ آزاد" پڑھتے رہتے ہیں تب تک تو ہنستے رہتے ہیں مگر بعد میں کوئی چیز ہمارے
ذہن پر ایسا اثر نہیں چھوڑ جاتی کہ ہم اس کو یاد کر کر کے ہنسا کریں۔ ایک حد تک یہ اعتراض صحیح ہوگا کیونکہ سرشار
کا زیادہ تر مزاح اسی قسم کا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اکثر جگہ پر ایسا مزاح بھی نظر پڑتا ہے جس کی بنیادیں فلسفیانہ
اور نفسیاتی گہرائیوں میں مستحکم ہوتی ہیں۔ اس کی سب سے بہتر مثال خوجی کا مزاحیہ کردار ہے۔

(۵)

فسانۂ آزاد میں واقعیت اور مزاح دونوں کا رنگ زیادہ تر کردار کے ذریعہ قائم ہوتا ہے اور اس
لئے اس تصنیف میں کردار نگاری بڑی اہمیت رکھتی ہے مگر جب ہم اس کردار نگاری کو غور سے
دیکھتے ہیں تو اسے کردار نگاری کہتے ہوئے جھجک سی ہوتی ہے ایک طرف تو یہاں شعوری طور پر
افراد کے بیان میں وہی رنگ جمائے گئے ہیں جو ہمیں قصیدوں کے مدحیہ حصوں میں مرثیوں اور
مثنویوں کے سراپا میں یا داستانوں کے بیانوں میں ملتے ہیں اور ہم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ نفسیات
انسانی کی بابت اب تک اردو ادیب کی وہ حقیقی نظر نہیں پیدا ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ انسان کو
واقعی انسان دیکھ سکے اور محض مدح اور محض ہجو کے درمیان اس راہ پر آسکے جہاں انسانی فطرت اپنی
انفرادیت کے ساتھ اپنی گوناگوں صفات لئے ہوئے ہوتی ہے مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ
سرشار ہمارے اردو ادیبوں کی کم فہمی سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں اور ان کی فطرت ان کو صحیح کردار
نگاری کی کچھ بنیادی باتوں کی طرف ضرور ملاتی ہے سوداگران کی روایات اور ان کی توجہ ان کی

کرتے تو اس سے زیادہ کردار نگاری کی صلاحیت اردو کے کسی ادیب میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ فسانہ آزاد کی کردار نگاری میں بہت سے کردار نگاری کے خلاف طریقے اس فن کے موافق طریقوں کے ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

جو کردار "فسانۂ آزاد" میں ابھرتے ہیں ان کو پیش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے یا موقع موقع سے ان کے بابت کچھ بیانات دئے گئے ہیں۔ یہ بیانات تمام تر مبالغہ آمیز انداز میں ڈوبے ہوئے ہیں میاں آزاد پر قصیدہ ہو یا خوجی کی شکل و صورت و وجاہت یعنی ان کے "ماشہ ماشہ بھر کے ہاتھ پاؤں" دونوں کو بالکل ہجو کے رنگ میں بیان کیا جاتا ہے پھر یہ کردار کچھ مواقع سے گزرتے ہوئے اور دوسرے افراد سے بات چیت کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ ان مواقع پر اور اس بات چیت میں وہ ضرور کردار ہو جاتے ہیں اور ان کی انفرادیت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے اور یہیں ان کو کردار کی حیثیت سے جانچا جا سکتا ہے اس بنا پر ہم آزاد، حسن آرا، نواب ذوالفقار علی خاں، اللہ رکھی، خوجی، سب کو کردار کی حیثیت سے جانچنے کا حق رکھتے ہوئے انکے بابت کچھ لکھ سکتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ ان افراد کو لیا جائے اس تصنیف کی کردار نگاری کے بابت ایک عام بات لکھ دینا ضروری ہے کہ سرشار کے طریقے سے حد سے حد جس طرح کی کردار نگاری ممکن تھی وہ وہی ہو سکتی تھی جسے خاکہ (CARICATURE) نگاری کہا جائے کیونکہ حد سے حد یہ کردار چپٹے (FLAT) ہی قسم کے کردار ہو پاتے ہیں اور ان کا ایک ہی پہلو ہمارے سامنے آنے پاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن کردار کی طرف ہماری توجہ سب میں پہلے جاتی ہے وہ میاں آزاد ہیں۔ یہ عجیب چیز ہیں بالکل افسانوی چیز جن کے بابت ہر امر مبہم ہے اور جن میں ہر صفت موجود ہے پہلے پہلے تو یہ ایک عینی کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں پھر ان کی انفرادیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ جہاں گشت ہیں اور زندگی کے ہر پہلو میں نہایت ہمدردی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں ان کی دلچسپی ایک ذہین اور صاحب ذوق شخص کی سی ہے۔ اس معنی میں وہ سرشار کا عکس ہیں ان کا اللہ رکھی سے تعلق مبہم ہی رہ جاتا ہے اور حسن آرا سے عشق محض روایتی ہے کیونکہ اس عشق کے ماتحت وہ ایک مہم فتح کرنے جا رہے تھے اس لئے یہ امید ہوئی تھی کہ وہ اس میں ثابت قدم رہیں گے مگر وہ پیدائشی عاشق تن ہیں اور ہر جگہ معاشقہ ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے ساتھ کئی کئی

باندھ لیتے ہیں۔ وہ بڑے بااخلاق، فیشن ایبل اور مستعد ہیں اور ہر جگہ اپنے لئے ایک مخصوص مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اس سے ان کی ذہانت، عملی قوت اور رکھ رکھاؤ کا پتہ چلتا ہے مگر وہ سیکڑوں متضاد حالتوں میں دکھائے گئے ہیں۔ ہر جگہ وہ سب سے الگ اور سب سے اہم نظر آتے ہیں۔ ان کی فطرت، مدارج ارتقا بھی طے کرتی ہے اور یہ مدارج فطری ہیں مگر مجموعی طور پر ان کا کردار مبہم اور بے اثر ہی رہ جاتا ہے۔ ان کی سب سے خاص محبوبہ یعنی حسن آرا بیگم کے کمال حسن اور سچی محبت کے ہی کچھ تاثر باقی رہ جاتے ہیں ورنہ وہ بالکل فسانوں کی پری ہی ہیں۔ اسی طرح دوسرے کردار جن میں صف شکن والے نواب ذوالفقار علی خاں بھی ہیں محض کچھ دھندلے سے تاثرات قائم کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اللہ رکھی شاید اس تصنیف میں سب سے زیادہ دلچسپ کردار ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی حد سے زیادہ تیزی کے ساتھ بدلتی ہوئی زندگی اور اس کا عیشیاری سے ہر طبقہ کی زندگی کے درمیان سے اعلیٰ ترین ترقی تک پہونچنا لکھنوی زندگی کے اس خاص پہلو کو واضح کرتا ہے جس کو بعد میں رسوا نے امراؤ جان ادا میں نیا بنا کے پیش کیا۔ اللہ رکھی ایک بہت ہی زوردار پاٹر ناول کی ہیروئن ہو سکتی تھی اگر سرشار ناول نگاری اور کردار نگاری کے فن سے واقف ہوتے کیونکہ ان کا فن محض اتفاق محض جودت طبع پر مبنی ہے اس لئے وہ یہ نہ پہچان سکے کہ کتنا اچھا جواہر ان کے ہاتھ لگا تھا اور انھوں نے اسے کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا۔ مگر جہاں ایک اتفاق نے انھیں اللہ رکھی کو پوری طرح پیش نہیں کرنے دیا وہاں دوسرے اتفاق نے ان کی جودت کی یوں مدد کی کہ وہ خوجی کا لافانی کردار بنا کر اردو ادب پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے احسان کر گئے۔

(۶)

آخر کار فسانۂ آزاد کی روح رواں خوجی ہی ہے۔ اس نے اس تصنیف کے ہر پڑھنے والے کو متاثر کیا اور اس میں وہ جان اور وہ کیفیت ہے کہ سرشار کا ہر نقاد اس کی تعریف کے راگ گاتا نظر آتا ہے یوں تو خوجی کی کردار نگاری میں ہر وہ خامی موجود ہے جو سرشار کی کردار نگاری میں عام طور سے پائی جاتی ہے اور جس سے ہر فنکار کو نفرت کرنا چاہیے مگر ان سب باتوں کے باوجود خوجی فن کردار نگاری کا ایک اعلیٰ ترین شاہکار ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کردار نہیں

خاکہ ہے اور اس کا ایک ہی پہلو ہمارے سامنے آتا ہے وہ شروع ہی سے مکمل ہے اور بدلتی ہوئی
دنیا اس پر کوئی اثر نہیں کرتی یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کے صفات کو کافی حد تک موڑ کر ایک
ہیبت ناک روپ دیا گیا ہے مگر اس میں ایک ایسی جان ہے کہ اس کے خلاف کچھ بھی کہنے کو جی نہیں
چاہتا بلکہ جوں جوں ہم اس کی بابت پڑھتے جاتے ہیں اور کتاب ختم کرنے پر جوں جوں ہم اس کو
یاد کرتے جاتے ہیں وہ ہمارے دل میں گھر کرتا جاتا ہے وہ ایک معجزہ ہے اردو میں کردار نگاری کا پہلا
معجزہ اور شاید اب تک سب سے بڑا معجزہ!

خوجی کا کردار نہایت سادہ اور نہایت پر زور ہے ایک نواب کا افیونی مصاحب جس کو
میاں آزاد سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ان کے ساتھ پہلے شہر کے ہر کونے کی اور پھر دنیا کے
مختلف حصوں کی سیر کرتا ہوا مختلف قسم کے حالات سے گزرتا اور مختلف قسم کے انسانوں سے بھڑتا
ہوا دکھایا گیا ہے ہر جگہ وہ اس طرح موجود ہے کہ آنکھ کو ذرا بھی نہیں کھٹکتا مگر پھر بھی اس
ماحول میں ایسا بے ڈھنگا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حرکتوں اور اس کی باتوں پر ہم ہنستے ہنستے لوٹ
جاتے ہیں وہ ہر جگہ ایسی مضحک صورت میں نمایاں ہوتا ہے کہ ہر فرد بشر کو اس پر ہنسی آئے بغیر
نہیں رہتی اس پر ہنسنے کے لئے کسی خاص مذاق یا تربیت کی ضرورت نہیں ہے وہ ان سب عام
اور معمولی چیزوں کا پلاٹ ہے جس پر ہر درجہ ہر طبقہ اور ہر ذہنیت کا آدمی ضرور ہنسے گا اس کے خیالات
اور تصورات اس قدر سیدھی سادی اور کھلی ہوئی حماقت میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ احمق سے احمق
شخص کو بھی ان پر بے ساختہ ہنسی آجائے گی اس کی قدامت اور جسامت اس کا اکڑنا اور ڈینگ مارنا
اس کا منہ کی کھانا اور پھر بھی زعم میں تن جانا اس کا اپنے ماضی پر ناز اور حال پر اطمینان غرض ہر صورت
میں وہ نہایت سیدھی سادی اور بہت ہی پر اثر چیز ہے سرشار اس کی تخلیق میں فنکاری کے اسی
درجہ پر ہیں جس پر میر اپنے نشتروں میں نظر آتے ہیں۔

پھر خوجی ایک کردار ہے یعنی اس میں ایک انفرادیت ہے یہ انفرادیت اس کے ہزاروں
بار دہرائے ہوئے اس فقرہ سے نمایاں ہو جاتی ہے جس کو یاد کرتے ہی باچھیں کھل جاتی ہیں یعنی
اس کا ہر جگہ یہ کہنا "نہ ہوئی قرولی" اس فقرے سے جو مخصوص نفسیاتی ذہنیت نمایاں ہوتی ہے وہ یہ ہے
کہ اس فقرے کا کہنے والا حقیقت میں کچھ نہیں ہے مگر اپنے تئیں سمجھتا سب کچھ ہے اور دوسروں پر

اپنی دھونس جمانا چاہتا ہے یہ خاص قسم کا زعم یا بر خود غلط ہونا خوجی کے کردار کو ایک وحدانیت دیتا ہے اور سرشار کا اس صفت پر اتنا زبردست قابو ہے کہ خوجی اس صفت سے کہیں الگ نہیں ہوتا تعجب ہوتا ہے کہ سرشار ایسا نا پروا شخص جو آزاد اور اللہ رکھی ایسی بے ترتیب اور بے ڈھنگی تخلیقوں کو پیش کرنے کا عادی ہو کس طرح ایسا ثابت قدم کردار بنا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں تمام تر وہ پیدائشی قوت کردار نگاری کام کر رہی ہے جو سرشار کو قدرت نے ودیعت کی تھی مگر جس سے شعور کی کمی کی وجہ سے وہ دوسری تخلیقوں میں فائدہ نہ اٹھا سکے خوجی کی انفرادیت اتنی ٹھوس ہے کہ وہ ہر جگہ پورے طور پر وہی رہتا ہے جو وہ ہے ہم اس کو ہر جگہ پہچان لیتے ہیں اور اس سے ہمدردی کرتے ہیں وہ ہمارا ایک خاص قسم کا دوست ہو جاتا ہے اور ہم اسے اپنے ذہن میں اس طرح جگہ دیتے ہیں جیسے کہ کسی خاص دوست کو' وہ ایک اپنی الگ دنیا ہے اور اس حقیقی دنیا کے ہر پہلو کے درمیان سے وہ ایک ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح گزر جاتا ہے۔

خوجی کو ہم اس لئے اور بھی پسند کرتے ہیں کہ اس کی انفرادیت ایک ایسی صاف مگر زور دار حماقت ہے جو ہمیں ہر وقت ہنساتی رہتی ہے۔ اس کی فطرت میں متضاد باتیں اس خوبی سے ملی ہوئی اور ایسے قدرتی طریقہ پر نمایاں ہوتی ہیں کہ ہم اس کے روبرو اپنے تئیں عقلمند سمجھتے ہیں اور اس پر ہنسنے کا پورا پورا حق جتلاتے ہیں ایک طرف وہ ایسا شخص ہے کہ کوئی پھونک مارے تو وہ اڑ جائے مگر دوسری طرف وہ پہاڑ کو اپنی ٹھوکر سے ہٹا دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسے ہر شخص آسانی سے پیٹ لیتا ہے مگر وہ یہ کہنے سے باز نہیں آتا "او گیدی نہ ہوئی قرولی" وہ خود ہر جگہ نہایت سنجیدہ ہے اور سچ مچ اپنے تئیں بڑا بہادر، بڑا صاحب علم فارسی بولنے میں یکتائے روزگار وغیرہ وغیرہ سمجھتا ہے مگر اس کی حرکتیں اور باتیں اس میں ان صفتوں کی متضاد صفتیں نمایاں کرتی ہیں اور ہم سے بغیر ہنسے نہیں رہا جاتا وہ ہر جگہ فطرت کے موافق ہے اور وہ کہیں بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہمارا تعلق اس سے ہمدردانہ ہوتا ہے اس کے بے ڈھنگے پن پر ہم دوست کی حیثیت سے ہنستے ہیں اور اس سے زیادہ محبت کرنے لگتے ہیں۔ جب ترکی کے میدان جنگ میں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ خوجی ڈوب گئے تو ہمیں افسوس ہوتا ہے اور "فسانہ آزاد" کو آگے پڑھنے میں ہمیں دلچسپی نہیں رہتی مگر مصنف اس ڈوب جانے کو بھی ایک مذاق ہی بنا کر خوجی کو پھر زندہ کر کے ہمارے سامنے

کھڑا کر دیتا ہے اور ہم پھر اس کے حالات کو بحال خوشی پڑھتے ہوئے کتاب کو ختم کرتے ہیں۔ سرشار مزاحیہ کردار نگاری کے گہرے سے گہرے رنگ پہونچے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہر قدم پر کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

جہاں سطحی نظر رکھنے والے خوجی کی ہمراہی میں ہنستے ہیں اور ہنستے رہنے کے لئے ایک ایک دائمی تاثر اپنے ذہن میں لے جاتے ہیں وہاں گہری نظر رکھنے والے اس کے کردار میں تجزیہ زندگی اور مطالعہ فطرت انسانی کی گہرائی پر عش عش بھی کرتے جاتے ہیں۔ سرشار کے زمانہ کا لکھنؤ انحطاط کے اس درجہ پہ آگیا تھا کہ اس کی تہذیب کے مضحکہ خیز پہلو سامنے آگئے تھے یہاں کی ایک خاص ذہنیت تھی جس میں افیونیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ اس ذہنیت کو افیونیت ہی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور افیون اس ذہنیت کا موزوں ترین اشارہ (SYMBOL) ہے لکھنؤ افیون پیدا کرنے والے خطوں سے بہت دور ہے مگر یہاں جس قسم کی تہذیب مخصوص طور پر قائم رہی اس کو افیون کے اس نشے سے گہرا تعلق ہے جس میں آکر انسان اپنی سب کمزوریوں کو بھول جاتا ہے اور اپنے تئیں کائنات کا مکمل ترین فرد سمجھنے لگتا ہے اس لئے افیون یہاں کے لوگوں کو بہت پسند آئی اور یہاں کا افیون سے ایسا پر لطف تعلق ہو گیا کہ لکھنویت اور افیونیت ہم معنی الفاظ ہو گئے۔ خوجی ایک پکا افیونی ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کی افیونیت کا نہایت گہرا نقشہ ہے۔ اپنی کمزوریوں کے احساس کا بالکل فقدان اور اپنی ہر بات کو کامل سمجھنا یہ لکھنؤ کی تہذیب کی وہ بنیاد ہے جس پر یہاں کی زندگی اور یہاں کی کلچر کی پوری عمارت کھڑی نظر آتی ہے۔ اس بنیاد تک سرشار پہونچ گئے ہیں اور اس کے کھوکھلے پن کو وہ ہمیں دکھا دکھا کر خود بھی ہنس رہے ہیں اور ہمیں بھی ہنسا رہے ہیں ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ انسانی نفسیات کی تہہ تک پہونچ گئے ہیں اور ایک پورے طبقے اور پورے ماحول پر انھوں نے ایسی گہری نظر ڈالی ہے کہ وہ پورا طبقہ ایک کوزہ میں بند ہو کر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ خوجی ایک پورے طبقے اور قوم کی ذہنیت کا نمائندہ فرد ہے اور اس بات میں اس کے وجود کا وہ کمال ہے کہ سوشل تاریخ کا بڑے سے بڑا عالم اور انسانی فطرت کا بڑے سے بڑا ماہر اس کو دلچسپ پائے گا اور اپنے علم کی ترقی کے ساتھ اسے زیادہ سے زیادہ دلچسپ پاتا رہے گا۔ فلسفیوں کے لئے خوجی محض مزاحیہ ہی نہیں بلکہ ایک تعجب انگیز ہستی بھی ہے اور اسی لئے سرشار کو فطری نفسیات نگاروں میں

اعلیٰ درجہ ملنا چاہیئے۔

خوجی محض لکھنؤ کی افیونیت ہی کا ایک اشارہ نہیں بلکہ انسانی فطرت کی ایک خاص حماقت آمیزاور مضحکہ خیز صورت کا آفاقی نمونہ بھی ہے۔ اول تو دنیا کی ہر تہذیب نے اپنے انحطاطی دور میں ایسے لوگ پیدا کئے اور ایسے دور میں انسان کا ایسا ہو جانا ضروری ہے مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ خوجی کی خود فریبی اور زعم کچھ ایسی صفت ہے جو شاید ہی کسی انسان میں نہ پائی جاتی ہو کون انسان ایسا ہے جو اپنی روایات میں کچھ نہ کچھ منہمک نہ ہو جو شاہراہ عام پر آکر اپنی اہمیت جتانے کا خواہاں نہ ہو اور جو زک اٹھا کر اگر زور سے نہیں تو دل ہی میں یہ نہ کہہ دیتا ہو "اوگیدی نہ ہوئی قرولی" خوجی عام انسانی فطرت کا ایک خاص پہلو ہے جو ہوتا تو ہر انسان میں ہے مگر کچھ انسانوں میں مضحکہ خیز طریقہ پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ کون انسان ایسا ہے جس میں کمزوری دماغ نہ ہو اور کون ایسا ہے جس میں کچھ نہ کچھ خود فریبی نہ ہو اور کم فہم شخص کی خود فریبی کی اگر ایک مضحکہ خیز صورت عین آسٹن کے مسٹر کالنز میں ہے تو دوسری صورت سرشار کے خوجی میں۔

یہ امر ہر شخص مانتا ہے کہ خوجی اردو ادب کا سب سے بڑا مزاحیہ کردار ہے اور اس کا مقابلہ دنیا کے مشہور مزاحیہ کرداروں سے کیا گیا ہے۔ شیکسپیر کے فالسٹاف یا مختلف ڈراموں میں مسخروں اور بولون اور مولیئر کے مزاحیہ کرداروں سے وہ بالکل مختلف ہے کیونکہ یہ پورے طور پر گول Round کردار ہیں خوجی چپٹا ہے وہ مکمل ڈرامائی کردار ہیں اور یہ ایک سفری ناول کا خاکہ ہے۔ ممکن ہے کہ ڈون کوئی زوٹ" میں سانکو پانزا کے وجود نے سرشار کو بھی اپنے ہیرو کا ایک مزاحیہ ساتھی پیش کرنے کی ترغیب دی ہو۔ مگر خوجی اور سانکو کی فطرت بالکل مختلف ہے اور سرشار کی اپج تعریف کے قابل ہے کہ اگر انھوں نے تتبع بھی کیا تو اس طرح جیسے کہ جینیس (CENIUS) کو کرنا چاہیئے سانکو انسان کی اس حماقت کا نقشہ ہے جو صحیح عقل رکھتے ہوئے بھی ایک امید موہوم میں اپنی زندگی تباہ کر دیتی ہے جب کہ خوجی کے یہاں عقل کا فقدان ہے اور زعم کی فراوانی اور امید کی کوئی ضرورت ہی نہیں پھر بھی ساخت اور فن میں یہ دونوں کردار مناسب کہے جا سکتے ہیں مگر فنکاری میں جو کردار خوجی سے قریب ترین آجاتا ہے وہ ڈکنس کے پکوک (PICKWICK) کا ساتھی سام ویلر ہے یہ دونوں فطرت میں تو ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر فن میں بالکل یکساں ہیں

اس طرح خوجی بہترین مزاحیہ ناولوں کے اچھے سے اچھے مزاحیہ کردار سے کسی طرح پیچھے نہیں رہتا۔ اگر خوجی ہی کو دیکھتے ہوئے "فسانۂ آزاد" پر رائے دی جائے تو اس کو ناول کہنے میں کوئی عار نہ ہونا چاہیئے۔

(۷)

سامرسٹ ماہم نے اپنی بہترین ناول کی بابت یہ کہا ہے کہ آئندہ نسلیں اس کو اس لئے نہ پڑھیں گی کہ وہ ضخیم ہے۔ عام ناظرین ضخامت سے گھبراتے ہیں اور "فسانۂ آزاد" تو اس قدر ضخیم ہے کہ پڑھنے کے بڑے بڑے رسیا بھی اسے پڑھنے کی ہمت نہیں کرتے۔ اردو ادب کے محققین اور مدرسین میں بھی شاذ و نادر ایسے حضرات ملے جنھوں نے اس کی چاروں ضخیم جلدیں پڑھی ہوں زیادہ تر اس سے محض ان ٹکڑوں کے ذریعہ واقف ہیں ....

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مکمل فسانۂ آزاد کی دلچسپی اب چند ادیبوں تک رہ گئی ہے۔ مگر تاریخ ادب میں اسکی جگہ ہمیشہ کے لئے ہے اور اس کی اس حیثیت سے ہر شخص قدر کرتا ہے ممکن ہے کہ اگر خوجی سے متعلق ابواب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور کاٹ چھانٹ کر ان میں ربط و تسلسل پیدا کر دیا جائے تو ایک مقبول ناول بن سکے مگر وہ "فسانۂ آزاد کا الگ کیا ہوا عضو ہی ہوگا۔

"فسانۂ آزاد" کی آخر کار یہ اہمیت ٹھہرتی ہے کہ اردو ناول نگار (یعنی ادبی ناول نگار) کے لئے اس کا گہرا مطالعہ ناگزیر ہے ناول کا فن اردو میں یورپ سے آیا اور اردو ناول نگار کو یورپ کی ناول سے انسپریشن لینا ضروری ہے مگر وہ اپنے ادب کی روایات کو بھلا کر کوئی قابل قدر اور قابل وقعت چیز پیش نہیں کر سکتا اور وہ جب اردو ناول نگاری (یعنی صحیح ادبی ناول نگاری) کو دیکھتا ہے تو اسے "فسانۂ آزاد" سے بہتر کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی آخر اردو میں ناول ہے ہی کہاں۔ سرشار جو ناول نگاری کے موجد ٹھہرائے جاتے ہیں قدرتی طور پر اس فن کو برتنے کے لئے ناموزوں تھے کیونکہ وہ واقعی زندگی کو سمجھنے اور فطرت انسانی کی تحلیل کرنے سے بالکل قاصر تھے رسوا اتفاق سے ایک "امراؤ جان ادا" لکھ گئے جو ہر طرح مکمل ناول ہے مگر کردار کو زندہ کرنے کی اہم صلاحیت سرشار کے مقابلے میں ان کے یہاں عشر عشیر بھی نہیں حالانکہ ٹکنیک میں وہ سرشار سے سوگنا آگے ہیں ان کے بعد ایک طرف تو پرانے انشا پردازوں نے

اپنا زورِ قلم قصہ گوئی کے ذریعہ دکھایا اور ان قصوں کو ناولیں کہلوایا اور دوسری طرف انگریزی داں
ناول نگاروں نے دو نمبری ناولوں کو کمالِ فن سمجھ کر ان کا تتبع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدمذاقی کے
کہنے کے لئے تو ناول کا بڑا سرمایہ جمع ہو گیا مگر حقیقت میں ناول کا فن پیدا ہوتے ہی ختم ہو گیا
ایسی حالت میں "فسانۂ آزاد" ہی کی ایسی ادھکچی چیز کو غنیمت سمجھنا پڑے گا۔ اس جنگل میں داخل
ہوئے بغیر چارہ ہی نہیں کیونکہ اس سے زیادہ مفید کوئی اور عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ زندگی کو زندہ
کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ زندگی کو زندہ کرنے والوں کی صحبت اٹھائی جائے
اور اس سلسلے میں سرشار سے بہتر صحبت اردو میں کسی اور شخص کی نہیں حاصل ہو سکتی جہاں تک
تکنیکی نکات سے واقفیت کا اور ان کو برتنے کا سوال ہے وہاں تک تو سرشار کے "فسانۂ آزاد"
سے منفی ہی سبق ملیں گے مگر ناول نگاری کی روح سے ہم کناری کا اردو ادب میں انھیں کے یہاں
سب سے زیادہ ذریعہ ملتا ہے۔

محمد حسن

جدید اردو شاعری

(ایک جائزہ)

جدید اردو شاعری کی حد بندی راشد اور فیض کرتے ہیں۔ تنقید کے نزدیک اس دور کے حسن و قبح کو پرکھنے اور اس کی کامیابی اور ناکامی کو جانچنے کے لئے کچھ اور وقت اور فاصلے کی ضرورت ہے مگر پھر بھی اردو شاعروں کی نئی نسل کو اس دور نے اس قدر متاثر کیا ہے کہ آج کے مسائل کو سمجھنے اور کل کے فن کی حفاظت کے لیے اس کا جائزہ لینا تنقید کا فرض بن جاتا ہے۔

شاعری کے اس نئے دور کا تاریخی اور سماجی پس منظر کیا تھا۔ اس کے پیچھے شاعری اور ادب کی روایات تھیں، اس کی پشت پر اقبال اور جوش کے قد آدم سائے تھے۔ ایک نے شاعری کو فکر کی پختگی اور فلسفے کی متانت سے آشنا کیا تھا دوسرے نے زندگی کی توانائی اور جذبے کی بے پناہ آگ سے۔ جدید شاعری کے پاس تکنیک کے تجربوں کی متاع بھی تھی۔ اختر شیرانی اور حفیظ نے وزن اور بحر کے نئے مرکبات تیار کر رکھے تھے۔ اس طرح موضوع اور اسلوب دونوں حیثیتوں سے اردو شاعری تبدیلی کے لئے تیار ہو چکی تھی اور جامد اسالیب کی جگہ نئے سانچوں میں ڈھلنے کے لئے بے تاب۔

جدید اردو شاعری کا ذہن محض ادبی روایات ہی سے نہیں بنا، اس کے پیچھے وہ سارا علمی اور ادبی سرمایہ تھا جو مغرب نے ہمارے سامنے لا ڈالا تھا۔ انگریزی اور یورپی ادب کے ذخیرے ایلیٹ اور آڈن کا بڑھا ہوا تفکر، رومانوی شاعروں کا سوز، حقیقت پسندوں کی تلخیٔ فکر اور اس کے ساتھ سائنس کی وہ

فضائیں جن میں ذہن انسانی یقین اور اعتقاد کی ساری زنجیریں شکست کرکے آوارہ گھوم رہا تھا۔ ڈارون نے بتایا کہ انسان خدا کا نائب ہونے کی بجائے حیوانی وجود ہی کی ایک کڑی ہے۔ فرائڈ نے کہا کہ یہ کڑی بھی اپنے شعور اور عمل میں ان غیر مہذب جذبے ہی کی پابند ہے جس پر کسی کا اختیار نہیں۔ مالتھس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ موت اور جنگ، وبا اور قحط جرم ضعیفی کی سزائیں ہیں اور اس کمزور انسان کے لئے جو اپنے وجود کے سارے بھرم کو توڑ نہیں سکتا۔ دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ دنیا تنازع البقا کا ایک وسیع میدان تھی جس میں آرزو کا مطلب شکستِ آرزو کے سوا اور کچھ نہیں، جہاں پیسہ خدا ہے، مادی ضروریات مختار ہیں اور جذبۂ معصوم سادہ امیدیں محض اپنی آگ کی خس و خاشاک۔ اشرف المخلوقات کی خودی اور سربلندی کا سارا پندار شکست ہو گیا۔

مارکس نے پھر سے انسانی عمل کو کارگر ٹھہرایا اور تصورات کی تبدیلی اور قدروں کی اضافیت پر زور دیتے ہوئے بھی یہ امید دلائی کہ دنیا بدلی جا سکتی ہے، ماحول کو تبدیل کیا جا سکتا ہے، یہ تبدیلی بہتری کے لئے ہوگی اور یہ حقیقی بھی ہے اور لازمی بھی۔

وہم و یقین کی اس دھوپ چھاؤں میں ہماری شاعری پروان چڑھی۔ جذبۂ محض اور روحانی سرمستی کا اثر دھندلا ہوتا گیا اور فکر ابھرنے لگی۔ علم سے آشنا کبھی گھبرائی ہوئی الجھی ہوئی مجروح کبھی روشن تابندہ اور یقین خود آگہی سے آراستہ۔ اس کے چاروں طرف مغرب سے آئے ہوئے علم کی تشکیک اور جستجو بھی تھی جس نے انسان کو تبلایا تھا کہ زندگی اتنی سادہ اور آسان نہیں جتنا وہ ان نگاروں نے اسے سمجھ رکھا تھا۔ اس کے گرد ہندوستانی سماج کی ناہموار سطح بھی تھی۔

غلامی، سیاسی اور ذہنی جاگیردارانہ قدریں ارضی اور سماوی، مذہب کے قیود اور مناقشے سرمایہ داری شہروں کا بڑھتا ہوا بحران اور اقتصادی تشنج اس فضا نے نئے دور کی آمد آمد کا اعلان کیا۔ اس ماحول میں شاعرانہ ذہن نے بہت کچھ بنایا بہت کچھ بگاڑا سوچا اور جھنجلایا کبھی پرچم کاندھے پر سجایا اور اسے بدلنے چلا کبھی چاند تارے توڑ لانے کے حوصلے کئے مگر یہ احول، خارجی حقیقت کا یہ پرتو ہمارے شاعرانہ ذہن پر مستول تھا۔ حقیقت کا یہی گہرا احساس جدید شاعری کی حد بندی کرتا ہے اور اس کے لہجے کو قدیم سرمایۂ شعر سے علیحدہ کرتا ہے۔

اس نئے لہجے نے فن کے پیکر میں اظہار پایا۔ اظہار کی مختلف صورتیں تھیں اور ہر منفرد شاعر

کے کلام اور اسلوب میں اس کی جگہ اور اس کی نوعیت نرالی تھی۔

جدید اردو شاعری کے اس لہجے کی پرورش رومانوی دور نے کی۔ رومانوی دور جذبے کی فراواں روانی کا دور ہے اور اس آئینہ خانے میں قوت حیات اور جمالیاتی تکمیل کے آدرش ملتے ہیں، اس کے رنگ اور صورت مختلف ہوتے ہیں یہ جذبہ کبھی اقبال کو مرد مومن کے خواب دکھاتا ہے کبھی جوش کو فطرت پرستی اور انقلاب پرستی پر اکساتا ہے، کبھی اختر شیرانی کو منزل لیلیٰ کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے اور کبھی حفیظ کو تیرہ سو سال پرانی عظمتوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ نسلی اور قومی عظمت کی بازیافت کا عہد ہے اور اسلوب کے لحاظ سے نغمے کی نئی ترتیب اور اسالیب کے نئے تجربوں کا۔

نئی شاعری جذبے کی اسی فراوانی اور اسالیب کی اسی تلاش کا نتیجہ ہے لیکن جذبے کی آگ یہاں افسردہ ہونے لگتی ہے اور فکر سورج کی طرح طلوع ہو کر رومانیت کے فانوسوں کو پھیکا کر جاتی ہے۔ جذبے اور فکر، رومان اور حقیقت کی یہ امتیازی لکیر اس دور کے تمام تر شعرا کے کلام میں ملتی ہے فیض نے تو "دے بعز وختم جانے خریدم کہ کہ کر اس کی حد بندی کر دی اور اپنے کلام کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سرود شبانہ" آج کی رات اور میرے ندیم" سے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" "رقیب سے" "بول" اور میرے ہمدم میرے دوست" تک یہ منزل پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ راشد کی نظمیں سوچتا ہوں کہ اسے واقف الفت نہ کروں" اور لارنس باغ" جیسے رومانوی تاثر پاروں سے دریچے کے قریب" "داشتہ" اور پہلی کرن" تک پہونچتے پہونچتے آہستہ آہستہ اس درمیانی خط سے گذرتی ہیں جب سنگین حقیقتیں ایک چھناکے کے ساتھ سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیتی ہیں۔

"یہ گرگیا تھے، خیالات تھے، اوہام تھے دیوانے کے
نہ وہ گل چہرہ کنیزیں تھیں نہ دل شاد غلام
در و دیوار کے وہ نقش نہ دیواریں تھیں
سنگ اور خشت کے ڈھیروں پہ تھا کائی کا خول
اور وہ ڈھیر بھی موجود نہ تھے !!

(خرابے)

جذبی کی ابتدائی غزلوں سے ”نزع ‌طوائف“ اور ”نقاد سے“ تک بڑی منزل ہیں اور یہ وہ منزل ہے جو جذبے کو فکر تک لاتی ہے مجاز کی نظمیں یا مکمل انقلابی ہیں یا پورے طریقے پر رومانوی شاعر کی رومانوی سرمستی دونوں کے امتزاج کی اجازت نہیں دیتی "نورا" "آج بھی" اور "نذرِ ادام" ایک سمت اور "مزدور" "انقلاب" اور "خوابِ سحر" دوسری طرف۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی رومانوی نظموں میں لطیف اشارے ملتے ہیں اور انقلابی نظموں میں کہیں رومانوی کوندے لپک جاتے ہیں جیسے آہنگ نو میں۔

پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو

اور عشرتِ تنہائی کا آخری بند۔ ساحر کے کلام میں یہ حد بندی رومانوی سرمستی سے شروع ہو کر "فن کار" اور "کوئی نے سوچا تھا" سے گذرتی ہوئی "میرے گیت تمہارے ہیں" اور "آج" تک پہونچتی ہے۔ یہی خط جعفری کی شاعری سے بھی گذرتا ہے گو اس کی قطعیت کم ہے۔

یہ صورت اردو شاعری کی ایک نئی منزل تھا اور اس کے اپنے امکانات بھی تھے، اور اندیشے بھی زندگی کی طرف یہ نیا رویہ جدید اردو شاعری کی خصوصیت ہے ہمارے شاعروں نے جس طرف دیکھا نہ تھا اب اس طرف دیکھا یہ اور بات ہے کہ فکر آشنائی اور علم کے آگے سر جھکا دینے کی اس کوشش نے جذبے اور رومان کے وہ حوصلہ نواز چراغ گل کر دیئے

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے

وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم

کہیں انفرادی درد کو اجتماعی کرب میں سمونے کی کوشش کی اور اسے ہجوم میں گم کر دیا۔ کبھی کلبۂ احزان میں اسیر کر کے داخلی خلاؤں کے سپرد کر دیا۔ کہیں جعفری نے جنم لیا کہیں میراجی نے۔ جدید شاعر کے نزدیک زندگی نہ داخلی خواہش تھی۔ نہ مایا جال۔ کائنات نے ایک خارجی حقیقت کا روپ لے لیا تھا جسے نہ بھلایا جا سکتا ہے اور نہ جس سے منہ پھیرا جا سکتا ہے۔ اختر شیرانی کی سرمستی اور اقبال کا اعتماد اور حوصلہ یہاں کہیں نہیں ملے گا۔ امید پرست اور مارکسی شاعروں میں بھی نہیں۔ ہمارے

گی کے بارے میں سوچنا زیادہ ہے۔ اس سے لرزاں اور خائف ہے اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت
ہے یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" کو چھوڑ کر کوئی طویل نظم نہیں لکھی گئی۔
نے ساقی نامے اور حفیظ کے شاہنامے کے لئے جس داخلی اور خارجی زندگی کے بارے میں
۔ رویے کی ضرورت ہے وہ یہاں مفقود ہے "دہر تجہ دوں سے جو طویل نظمیں لکھی جا رہی ہیں ان کی
۔ خارجی عمل سے زیادہ داخلی خود کلامی کی ہے۔

اپنے میں کھوئی ہوئی یہ تلخ کا نام ہر قدم پر ملتی ہے۔ یہ ایک نیم فکری نیم جذباتی ترکیب ہے جو باہری
ہ صرف اتنی حد تک واقف ہے کہ اس کے بارے میں سوچ سکے۔ ہمارا شاعر ایک فکری وجود
ب سوچنے والا ذہن ہے۔ ٹھوکریں کھانے اور امنگ کے نغمے گانے والا مطرب خوش نوا شاذ و
کہیں ملتا ہے۔

حقیقت پسندی نے محبت اور حسن کے بارے میں بھی نیا تصور قائم کیا اور یہ نیا تصور جدید
ے سالم و بیش سبھی نے اپنایا۔ وہ حسن جس پر دل و ایمان لٹتے تھے اور جس کے مل جانے سے
دل ہو جانے کا یقین رہتا تھا خلا میں گم ہو گیا تھا اس کی جگہ گوشت پوست کے نسوانی ڈھانچے
ہے تھے۔ ان کے دروازوں پر دربان نہیں امارت اور سماجی وقار کے پہرے تھے یہ محل سرائے
دیواری میں نہیں طبقاتی تقسیم اور اقتصادی ناہمواری کی دیواروں میں اسیر یا محفوظ تھے۔
عشق افلاطونیت سے گذر کر جسم کی مادی پکار تک اب وہ عبادت لب و رخسار کی حدود سے
ب سے قریب آتا ہے "غم جاناں" "دست حنائی" کے لمس سے گذر کر غم دوراں تک پہونچتی ہے۔
ا پر جان دینے کی بجائے اسے غم دوراں پر کمند ڈالنے کا ذریعہ بناتا ہے کبھی اسے غم دوراں
ے حصہ سمجھ کر اس میں محو ہو رہتا ہے کبھی اسے فراموش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔
ستند کی محبت خالص جنسی اور مادی ہے۔ اسے جذباتی سیرابی کی آرزو بھی نہیں اس کا سارا
... سرے پر دماں اور عشق کے مسائل طے کر لیتا ہے "پہلی کرن" کے سوا اور کہیں بھی اس کا دل
... جنبش لب کا آئینہ نہیں چاہتا:۔

اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشی و عشرت کے لئے

اور نری سادہ پرستش کی بجائے
مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذت کیلئے

(عہدِ وفا)

فیض حسن کی مجبوریوں اور اداسیوں سے واقف ہو کر بھی عارض پر غازے کے غبار اور تمتماتے ہوئے آویزے کا خیال کرتا ہے ملبوس کی افسردہ مہک اور سنتی ہوئی راتوں کی کسک کے تذکرے کرتا ہے جو اسے کشاں کشاں کائنات کے درد اور غم دوراں کے مسائل تک لے جاتے ہیں "پہلی سی محبت" شکست ہوتی ہے حسن کے چہرے پر آلام کی گرد کے نشانات ابھرتے ہیں اور عشق اپنی دوروزہ جوانی کی شکستوں کا شمار کرتے ہوئے رومانوی ناکامی کو بھی :-

مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی
کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

فراق کے کلام میں عشق آرزو اور شکست آرزو محرومی اور کامرانی کا ایک نخلستان ہے جہاں سایہ بھی ہے اور رنگ بھی۔ وہ ایک تصور پرست کا جذبۂ بے باک نہیں سنبھلا ہوا اٹھا ہوا تجربہ ہے جو انسانی وجود کو پیش آیا ہے کبھی حسن کی یہ تابناکی زندگی کی رونق اور جینے کی حسرت کو اجاگر کرتی ہے جیسے "شام عیادت میں" :-

جیوں گا ہاں جیوں گا میں نگاہ آشنائے یار

کبھی اداس کرتی ہے کبھی اداسی بھی غم روزگار کی تلخی کے مقابلے میں بھلادی جاتی ہے اور شاعر اسی اداسی کے لئے زندگی کے اسی حوصلے کے لئے اسی حسرت تعمیر اور شکست آرزو کے لئے تڑپتا ہے کبھی حسن کی اداسیوں کا خیال کرتا ہے :-

یہ دکھ یہ درد یہ آرزوہ حالیاں تیری
جو چوم چوم نہ لوں سب ادامیاں تیری

کبھی اپنے جبر و اختیار کے تذکرے :-

جو تیرے گیسوئے پُرخم سے کھیل بھی نہ سکیں
ان انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑتا ہوں میں

جذبی کی "طوائف" اور "تو ہی بتلا" میں حسن آلام اور شکست آرزو سے بے پروا نہیں رہتا
ناشدنے جوبات "خندۂ بے باک" سے پہچانی تھی :-

میں ترے خندۂ بے باک سے پہچان گیا
کہ تری روح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے!
کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے کوئی الم زہرہ گداز

(داشتہ)

جذبی نے اسے بڑے فن کارانہ وقار اور خلوص کے ساتھ کہا ہے:-

جن فضاؤں میں بھٹکتے ہیں خیالات ترے
ہے وہاں کوئی بجز میرے ترا ہم پرواز
کون سمجھے گا سوا میرے ترا حزن و الم!
جب ترے دوش پہ بکھری بھی نہ ہو زلف دراز

جذبی نے پہلی مرتبہ افسردگی میں حسن پانے کی سعی کی ہے یہ حسن کاری کا ایک نیا خاکہ ہے۔
عشق کے بارے میں مجاز نے ایک نیا رخ پیش کیا۔ یہ رخ مجاز ہی پیش کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے کلام میں فکر کی تلخ پختگی کی بجائے زندگی کی امنگ اور جذبے کا والہانہ پن ملتا ہے۔ جذبی کی افسردگی کے برخلاف مجاز کا عشق سرمست اور حسن شاداب اور جوان ہے وہ نہ تشنہ کام ہے اور نہ آورشی دای۔ وہ شکستوں سے گھبرانے کا نہیں ان میں گھر کر گیت گانے کا عادی ہے۔ ناکامیوں سے اسے محبت نہیں لیکن ناکامیاں اسے مایوسی نہیں امنگ اور حوصلہ دیتی ہیں۔

میں ہوں محتاب نہ آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں

"میں آج بھی" کا ٹکڑا سرمد کی اس رباعی کی بازگشت اپنے ساتھ لاتا ہے :-

سرمد گذشت وایں دل زار ہماں!
گرما گذشت وایں دل زار ہماں!
القصہ تمام سرد و گرم عالم!!!
برما گذشت وایں دل زار ہماں

اس کا عشق جراحت آشنا ہے سرمست، اور انجام سے بے پروا سرکش اور شوخ۔ مجاز فکر کی
افسردگی کا نہیں جنون کی طوفانی مستی کا شاعر ہے۔
ساحر نے نسوانی پیکر کی تصویر سارے تنوع اور ارمان میں سمو کر بنائی پورے جوش کے ساتھ زندگی
کے ۔۔۔ آدرش، محبت کرنے اور حسن کو پالینے کے منصوبے بنائے اور پھر ان خوابوں کی شکست
کا نظارہ بھی کیا۔ پرخلوص اور پاکیزہ محبت کی جو تصویریں ساحر نے کھینچی ہیں نشاط اور طرب کے جو خاکے
اس کی شاعری میں اسیر ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتے "کبھی کبھی" اور "میں نہیں تو کیا" میں احساس
پوری شدت سے اجاگر ہوا ہے۔

جدید اردو شاعری غم جاناں سے غم دوراں کی طرف ایک طویل سفر ہے۔ غم دوراں کا یہ احساس
بڑا ہی متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ یہاں زلف و عارض کے سائے بھی خنک اور سرد ہوتے نظر آتے ہیں
اور ان میں بھی زندگی کی محرومی اور تشنگی ساتھ نہیں چھوڑتی حسن اور رومان کے نخلستان سکون نہیں
دیتے پناہ البتہ دیتے ہیں یہ لمحہ لمحۂ غنیمت ہو مگر کرب اور درد سے بھرپور ہے۔

زندگی کے ہمت شکن ماحول نے کاغذی پھولوں سے سجی ہوئی زنجیروں سے ساری آرائشیں
نوچ پھینکیں اور ان کا آہنی اور بے رنگ روپ ظاہر کر دیا۔ کچھ شاعروں نے زندگی کے مسائل سے
الجھنے کی کوشش کی اور کچھ نے اپنے گریبان ہی کو غنیمت جانا۔ وہ اپنے ہی خول کی طرف لوٹنے لگے
کیا وہ حسن کے قصیدے لکھے جب کہ حسن کے یہ خاکے بھی اس کے پاس نہیں رہ سکتے، کیا وہ عشق کے
نغمے گائے جب کہ عہد وفا اور پیمان ابدی سبھی فریب ہیں کیا وہ اس سماج کے لئے لکھے جو اس کے
دکھ درد، اس کی زندگی اور موت سے بے پروا ہے جو اس کی نظم کو محض ایک جنس کی طرح خریدنا چاہتی ہے۔

شاعری میں داخلیت کے اس شکن جذبے نے دخل پایا یہ جذبہ پچھلے دور کی داخلیت سے مختلف
تھا کیونکہ اس کے پاس جذبہ معصوم نہیں تھا فکر مسموم تھی۔ میراجی کی شاعری اس جذبے کی ترجمان ہے
ان کی شاعری ہمارے سارے تشنج، تلخی اور اعصابی کھچاؤ کو پوری عریانی اور بے باکی کے ساتھ اسیر کرتی
ہے ان کی زبان اور تشبیہیں وہ ہیں جو اپنی انفرادی دنیا علیحدہ بسائے ہوئے ہیں۔ انفرادیت کے اس
خول سے کبھی کبھی ایک اجتماعی سرت ملتی ہے ایک انسان ایک سماجی اور مجلسی انسان یکا سا اٹھتا ہے۔

مرے پیارے لوگو

میرے پاس آؤ ـــــ

گر سماجیت شاعروں کی زبان چلتی ہے اور جذبات مجروح اور ناآشنا سا اس طرز خیال نے میرا جی جیسا تیز
طاقتور وسیع اور کچھ عرصہ کے لئے ادبی زندگی پر حاوی رہا پھر بھی میرا جی کے سوا اور کوئی شاعر کامیابی سے
اس اسلوب کو اختیار نہیں کر سکا اس لئے جس تشکیک مکمل اور جس طاقتور غیر سماجی "انا" کی ضرورت
تھی وہ انقلابی شاعری کے رواج سے پیدا نہ ہو سکی اور یہ طوفان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے اتر بھی گیا

انقلابی شاعری جلد ہی جدید اردو شاعری کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ ترقی پسند مصنفین سے
متعلق ہو کر شاعروں کو قنوطیت کی بجائے امید اور وہم کی جگہ ایک ایسا یقین ملا جس نے کم از کم وقتی
طور پر سارے مسائل کو حل کر دیا۔ مجاز اور ساحر گو دیر تک انقلابی شاعر نہ رہ سکے پھر بھی ان کے یہاں انقلابی
فلسفے کی یہ گونج ایک بازیافت کی حیثیت رکھتی ہے فردوس گم گشتہ کی بازیافت "طلوع سحر" اور
"طلوع اشتراکیت" دونوں اس کی مظہر ہیں۔

اردو میں انقلابی شاعری کی روایت جوش سے شروع ہوتی ہے۔ یوں تو حالی اور اکبر۔ اقبال
اور ظفر علی خاں کی شاعری بھی اس ضمن میں رکھ سکتے ہیں لیکن موجودہ ذہن انقلابی شاعری سے آج
جو مفہوم سمجھتا ہے اس کی بنیاد جوش ہی نے استوار کی۔ جوش نے انقلاب کا نعرہ ایک رومانی لحن کی گرج
کے ساتھ لگایا تھا ان کے نعرۂ جنگ میں صلیبی لڑائیوں کے رجز کی گونج تھی جہاں شاعر جہانِ خراب کی ساری
کوتاہیوں کو کچھ اس جذبے سے مٹانا چاہتا تھا:-

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

جوش کے کلام میں انقلاب داخلی آرزومندی کی ایک تمثیل ہے اختر شیرانی کے کلام
کی سلمیٰ منزل لیلیٰ۔ رندوں کے لئے مژدۂ جاں فزا اور ناخوشگوار عناصر کے لئے عذاب الیم کی بشارت
اس کا حکیمانہ جواز معدوم ہے۔

مجاز کی "انقلاب" "مطرب سے" "مزدور" اور "ہمارا جھنڈا" میں بھی یہی رجزیہ رنگ ملتا ہے۔ بنیادی
طور پہ مجاز کا کلام سنبھلی ہوئی لطیف رومانیت کا شاہکار ہے۔ اس میں دورِ وسطیٰ کے یورپ کی فضا کا
احساس ہوتا ہے۔ وہی انفرادی ہیروازم کا داخلی جذبہ۔ مصیبتوں میں گھرنے کا شوق، انھیں فتح کرنے کا

ارمان جو اسے انقلاب کی طرف لے جاتا ہے۔

صحرا ہو خارزار ہو وادی ہو آگ ہو!
اک دن انھیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں
اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آب دار
ہنگامِ جنگ نعرۂ باطل میں ہم بھی ہوں

یہ تمنا اس کی بھی انقلابی نظموں میں کارفرما ہے' سرمایہ داری' مجھے جانا ہے ایک دن' اور اندھیری رات کے مسافر میں اس کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ پھر انھیں جاں بازوں کی طرح نازنینوں کی بے پایاں محبت' سرکش آرزو' انھیں جان پہ کھیل کر پانا۔ وہی عارض ولب کی حکایتیں۔ فتوحات کے دعوے' جنگی جہات' اور انقلابی نغموں کی آگ' جراحتوں سے محبت اور خطر پسندی کا جوش' لمندو چہرے کے چرچے' شہریاروں سے رقابت کا جنون' اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کرنے کا حوصلہ ــــــ ایک نیا ہیجان پیدا کرتا ہے جو ذہن میں کسی نائٹ کی یاد تازہ کر دیتا۔ یہی وہ آہنگ ہے جو مجاز کی شاعری کو بیک وقت انقلابی آگ اور رومانوی نغمگی سے آشنا کرتا ہے۔

انقلابی شاعری کو جعفری نے ایک نئے رخ سے پیش کیا۔ یہاں اسے رومانوی آرزومندی اور حکیمانہ فکر کو سمونے کی کوشش کی گئی تھی۔ سائنٹیفک اور سیاسی نظریوں ہی کو نہیں وقتی موضوعات کی صحافت کو شاعرانہ وقار اور فنی ابدیت بخشنے کی سعی کی گئی جعفری نے انقلابی شاعری کو نئی توانائی ہی نہیں تابانی بھی بخشی آواز اور رجز ہی کو نہیں رنگ اور نور کو بھی فروغ دیا۔

شہر اور گاؤں شربت کے پیالے ہیں۔
جو وادیوں اور میدانوں کی کشتیوں میں سجائے گئے ہیں۔
ایک ایک کر کے ان کو اٹھا لو
اپنی صدیوں کی پیاس اب بجھا لو

شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہارے بیٹے تمہاری فریاد سن رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وہ اپنے پسینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلائے نکلو۔
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے ۔
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں۔

"نئی دنیا کو سلام" انقلابی شاعری کا نیا روپ ہے۔ اس کی کامیاب نظموں نے انقلابی شاعری کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا۔ جعفری ان گنے چنے شاعروں میں ہے جو علم کی بے یقینی کا فنکار نہیں جن کے پاس یقین کا وزن ہے اور اعتقاد کی روشنی۔ اس میں انفرادی فکر کی کمی، داخلی سوز کا فقدان اور خطابت کی بہتات نظر آتی ہے جو شاعرانہ تناسب کا طلسم شکست کر دیتی ہے مثلاً "سیلاب چین" کے ابتدائی تین صفحے یہ بے جا تکرار اور غیر محتاط طور پر زور دینا جگہ جگہ پر نامناسب حد تک پہونچ جاتا ہے۔ جعفری کی انقلابی شاعری نے نئے موضوعات اور اظہار کی نئی دولت بخشنے میں ایک کارنامہ انجام دیا ہے آئندہ نسلیں اس سمندر سے موتی چن لیں گی اور خالی سیپیاں ساحل پر پھینک دیں گی ساحر کی انقلابی شاعری میں البتہ ایک نئی آن بان ہے گھن گرج کم اور نغمگی زیادہ اس کے طوفانی اور شوخ رنگ نظموں میں بھی ایک ایسی نرم آنچ ہے جو محض داخلی جذبے ہی سے پیدا ہوتی ہے شہزادے جاگیردار فن کار حکیمانہ فکر اور داخلی جذبے کے کامیاب نمونے ہیں۔ وقتی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی یہ داخلی شائستگی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی "آج" اس کی کامیاب مثال ہے۔

" ساتھیو۔ میں نے برسوں تمہارے لئے
چاند تاروں بہاروں کے سپنے بنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا

آرزوؤں کے ایوان سجاتا رہا . . . .
آگ اور خون کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پر راستوں پہ
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں ـــــ
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو"

کیفی نے وقتی موضوعات پر کامیاب نظمیں لکھنے کا تجربہ کیا۔ اس نے تجربے میں ظفر علی خاں اور اکبر کی سادگی نہیں اس کے اجزا ہنوز پختگی سے آشنا نہیں ہوئے کیفی کے پاس شعریت روانی اور سادگی ادا کی متاع ہے لیکن اس نے اپنے لئے جن منازل کا انتخاب کیا ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دوسرے لوازمات کی ضرورت ہے۔

اس طرح جدید اردو شاعری ایک نیا احساس اور نیا ادراک لے کر پیدا ہوئی احساس سے تلخی داخلی الجھن، خود سپردگی اور بغاوت کے جذبے جاگے اور ادراک نے خارجی دنیا کے دیکھنے اور اسے بدلنے کا خیال پیدا کیا حقیقت ایک بے رحم دیوی کی طرح سامنے آئی ہمارا شاعر ایک ایسی دنیا میں اپنے وجود کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے پہلی بار دیکھی تھی علم اور آگہی سے تاریکی کے غلاف اتر رہے تھے اور اندھیرے کی عادی نگاہیں دہم اور یقین جستجو اور بازیافت کے سہارے دھیرے دھیرے اُجالے کی طرف اٹھ رہی تھیں ان میں کہیں "اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی" کی کیفیت اور کہیں ایک نئے اعتماد کی جھلک۔

شاعری میں بہرحال خارجی دنیا پوری سنگین حقیقت اور بے رحم سچائی کے ساتھ در آئی تھی رومان کے پردے اٹھتے۔ داخلی رنگ محلوں کو چکنا چور کرتی۔ اب اپنے گریبان سے الجھنے کا شغل ہی سب کچھ نہ تھا، آج جراحتوں کے چمن سامنے کھلنے لگے تھے اور چمن بندیٔ دوراں کا فریضہ شاعر کو چار و ناچار قبول کرنا پڑا۔ آج شاعر کی آواز داخلی گہرائیوں ہی سے نہیں کائنات کی وسعتوں سے بھی آنی چاہیے اسے محض جذبے سے گرانبار نہیں علم اور شعور سے رچا ہوا بھی ہونا چاہیے۔ یہی جدید شاعرانہ عظمت کا نیا نشان تھا اور اردو شاعری کی نئی شاہراہ اس نئی روشنی میں کتنی تابناک اور دل آویز کیوں نہ ہو پھر بھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ چراغ بھی۔ "چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے"

نظمیں

احمد راہی

زوالِ دار و رسن

نہیں ہے درد کے ماروں کو اذنِ گویائی
نہیں تو کیسے کہیں دل پہ جو گزرتی ہے
طلسم کاریٔ حالات کے تموج میں
بس اک امید ہے جو ڈوبتی ابھرتی ہے

یہ حادثات انوکھے نہیں نئے بھی نہیں!
ہزار بار ہم ان مرحلوں سے گزرے ہیں
غبارِ راہ کی صورت بکھر کے بھی ہم لوگ
نشانِ راہ کی صورت ہمیشہ ابھرے ہیں

ستم شعار کی یہ جرأتِ ستم کب تک
جنوں شعار بھی اپنی سی کر دکھائیں گے
بجھے بجھے ہی سہی آج ولولے دل کے

کبھی تو گرمیٔ برق و شرر دکھائیں گے

مسرتوں کے پھریرے ہیں، راحتوں کے علم
یہ چاک چاک گریباں، لہو لہو دامن !
جلی بھی ہوئی پیشانیوں پہ کندہ ہے !
شکست محبس و زنداں، زوال دار و رسن

ادب لطیف دسمبر ۱۹۵۱ء

احمد ندیم قاسمی

کارواں

جرسِ کارواں کی موسیقی — کارواں کے خرام کی غماز
جرسِ کارواں کی خاموشی — کارواں کے قیام کی غماز
جرسِ کارواں کی نالہ زنی — سفرِ ناتمام کی غماز

نہ ترنم ملا نہ سناٹا — نہ مقدر میں نالۂ شب تھا
چند قزاق جا رہے تھے کہیں — ہم سفیرو! یہ کارواں کب تھا
دل میں بوسیدہ لاش کی سی بساند — لب پہ گو احترامِ مذہب تھا
زندگی زندگی پکارتے تھے — مردہ خوری قدیم مشرب تھا
دل کی آنکھوں میں پیاس جلتی تھی — ہم کو جس پر گمانِ کوکب تھا

[illegible] کارواں کی دھن کیسی — کارواں کا سراغ بھی تو ملے
[illegible] راستہ دھواں ہے — [illegible] کا وہ چراغ بھی تو ملے

اک طویل سوچ میں ہیں ہت — اترے آتے ہیں برف کے گالے
چار سو ٹوٹتے ہوئے تارے

ہر طرف عنکبوت کے جالے

ناگہاں خامشی میں لہر اٹھی — نیند میں کوئی جیسے کچھ گالے
جیسے امڈی ہوئی گھٹا میں ہلال — جیسے صحرا کی گود میں لالے

جرسِ کارواں کے منتظرو — چاپ قدموں کی سن سکو تو سنو
یہ کروڑوں نقوشِ پا ــــ یہ پھول — اپنی نظروں سے چن سکو تو چنو

کارخانوں میں ہونکتا فولاد — جوششِ تخلیق میں ہے شعلہ بیاں
کھیت، کانیں، کٹے ہوئے کہسار — ہاں، یہی تو ہیں کارواں کے نشاں
وہ اسی راستے سے گزرے ہیں — جن کی جانب ہے اک جہاں نگراں
ان کے دم سے زمیں کا ذوقِ نمو — اُن کے دم سے حیات زمزمہ خواں
ان کی تخلیق، محورِ تہذیب — ان کی محنت سے زندگی آساں
ان کا ماضی غبار آلودہ! — اور مستقبل آفتابِ جواں

رہزنوں کا حصار ٹوٹ چکا — اہتمامِ سفر کرو تو چلیں!
خون کی خوفناک دلدل سے — ہم صفیرو! ابھر چلو تو چلیں
جرسِ کارواں کے منتظرو — چاپ قدموں کی سن سکو تو چلیں

شاہراہ سالنامہ

آنند نرائن ملا

خاکِ میر و غالب سے

پھر اک تجدیدِ الفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں
میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں

بنامِ خطۂ اقبال خاکِ میر و غالب سے
سلامِ شوق نذرِ دوستانہ لے کے آیا ہوں

تڑپتی بجلیوں میں گم نہ ہوتے دو مرے نغمے
برستی بوندیوں کا اک ترانہ لے کے آیا ہوں

بنامِ ساقیِ دوشیں بیادِ بزمِ مے خانہ
حرم میں دیر سے جامِ شبانہ لے کے آیا ہوں

مرے اوراقِ دل کو اب نہ یوں برباد ہونے دو
کہ میں ان میں تمھارا بھی فسانہ لے کے آیا ہوں

مری نذرِ محبت کو نہ ادنیٰ کہہ کے ٹھکراؤ!
سمجھ لو اک چراغِ آستانہ لے کے آیا ہوں

خشونت کیا کدورت تک کہیں اس میں نہ پاؤ گے
تلاشی دل کی لیں خانہ بخانہ لے کے آیا ہوں

ذرا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو مری جانب
میں سچ کہتا ہوں یا کوئی بہانہ لے کے آیا ہوں

فقط تھوڑا سا نرم اس کے بدلے میں مجھے دیدو
میں گنگا کے دہانے کا دہانہ لے کے آیا ہوں!

سالنامہ ادب لطیف

باقر مہدی

آج بھی

درد دل آج بھی ہے، جوشِ وفا آج بھی ہے ــ زخم کھانے کا محبت میں مزا آج بھی ہے

گرمیٔ عشق نگاہوں میں نہیں ہے، نہ سہی ــ مسکراتی ہوئی آنکھوں میں حیا آج بھی ہے

گونجتی رہتی تھی جو نجد کے صحراؤں میں ــ شب کے سناٹے میں گونجی وہ صدا آج بھی ہے

حسرتیں زیست کا سرمایہ سہی جاتی ہیں! ــ سینۂ عشق پہ وہ مشقِ جفا آج بھی ہے

حسن پابستۂ قفسِ عشق اسیرِ آلام! ــ زندگی، جرمِ محبت کی سزا آج بھی ہے

وہی نغموں میں ہیں فریاد کے معنی پنہاں ــ لبِ شاعر کے تبسم میں نوا آج بھی ہے

بندشیں لب کے تو ہیں وہی ہیں اے دوست ــ زہر آمیزہ مسموم فضا آج بھی ہے

دستِ مزدور سے الجھی ہوئی زنجیریں ہیں ــ آہنی ہاتھوں پہ یہ ظلم روا آج بھی ہے

غم کدوں پر ہیں وہی جنگ کے بادل چھائے ــ امن کی گونجتی ہر سمت ندا آج بھی ہے

دامنِ صبر کے ہر تار سے آتی ہے صدا ــ اور ہر زخم پہ ہنگامہ اٹھا آج بھی ہے

اپنے آلام و مصائب کا وہی درماں ہے ــ "درد کا حد سے گزرنا" ہی دوا آج بھی ہے

میر و غالب کے زمانے سے نئے دور تلک
شاعرِ ہند گرفتارِ بلا آج بھی ہے!

ادبِ لطیف ستمبر ۵۱ء

جگن ناتھ آزاد

اک نور کا طوفاں دیکھیں گے

دو چار ہی دن میں ایک نیا اندازِ گلستاں دیکھیں گے
ہم خاک کے ذرے ذرے میں تصویرِ بہاراں دیکھیں گے
اے جوشِ جنوں اک روز تجھے یوں سلسلہ جنباں دیکھیں گے
جتنے خاموش عنادل ہیں ان سب کو غزلخواں دیکھیں گے
یوں آمدِ فصلِ بہاری کو گلنار میں رقصاں دیکھیں گے
اے شاخِ فرومایہ تجھ کو ہر سمت گل افشاں دیکھیں گے

اس طرح کھلے گا رازِ چمن ہر پھول بنے گا سازِ چمن
اک نکہتِ گل کی موج میں ہم کل رازِ گلستاں دیکھیں گے
وہ شمع جو آج بھی، روشن ہے آندھی کے تھپیڑے کھا کھا کر
اس شمع کا نور زمانے میں ہر سمت پہ افشاں دیکھیں گے

کہتے ہیں جس کو دردِ بشر اس درد کے اے روحِ فردا
ہر درد میں شامل پائیں گے ہر سانس میں غلطاں دیکھیں گے
وہ خاک کہ جس کے دامن میں ظلمت کے سوا اب کچھ بھی نہیں
اس خاک کے ذرے ذرے کو خورشید بہ داماں دیکھیں گے
ظلمات کی ہر اک موج کہیں سورج کی کرن بن جائے گی

اے شامِ الم اک روز تجھے ہم صبحِ درخشاں دیکھیں گے
جب صبح کو سورج چمکے گا ہم اس کی حسیں تابانی میں
ہر غم کا مداوا پائیں گے ہر درد کا درماں دیکھیں گے
ان سب کو ہراساں دیکھیں گے حائل ہیں جو اپنے رستے میں
اے آج کی مشکل تر منزل! ہم کل تجھے آساں دیکھیں گے
وہ محفل جو بے رنگ ہے آج اس محفل میں کل صبح کو ہم
اک حسن کا دریا دیکھیں گے اک نور کا طوفاں دیکھیں گے

دنیا میں فروزاں ہونے سے جس ضو کو ابر نے روکا ہے
اس ضو کے مستقبل کی قسم اس ضو کو خراماں دیکھیں گے
اے رازِ محبت بول ذرا یہ عقدۂ نازک کھول ذرا
انسان سے آخر کب تک ہم انساں کو گریزاں دیکھیں گے
آخر ترا دھوکا کھائیں گے پابندیٔ انساں ہم کب تک
کب تک نہ بھلا ہم دنیا میں آزادیٔ انساں دیکھیں گے
اس وقت جو اپنے فکر میں ہے اس وقت جو اپنے عزم میں ہے
اس طرح کی اک تصویر تری اے عالمِ امکاں دیکھیں گے

شاہراہ سالنامہ

جمیل مظہری

نئے ادب کی زبان سے

بہت اونچا غبارِ راہ امکاں کر دیا ہم نے
بلندی کو قریبِ ذہنِ انساں کر دیا ہم نے

قفس میں آب و گل کے طائرِ ذہنِ فسردہ کو
شعور بال و پر دے کر پرافشاں کر دیا ہم نے

نگاہِ ناز حیراں ہے ہمارے اس سلیقہ پر
تبسم میں بھی زخموں کو نمایاں کر دیا ہم نے

شبِ غم کی سیاہی سے فسانہ لکھ کے ہستی کا
تمنائے سحر کو زیبِ عنواں کر دیا ہم نے

دلِ مزدور سے قطرے نچوڑے خونِ ارماں کے
اور ان سے وقت کے سینے میں طوفاں کر دیا ہم نے

محبت نے جو دی تھی آگ اس کا یوں لیا مصرف
کہ گرم اس سے تنورِ قلبِ دہقاں کر دیا ہم نے

ہنسی اب دیدنی ہے مفلسی کے زخمِ رسوا کی
جسے تہذیب کا چاکِ گریباں کر دیا ہم نے

کچھ ایسی شرح کی گلگونۂ رخسارِ تاباں کی !
کہ اس کو سُرخیٔ خونِ شہیداں کر دیا ہم نے

مزاجِ صید بے پروا دلِ صیاد افسردہ
بہت کم زور دامِ زلفِ پیچاں کر دیا ہم نے

نقابوں کی شکن میں بھی جبینوں کی شکن دیکھی
لطیف اتنا شعورِ نکتہ بیناں کر دیا ہم نے

حقائق کے صنم گر گر پڑے طاقِ توہم سے
خرد کے سارے بتخانوں کو ویراں کر دیا ہم نے

نقابیں نوچ کر حرص و ریاکاری کے چہروں سے
بناتِ عصمت و تقویٰ کو عریاں کر دیا ہم نے

محبت کے لہو سے بھی جراثیمِ خودی نکلے
دل اس کا چیر کر دنیا کو حیراں کر دیا ہم نے

فضا کی خامشی سے زندگی کے راز اگلوائے
زبانِ گنگِ فطرت کو غزل خواں کر دیا ہم نے

ستارے موند لیتے اپنی آنکھوں کو تو اچھا تھا
کہ اپنے دل کے داغوں کو درخشاں کر دیا ہم نے

تعجب کیا اگر قدسی گرا دیں عرش کے پردے
کہ جبریلِ تصور کو پرافشاں کر دیا ہم نے

جمیلؔ اس جام کا صدقہ ہو جس نے ان دماغوں کی
جنھیں پیمانۂ صہبائے عرفاں کر دیا ہم نے

نئی راہ - پٹنہ

جوش ملیح آبادی

اعترافِ عجز

لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں!
صدرِ معنیٰ داورِ الفاظ، امیرِ شاعراں

اور خود میرا بھی کل تک خیر سے تھا یہ خیال
شاعری کے فن میں ہوں من جملۂ اہلِ کمال

لیکن اب آئی ہے جب اک گونہ مجھ میں پختگی
ذہن کے آئینہ پر کانپا ہے عکسِ آگہی

آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں

جہل کی منزل میں تھا مجھ کو غرورِ آگہی
اتنی لامحدود دنیا اور میری شاعری

الاماں آفاق کا دل اور یہ طغیانِ سوز
اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز

زلفِ ہستی اور اسے بے نہایت پیچ و خم
اڑ گیا رنگِ تعقل کھل گیا اپنا بھرم!

میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے کچھ عاشقانہ رنگ ہے

کچھ مناظر کچھ مباحث کچھ مسائل کچھ خیال
اک اچٹتا سا جمال اک سر بہ زانو سا جلال

میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور
ایک طفلانہ بلوغ اک کھوکھلا سنِ شعور

میرے قصرِ شعر میں غوغائے فکرِ ناتمام
ایک درد انگیز درماں اک شکست آمادہ جام

گاہ سوزِ چشم و ابرو گاہ سازِ ناؤ نوش
گاہ خلوت کی خموشی گاہ جلوت کا خروش

چہچہے کچھ موسموں کے زمزمے کچھ جام کے
دیر دل میں چند ٹکڑے مرمریں اصنام کے

چند زلفوں کی سیاہی چند رخساروں کی آب
گاہ حرفِ بے نوائی گاہ شورِ انقلاب

وہ بھی کچھ جاگیردارانہ بہ قولِ ناقداں
وصل کے دو چار نغمے ہجر کی اک آدھ آہ
گاہ مرنے کے عزائم گاہ جینے کی امنگ
اتنی اوچھی رنگ سازی سے کھلا جاتا تھا میں
بے خبر تھا میں کہ دنیا رازِ اندر راز ہے
جو یہاں اظہر من الشمس چراغِ طور ہے
یہ سہانا بوستاں سرو و گل و شمشاد کا!
ہر ترنم ہے دلِ خوں بستہ کی اک موجِ زہر
شرم شوخی کی تھکاوٹ عشوہ عجزِ دل بری
بوئے گل کیا ایک عیارانہ شوخی گرد کی
برق بینائی پہ اک ضربِ سحابِ تیرگی
اس مسلسل آب و گل میں حیاتِ آدمی!
استبدادِ انتہا کا علم نظروں سے نہاں
جہل کا اک قہقہہ ہر ادعائے آگہی
روشنی بن کر اکڑتا پھر رہا ہے برملا !
انجمن میں تخلئے ہیں تخلیوں میں انجمن !
عالمِ معلوماتِ دنیا واقعاتِ صبح و شام
ہر گماں میں اک یقیں سا ہر یقیں میں گماں
روشن امیدوں کی پیشانی میں غلطاں ابہام
ایک اک گوشے سے پیدا وسعتِ کون و مکاں
جنگ میں پیغامِ رحمت سنگ میں پیکِ بہار
بیلی سنجیدگی کے لب پہ سرمستی کا حرف
تخم کے سینے میں غلطاں گلستانوں کے نشاں

بے سواد و بستۂ رسم و رہِ رومانیاں
قعر سے ناواقفیت سطحِ دریا پر نگاہ !
بس یہی سطحی سی باتیں بس یہی اوچھے سے رنگ
اتنی عبرت ناک سطحیت پہ اتراتا تھا میں
وہ بھی گہری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے
وہ درخشاں چیز بھی اک حلقۂ بے نور ہے
ایک پل بھر کا کھلنڈرا پن ہے ابر و باد کا
ہر تبسم ہے حنائے سینہ کی ہلکی سی لہر
ناز اک رنگیں سہارا نازکی اک لاغری
زمزمے کیا ایک خوش فعلی ہے آہِ سرد کی
شعلۂ جوالہ قرطاس کتابِ تیرگی
گریہ کی صرف ایک پل بھر موش سی بازیگری
ہر تماشا سا دیا دو ظلمتوں کے درمیاں !
موت کا اک مسخرا پن ہے بقائے زندگی:
تہ بہ تہ تاریکیوں کا خندۂ دنداں نما
ہر شکن میں اک کھچاوٹ ہر کھچاوٹ میں شکن
فکرِ انسانی کے معبد عقلِ انسانی کے دام
ناخنِ تدبیر بھی خود ایک گتھی بے اماں
ہم سوادِ گیسوئے پرخم صراطِ مستقیم
ایک اک غنچے میں پنہاں صد بہارِ جاوداں
پرنیاں میں تیغ کی باڑھ آب میں آہن کی دھار
برف میں شعلے تپاں شعلوں کی جولانی میں برف
خاک کی چٹکی میں پرافشاں نوائے کائنات۔

ہر گرہ ایک ابر، ہر تعبیر اک ژولیدہ خواب
ہر سحر اک دیو شب، ہر جلوہ اک مکرِ حجاب

ہر نمایاں نقش، اک پنہاں فریب اعتبار کا
ہر گلِ شاداب، اک بہروپیا پن خار کا

ہر خزف، الماس، ہر زنجیر، تارِ عنکبوت
ہر کلید، اک قفل، ہر جھنکار اک جولاں سکوت

پیکرِ ہستی پہ ڈھیلا ہے مظاہر کا لباس
اور میں اس کی ذرا سی اک شکن سے روشناس

برق کی لہروں کی وسعت، الحفیظ و الاماں
اور میں صرف ایک کوندے کی لپک کا رازداں

رازداں کیا، مدح خواں اور مدح خواں بھی کم سواد
نابلد، نادان، ناواقف، ندیدہ، نامراد!

خارج از وہم و گماں ہے عرصۂ پیدائے زمیں
اور اک لمحے کی پیمائش پہ میں قادر نہیں

کیوں نہ پھر سمجھوں سبک اپنے سخن کے رنگ کو
نطق نے الماس کے بدلے تراشا سنگ کو

لیلئ آفاق الٹتی ہی رہی پیہم نقاب
اور یہاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب

دامنِ قدرت کی ہر ساعت گہر پاشی رہی
اور یہاں ذہنی مسائل ہی کی عیاشی رہی

غرفہ ہائے لعل و گوہر آسماں کھولا کیا
اور میں رندِ سیہ رو کوئلے تولا کیا

پا رہا ہوں شاید اب اس تیرہ حلقے سے نجات
کیوں کہ اب پیشِ نظر ہیں عقدہ ہائے کائنات

کائنات اک کارگاہِ سطوت و کاخِ جلال
جلوہ گر جس کے نقائص میں بھی روحِ صد کمال

یہ جبیں بھی، یہ زمیں، یہ پیچ در پیچ آسماں
الاماں و الاماں و الاماں و الاماں

ایک ننھا سا ستارہ، ایک ننھا سا شرار
یہ تزلزل، یہ تلاطم، یہ تموج، یہ فشار

اک نفس کا تار اور یہ شورِ عمرِ جاوداں
اک کڑی اور اس میں زنجیروں کے اتنے کارواں

اک تبسم اور اتنے خونِ صاعقہ کے نجوم
ایک مبہم نقش اور اتنی شعاعوں کا ہجوم!

ایک اک لمحے میں اتنے کاروانِ انقلاب
ایک اک ذرے میں اتنے ماہتاب و آفتاب

یہ گھٹا، یہ برق، یہ طوفان، یہ صرصر، یہ سموم!
سجدہ گاہیں چند اور اتنے خداؤں کا ہجوم

سانس کی جنبش اور اتنے حلقہ ہائے بیشمار
سینے کی کروٹ اور یہ ہنگامۂ رقصِ شرار

ایک حرف اور اس میں یہ لاکھوں ہوائی حاشیے
جن کی آوازیں اگر سن لے تو دنیا گونج اٹھے

ایک پرتو اور فضائے بے کراں پر جست خیز
اک دیا اور آندھیوں کی فوج سے گرمِ ستیز

ایک بوند اور وسعتِ قلزم کے ہلا دینے کا جوش
ایک گونگا خواب اور تعبیر کا اتنا خروش

کوہ کی رفعت میں اتنی پستیوں کے خط و خال
کاہ اور اتنے عناصر کے مساعی کا مآل!

اک ہیولیٰ اور یہ اشکال و اسماء کا ہجوم
جہلِ مطلق کے سیہ خانے میں یہ رقصِ علوم

بہرِ یک ساعت، برائے تابشِ یک بامداد
اتنی سعیِ آب و آتش، اتنی جہدِ برق و باد

ایک شبنم اور اتنے تند شعلوں کی ترنگ
اک صدا اور اتنے نغمے، اک نظر اور اتنے رنگ

اک کلی اور اس میں صدیوں کی تمازتِ رنگ و بو
صرف اک لمحے کی رگ میں اور قرنوں کا لہو

ہر قدم پر نصب اور اسرار کے اتنے خیام
اور اس منزل میں میری شاعری میرا کلام

جس میں علمِ آسماں ہے اور نہ اسرارِ زمیں
ایک خس، اک دانہ، اک جو، ایک ذرہ بھی نہیں

نوعِ انسانی کو جب مل جائیگی رفتارِ نور
شاعرِ اعظم کا تب ہوگا کہیں جا کر ظہور

خاک سے پھوٹے گی جب عمرِ ابد کی روشنی
جھاڑ دے گا موت کی دامن سے جب گرد آدمی

جب قوائے بحر و بر پر آدمی ہوگا سوار
جب بنے گا بندۂ مجبور الٰہِ روزگار

جب بشر کی جوتیوں کی گرد ہوگی کہکشاں
تب جنے گی نسلِ آدم شاعرِ جادو بیاں

فکر میں کامل، نہ فنِ شعر میں یکتا ہوں میں
کچھ اگر ہوں تو نقیبِ شاعرِ فردا ہوں

آج کل جون ۵۱ء

ساحر لدھیانوی

آوازِ آدم

(پاکستان میں ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی نظر بندی پر)

— فیض کی نظم "سرِ مقتل" کے تتبع میں —

بے گی کب تلک آوازِ آدم، ہم بھی دیکھیں گے
میں گے کب تلک جذباتِ برہم، ہم بھی دیکھیں گے
چلو یونہی سہی یہ جورِ پیہم، ہم بھی دیکھیں گے

رِ زنداں سے دیکھیں، یا عروجِ دار سے دیکھیں
ہمیں رسوا سرِ بازارِ عالم، ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو، مآلِ شوکتِ جم، ہم بھی دیکھیں گے

زعمِ قوتِ فولاد و آہن، دیکھ لو تم بھی
بیغِ جذبۂ ایمانِ محکم، ہم بھی دیکھیں گے
جبینِ کج کلاہی خاک پہ خم، ہم بھی دیکھیں گے

کافاتِ عمل، تاریخِ انساں کی روایت ہے
دگے کب تلک ناوک فراہم، ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم، ہم بھی دیکھیں گے

ہنگامِ وداعِ شب ہے، اے ظلمت کے فرزندو
رکے دوش پہ گلنار پرچم، ہم بھی دیکھیں گے
تمہیں بھی دیکھنا ہوگا یہ عالم، ہم بھی دیکھیں گے

شاہراہ جولائی ۱۹۵۱ء

سجاد شاہد

ہر شاخ پہ گریاں ہے بہاروں کا تقدس
گلشن ابھی معمورۂ صد آہ و فغاں ہے
لہراتے ہیں ماحول میں ظلمت کے پھریرے
خورشید جہاں تاب دھندلکوں میں نہاں ہے

مفہوم و مطالب پہ ہیں قانون کے پہرے
حق گوئی کی پاداش میں کٹتی ہیں زبانیں
تنقیدِ خیالات پہ تن جاتے ہیں ابرو
اظہارِ صداقت پہ کڑکتی ہیں کمانیں

سرکار کی عظمت سے جو منکر ہیں وہ مجرم
جیلوں میں مقید ہیں صداقت کے پرستار
سرمائے کے ہاتھوں میں ہے انسان کی تقدیر
جو بھوک سے فریاد کناں ہیں وہ گنہ گار

پھر اپنی حقیقت سے ہے بیزار و گریزاں
ہر امن پسندی کا دلآویز دکھاوا
بل کھا کے مچلنے کے لئے کب سے ہے بیتاب
جمہور کی آہوں کا سلگتا ہوا لاوا!

نظروں میں مچلتے ہیں [illegible] کے شرارے
سہمے ہوئے ہونٹوں پہ صدا کانپ رہی ہے
اک شعلۂ جاں تاب بھڑکتا ہے فضا میں
شاہی کے تحفظ کی ہوا کانپ رہی ہے

محلوں کے پر آشوب اجالوں کو نگلنے
تاریک مکانوں سے چلیں سرخ شعاعیں
ہے سطوتِ ایوانِ شہی لرزہ بر اندام
سرکش ہیں دہکتی ہوئی بیباک ہوائیں

سرمائے کے بیداد سے مرتا ہوا انسان!
پھر زیست کی تابندہ رمق مانگ رہا ہے
صدیوں کا ستایا ہوا کچلا ہوا مزدور
محنت کا صلہ کام کا حق مانگ رہا ہے

(انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی میں پڑھی گئی)
[illegible] اکتوبر ۵۱ء

(سردار جعفری)

اودھ کی خاکِ حسیں

گذرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کی مانند اڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصور کے زخم خوردہ
افق سے یادوں کے کارواں یوں گذر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے
چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گذریں
میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
کہاں ہیں وہ دلنواز باہیں
وہ شاخ صندل
جہاں پہ انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشیمن بنائے ہیں

میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں۔
میری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سُریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں
میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحر عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے۔
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے
شفق کی سُرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھلی ہوئی ہے

(۲)

مرے تصور میں ساقیوں کا خرام رنگیں نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں نہ میکدے میں شور تنیں ہیں

میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
نہ میرے قصبوں کو یاد کرکے تڑپ رہا ہوں ؛ وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں
وہ گاؤں جو سیکڑوں برس سے بسے ہوئے ہیں
کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہوئے کھڑے ہیں
یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
وہ ہاتھ کہ جن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے جو بنوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پہ
سیاہ بھینسوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں
یہ سادگی کس قدر حسین ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں

جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھاؤں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو
ہزار بوسوں سے جگمگا دوں

(۳)

میں اپنے بچپن کے ساتھیوں کی گرجتی آواز سن رہا ہوں
وہ کارخانوں کے سامنے انقلاب بن کر کھڑے ہوئے ہیں
دہکھیتوں میں بہار بن کر رواں دواں ہیں
اندھیری کانوں کی تیرگی میں
وہ نور بن کر اتر رہے ہیں
زمیں کے سینے پہ کاشتکاروں کی لاٹھیوں کے
ہزاروں جنگل اگے ہوئے ہیں
کدالیں کھیتوں کی پاسباں ہیں
درانتیاں جگمگا رہی ہیں
زمیں کے غاصبوں کے چہرے کا رنگ کافور ہو رہا ہے
ملوں کے مالک لرز رہے ہیں
غریب سیتا کے گھر پہ کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک چھنا کرے گا
شکنتلا کب تک اندھی تقدیر کے بھنور میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنؤ کی شگفتگی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی
سروں کے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ کب تک گرا کریں گے
بلکتی آنتوں کو بھوک کب تک ڈسا کرے گی
زمیں کے سینے پہ قاتلوں کے گروہ کب تک چلا کریں گے
خیانتیں کب تلک اہنسا کا روپ دھارے پھرا کریں گی

کسان جو اپنی پاک دھرتی پہ جانور کی طرح جُٹے ہیں
وہ جن کی پیٹھوں پہ بھاری اینٹیں لدی ہوئی ہیں
جو کچے چمڑے کے سخت جوتوں سے پٹ رہے ہیں۔
یہ جسم جو کارخانے داروں کی بھٹیوں میں ابل رہے ہیں۔
یہ ہاتھ لوہے کے دانت جن کو چبا رہے ہیں
یہ خون جو نفع خور بنیوں کی تھیلیوں میں کھنک رہا ہے
یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں
جو اونچے پیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں
یہ کانپتی مفلسی جو آئی ہے چھاتیوں کا لگان لے کر
یہ ننھے بچے جو مالکوں کے مویشیوں کو چرا رہے ہیں
جو کھیت مزدور بھوکے رہ کر زمیں سے گیہوں اگا رہے ہیں
یہ اپنے سینے کی آگ کب تک دبا سکیں گے
یہ اپنی نفرت کا زہر کب تک چھپا سکیں گے
یہ زخم کب تک ہرے رہیں گے
ادھر کی خاک مسکیں کے ذرے بگولے بن کر مچل رہے ہیں۔
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سرخ شعلے ابل رہے ہیں
غموں کی بھاری سلیں دلوں سے سرک رہی ہیں۔
شجاعتیں گرم سینوں کو لے کر نکل رہی ہیں
جھکے ہوئے سر ابھرتے سورج کی شان و شوکت سے اٹھ رہے ہیں
یہ سورماؤں کی سرزمیں ہے
یہ آسمانِ خروشِ طوفانِ برق و باراں کا آسماں ہے
یہ مسکراتی ہوئی فضا سرخ آندھیوں سے بھری ہوئی ہے
یہاں کا ایک ایک چپہ لاکھوں بغاوتوں سے بسا ہوا ہے۔

بغاوتیں جو مغل شہنشاہیت کی چولیں ہلا چکی ہیں۔
بغاوتیں سامراج کو جو بلندیوں سے گرا چکی ہیں
بغاوتیں جو فرنگیوں کے دلوں پہ ہیبت بٹھا چکی ہیں
یہی پرانی بغاوتیں پھر نئے سرے سے جواں ہوئی ہیں

(۴)

مرے وطن کی زمیں کو ناپاک کرنے والو
میں ان پرانی نئی عوامی بغاوتوں ہی کا ترجماں ہوں
میں اپنے اہل وطن کے احساس اور جذبات کی زباں ہوں
میں خاک سے کہہ رہا ہوں اپنے اناج کو کوکھ میں چھپا لے
لٹیرے کھیتوں میں پھر رہے ہیں
میں لاکھوں مزدور نوجوانوں کے ساتھ میداں میں آ رہا ہوں
غدر کے مقتول سورماؤں کو مرقدوں سے اٹھا رہا ہوں
میں چوری چورا کے سوئے شیروں کو گیت گا کر جگا رہا ہوں
چمن کے پھولو چمن میں اک آگ سی لگا دو
لچکتی شاخو فضائیں زنجیریں کے پھیلو
زمیں کی دھاتو ہوائیں جوالا مکھی اچھالو
ملوں کے پہیو بغاوتوں کے ترانے گاؤ
کہاں ہو اے نیکیوں کی فوجو
بدی کے اونچے محل گرا دو
صداقتو آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو
حیات کی تیز و تند موجو فنا کے خاشاک کو بہا دو
سحر کی کرنو اندھیری راتوں کے سر پہ برسو
عوام کے دشمنوں کا نام و نشاں مٹا دو

(۵)

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّہ

جو سیکڑوں میل دور سے اڑ کے میرے خوابوں میں آگئے ہو۔

میرے وطن کی زمیں سے میرا سلام کہنا

اسے بتانا

کہ میرے ہونٹوں پہ تنگ ذہن کی سرد مہر لگی ہوئی ہیں

وہ کالا قانون ایک دیوار بن کے رستے میں آگیا ہے

جسے اہنسا کا نام لے کر پجاریوں نے کھڑا کیا ہے

مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو

ابلتے جوالا مکھی کو کون دبا سکا ہے؟

میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے

وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے

مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں۔

شاہراہ فروری

سکندر علی وجد

۱۵ اگست

اور

شاعر کا اندیشہ

تیغِ ہوس بے نیام دیکھیے کب تک رہے
روئے زمیں لالہ فام دیکھیے کب تک رہے

اہلِ نظر کے لئے تحفۂ دار و رسن
ظلم کا یہ انتظام دیکھیے کب تک رہے

وہم کے زاغ و زغن دہر میں ہیں نعرہ زن
مرغِ خرد زیرِ دام دیکھیے کب تک رہے

ذریتِ اہرمن مست مئے بے خودی
خلقِ خدا تشنہ کام دیکھیے کب تک رہے

نور سے محروم دن، رنگ سے محروم رات
یہ روشِ صبح و شام دیکھیے کب تک رہے

آج دوراہے پہ ہے قافلۂ زندگی !
منزلِ حق چند گام دیکھیے کب تک رہے

مضطرب انسان کو، امن میسر نہیں
کارِ جہاں ناتمام دیکھیے کب تک رہے

خیابان اگست سنہ ۵۰ء

سلیمان اریب

طلوع

ملکۂ شب کی سیہ تاب گھنیری زلفیں
چھا گئیں عارضِ گیتی پہ اندھیرا بن کر
مٹ گیا دن کا چمکتا ہوا ہر نقشِ جمیل
کالی ناگن بنی لیٹی ہے ہر اک راہگذر

اب وہ ہلچل نہیں ہنگامہ نہیں زیست نہیں
غالب آتا چلا جاتا ہے گرانبار سکوت
دستفے متفنے سے مگر قلب کو برماتی ہے؟
کس کی فریاد ہے یہ جبرِ مسلسل کا ثبوت

کب تلک گردنِ جمہور جھکے گی آخر
کب تلک ظلم کے چلتے ہی رہیں گے آرے
کب تلک آہوں کراہوں پہ ہنسینگے آخر
آگ اور خون کے بکھرے ہوئے اندھے دھارے

فاتحی مشرق سے وہ پہلی کرن کی برچھی
چھد گیا سینۂ شب ظلمتیں روپوش ہوئیں
ان گنت زخم نصیبوں کی سسکتی روحیں
عدل و انصاف کی روحوں سے ہم آغوش ہوئیں

شور علیگ

آزاد غلاموں کے نام

یہ چاند یہ دھوپ یہ برسات یہ خزاں یہ بہشت
جس کی گردش نے کٹھن ظلمات دوراں کے لئے
اے وا محراب و منبر اے ضمیر خانقاہ
[illegible] کے نفس سے آج ہر ایک کی آگ
جن کے زخموں پہ پڑا ہے آج ملت کا نقاب
خشت ہر دیوار سے آتی ہے جن کے خون کی بو
کتنی کلیوں نے خنک سائے میں کملائے ہیں تو
تیرگی سے آج بھی بوجھل ہے پشت آفتاب
آج بھی بنتے ہیں عریانی پہ کمخواب و حریر
آج بھی اک طنز ہے راتوں پہ سورج کا فروغ
طاعت و تقدیس کی قسمیں ہیں اب بھی دود خیز
زہد کی فتنہ گری ہے آج بھی پشمینہ پوش!
مومن و درویش و صوفی اب بھی ہیں یزداں شکار
آج بھی ریش و عبا ہے مسجد و منبر کا سود
بجھ گئے ہیں بجھ کے جن تاریک سینوں کے چراغ

اے کہ تیرے دام کا نخچیر ہے سارا بہشت
تو سمجھتا ہے وہ سورج ہے فقط تیرے لئے
ہند کے زندہ شہیدوں کی طرف بھی اک نگاہ
اس ہوا سے بجھ چکے ہیں سچ بتا کتنے سہاگ
ان شہیدوں کی رگوں سے کس نے کھینچی ہے شراب
آج انہی کے زرد چہرے دیکھ کر ہنستا ہے تو
آہ کن چہروں کو جھلساتی ہے "آزادی" کی دھوپ
آج بھی سڑکوں پہ بک جاتے ہیں لاوارث شباب
زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں آج بھی سونے کے تیر
اب بھی قائم ہے "مساوات و اخوت" کا دروغ
آج بھی ابلیس ہے یزداں سے سرگرم ستیز
آج بھی "گندم نما" ہیں مسجدوں کے "جو فروش"
اب بھی ہر دوکاں پہ بکتے ہیں رسول و کردگار
آج بھی ہیں رونق بازار کعبے کے یہود
ان کے ماتھوں پر بھی ہیں ابھرے ہوئے سجدوں کے داغ

اب بھی سلطانِ حرم ضبتی ہے بوجہل و یزید
آج بھی ارزاں ہے اس بازار میں خونِ شہید

اب بھی تیمور و ہلاکو کو ہے ذوقِ غارتِ کائنات
آج بھی چنگیز کر جاتے ہیں کعبے کا طواف

دیو افگن ہیں حرم پر آج بھی لات و منات
آندھیوں کی زد پہ ہے اب بھی چراغوں کا ثبات

ظلمتوں میں اب بھی ہے ڈوبی ہوئی انساں کی روح
آج بھی ڈرتا ہے آدم کو اک طوفانِ نوح!

لب کشائی اب بھی ہے حق و صداقت پہ حرام
آج بھی سقراط کا ہے زہر سے لب ریز جام

اپنے بوجہلوں سے ہیں اب بھی پیمبر بیم ناک
آج بھی سکتے میں ہیں ہوش و خرد کے سینہ چاک

ہو رہا اب بھی ہے دین و سیاست کا فریب
قسمتِ ہر ابنِ مریم اب بھی ہے مرگِ صلیب

اعتبارِ ناخدا و بادباں کچھ بھی نہیں
بحر کے سینے میں جز موجِ رواں کچھ بھی نہیں

ان شکستہ کشتیوں کے ڈوبنے کا غم نہ کر
فطرتِ دریا سمجھ گرداب کا ماتم نہ کر

یہ ہوائیں، یہ اندھیرا، یہ تلاطم، یہ بھنور
ہیں کسی طوفانِ نو آغاز کے پیغامبر

بحر کہتا ہے سفینے ٹوٹ کر رہ جائیں گے
موج کہتی ہے یہ ساحل دور تک بہ جائیں گے

کوئی طغیانی ہوا اپنا رخ بدلتی ہے ضرور
ناخدا ڈوبے کہ ابھرے موج چلتی ہے ضرور

نگار

عزیز قیسی

جیت کس کی؟

زیست تمہاری اُجلی اُجلی
سکّوں کی جھنکاروں والی
دردسے عاری رنج سے خالی

زیست تمہاری گندی گندی
کٹیاؤں میں رہنے والی
اونچے ایوانوں پر گالی!

تم پیارے اور بات تمہاری
میٹھی میٹھی پیاری پیاری
میٹھے انگوروں کی پٹاری

ہم غصّے اور بات تمہاری

کڑوی کڑوی کھاری کھاری
کانٹے نشتر، تیر کٹاری

تم سپنوں کے راج محل میں
ہم جیون کے طوفانوں میں
ننگے بھوکے انسانوں میں

تم چمگادڑ رات کے باسی
ہاتھ تمہارے ہیں اندھیارے
ٹوٹنے والے بیچ سہارے

ہم اجیاروں کے ساتھی ہیں
سرکش سرکش طوفاں پرور
کڑیل کڑیل آہن پیکر

تم جن کے نغمے گاتے ہو
جن کی خاطر حق ہے تمہارا
لوری سے بھی پیارا پیارا

ہم جن کے نغمے گاتے ہیں
عہد کے نغمے وقت کے دھارے
کٹیاؤں کے راج دلارے

آج وہ دونوں صف آرا ہیں
ایٹم شاہی اور جن شکتی!
کچھ بنگلے اور بوری دھرتی

بولو کس کی جیت رہے گی
تم انساں سے گھبراتے ہو
تم جیون سے کتراتے ہو

بولو کس کی جیت رہے گی:
ہم امرت رس برساتے ہیں
ہم جیون پر چھا جاتے ہیں

موت بھی جن سے ڈر جاتی ہے
ان دیروں سے آنکھ ملاؤ
آنکھ بچا کر بھاگ نہ جاؤ

چراغ

عرش ملسیانی

شکوۂ ساقی

زمانے پر مسلط پھر جنونِ جنگ ہے ساقی
فساد انگیز پھر تمییزِ نسل و رنگ ہے ساقی

سریر آرائے عالم وحشتیں ہیں بربریت ہے
تنفر پھر جہاں میں صاحبِ اورنگ ہے ساقی

کدورت سے لیے آساں ہے جینا تو کیا حاصل
محبت پر تو عرصہ زندگی کا تنگ ہے ساقی

بنائے حرب کے آلاتِ مہلک اور اس پر بھی
خود اپنی بے بسی پر عقلِ انساں دنگ ہے ساقی

شرابِ ناب سے گو تو نے صدیوں تک اسے دھویا
دلِ آدم پہ پھر بھی تفرقوں کا زنگ ہے ساقی

کہاں ہے وہ طرب افزائی جامِ مئے گلگوں
نوائے دل نوائے غم سے ہم آہنگ ہے ساقی

ربابِ دہر نے پر درد نغمے ہم سنیں کب تک
کہاں تو ہے کہاں تیرا سرودِ چنگ ہے ساقی

نگاہِ لطف تو نے پھیر لی کیوں اپنے بندوں سے
نہ وہ رونق ہے محفل کی نہ اب وہ رنگ ہے ساقی

جہاں میں بادۂ نفرت کے پیہم دور چلتے ہیں
علاجِ دردِ آدم کا یہ اچھا ڈھنگ ہے ساقی

ہر اک راحت اثر تیری ہے تخریب کا باعث
ہر اک شیشہ جہاں کے واسطے اک سنگ ہے ساقی

مئے جامِ اخوت ہی سے اب تسکین ممکن ہے
کہ راحت بخش زمزم ہے نہ آبِ گنگ ہے ساقی

پلا دے پھر مئے اخلاص اس گمراہ دنیا کو
زمانے پر مسلط پھر جنونِ جنگ ہے ساقی!

غلام ربانی تاباں

نشاۃ ثانیہ

رات زنجیر کہکشاں پہنائے
صبح نو قید ہو نہیں سکتی
موت صیاد بن تو سکتی ہے
زندگی صید ہو نہیں سکتی

۲

وقت کے تند و تیز دھارے کو
کون، ہاں کون موڑ سکتا ہے
رہرو شوق اور منزل کے
ربط کو کون توڑ سکتا ہے

۳

دیکھ مشرق کے خارزاروں میں
رنگ و نکہت کی کارفرمائی
جو رہا مسکن خزاں صدیوں
اس گلستاں میں پھر بہار آئی

۴

سرخ پرچم کے پھول کھلتے ہیں
خون شہیدوں کا رنگ لایا ہے
قصر و ایواں ہیں بوم کے مسکن
جھونپڑوں پہ ہما کا سایہ ہے

۵

ان کے ہاتھوں میں آج طاقت ہے
جو زمین و زماں کے مالک ہیں
خون سے اپنے سینچنے والے
اصل میں گلستاں کے مالک ہیں

۶

ایک تازہ نظام آتا ہے
ہر مداوائے احتیاج لئے
کارخانوں میں ڈھیر ریشم کے
کھیت جھول میں اپنی ناج لئے

۷

موت کی سرد و تیرہ چھاؤں میں
دیکھ نقش بقا ابھرتا ہے
چین اور کوریا کے کھنڈروں سے
اک نیا ایشیا ابھرتا ہے

فارغ بخاری

ارتقاء

دہر میں انقلابات آتے رہے — بزمِ عالم کا نقشہ بدلتا رہا
ہر نیا دور لایا نئی وسعتیں — جن میں انسان کا ذہن ڈھلتا رہا
ان روایات کو پھاند کر آدمی! — نت نئی شاہراہوں پہ چلتا رہا

اور ہمیشہ تہذیبِ نو کا چراغ
آندھیوں کے تھپیڑوں میں جلتا رہا

کارواں کارواں سے ٹکرا گئے — کہنہ افکار کو نیند سی آ گئی
جب افق پہ گھٹاؤں نے قبضہ کیا — کوئی اجلی کرن نور برسا گئی
تیرگی کا مقدر بدلنے لگا!! — روشنی سی فضاؤں میں لہرا گئی

ٹمٹماتے ستارے اگر بجھ گئے
ناچتی مسکراتی سحر آ گئی!

دو یہاں وقت کی ہر نئے دور میں — کچھ نئی داستانیں سنانے لگیں
عہدِ ماضی کی دم توڑتی قوتیں — عہدِ حاضر کو آنکھیں دکھانے لگیں
برق نے پھونک ڈالے نشیمن اگر — نکہتیں بلبلوں کی ٹھکانے لگیں

پھول مرجھا گئے تو نئی کونپلیں

گلستانوں کی رونق بڑھانے لگیں

مشعلیں ارتقا کی لئے زندگی — ظلمتوں کا فسوں توڑتی ہی رہی
پستیوں میں نشیبوں میں بہتی رہی — رفعتوں سے نظر جوڑتی ہی رہی
ڈھونڈتی ہی رہی یہ نئی منزلیں — ل گئے راستے چھوڑتی ہی رہی

روکنے کو چٹانیں جو حائل ہوئیں
ان چٹانوں کا منہ موڑتی ہی رہی

آج ان مشعلوں کی حرارت سے ہی — ساری دنیا کے سینے میں ہیجان ہے
سارے عالم کو ہے زندگی کی طلب — ساری دھرتی کو جینے کا ارمان ہے
اس تجسس کے فیض کرامات سے — آج نوع بشر کو یہ عرفان ہے

ایک قطرہ تلاطم در آغوش ہے
ایک ذرّہ حقیقت میں طوفان ہے

ماحول

فضا ابن فیضی

دھارے

میں آخر اس زندگی میں قوم و وطن کے کتنے فریب کھاؤں
میں تیرگی کی فضا میں تا چند روشنی کے کنول جلاؤں
میں تا کجا دشتِ خشک و ویراں کو ہم سوادِ چمن بناؤں
چمن کے پھولوں کا نام دیکر چمن کے خاروں کو کیا کرونگا

خزاں کی آندھی اٹھی چمن میں وداعِ گل کا پیام دیتی
نہ ایک لمحہ بھی لہلہاتی متاعِ نجم و قمر کی کھیتی!
سمیٹ کر اپنی دھوپ کو ساتھ لے گیا آفتاب گیتی
میں ان فسردہ بجھے بجھے زرد رو ستاروں کو کیا کرونگا

یہ آئینہ تیرہ بختیوں کا یہ بے مآلی حقیقتوں کی
یہ انجمن خود فریبیوں کی یہ بزم جھوٹی صداقتوں کی
یہ پستیٔ جہل کا ہمالہ یہ خشک گنگا مسرتوں کی
ضمیرِ انساں کی منقلوں میں اک آگ روشن ہر دشتوں کی
میں اپنی دنیا کے ایسے شاداب مرغزاروں کو کیا کرونگا

اتر گیا چہرۂ روزِ روشن کا ڈھل گئے آفتاب کتنے
اٹھا دئے وقت کے تقاضوں نے سامنے سے حجاب کتنے

زمیں پہ ٹوٹے پڑے ہیں کردار و آگہی کے رباب کتنے
دہکتی چنگاریوں میں تبدیل ہو گئے ہیں حباب کتنے
میں پنبہ زاروں کے بدلے لیکر پھر ان شراروں کو کیا کرونگا
خزاں کا مارا ہوا ہو گلشن تو پھول کیا مسکرا سکیں گے
غلاف ہوں تیرگی کے جن پر وہ تارے کیا جگمگا سکیں گے
جو خود ہی گم کردہ کارواں ہوں وہ راستہ کیا دکھا سکیں گے
جو خود ہی دھاروں میں بہ رہے ہوں میں ان کناروں کو کیا کرونگا

نگار۔ جون ۵۱ء

جُدائی

شجر حجر وہیں غم کی گھٹا میں چھائی ہوئی — سبک خرام ہواؤں کو نیند آئی ہوئی

رگیں زمیں کے مناظر کی پڑ چلیں ڈھیلی — لویں فلک کے چراغوں کی جھلملائی ہوئی

خجستہ حالی یہ درماندگی، یہ سناٹا! — فضائے نیم شبی بھی ہے سنسنائی ہوئی

دھواں دھواں سے مناظر ہیں شبنمستاں کے — سیاہ رات کی زلفیں ہیں رسمسائی ہوئی

یہ رنگ تاروں بھری رات کے تنفس کا — کہ بوئے درد میں ہر سانس ہے بسائی ہوئی

خنک اداس فضاؤں کی آنکھوں میں آنسو — ترے فراق کی یہ ٹیس ہے اٹھائی ہوئی

سکوتِ نیم شبی گہرا ہوتا جاتا ہے — رگیں ہیں سینۂ ہستی کی تلملائی ہوئی

ہے آج سازِ نواہائے خونچکاں اے دوست — حیات تیری جدائی کی چوٹ کھائی ہوئی

مری ان آنکھوں سے اب نیند پردہ کرتی ہے — جو تیرے پنجۂ رنگیں کی تھیں جگائی ہوئی

سرشک پالے ہوئے تیرے نرم دامن کے — نشاط تیرے تبسم سے جگمگائی ہوئی

لٹک وہ گیسوؤں کی جیسے پیچ و تابِ کمند — لچک بھوؤں کی وہ جیسے کماں جھکائی ہوئی

سحر کا جیسے تبسم دمک وہ ماتھے کی! — کرن سہاگ کی بندی کی لہلہائی ہوئی!

وہ انکھڑیوں کا فسوں، روپ کی وہ دیوِسُت — وہ سینۂ روح نمو جس میں کسمسائی ہوئی

وہ سیج سانس کی خوشبو کو جس پہ نیند آجائے — وہ قد گلاب کی اک شاخ لہلہائی ہوئی

وہ جھلملاتے ستارے ترے پسینے کے — جبینِ شامِ جوانی تھی جگمگائی ہوئی

ہو جیسے بتکدہ آذر کا بول اٹھنے کو وہ کوئی بات سی گویا لبوں تک آئی ہوئی
وہ دھیج وہ دلبری وہ کام روپ آنکھوں کا سجل اداؤں میں وہ راگنی رچائی ہوئی
وہ خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں دمِ صبح وہ بھیرویں تری بیداریوں کی گائی ہوئی
وہ مسکرائی ہوئی لطفِ دید کی صبحیں ! تری نظر کی شعاعوں کی گدگدائی ہوئی
لگی جو تیرے تصور کے نرم شعلوں سے حیاتِ عشق ہے اس آنچ کی تپائی ہوئی
ہنوز وقت کے کانوں میں چھپچھاہٹ ہے وہ چاپ تیرے قدم کی سنی سنائی ہوئی
ہنوز سینۂ ماضی میں جگمگاہٹ ہے دمکتے روپ کی دیپاولی جلائی ہوئی
لہو میں ڈوبی امنگوں کی موت روک ذرا حریم دل میں چلی آتی ہے ڈھٹائی ہوئی
رہے گی یاد جواں بیوگی محبت کی !! سہاگ رنگ کی وہ چوڑیاں بڑھائی ہوئی
یہ میری پہلی محبت نہ تھی مگر اے دوست ابھر گئی ہیں وہ چوٹیں دبی دبائی ہوئی
سپردگی و خلوصِ نہاں کے پردے میں جو تیری نرم نگاہی کی تھیں بٹھائی ہوئی
اٹھا چکا ہوں میں پہلے بھی ہجر کے صدمے وہ سانس دکھتی ہوئی آنکھ ڈبڈبائی ہوئی
یہ حادثہ ہے عجب تجھ کو پا کے کھو دینا یہ سانحہ ہے غضب تیری یاد آئی ہوئی
عجیب درد سے کوئی پکارتا ہے تجھے گلا رندھا ہوا آواز تھرتھرائی ہوئی
کہاں ہے آج تو اے رنگ و نور کی دیوی اندھیری ہے مری دنیا لٹی لٹائی ہوئی

پہنچ سکے گی کبھی تجھ تک مری نوائے فراق
جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی

فیض احمد فیض

طوق و دار کا موسم

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

یہ دل کے داغ دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

قفس ہے بس میں ونیکن تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

ادبِ لطیف نومبر ۵۱ء

لطیف ساجد

تفاوت

تو مرے دردِ تمنا کا مداوا ہی سہی
مرے احساس مری فکر کا حاصل تو نہیں
تری آغوش تری مسندِ شب ہائے جمال
خواب افروز سہی گرمیٔ محفل تو نہیں

تو بہارِ گل و لالہ کا نشیلا ارماں
میں خروشِ غمِ ایام کا دہکا ہوا راگ
تیرے ہونٹوں پہ تبسم کا نم آلود سکوت
میری سانسوں میں شرارے مری آواز میں آگ

جہدِ پیہم ہے نشانِ سرِ منزل میرا
زندگی رنگ اڑاتی ہے مری راہوں میں
مرے نغمے ہیں پیامِ یقینِ فتح بدست
امنِ مستقبلِ عالم کی گذرگاہوں میں

اک نئی شان سے نکلا ہے جلوسِ مہ و مہر
دیکھ وہ ظلمتِ گیتی کا فسوں ٹوٹ گیا
اب نہ وہ پستیٔ احساس نہ جبرِ مہ و سال
ابنِ آدم کی غلامی کا فسوں ٹوٹ گیا

تو مرے دردِ تمنا کا مداوا ہی سہی
مرے احساس مری فکر کا حاصل تو نہیں

مخمور جالندھری

جشنِ جمہوریت

رہگذاروں پہ دھمک اور سجیلے پہرے
پھر کسی نے ہمیں بہکایا کہ آزاد ہیں ہم
تخت ہے، تاج ہے، منصب ہے ہماری خاطر
ایک جمہوریۂ عظمیٰ کے افراد ہیں ہم

جمع ہے جاہ و حشم آج پھریروں کے تلے
گھر سے نکلے ہیں وہی لوگ فراغت ہے جنھیں
صبح بھی جن کی سبھا، شام بھی جن کا جلسہ
اپنے پندار کے دکھلانے کی عادت ہے جنھیں

آج چھٹی ہے حکومت کی طرف سے ان کو
مول لے لیتی ہے یہ چند نوالوں سے جنھیں
اور پھر اپنے تماشوں میں اضافے کیلئے
کھینچ لاتی ہے کرٹ کے خوف کے بھالوں سے جنھیں

اور جو دیش کی قوت ہیں فضیلت ہیں وہ لوگ
ان کا ہر لمحہ تگ و تاز ہے کیسے آ بیٹھ
آج کے دن بھی وہ اس سنکرے آزاد نہیں
چولھا روشن ہو کسک کم ہو جو پیسے آئیں

آج کے دن کوئی میلا ہے وہ سُن لیتے ہیں
جانا بھی چاہیں تو پل بھر کو نہیں جا سکتے
میلے جانے کی نفاست کے بھی وہ اہل نہیں
منہ تو دھو سکتے ہیں کرتہ نہیں دھلوا سکتے

میلے میں جانے سے کرے نے یہ بہتر جانا
چار پائی جو ہے ٹوٹی ہوئی اس کو بُن لے
رادھا نے چاہا کہ چوکے سے نپٹ کر فوراً
شب کے ایندھن کے لئے تھوڑے سے تنکے چن لے

گندی نالی سے اٹھاتا ہے غلاظت نانک
دیسا بازار میں بیٹھا ہے لئے گھاس اور پھوس
اور ٹینکوں پہ، مشینوں پہ، حسیں فٹنوں پہ
رہگزاروں سے گذرتا ہے حکومت کا جلوس

اور ان ٹینکوں پہ گھوڑوں پہ حسیں فٹنوں پہ
بڑی سرکار، زمیندار نظر آتے ہیں
حرص، تکذیب، غبن، سود، اجارہ، رشوت

سبھی اقسام کے بٹ مار نظر آتے ہیں

آہنی فوج کے، پولیس کے دکھلاوے کو
جشنِ جمہور ریا کار ہی کہہ سکتے ہیں
جشنِ جمہور کے پردے میں یہ مذموم مذاق
سچے انسانوں کے غدار ہی سہہ سکتے ہیں

جشنِ جمہور نہیں، یہ تو ہے جشنِ قوت
اک بہانہ ہے ہمیں لوہے سے دہلانے کا
کوئی حیرت نہیں ایسے میں ہمارا سودا
اور بڑھتا ہے جو اس لوہے سے ٹکرانے کا

ایک بار اور ہم ایسے میں قسم کھاتے ہیں
اپنی دھرتی پہ بہت جلد وہ دن لائیں گے
جشنِ جمہور کا دن جب یہ گلی کوچوں سے
لوگ خوشبوؤں سے ریشم سے لدے آئیں گے

شاہراہ ستمبر ۱۹۵۱ء

مسعود حسین

دیے جلاؤ ساتھیو!

دیے جلاؤ ساتھیو!
جلاؤ ساتھیو دیے
شبِ فراق سے بھی کچھ زیادہ گہری رات ہے
صدف میں بند ہے گہر
ڈھکا ہوا رخِ سحر
ستارے ڈوبتے ہوئے
سہارے ٹوٹتے ہوئے
کہو تو زندگی کو آج کس قدر ثبات ہے
ستارے ٹوٹتے رہیں!
یہ آسماں یوں ہی رہے
دیے جلاؤ ساتھیو!
جلاؤ خوں کے دیے
وہ کہکشاں کی رہ گزر ہے چل پڑو تو بات ہے

طویل رات ساتھیو!
یہ کٹ سکے گی کس طرح؟
"کٹے گی آنکھوں آنکھوں میں
یہ کٹ رہی ہے جس طرح!"
بتاؤ کتنی کٹ چکی، بتاؤ کتنی رات ہے!
سحر کی آس پر جئیں!
گلوں سے اوس کیوں پئیں
سحر کے چاک چاک کو
حریرِ شب سے کیوں سئیں
شبِ سیاہ سے ڈھکا ہوا رخِ حیات ہے

قدم بڑھاؤ ساتھیو!
کرن کے تیشے کو لیے!
سحر کی جوئے شیر ہے
پھر یہ گے اب نہ بن پیے
حیاتِ نو کے نور کا وہ سامنے فرات ہے

منزل جون ۱۹۴۸ء

منظر سلیم

ہماری محبّت

پھر وہی خونِ تمنا ہے، وہی دامنِ زیست
پھر وہی تیرا تغافل ہے، وہی قلبِ حزیں
پھر وہی میں ہوں، وہی ذہنِ پریشاں میرا
وہی دن رات وہی کشمکشِ وہم و یقیں!

کیا اسی دن کے لیے میں نے محبّت کی تھی
دل کو ہر کوہِ غمِ دہر سے ٹکرایا تھا
خارزاروں میں بسر کرنے کی خو ڈالی تھی
آگ سے کھیلا تھا، زنجیروں کو اپنایا تھا

اتفاقات پہ جذبات کی بنیاد ہے کیا
کیا مہ و سال کی جاں سوز وفا کچھ بھی نہیں
ایک لمحہ کی مسرّت کا فسوں سب کچھ ہے
زندگی بھر کی خلش آہ و بکا کچھ بھی نہیں

حسن اس دور کے حالات سے غافل تو نہیں
اور اگر ہے تو بتاؤ کہ خطا کس کی ہے!!

بوالہوس کون ہے، لذت کا خریدار ہے کون
سر جھکا لینے کی محبوب ادا کس کی ہے

کیا ابھی حسن کے انداز نہیں بدلے ہیں
یا اسی طرح سے ویران ہے، ویرانۂ عشق
وہی دلہائے فسردہ کے فسردہ سے چراغ
وہی خاموشی، وہی ظلمتِ غم خانۂ عشق

عشق کی بے سر و سامانی حقیقت ہی سہی!
حسن کا ذوقِ نظر تو بھی کہیں خام نہیں
کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہی ایک تضاد
باعثِ خونِ تمنا ہے، مرے قلبِ حزیں

سالنامہ ماحول

منظور عارف

میرے بچے! مرے آغوش میں سوئے ہوئے چاند
یوں ہی رخشندہ و تابندہ رہے تیری جبیں
میری امید کے غنچے! مرے نورستہ کنول
کاش چھونے بھی نہ پائے تجھے دستِ گلچیں

تجھ سے قائم مرے خوابوں کے فلک بوس محل
تجھ سے وابستہ مرے پیار کے اونچے ایواں
تو دمِ صبحِ طلا رنگ شعاعِ اوّل!!!
تو مرا نورِ نظر، رونقِ دل، راحتِ جاں

میں کہ ہوں تیرا جواں باپ غلام ابنِ غلام
جور آقاؤں کے اب اور نہیں سہہ سکتا

میں کہ ہوں ایک مغنّی جو' زباں بند رہا!
اب کسی طرح بھی خاموش نہیں رہ سکتا

خواب میں خوف سے مت کانپ مرے لختِ جگر
میں تجھے جنگ کی بھٹی میں نہیں جھونکوں گا!
میں سکھاؤں گا تجھے امن کے شیریں نغمے!
بربطِ دل کے لئے زخمۂ الفت دوں گا

جنگجو آڑ میں ناموسِ وطن کی اب تک
قتل کرنے چلے آئے ہیں کروڑوں انساں
اب مگر دور نکل آیا ہے انساں کا شعور!!
آج ہے اس کا وطن ساری زمیں' سارا جہاں

میرے بچے! مری جاں! تیرے جواں ہونے تک
کٹ چکی ہوگی یہ سرمایہ کی کہنہ زنجیر
باپ بچوں کی جوانی کو نہیں بیچیں گے
تُل سکیں گے نہ کبھی زر کے ترازو میں ضمیر

تو جواں ہو کے ستاروں کا شکاری ہوگا
تیرے کردار کے گُن ایک جہاں گائے گا
تو جواں ہو کے الاپے گا محبت کے وہ راگ
حسن بے پردہ سرِ بزم نکل آئے گا!

تو مسرت کی حسیں پینگ سدا جھولے گا
تو شفق رنگ بہاروں میں پھلے پھولے گا

سالنامہ ادب لطیف

وامق جونپوری

نفرت

میں کچھ کھڑا گنگنا رہا ہوں
میں اپنی سانسوں سے کھیلتا ہوں
میں اپنے پیروں پہ زور دے کر
یقین اپنے کو دے رہا ہوں
کہ میں ابھی تک تو جی رہا ہوں
کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے
کہ وہ بھیانک مہیب اک خواب
جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے
میں دیکھ کر چونک اٹھا تھا
مجھے ابھی تک ڈرا رہا ہے ——
وہ خواب جس میں درندے اپنے نکیلے اور تیز ناخنوں سے
مرا گوشت اور پوست نوچتے تھے
فضا میں مجھکو اچھالتے تھے

اور اپنے دانتوں پہ رو گئے تھے
مگر یہ محض ایک خواب تو نہیں تھا
بدن ہے زخموں سے چور اب تک
لہو کی سرخی سے میری راہیں تمام رنگیں بنی ہوئی ہیں
مگر میں اب تک مرا نہیں ہوں۔
میں ہنس رہا ہوں!!
میں بولتا ہوں!!!
میں اپنے پیروں پہ زور دے کر
یقین اپنے کو دے رہا ہوں!!!!
ابھی تو کام و دہن سے میرے نکل رہی ہیں صمیم سانسیں
یونہی میں اس وقت تک جیوں گا
کہ جب تک اس خواب کا حسین رخ نہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا

کہانیاں

خواجہ احمد عباس

شکر اللہ کا

نہیں، صاحب۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں، دشمنوں، ہمسایوں، افسروں، مالکوں۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ نہ سرکار سے کوئی گلہ ہے نہ اللہ میاں سے کوئی شکوہ۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ قسمت کے لکھے کو کوئی کیسے مٹا سکتا ہے۔ سو میں اپنی قسمت پر قانع ہوں اور صبح و شام خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کھانے کو پلاؤ قورمہ نہیں تو چٹنی روٹی تو بھیج ہی دیتا ہے۔ سر کے اوپر آسمان کے سوا کوئی دوسری چھت نہیں تو کیا سونے کیلئے فٹ پاتھ کے پتھر تو ہیں۔ میری کٹی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھ کر مجھ پر رحم نہ کھائیے۔ صاحب۔ خدا کا شکر ہے۔ دوسری ٹانگ تو صحیح سلامت ہے۔

سچ پوچھئے تو قناعت ہی ہم غریبوں کی سب سے بڑی دولت ہے۔ قناعت ہماری عورتوں کا زیور ہے اور ہمارے بچوں کا کھلونا۔ آپ محلوں، بنگلوں میں رہنے والے قناعت کے فائدے کیا جانیں۔ سوکھی روٹی کو قناعت کی چٹنی سے لگا کر کھاؤ تو مرغ مسلم کا مزہ آتا ہے۔ پھر سڑک کے کنارے قناعت کا مخمل گدا بچھا کر، اوپر سے قناعت کا ریشمی لحاف اوڑھ کر سو جاؤ۔ ایسی نیند آتی ہے کہ کسی راجہ نواب کو نہ آتی ہوگی۔ اور سنئے جب مشین میں آکر میری بائیں ٹانگ کٹ گئی اور مل مالکوں نے ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا اور میں کباڑی کے ہاں سے دو روپے میں یہ ٹوٹی ہوئی بیساکھیاں

اچھلتا، کودتا، لنگڑاتا ہوا ایک ڈاکٹر کے ہاں پہنچا جو نقلی اعضاء بنانے کا ماہر ہے اور اس سے ربڑ کی ٹانگ لگانے کے لئے ہزار روپے اور لکڑی کی ٹانگ لگانے کے لئے پانچسو مانگے اور میری جیب سے صرف سات روپے نکلے تو آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا؟ نہ ربڑ کی ٹانگ لگوائی نہ لکڑی کی۔ قناعت کی ٹانگ لگوائی۔ اس دن سے آج تک اس ہی ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں اور قناعت کی ٹانگ سے گذارا کر رہا ہوں۔ قناعت ہو تو بیساکھیوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صاحب! اللہ نے ہاتھ دیئے ہیں۔ کولہے دیئے ہیں۔ وہ سامنے دیکھئے نا اس لنچے رلدو کی دونوں ٹانگیں بیکار ہیں پھر بھی ہاتھوں اور کولھوں کے سہارے مزے سے گھسٹ گھسٹ کر چل دیتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے ٹانگوں کے ساتھ باہوں پر فالج نہ گرا دیا۔

خدا کی مہربانی تھی کہ بچپن ہی سے ماں باپ سے قناعت کا سبق ملا۔ ہم ذات کے جولاہے ہیں صاحب، یوں تو ہم مسلمانوں میں کوئی ذات پات نہیں ہوتی۔ خدا کے بندے سب برابر ہیں مگر امیری غریبی، اونچ نیچ شرافت اور ذلت بھی تو شیئی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے میرے باپ کا کہنا تھا کہ "انسان کو اپنا درجہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے"! اور وہ عمل بھی ہمیشہ اسی اصول پر کرتا تھا بوڑھا ہونے پر بھی وہ شریف شرفا تک کے لونڈوں تک کو جھک کر سلام کرتا۔ ہر پٹھان کو "خان صاحب" ہر سید کو "میر صاحب" ہر بنئے کو "لالہ جی" ہر برہمن کو "پنڈت جی" اور ہر چھوٹے سے چھوٹے افسر یہاں تک کہ پٹواری اور نمبردار تک کو "سرکار" کہتا تھا مگر وہ سب اس کو "بندو جلاہا" کہہ کر ہی پکارتے تھے۔

ان امیروں، شریفوں کے بچوں کو اُجلے کپڑے پہنے، کتابیں ہاتھ میں لئے سکول جاتے ہوئے دیکھ کر ہم بھائیوں کا بھی جی چاہتا کہ ہمارے بھی ایسے کپڑے ہوں اور پڑھ لکھ کر ہم بھی افسر بنیں مگر میرا باپ ہمیں سمجھاتا "بیٹا اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ خدا نے جو درجہ دیا ہے اسی پر صبر شکر سے قناعت کرنی چاہیئے۔ نہیں تو کوا چلا ہنس کی چال والی کہاوت ہو جاوے گی"!

میرے باپ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں اور جیسا موقع ہوتا وہ کوئی نہ کوئی کہاوت سنا دیتا۔

ایک برس کی بات ہے جب ہم شہر کے ایک آڑھتی بنئے کے لئے کمبل بُنا کرتے تھے۔ وہ ہمیں اون اور فی کمبل ڈیڑھ روپیہ کتائی اور بنائی کا دیتا اور پھر اسی کمبل کو دس گیارہ روپے میں بازار میں بیچتا۔ ہاں تو اس برس عید کے موقع پر بابا کو آڑھتی کے ہاں سے رقم نہ ملی۔ بات یہ تھی کہ اس سال

ولایت اور جاپان سے مشین کے بنے ہوئے جھاگ جیسے ملائم کمبل بڑے سستے داموں آ گئے تھے اور ہمارے مظفر نگر کے کمبلوں کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔ سینکڑوں کمبل بن بکے پڑے ہوئے تھے اور خود ہمارے والے آڑھتی نے ولایتی کمبلوں کی ایجنسی لے لی تھی۔ ہاں تو جب بابا کو کوئی پچاس ساٹھ کمبلوں کی بنائی نہ ملی تو وہ بیچارہ ہمارے واسطے عید کے کپڑے کہاں سے بنواتا۔ وہی پچھلے سال کی عید کے کپڑے ماں نے گھر میں صابن سے دھو کر دے دیئے۔ جب ہم نے اپنے پڑوس میں وکیل صاحب کے بچوں کو ریشمی اچکنیں اور نئی ترکی ٹوپیاں پہنے دیکھا تو ہمیں بڑا رونا آیا پر بابا نے کہا "ارے بیٹے کیوں ہو وہ امیر اپنے مال میں مست ہیں تو ہم غریب اپنی کھال میں مست"! یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی وہ دن اور آج کا دن جب کبھی میں کسی امیر رئیس کو بڑھیا کپڑے پہنے اکڑ فوں کرتے دیکھتا ہوں تو فوراً اپنی کھال میں مست ہو جاتا ہوں۔

ہاں صاحب تو جب میں بڑا ہوا۔ تو کئی برس تو اپنے باپ کے ساتھ کمبل بننے کا کام کرتا رہا۔ مگر جب یہ دھندا مندا پڑ گیا تو میرے باپ نے نمبر دار سے سفارش کروا کے مجھے تحصیلدار کے ہاں نوکر رکھوا دیا۔ تحصیلدار صاحب شہر کے باہر تحصیل کے پاس ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ اللہ بخشے خانصاحب قدرت اللہ خاں نام تھا اُن کا۔ بڑے رعب داب والے تھے۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور آواز ایسی کہ کسی کو زور سے ڈانٹ دیں تو ڈر کے مارے پیشاب خطا ہو جائے۔ شہر بھر ان سے کانپتا تھا۔ اُن کے ہاں بس میں ہی ایک نوکر تھا۔ تحصیل کے دو چپراسی کبھی کچہری کے وقت کے بعد اوپر کا کام کرتے تھے۔ مگر گھر کا سب کام کاج مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانے کو ایک بڑھیا دو وقت آجاتی تھی مگر جھاڑو دینا، گول کمرے کی میز کرسیوں کو جھاڑنا، پونچھنا۔ تحصیلدار صاحب کو ہر پندرہ بیس منٹ بعد حقہ بھر کر دینا، برتن دھونا، بستر بچھانا، بازار کا سودا سلف لانا یہ سب میرا کام تھا اور ہاں ان سب کاموں کے علاوہ ایک کام اور بھی تھا۔ وہ تھا تحصیلدار صاحب کی بیٹی بانو کی کتابیں اٹھا کر اسے سکول چھوڑ کر آنا۔ لڑکیوں کا سکول کوئی دور نہیں تھا بنگلے سے مشکل سے آدھے میل پر ہوگا اور کھیتوں میں سے ہو کر جاؤ تو اس سے بھی کم۔ مگر تحصیلدار صاحب کی شان کے خلاف تھا کہ اُن کی بیٹی خود کتابیں اٹھا کر لے جائے۔ اس لئے بانو کو سکول پہنچانا اور وہاں سے واپس لانا یہ میرا فرض تھا اور سچ پوچھئے تو سارے کاموں میں سے مجھے یہی کام سب سے اچھا لگتا تھا۔ اُن دنوں میں

کوئی سترہ اٹھارہ برس کا ہوں گا صاحب۔ خدا کے فضل سے ناک نقشہ بھی برا نہیں تھا اور صحت بھی ماشاءاللہ اچھی تھی۔ پھر تحصیلدار صاحب نے دے چار پرانی قمیضیں اور شلواریں دے دی تھیں جنھیں میری ماں نے گز بھر کا ٹ کر ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ پہن کر سر کے بالوں میں کڑوا تیل ڈال کر میں بھی اچھا خاصا جینٹلمین لگتا تھا۔ بانو سکول تو برقعہ اوڑھ کر جاتی تھی مگر مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ تحصیلدار صاحب پردے کے معاملہ میں ویسے بڑے کٹر تھے مگر ان کا کہنا تھا کہ نوکروں سے کیا پردہ۔ اور وہ ایسے ہی کہتے تھے جیسے کوئی کوئی کہے گھر کے کتے سے کیا پردہ، یا بیل یا گھوڑے سے کیا پردہ۔

ہاں تو صاحب بانو مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ کوئی پندرہ یا سولہ برس کی ہوگی۔ دسویں کا امتحان دینے والی تھی۔ اس کا کیا حال بتاؤں۔ آپ سے ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے۔ پر یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے بانو کو بنایا تھا۔ رنگت ایسی جیسے میدہ اور شہاب اور کالے ریشمی برقعہ میں سے منہ نکال کر جب وہ میری طرف دیکھ کر کبھی مسکرا دیتی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا ہے۔ گھونگھر والے بال۔ یہ بڑی بڑی کٹورے جیسی آنکھیں۔ میں تو آدمی تھا سرکار اور وہ بھی جوانی کا عالم۔ پر فرشتے بھی اسے دیکھ لیتے تو ایک بار اپنی پارسائی کو بھول جاتے۔ پھر بھی وہ مالک کی بیٹی تھی اور میں نوکر۔ کبھی ایسا ویسا خیال آتا بھی تو میں سوچتا "ابے او بندو جلاہے کے بیٹے کیوں پاگل ہوا ہے۔ اپنی اوقات مت بھول۔ نہیں تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر گنجا ہو جائے گا۔" اور یہ سوچتے ہوئے میرا نشہ ایسا غائب ہو جاتا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پر سرکار جھوٹ کیوں بولوں۔ دوسرے دن جب اس کی کتابیں اٹھائے کھیتوں سے ہوتا ہوا بانو کے ساتھ سکول جاتا اور ادھر ادھر کوئی نہ پاکر وہ برقعہ سر سے اتار دیتی اور اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں پھیل جاتی تو شیطان پھر مجھے ورغلانے لگتا اور کہتا "ابے تو نوکر نہیں ہے اور وہ مالک کی بیٹی نہیں ہے تو بھی جوان ہے اور وہ بھی جوان"۔

ویسے تو بانو تحصیلدار صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑی چہیتی اور اس کے واسطے دنیا کا ہر عیش و آرام موجود تھا۔ پر سچ مچ وہ بڑی دکھی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کی ماں کے مرنے کے بعد تحصیلدار صاحب نے دوسری شادی کر لی تھی۔ سوتیلی ماں تو آپ جانتے ہی ہیں سرکار بڑی بری بلا ہوتی ہے۔ پر یہ تحصیلدار کی دوسری بیوی خانم جو تھی یہ بہت ہی ظالم تھی۔ سوتیلی بیٹی کو ایک گھڑی خوش دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ یہ تھی بڑی چالاک، جب تک تحصیلدار صاحب گھر پر رہتے اُن کو دکھانے کے لئے بانو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی

پھر جیسے ہی کچہری جانے کے لئے وہ گھر سے نکلے۔ اس نے چولا بدلا۔ بات بات پر بانو غریب پر ڈانٹ پڑتی
پٹتی بھی بیچاری بانو۔ ایک دن سویرے خانم نے اپنے گود کے بچے کے گو موت سے بھرے نہالچے پوتڑے
دھونے کے لئے بانو سے کہا۔ وہ بیچاری اسکول کا کام کر رہی تھی۔ اس میں ذرا دیر ہو گئی۔ خانم گودام میں
سے کھانا پکانے والی کو آٹا تول کر دیکر باہر جو نکلی تو دیکھا کہ نہالچے ویسے ہی پڑے ہیں۔ بس آگ ہی تو لگ
گئی۔ بانو کے ہاتھ سے اسکول کی کاپی چھین کر پرزے پرزے کر دی۔ وہ لڑکی کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی
اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں چھپرکھٹ کا پایہ اٹھا کر اس کے ہاتھوں کو نیچے دبا کر خود چھپرکھٹ پر چڑھ کر بیٹھی
اور کہتی رہی تو جب تک معافی نہیں مانگے گی، تب تک یہیں تڑپے گی۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ پر وہ بھی
بڑی ہی ہٹ کی پکی تھی۔ دانت بھینچے رہی۔ نہ روئی۔ نہ سسکی لی۔ نہ معافی مانگی۔ جب خانم کا جی بھر گیا
تو وہ خود ہی اٹھی۔ میں برآمدے کی چک میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ جا کر
خانم کو جان سے مار دوں۔ جب اس کمبخت کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تب جان میں جان آئی۔ پر
اب بانو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ خود پائے کو اٹھا سکے۔ یہ دیکھ کر میں خانم سے ڈرتا
ڈرتا کمرے میں گیا اور جلدی سے پلنگ کا پایہ اٹھایا۔ اس وقت بانو کی آنکھوں کی کیفیت کیا بیان
کروں سرکار ایسی لگتی تھی جیسے کوئی زخمی ہرنی ہو جسے کسی نے قصائی کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچا لیا ہو۔
دیکھتے ہی دیکھتے اب ان آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور پھر تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے مونڈھے پر سر
رکھے سسکیاں بھر رہی ہے۔ آپ ہی بتائیے ایسے موقع پر کوئی کرے بھی تو کیا کرے۔ میرا سانس اوپر
کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "چھوڑو بی بی کیا کرتی ہو۔ خانم دیکھ لے گی تو میری کھال ادھیڑ دے گی؟"
میں نے آہستہ سے کہا اور پھر جیسے ہی دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک نے ساڑھے نو کا گھنٹہ بجایا میں نے
کہا "اسکول جانے کا وقت ہو گیا" اور اسکول کا نام سن کر بانو کی سسکیاں ختم ہو گئیں اور میرے
گیلے مونڈھے سے سر اٹھا کر اس نے کہا "چل ممدو میری کتابیں اٹھا۔ آج تو میرے ہاتھوں میں قلم
پکڑنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔"

اس دن بانو اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلی تو میں نے دیکھا برقعے کے اس نے ایک پوٹلی
سی چھپا کر بغل میں دبائی ہوئی ہے۔ اسکول کے راستہ میں بانو نے ہمیشہ کی طرح نقاب الٹ دی
راستہ پگڈنڈی پگڈنڈی کھیتوں میں جاتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ بولی۔

"ممدو! یوں تو میں مر جاؤں گی۔"

میں نے کہا "ہاں چھوٹی بی بی - یہ خانم بڑی ظالم ہے۔"

"پھر؟" اور یہ کہہ کر اس نے میری طرف یوں نظر بھر کر دیکھا کہ میرا منہ گھبراہٹ سے لال ہو گیا۔

"تحصیلدار صاحب سے کیوں نہیں شکایت کرتیں۔ وہ تمہارے باپ ہیں آخر۔"

"ابا سے شکایت کی تو یہ ڈائن مجھے جان ہی سے مار ڈالے گی۔ اور پھر ابا میری بات کیوں ماننے لگے۔ تم نے دیکھا نہیں ان کے سامنے کتنی چکنی چپڑی باتیں کرتی ہے۔"

"پھر؟" اس بار میں نے سوال کیا۔

وہ بولی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر "چل ممدو کہیں بھاگ چلیں۔ میرے پاس تھوڑا سا زیور بھی ہے تیس چالیس روپے بھی میں نے بچا کر رکھے ہیں۔"

امیر چھوکریاں اپنے نوکروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔ ایسے قصّے میں نے سُنے ضرور تھے مگر میں سمجھتا تھا یہ باتیں قصّے کہانیوں ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ اب بانو کی زبان سے خود یہ سن کر میرا تو یہ حال ہوا سرکار، کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑا ایسا لگا جیسے دل کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ ایک دل کہتا تھا "ابے ممدو تیری قسمت جاگ گئی ہے۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ذرا لونڈیا کا جوبن تو دیکھ اور ان جلاہوں کی کالی کلوٹی لونڈیوں سے مقابلہ تو کر جن سے تیری ماں تیری قسمت پھوڑنے والی ہے، اور پھر وہ خود کہہ رہی ہے کہ زیور گہنے بھی ہیں - اب عیش کرے گا عیش۔" پر سرکار دوسرے دل نے کہا "اپنی اوقات مت بھول۔ تو ممدو ہے ممدو۔ بندو جلاہے کا لونڈا۔ تحصیلدار صاحب کا نوکر۔ ایسی ویسی کوئی بات کرے گا تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پر ایک بال نہ رہے گا..."

وہ تو خیریت ہوئی سرکار کہ اتنے میں سامنے سے کوئی اسکول کا ماسٹر آتا ہوا نظر آگیا۔ اور بانو نے جھٹ سے نقاب گرادی پھر آہستہ سے مجھ سے بولی "چھٹی چار بجے ہو گی۔ پر تو تین بجے ہی تانگہ لے کر آجائیو۔ ساڑھے تین بجے کلکتہ میل جاتا ہے بس آج میں گھر واپس نہ جاؤں گی۔"

ماسٹر پاس سے گذر گیا تو میں نے چپکے سے کہا "بی بی ایسی باتیں مت کرو تحصیلدار صاحب کو پتہ چلے گا تو میری کھال کھنچوا دیں گے۔"

وہ بولی۔ "ارے تو مردہ ہو گر پڑتا ہے؟" اور پھر برقعہ میں سے ایک ہلکی سی سسکی کی آواز آئی ۔
"معاف کرو میں بچے تانگہ لیکر نہ آیا تو میرا خون تیری گردن پر ہو گا۔"

بس یہ کہا اور جھپ سے وہ تو اسکول کے اندر چلی گئی اور میں دہیا دروازے کے سامنے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے مجھ پر بجلی گری ہو۔ آپ ہی بتلایئے سرکار! کرتا تو کیا کرتا۔ ایک طرف تحصیلدار کے ہنٹر کا خوف دوسری طرف بانو کی جان کا خیال۔ نہ جانے کتنی دیر تک تو میں وہیں سکول کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا تو سیدھی پگڈنڈی سے بھٹک کر کتنی ہی دیر تک کھیتوں میں بھٹکتا رہا۔ جب میں بنگلے پر واپس پہنچا تو بارہ بج رہے تھے اور خانم غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ ابھی میں نے دروازے میں قدم ہی دھرا تھا کہ گالیوں، کوسنوں کی بوچھاڑ پڑنا شروع ہو گئی۔

"کہاں تھا اب تک تو حرام زادے گھر کا سارا کام یوں ہی پڑا ہے اور تو وہی تماشا ہی بنا رہتا ہے کیوں جواب کیوں نہیں دیتا۔ آخر تو تھا کہاں؟"

اور جب میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تو آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ "ارے بولتا کیوں نہیں۔ گونگا ہو گیا ہے کیا؟" یہ کہکر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھنجوڑا۔ پر جیسے ہی اس نے میری بانہہ کو پکڑا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ "ارے تجھے تو تیز بخار چڑھا ہوا ہے —— کہیں پلیگ تو نہیں ہے؟ گھر میں آج ہی ایک مرا ہوا چوہا نکلا ہے" اور یہ کہکر اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں ہی مرا ہوا چوہا تھا اور فوراً جا کر کار بالک صابن سے اپنے ہاتھ دھونے لگی کہ کہیں میری بیماری کی چھوت نہ لگ گئی ہو۔

تو سرکار خدا جو کرتا ہے۔ بندے کی بھلائی کے لئے ہی کرتا ہے۔ مجھے پلیگ تو نہیں ہوا پر ملیریا بخار جو اس دن چڑھا اس نے ایک مہینے تک جان نہ چھوڑی۔ میں ادھ موا تو ہو گیا۔ مگر تحصیلدار صاحب کے ہنٹروں سے میری چمڑی بچ گئی۔ خانم نے تو اسی وقت مجھے چپراسی کے ساتھ میرے گھر بھجوا دیا تھا اور کہدیا تھا کہ بس اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایسے نوکر نہیں چاہئیں جو روز بیمار پڑے رہتے ہوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے سرسامی کیفیت ہو گئی اور وہ سردی چڑھی کہ ماں نے گھر بھر کے لحاف، کمبل، گدے میرے اوپر ڈالدیئے۔ پھر بھی کپکپی نہ گئی۔ پر اس بخار کی

حالت میں بھی، سرکار، بانو کا خیال میرے دل سے نہ نکلا اور بے ہوشی میں بھی بار بار یہی چلاتا رہا۔
"چھوٹی بی بی تم گھبراؤ مت۔ میں پورے تین بجے تانگہ لے آؤں گا" یہاں تک کہ میرے باپ نے تنگ آکر مجھے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔

"ارے کیا تانگہ تانگہ بڑبڑا رہا ہے کہیں گرمی دماغ کو تو نہیں چڑھ گئی"

مہینے بھر کے بعد جب چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو تحصیلدار قدرت اللہ خاں کی تو سہارنپور بدلی ہو گئی۔ ان کی بجائے کوئی اور تحصیلدار آیا ہے۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ خانصاحب کی ترقی ہو گئی ہے اور اب وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر تو بڑا حاکم ہوتا ہے۔ سرکار تنخواہ بھی کافی ملتی ہے تبھی تو خانصاحب نے سہارنپور جاتے ہی موٹر بھی لے لی۔ ڈرائیور بھی رکھ لیا۔ آپ پوچھیں گے اب مجھے کیسے پتہ چلا کہ انھوں نے موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا۔ تو بات یہ ہے سرکار۔ اچھا ہونے کے دو چار مہینے بعد میں لالہ گردھاری لال آڑھتی کی غلے کی دکان پر اناج کی بوریاں ڈھونے پر نوکر ہو گیا تھا۔ ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ لالہ سے کوئی سہارنپور کے زمیندار ٹھاکر نواب علی جو ملنے آئے تو کہنے لگے۔

"لالہ سنا تم نے وہ تمہارے ہاں تحصیلدار قدرت اللہ خاں تھے نا۔۔"

یہ نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے اور بوریوں کے پیچھے سے میں غور سے سننے لگا۔
لالہ بولا "ہاں ہاں وہ نواب تمہارے ہاں ڈپٹی کلکٹر لگے ہوئے ہیں۔ اب سنا ہے بڑے ٹھاٹ ہیں موٹر بھی لے لی ہے"
ٹھاکر نواب علی بولے۔ "ارے لالہ یہ موٹر ہی کی تو برکت ہے موٹر کی اور نئی تعلیم کی"
یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی لالہ بھی بولا "ٹھاکر صاحب کیا کہہ رہے ہو"
ٹھاکر صاحب نے کہا "لالہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خانصاحب قدرت اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کی بیٹیا ان کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی ہے"
[illegible] ابے تجھے تو خوش ہونا چاہیے اب خانصاحب سے [illegible] پوچھیں گے۔ تو تو صاف بچ گیا۔ مگر جھوٹ کیوں بولوں سرکار [illegible] کام نہ ہو سکا اور اس رات کو جب ماں نے روز کی طرح

پھر جلدی جلاہی کی چھوکری شیری سے میرے بیاہ کی بات چیت چھیڑی تو میں نے بھی کہہ دیا۔

"اچھا اماں جیسی تیری مرضی۔"

قناعت عجیب چیز ہے، سرکار انسان کو اپنی قسمت پر صبر و شکر کرنا چاہیئے۔ یہ پہی فٹ پاتھ کے پتھر بھی مخملی گدا بن جاتے ہیں اور رات کے اندھیرے میں بھینگی شیری جلاہی بھی بانو جیسی حسین دکھائی دیتی ہے۔ سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ شیری نے ایک بچہ جن دیا۔ اگلے برس ایک بچی۔ پھر تو سرکار نمبر لگ گیا چھ برس میں پورے پانچ بچے تین لڑکیاں، دو لونڈے۔ پر خدا کی مرضی میں کسی کو چارہ ہے۔ اولاد بھی اس کی دین ہے جب چاہے واپس لے لے۔ ایک بچہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ اور ایک لونڈیا دو برس کی ہو کر نمونیے سے ہلاک ہو گئی۔ اب ایک لونڈا اور دو لونڈیا رہ گئیں۔ پر اپنے لئے اتنی اولاد کو بھی پالنا مشکل تھا۔ گھر کا سارا بوجھ مجھ پر ہی تھا۔ بابا کی کمر تو اب کھاٹ سے لگ گئی تھی اور ماں کو آنکھوں سے سجھائی دینا بہت کم ہو گیا تھا۔ بیچاری دن میں بھی ٹامک ٹوئیاں مارتی تھی۔ میرا بھائی تو دس برس پہلے بمبئی جو گیا تھا پھر لوٹا نہیں تھا۔ نہ کوئی خط ہی بھیجا نہ روپیہ۔ پہلے سنا تھا کسی کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ پھر سنا کہ کسی فلم کمپنی میں چوکیدار ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت ایکٹرسوں کی موٹروں کے دروازے کھولتا ہے —— میرا بھی کئی بار جی چاہتا تھا کہ بھائی کے پاس چلا جاؤں ذرا بمبئی کلکتے کی سیر کر لوں۔ مگر گھر والوں کو کس پر چھوڑوں اور پھر ریل کا کرایہ کہاں سے لاؤں۔ سو اسی سوچ بچار میں کئی برس گذر گئے اور ہم یہیں مظفر نگر ہی میں محنت مزدوری پر قناعت کرتے رہے۔

پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اپنا بھی کلکتے جانے کا ایک موقع نکل آیا۔ ہوا یہ کہ اپنے محلے میں ایک نھا نانبائی تھا اس کا لونڈا رحمت ایک برس سے دلی کام ڈھونڈنے گیا تھا وہ جو واپس آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ بالکل شہزادہ بنا ہوا ہے۔ جاپانی سلک کی قمیص گلے میں سونے کے بٹن۔ بال انگریزی فیشن کے بنے ہوئے میرا بچپن کا یار تھا۔ میں نے کہا "کیوں بے رحمت کہاں سے گڑا خزانہ مل گیا۔"

بولا "ہم تو پانی سے سونا بناتے ہیں۔"

میں سمجھا۔ سالے کو کیمیا بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ گیا ہے۔ پر اس نے بتایا کہ اس نے ریل میں سوڈا لیمن بیچنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اسی سے دو ڈھائی سو مہینے کی آمدن ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا تیس روپے مہینہ تو اپنے نوکر کو دیتا ہوں جو ہر اسٹیشن پر سوڈا لیمن برف کی آواز لگاتے ہیں اور سالے کلکتے بمبئی کی سیر مفت

کرتے ہیں وہ الگ"۔ یہ سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا میں نے کہا بھیا رحمت ایک بار تو کلکتہ مجھے بھی دکھا دے۔ سو، سرکار، سوڈا لیمن بیچتے بیچتے میں بھی کلکتہ پہنچ ہی گیا۔ میں نے پہلے دہلی بھی نہیں دیکھی تھی۔ کلکتہ دیکھ کر تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف شفاف سڑکیں۔ یہ موٹریں، بسیں، ٹرامیں میں نے کبھی پہلے کہاں دیکھی تھیں۔ میں نے سوچا رحمت کے سوڈا لیمن پر لعنت بھیجو اور یہیں رہ پڑو۔ وہ دن اور آج کا دن پندرہ برس ہو گئے ہیں آج تک کلکتہ سے باہر قدم نہیں دھرا۔

پہلے تو کئی مہینے میں رکشا چلاتا رہا۔ دن میں کبھی کبھی دو ڈھائی روپے بھی مل جاتے تھے۔ میں سمجھا یہ کام تو بڑا اچھا ہے۔ مہینے میں ساٹھ ستر مل جاتے ہیں۔ مزدوروں کی بستی میں ایک کوٹھری لے لی تھی۔ دس روپے اس کا کرایہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی دس پندرہ روپے بیوی کو گھر بھی بھیج دیتا تھا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے سال کے بعد میں نے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ ان پر کیا گذری۔ جوان آدمی تھا سرکار، اور پھر کلکتے میں جہاں روپے دو روپے روز میں سونا گاچی میں نئی بیوی مل جاتی ہے تو پھر ہزار میل دور ایک بھینگی بدصورت بیوی کو روپیہ بھیجنا بھی تو بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اوپر سے دارو پینے کی عادت بھی پڑ گئی تھی ہمرکار۔ آپ کہیں گے تو کہ یہ آدمی بڑا آوارہ اور بدمعاش ہے مگر اصل بات یہ تھی کہ دن بھر گدھے کی طرح رکشا کھینچنے کے بعد شام کو غم غلط کرنے کے لئے تھوڑی دارو ضرور چاہیئے اور پھر دارو کے بعد نہ جانے کیسے پیر آپ سے آپ سونا گاچی کی طرف چل پڑتے تھے۔

ہاں تو سال بھر رکشا چلائی۔ کوئی سو سوا سو روپے آڑے وقت کے لئے جمع بھی کر لئے پر یہ پتہ نہیں تھا کہ آڑا وقت اتنی جلدی آجائے گا۔

برسات کے دنوں میں بھیگ کر بخار چڑھا۔ بخار سے نمونیہ ہو گیا۔ ڈاکٹر نے کہا رکشا کھینچتے کھینچتے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ یہ کام چھوڑ دو۔ پورے ڈیڑھ مہینہ کھاٹ پر پڑا رہا۔ جب بخار نے پیچھا چھوڑا تو بدن میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ رکشا چلا سکوں۔ جمع جوڑ جو کچھ تھا وہ سب ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نمونیہ میں مرا نہیں۔ سوچا زندہ تو ہوں۔ لعنت بھیجو رکشا پر چلو کوئی اور کام کریں گے۔ کلکتہ شہر میں جہاں خدا تیس لاکھ کو رزق دیتا ہے کیا مجھے ہی نہیں دیگا۔ اللہ پر توکل کئے بیٹھا رہا۔

میرے برابر والی کوٹھری میں یو پی ہی طرف کے کئی مزدور رہتے تھے۔ ایک تو ہر نام تھا۔ بلند شہر کا ٹھاکر ذات کا تھا مگر باپ نے ساری جائداد شراب پی پی کر اڑا دی تھی۔ بیٹے کو پڑھایا لکھایا نہیں سو وہ

اب کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک بنارس کا چمار تھا منگو۔ ایک بیلی بھیت کا مسلمان رحمت خاں اور مزا یہ کہ تینوں میں بڑا یارانہ تھا اور ساتھ ہی رہتے تھے۔ میں نے ایک بار رحمت خاں سے اکیلے میں کہا بھی کہ تم ان کافروں کے ساتھ رہتے ہو۔ ایمان دھرم کا بھی کچھ خیال ہے۔ وہ گالی دیکر بولا " ارے ایمان دھرم کی ایسی تیسی۔ ہمارا دھرم تو مزدوری ہے مزدوری۔"

ان تینوں نے مجھ سے کہا چل تجھے اپنے کارخانے میں نوکر کروا دیتے ہیں۔ دو روپے روز مزدوری کے ملیں گے۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے رکشا کھینچ کھینچ کر پھیپھڑے کھوکھلے کرنے سے تو کارخانے کی مزدوری ہی اچھی رہے گی۔ اگلے دن وہ مجھے اپنے ساتھ کارخانے میں لے گئے۔ جہاں پٹ سن کی بنائی ہوتی تھی اور مزدوروں کے ٹھیکیدار کو جسے سب سردار سردار کہتے تھے کو میری طرف سے پانچ روپے رشوت کے بھی دیدیے گئے۔ پھر بھی مجھے نوکری نہ ملی " ویونگ ماسٹر بولا۔ کام آج کل مندا ہے۔ اس لئے ہم تو پہلے ہی بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینے کی سوچ رہے ہیں۔ نیا آدمی کیسے رکھ سکتے ہیں اور میری طرف اشارہ کرکے بولا " پھر اسے تو ہمارے جیسے کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ کتنے ہی دن تو اسے کام سیکھنے میں لگ جائینگے"!

میں واپس آگیا اور پھر رکشا والے مالک کے پاس جانے کی سوچنے لگا۔ پر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اسی مہینے اس کارخانے میں اسٹرائیک ہوگیا۔ ہوا یہ کہ مالکوں نے کہا " بازار میں مندی ہونے کی وجہ سے ہمیں یا تو بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینی پڑے گی یا ان کی پگھار کم کرنی پڑے گی۔ اس لئے ہم نے دو روپے کی بجائے مزدوری گھٹا کر ڈیڑھ روپیہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے "

مزدوروں نے جب یہ سنا تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ اسٹرائیک کی تیاری ہونے لگی۔ جب میں نے رحمت خاں اور منگو دونوں کو اسٹرائیک کی باتیں کرتے سنا تو میں نے کہا۔ تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔ آٹھ آنے کے لالچ میں آکر ڈیڑھ روپے روز کی آمدنی پر بھی لات مار رہے ہو۔ ارے بھائی جو ملتا ہے اس پر قناعت کرو۔ خدا کی مرضی ہوگی تو مزدوری پھر بڑھ جائے گی " پر ان دونوں پر اسٹرائیک کا بھوت سوار تھا رحمت خاں بولا۔ اس وقت ہم نے چپ چاپ پگھار کٹوالی تو مالک کل ہمارے سینے پر سوار ہو جائیں گے سینے پر "

اور منگو ایک موٹی سی گالی دیکر بولا " اگر بازار میں مندی ہو رہی ہے تو یہ سالا مالک اپنی پانچ موٹروں میں سے دو چار کیوں نہیں بیچ دیتا۔ سالے نے تین تین عورتیں رکھ چھوڑی ہیں جن میں سے

ایک ولایتی میم بھی ہے۔"

ہاں تو جب یونین والوں نے اسٹرائک کا اعلان کیا تو ان دونوں نے تو کام پر جانا بند کر دیا۔ مگر ہرنام سویرے اٹھ کر چپ چاپ کام پر چلا گیا۔ بستی میں یہ خبر فوراً پھیل گئی کہ ہرنام کام پر گیا ہے۔ اور بھی پچاس ساٹھ مزدور ایسے تھے جو اسٹرائیک میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ مگر رحمت اور منگو کو ہرنام کے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ رحمت تو کہنے لگا "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہرنام ہمارے غدار ہو جائے وہ ایسے ہی گھومنے گیا ہوگا۔"

مگر شام کو جب ہرنام لوٹا تو اس کے کپڑوں پر لگے گارے کے دھبوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کام کر کے آیا ہے۔ منگو تو لگا اسے ماں بہن کی گالیاں دینے۔ مگر رحمت نے دھیرے سے پوچھا۔ "کیوں ہرنام یہ سچ ہے؟" یہ سن کر ہرنام چلا کر بولا۔

"ہاں ہاں گیا تھا کام پر۔ کر لے جس کا جو جی چاہے۔"

رحمت اب بھی دھیرے سے ہی بولا "اچھا یہ بات ہے؟" پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ہرنام کا بستر، ٹین کا ٹرنک اور دوسرا سامان تھا۔ بڑے اطمینان سے اس نے وہ سب چیزیں برآمدے کے باہر میدان میں پھینک دیں اور ایک لفظ نہ بولا چپ چاپ اپنی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا اور حقہ گڑگڑانے لگا

ہرنام کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آستینیں چڑھا کر رحمت کی طرف لپکا۔ مگر منگو بیچ میں آ گیا۔ کالا کلوٹا منگو تھا تو دبلا پتلا سا مگر اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور بڑا پھرتیلا بھی تھا۔ ہرنام کو روک کر اس نے ایک اڑنگی جو دی تو وہ چاروں شانے چت زمین پر آ رہا۔ اتنے میں بستی بھر کے مزدور وہاں اکٹھے ہو گئے۔ ہرنام سے سب ہی جلے ہوئے تھے۔ اسے گرتا دیکھ کر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اب جو وہ گھٹنا سہلاتا ہوا اٹھا تو دیکھا چاروں طرف سے وہ گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ رحمت اور منگو پر ایک بار بھی وار کرتا ہے تو سارے کے سارے اس پر جھپٹ پڑیں گے۔ اس لئے اس بیچارے نے اپنی چیزیں اکٹھی کر کے میری کوٹھری کے سامنے برآمدے میں رکھ دیں۔ پھر میرے پاس آ کر بولا۔

"کیوں حمید تیرے ہاں آ جاؤں۔ کوٹھری کا سارا کرایہ آج سے میں دے دیا کروں گا۔

سرکار، اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں۔ میں ٹھیرا بیکار مجھے تو پہلے ہی سے فکر پڑی ہوئی تھی کہ ہر مہینے کرایہ کیسے دوں گا" سو میں نے کہا۔

"تو بلا کھٹکے یہاں آ جا، ہرنام میاں نہیں ڈرتا کسی سے "۔۔۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ "کر بھلا ہو بھلا ہوگا" سو وہی ہوا میں نے ہرنام کو رہنے کے لئے اپنی کوٹھری میں جگہ دیدی اور اس نے اگلے دن ہی مجھے کارخانہ میں نوکر کروا دیا۔ اسٹرائیک کی وجہ سے مالک ہر کسی کو رکھنے کو تیار تھے۔ چاہے وہ تجربہ کار ہو یا نہ ہو۔ بس دو ہاتھ اور دو ٹانگیں ہونی چاہئیں۔ سو میں بھی ڈیڑھ روپیہ روز پر رکھ لیا گیا۔ اوپر سے پیسہ اور اسٹرائیک الاؤنس کا بھی ملتا تھا اور ملنا بھی چاہیئے تھا۔ ہم پچاس ساٹھ آدمی اپنی جان پر کھیل کر کارخانہ چلا رہے تھے روز ہمیں گالیاں اور دھمکیاں سننی پڑتی تھیں بستی کے دوسرے مزدوروں نے ہمارا حقہ پانی بند کر رکھا تھا۔ دو ایک بار اینٹ پتھر بھی ہم پر پھینکے گئے۔ پر میں نے کہا۔ جو بھی ہو اسٹرائیک کر کے بھوکا مرنے سے بہتر ہوگا۔

ہاں تو میں کارخانے میں ہونے کو تو ہو گیا۔ مگر کام مجھے آتا ہی نہیں تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہرنام نے ویونگ ماسٹر سے جھوٹ کہدیا تھا۔ کہ میں نے اسے کام سکھا دیا ہے۔ اب یہ ایک مشین کو سنبھال سکتا ہے۔ کارخانے والوں کو ان دنوں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ مشینوں کو کسی نہ کسی طرح چالو رکھیں۔ تاکہ اخباروں میں یہ اعلان کر سکیں کہ اسٹرائیک فیل ہو گیا ہے اور کارخانے میں کام ویسے کا ویسا ہی ہو رہا ہے۔ ہرنام نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو یہی ظاہر کیجیو کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ویسے میری مشین اس کے پاس ہی تھی۔ میں برابر اس کو دیکھتا رہتا اور جو وہ کرتا وہی میں کرنے لگتا۔ اس نے بٹن دبایا میں نے بھی دبایا۔ اس نے تیل کی کپی لے کر پرزوں پر تیل دیا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اس نے رفتار تیز کی میں نے بھی کی تین دن تو میں نے اسی طرح گذار دیئے پگھار تو ہفتے کے پیچھے ملنے والی تھی، مگر اسٹرائیک اولاؤنس کا روپیہ روز کا روز مل جاتا تھا میں نے سوچا اپنی بلا سے۔ سٹرائیک عمر بھر چلے . . . . .

اتنے میں مجھے مشین کے کام کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو گیا۔ کوئی خاص مشکل نہیں تھا۔ کام تو سارا مشین کرتی تھی۔ ہمیں تو صرف بٹن دبا کر مشین چالو کرنا اور اس کی دیکھ بھال کرنا ہوتا تھا۔ چوتھے دن ہرنام کی مشین کا کوئی پرزہ بگڑ گیا اور اسے کسی دوسری مشین پر لگا دیا گیا۔ جاتے جاتے اس نے

میرے کان میں آہستہ سے کہا: کیوں ممدو سنبھال لے گا نا؟"

میں نے کہا: "تو فکر نہ کر اس میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں۔"

پھر بھی وہ جاتے جاتے لوٹ کر آیا اور کہنے لگا: "ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر کام کیجیو۔۔۔"

ہاں تو وہ دوسری مشین پر چلا گیا۔ اب اس کی مشین تو اور کتنی ہی مشینوں کی طرح بیکار کھڑی تھی مگر میری والی مشین کھٹاکھٹ کام کر رہی تھی۔

کھٹاکھٹ۔ کھٹاکھٹ مشین چلے جا رہی تھی اور میں خدا کی قدرت پر عش عش کر رہا تھا کہ واہ واہ ان ولایت والوں کو کیا عقل دی ہے۔ انسانوں کا کام مشینوں سے لیتے ہیں۔ جب ہم کمبل بنتے تھے تو میرا باپ اون کو دھو اور دھن کر اس میں سے میل نکالتا تھا، پھر میری ماں چرخے پر اون کاتتی تھی۔ پھر ہم سب بھائی تانا تیار کرتے تھے، پھر کرگھے پر میرا باپ کمبل بنتا تھا اور اس طرح ہم سب کی کئی دن کی محنت کے بعد دو گز کا کمبل تیار ہوتا تھا اور یہاں یہی سب کام مشینیں کر رہی تھیں۔ کپاس کا دھاگا آپ سے آپ کاتا جا رہا تھا، تانا بانا ہو رہا تھا، کپڑا بنا جا رہا تھا، لپٹا جا رہا تھا اور کتنی تیزی کے ساتھ۔ میرا باپ، ماں اور سب بھائی بلکہ مظفر نگر کے سارے جلاہے مل کر ایک مہینے میں اتنا کپڑا نہیں بن سکتے جتنا وہ مشین ایک گھنٹے میں بن رہی تھی۔ واہ واہ سبحان تیری قدرت۔ اب اس کپڑے کی بوریاں بنیں گی، ان بوریوں میں دھان اور گیہوں اور دالیں، مرچیں اور نمک بھر کر دوسرے ملکوں میں بھیجا جائے گا۔

کھٹاکھٹ کھٹاکھٹ مشین چلی جا رہی تھی۔ میں نے بجلی کی پھرکی دبا کر مشین کی رفتار اور تیز کر دی۔ اس تیز رفتاری میں مجھے مزا آ رہا تھا۔ کپڑا اب اور تیزی سے بنا جا رہا تھا اور اسی تیزی سے میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سن کا کپڑا جو میری مشین بن رہی ہے نہ جانے کس کس دیش کی سیر کرے گا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اسی کپڑے میں لپٹ کر میں بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کھٹاکھٹ کھٹ۔ کھٹاکھٹ کھٹ مشین کے گیت میں مجھے ایک بے سری سی آواز سنائی دی۔ سامنے دیکھا تو ایک جگہ سے تانے کا تار ٹوٹ گیا تھا۔ دھاگے کی نلی ادھر سے ادھر بیکار گھوم رہی تھی مگر بناوٹ نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے کرگھے پر جب کبھی اون کا دھاگا ٹوٹ جاتا تھا تو میرا باپ بڑی پھرتی اور آسانی سے ٹوٹے ہوئے سروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک مروڑی دے دیتا تھا بس وہ پھر چل جاتے اور تانے بانے کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ ایک دم میرے دماغ

میں بھی یہی آیا کہ مدد تو بھی یہی کر اور یہ ذرا بھی نہ سوچا کہ یہ بجلی سے چلنے والی مشین ہے۔ بند و جلاہے کا کرگھا نہیں ہے۔ بغیر مشین کو بند کئے میں نے بازو پھیلا کر ٹوٹے ہوئے تار کے سرے پکڑنے چاہے مگر میرے بازو چھوٹے تھے اور مشین لمبی تھی۔ ایڑیاں اٹھا کر مجھے کافی آگے کو جھکنا پڑا۔ کھٹا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ مشین چلے جا رہی تھی۔ جیسے ہی دھاگے کا ٹوٹا سرا میرے ہاتھ میں آیا میرے پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور میں منہ کے بل مشین پر تنے ہوئے کپڑے پر آ رہا۔ کھٹا گھٹ کھٹ۔ کھٹا کھٹ کھٹ مشین چل رہی تھی۔ کپڑے کو اور اس کے ساتھ مجھے اندر کو گھسیٹ رہی تھی۔ کپڑا لوہے کے رولر پر لپٹا جا رہا تھا اور میں مشین کے فولادی جبڑے کی طرف کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت سرکار مجھے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آ گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر کپڑے کی جھول میں اتنا الجھ گیا تھا کہ کسی طرح بیٹھنے کی صورت نہ نکلی اور ایک بار جو میں نے ٹانگوں کو جھٹکا دیا تو بایاں پاؤں اس کمبخت مشین کے نہ جانے کس پرزے میں پھنس گیا۔ اب میں لاکھ چھڑانا چاہتا ہوں مگر پاؤں نہیں نکلتا بلکہ الٹا میں گھسٹتا چلا جا رہا ہوں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور کتنے ہی مزدور میری طرف دوڑے۔ اور ویونگ ماسٹر کی آواز سنائی دی "بجلی بند کرو" "بجلی بند کرو"

مگر ابھی کوئی بٹن نہ دبایا تھا کہ کھٹاک سے آواز آئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی بھیانک ہاتھ نے میری ٹانگ کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ اور پھر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک خیراتی ہسپتال میں پڑا تھا اور میری داہنی ٹانگ کٹ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے پہلے تو بڑا دکھ ہوا مگر پھر میں نے سوچا۔ خدا کا شکر ہے ٹانگ ہی گئی۔ جان تو بچ گئی۔ اگر دونوں ٹانگیں چلی جاتیں تو کیا ہو سکتا تھا۔ آج میں بھی اس لنجے رلدو کی طرح بانڈوں اور کولھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتا۔

ہاں تو سرکار پندرہ دن کے بعد جب میں اس ہسپتال سے نکلا تو میں لنگڑا ہو چکا تھا میری جیب میں صرف سات روپے تھے۔ چھ روپے تو ہرنام نے چار دن کی مزدوری کے لا کر دئے تھے اور ایک روپیہ میرے پاس پہلے کا بچا ہوا تھا۔ ہرنام نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے ویونگ ماسٹر سے بات کی تھی کہ کارخانے کی طرف سے میری کچھ مالی مدد کر دی جائے مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ اناڑی مزدور اگر اپنی غلطی سے اپنی ٹانگ اور ہماری مشین توڑ ڈالیں تو ہم اس کے ذمہ دار

نہیں ہیں۔ غرض مل مالکوں کی طرف سے ہرجانہ ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ خیر میں نے دل کو سمجھایا
کہ محمد خدا تیری قناعت کا امتحان لے رہا ہے۔ گھبرا مت۔ جب میں بستی میں آیا اور گاڑی سے اتر کر
دیوار کا سہارا لیتا ہوا اپنی کوٹھڑی تک پہنچا تو رحمت منگو اور بہت سے مزدور مجھے دیکھنے آئے تھوڑی
دیر تو سب چپ چاپ کھڑے رہے میری ٹوٹی ٹانگ کو دیکھتے رہے اور ان کو اس طرح گھورتے دیکھ کر
نہ جانے کیوں میرے غصہ کا پارا ایک دم تیز ہو گیا اور میں چلایا "یہاں کھڑے کھڑے کیا گھورتے ہو ؟
کیا کبھی ایک ٹانگ کا آدمی نہیں دیکھا ! نکلو یہاں سے "

اس پر وہ سب ایک ایک کر کے باہر چلے گئے۔ پر رحمت وہیں کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا
"محمد یہ خدا نے تجھے اسٹرائیک توڑنے کی سزا دی ہے" بس یہ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ پر یہ
سن کر مجھے ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ پر میں نے سوچا۔ کتنا بدقسمت ہے یہ رحمت۔ اسے قناعت کی
قدر ہی نہیں معلوم اور پھر کون جانتا ہے۔ شائد خدا اسٹرائیک توڑنے والوں ہی سے خوش ہو۔
اور اسی لئے اتنے سخت حادثے کے باوجود میری جان بچ گئی۔ ورنہ سب اسٹرائیک توڑنے والوں کی
ٹانگیں ٹوٹنی چاہئیں تھیں ۔

ہاں سرکار، قناعت کے امتحان میں میں پورا اترا۔ جب ربڑ یا لکڑی کی ٹانگ نہ میسر ہوئی تو میں نے
قناعت کی ٹانگ لگوا لی اور کباڑی کے ہاں سے یہ دو بیساکھیاں لے لیں اور اس دن سے ان کے
سہارے ہی کود پھاند کر چل لیتا ہوں۔ جب محنت مزدوری ممکن نہ ہوئی تو بھیک مانگنا شروع کر دیا
رزق دینے والا تو خدا ہے۔ انسان تو اس کا وسیلہ ہے۔ پھر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں
کیسی شرم۔ اصل میں تو ہم خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا، سرکار، کہ
بھیک مانگ کر میں ڈیڑھ روپے روز سے زیادہ ہی کما لیتا ہوں۔ پھر کارخانوں میں جان کھپانے
سے حاصل ؟ اور ہاں جب ہرنام بیوی بیاہ کر لے آیا اور اس نے مجھے میری کوٹھڑی سے نکال دیا
جب سے میں نے یہاں سڑک کی پٹری پر اپنا گھر بنا لیا۔ چھتیں، فرش۔ بنگلے اور کوٹھیاں اور پلنگ
اور کرسیاں یہ سب تو بیکار کے چونچلے ہیں۔ قناعت کی چھت اور قناعت کا فرش ہو تو سڑک کا
کنارہ بھی محل بن جاتا ہے ۔

کتنے ہی مہینے میں نے قناعت سے بھیک مانگ کر گذار دیئے۔ مجھے اس فقیری کی زندگی میں

ہو آنے لگا۔ نہ کوئی گھربار کا جھنجھٹ، نہ محنت نہ مزدوری، نہ مالک مکان کو کرایہ دینا۔ نہ چولھے چکی کا بکھیڑا۔ فقیری زندگی ہی اصل میں آزاد زندگی ہے میں ان تمام دھندوں، فرضوں اور جھگڑوں سے آزاد ہو گیا۔ پر گلی ہوئی ٹانگ ہونے پر بھی ایک شیطانی ضرورت اب بھی جاڑے کی راتوں کو تنگ کرتی تھی۔ جب میرے پاس پانچ دس روپے جمع ہو جاتے تھے۔ میں رات کو چپکے سے سونا گاچی پہنچ جاتا۔ آپ جانتے ہی ہیں سرکار! بازار حسن امیر غریب، نواب، فقیر سب برابر ہیں جس کی جیب میں مال ہو وہ جو مال چاہے خرید سکتا ہے چاہے وہ لنگڑا لولا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے کہ میں بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہوا سونا گاچی میں ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ یہ جگہ میرے لئے نئی نہیں تھی۔ اکثر میں یہیں آیا کرتا تھا۔ دو روپے میں معاملہ ہو جاتا تھا۔ مگر اس رات کی بوڑھی نائکہ مجھے دیکھتے ہی ہیکس کر بولی۔

"کیوں رے لنگڑے پھر آگیا تو؟ پر آج دو روپے سے کام نہیں چلے گا۔ گدڑی میں پانچ پیسے ہیں تو ٹھیک ہے نہیں تو راستہ پکڑو"۔

ان دنوں مجھے بھیک اچھی مل رہی تھی۔ چالیس کے نوٹ تو میں نے اپنی گدڑی کے اندر سیئے ہوئے تھے اور سات آٹھ روپے کے پیسے اس وقت بھی میرے پاس تھے۔ میں نے کہا: "میں لنگڑا ہوں تو کیا ہوا۔ پیسہ میرا بھی دو ٹانگ سے چلتا ہے۔ مال دکھاؤ پانچ روپے بھی مل جائیں گے"۔

وہ بڑی گھاگ تھی۔ لونڈیا نہیں دکھائی۔ مجھ سے پانچ روپے لے کر مجھے اندر کمرے میں دھکیل دیا۔ اندر جا کر میں نے بیساکھیوں کو تو پھینک دیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لونڈیا کوئی نئی نئی معلوم ہوتی تھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

میں نے کہا "میری جان صورت تو دکھاؤ۔ میں لنگڑا ہوں پر تمہیں خوش کر دوں گا"!

پھر اس نے جو گھونگھٹ اٹھایا تو یقین مانئے سرکار میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

وہ چلائی "ممدو"!

اور میں چلایا "چھوٹی بی بی۔ تم یہاں؟"

وہ بولی "ہاں ممدو یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔ تمہاری ٹانگ کیا ہوئی؟"

میں نے کہا "یہ میری قسمت کا پھیر ہے"۔

وہ رو رہی تھی۔ میں نے دلاسا دینے کی کوشش کی تو بانو مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی میں نے غور سے دیکھا تو ان تین برس میں اس کا وہ رنگ روپ ہی نہ رہا تھا۔ میں اکیس برس کی عمر میں تیس پینتیس کی لگتی تھی۔ آنکھوں میں حلقے۔ پاؤڈر سُرخی کے ہوتے سوتے بھی رنگت پیلی۔ دبلی اتنی ہو گئی تھی کہ بانہوں کی ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئیں اور ہاتھ منہ پر کئی جگہ عجیب سی پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔

جب آنسو کچھ دیر کو تھمے تو اس نے مجھے اپنا حال بتایا جس ڈرائیور کے ساتھ وہ بھاگ گئی تھی وہ بڑا بدمعاش نکلا۔ لاکر دو تین مہینے تو بانو کا زیور بیچ بیچ کر خوب عیش کئے۔ پھر جب گذارے کی صورت اور نہ رہی تو اسے بدکاری پر مجبور کیا اور ایک رات اسے ایک سیٹھ کے ہاتھوں بیچ کر غائب ہو گیا۔

میں نے کہا "چھوٹی بی بی! تم نے پولیس میں کیوں نہ رپٹ لکھوائی۔ تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تحصیلدار صاحب کو لکھا ہوتا وہ آکر تمہیں لے جاتے اور اس موئے ڈرائیور کی چمڑی ادھیڑ دیتے۔"

وہ بولی "پولیس میں رپٹ لکھواتی تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ مجھے زبردستی واپس گھر بھیج دیا جاتا جو کچھ مجھ پر گذر چکا تھا۔ اس کے بعد میں کیا منہ لے کر ابا کے سامنے جاتی"۔

غرض بے چاری بانو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ ہوتی ہوئی آخرکار اس گھٹیا رنڈی خانے میں پہنچی تھی جہاں قسمت اس رات مجھے لے آئی تھی۔

میں نے کہا "اب تم کوئی فکر نہ کرو۔ جب تک ممدو کے دم میں دم ہے تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ اب میں تمہیں ایک منٹ بھی اس پاپ کے جہنم میں نہ رہنے دوں گا"۔

وہ آنکھیں نیچی کرکے بولی۔ "پر ممدو میں بیمار ہوں۔ بہت بُری بیماری ہے"۔

اب مجھے ان پھنسیوں کی وجہ سمجھ میں آئی جو بانو کے چاند جیسے مکھڑے کو داغ دار بنائے ہوئے تھیں۔ پر میں نے کہا "کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہی کونسا چھبیلا جوان ہوں۔ لنگڑا فقیر ہی تو ہوں۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے سنا ہے اب ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ چلو میرے ساتھ اسی وقت۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔

میں نے کہا "آجاؤ" بڑھی نائکہ بولی "پانچ روپے دیئے ہیں کوئی رات بھر کا ٹھیکہ نہیں

لیا، دوسرا گاہک انتظار کر رہا ہے۔"

اس کے پیچھے ایک بدہیبت کالا سا موٹا تگڑا آدمی کھڑا نشے میں جھوم رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے بیساکھیاں اٹھاتے ہوئے کہا: "یہ لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے اب یہ یہاں نہ رہے گی۔"

اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہوا ٹھیک یاد نہیں۔ شائستہ نے اس آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ بانو کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھا۔ بانو کی چیخ ضرور یاد ہے۔ ایسی چیخ جو پتھروں کو بھی موم کر دے۔ نہ جانے کب اور کیسے میری بیساکھی ہوا میں اٹھی اور اس شرابی کی کھوپڑی پر پڑی۔ اگلے لمحے میں وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور شائستہ چلا رہی تھی "خون خون! کوئی آؤ، دوڑو۔ اس خونی کو پکڑو۔" اور بانو وحشت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی: "محمود یہ تو نے کیا کیا!" اور میں کہہ رہا تھا: "چھوٹی بی بی تم فکر نہ کرو۔ اس دن میں تانگہ وقت پر نہ لا پایا۔ یہ اس کی سزا ہے۔"

اور سو وہ دن اور آج کا دن۔ دس برس قید کاٹ کر پرسوں ہی چھوٹا ہوں۔ اب پھر وہی سڑک کا کنارہ ہے۔ وہی قناعت کا فرش ہے اور قناعت کی چھت۔ سنتا ہوں ان دس میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہوئی ہو گی۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ لاکھوں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے اور اسی کلکتے کی سڑک پر خون کے دریا بہے ہوں گے۔ سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا ہے۔ ہوا ہو گا۔ مجھے تو پتہ نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک اب پہلے سے بہت کم ملتی ہے اور بہت سے رحم دل بابو بھی جب پاس سے گزرتے ہیں اور پیسہ دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو جیب خالی پاتے ہیں۔

پھر بھی میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ سرکار زندہ ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ کم سے کم ایک ٹانگ تو ہے۔ سلامت کی طرح بالکل اپاہج نہیں ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ روپے روز نہیں تو چار پانچ آنے تو بھیک مل ہی جاتے ہیں اور شکر ادا کرتا ہوں کہ بانو اب تک زندہ ہے اور میرے پاس ہے۔ وہ بڑھیا جو آپ دیکھتے ہیں۔ سامنے بیٹھی اپنے سفید بالوں میں سے جوئیں نکال کر مار رہی ہے وہی بانو ہے۔ بانو جس کی رنگت کبھی ایسی تھی جیسے میدہ اور

شہاب اور جو کبھی کالے ریشمی برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف مسکرا دیتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں چاند نکل آیا ہو جس کی بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں تھیں اور جس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو مست کرنے کو کافی تھی۔ اب اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں اور سارا بدن پیپ رستے ہوئے پھوڑے پھنسیوں سے پٹا پڑا ہے اور مدت ہوئی اس کا دماغ جواب دے چکا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کے سکھ یاد ہیں نہ جوانی کے دکھ۔ نہ تحصیلدار صاحب نہ خانم، نہ محمود۔ دن بھر وہ بیٹھی بیٹھی جھولیں مارتی رہتی ہے۔ آپ ہی آپ نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہتی ہے۔۔۔۔

مگر شکر اللہ کا کہ بانو زندہ ہے اور میرے پاس ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں؛

• • •

انور عظیم

کرشن چندر کے نام

(کوریا کے محاذ جنگ سے ایک انڈین ایمبولنس ڈرائیور کا خط)

میرے پیارے کہانی لکھنے والے ——

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں خط لکھنے کی خواہش میرے دل میں کیوں پیدا ہوئی۔ پہلے تو کوئی جان پہچان نہ تھی اور مزیدار بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں اس وقت کوئی خط نہیں لکھا جب میں اپنے دیش میں تھا۔ سچ ہے آدمی وطن سے دور ہو کے وہاں کی ایک ایک چیز کو یاد کرتا ہے معمولی معمولی تفصیلات کی فلم آنکھوں اور ذہن میں ہر وقت دوڑتی رہتی ہے۔ یادوں کی فلم دراصل سلولائڈ کی فلموں سے زیادہ دلچسپ اور دل کش ہوتی ہے (اور خاص طور سے ہندوستانی فلموں سے)

—— لیکن تم سے جان پہچان رسمی نہ ہونے پر بھی میں نے تمہاری بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان کہانیوں میں جتنا حسن پایا ہے میں نے اتنی ہی سچائی بھی پائی ہے اور میرا خیال ہے کہ سچائی سے بڑھ کر کوئی چیز حسین نہیں ہوتی۔ سچائیاں جو ماضی نے ہمیں دی ہیں۔ سچائیاں جو ہم تخلیق کر رہے ہیں۔ سچائیاں جو مستقبل کے دھڑکتے سینے میں چھپی ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں تم مجھے میری عبارت دیکھ کر اپنا نقال نہ سمجھنے لگو —— میں اور تمہاری نقل۔ کہاں ہنس کہاں کوا —— اچھا دیکھو یہ تشبیہ کیسی بھونڈی رہی۔ خیر —— مجھے یہ سب کچھ نہیں دیکھنا۔ مجھے تو

اپنے من کی بات تمہارے من تک پہنچا تا ہے۔ کاش یہ بات تمہارے قلم کے خون سے رچ کر ایک حسین سی
کہانی بن جائے تمہاری تخلیق کی دنیا میں، تمہارے فن کے کہکشاں میں پہنچ کر دردر کی طرح جگمگا اٹھے
اس لئے کہ یہ بات صرف بات ہی نہیں ایک دکھی انسان کی روح بھی ہے۔ ان گنت نامراد آرزوؤں
اور ناآسودہ خواہشوں کی روح!

بھئی --- میں کوئی خاص پڑھا لکھا آدمی نہیں۔ ورنہ تم ہی سوچو میں اپنے ملک سے ہزاروں
میل دور کوریا کے بیابان میں آگ اور خون کے پھاگ کا تماشا کیوں دیکھتا ——— تماشا ہی نہیں
دیکھتا ہوں۔ بلکہ اس میں جھلس کر رہ گیا ہوں دشت و بیابان اس لئے کہ آج کوریا میں شہر، پارک
کالج، سکول، ہسپتال، گاؤں اور کھیت کے نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ تہذیب اور انسانیت
کی ترقی کے سر سے سنہری کلس گر گیا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہمارے ضمیر کے آفتاب
اور مہتاب نے لہو میں ڈوب کر خودکشی کر لی ہے۔

ہاں تو میں ان دنوں کوریا میں ایمبولنس ڈرائیور تھا اور ہندوستانی میڈیکل مشن کے ساتھ
صحرا نوردی کر رہا تھا۔ اب تو مارا مارا بھی پھر نہیں سکتا۔ معذور اور بے کار ہو کر ہسپتال
میں پڑ گیا ہوں۔

چند ہی دن تو بیتے۔ سیول کے پاس دو طرفہ فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی! امریکی
فوجیں پیچھے ہٹتی تھیں اور پھر سنبھل کر گولیوں کی بارش کرتی ہوئی دو چار قدم آگے بڑھتی تھیں۔ امریکی
بمباروں کے ٹڈی دل آتے اور جن دیو کے قصوں میں اڑتی ہوئی سیاہ چمکیلی مچھلیوں کی طرح ہمارے
سروں پر سے گذرتے چلے جاتے ہیں۔ شمالی کوریا کی فوجوں پر برابر بم برسا رہے تھے۔ پٹرول جیلی گرتی، دھماکہ
ہوتا، آن واحد میں زمین سے شعلوں کا جنگل اگ آتا۔ فلک بوس آسمان سے باتیں کرتا جنگل۔ آگ کی مہیب
زبانیں، آسمان کا سینہ چاٹنے کے لئے اوپر اٹھتیں ——— آہ! درد کراہ کی صدائیں ان دھماکوں میں
سسک سسک کر سو جاتیں۔ لیکن یہ سلسلہ بڑھتا ہی جاتا تھا ——— دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔
دھواں دھواں فضاؤں میں گیس اور زہر سا گھل گیا تھا۔

میں اپنی ایمبولنس کار لے کر ایک چنار درخت کے سائے میں کنارے پہ کھڑا تھا۔ چاروں
طرف بڑے اونچے اونچے گھنے پہاڑی جنگل تھے۔ جلے ہوئے اور گرد سے اٹے ہوئے جنگل اور اب

اس وقت جنگ کے طوفان میں، بموں کی گھن گرج میں، اٹیس کی طرح اٹھتی ہوئی گونج میں، ہر چیز
منتشر اور بہت عجیب نظر آتی تھی۔ دھرتی اپنا محور چھوڑ کر کہیں گم ہو جاتی تھی۔ ناچتی ہوئی ایک جلتی
ہوئی گیند کی طرح چنگھاڑتی ہوئی —— دھڑام! دھڑ دھڑ! دھڑ دھڑ دھڑام!

ٹھیک اس وقت بڑھتے ہوئے دھندلکے اور گرد و غبار میں ٹوٹو سیٹی بجاتی ہوئی کئی گولیاں
امبولینس کار کے پاس سے، اس کے انجن اور چھت کو چاٹتی ہوئی آگے نکل گئیں۔ درختوں کے
پتے جھڑ جھڑا کر گر پڑے۔

اب کیا بتاؤں اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ اس وقت ایمبولینس گاڑی میں دو امریکی
سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ وہ مرتعش ہونٹوں میں جلدی جلدی
سگریٹ لگاتے اور جدا کر دیتے۔ ان کی چند منٹ قبل کی ساری مستی گم ہو گئی تھی۔ خالص معیاری
امریکی شراب کا نشہ تو ایسا ہرن ہوا تھا کہ اگر اس وقت انھیں کوریا سے ہزاروں میل دور لے جا کر
کسی شراب کی خلیج میں گھنٹوں غوطہ دیا جاتا تو بھی ان کے کانوں میں بموں کے دھماکے ختم نہ ہوتے
اور ان کی آنکھوں میں شعلوں کی لپکتی ہوئی زبانوں پر ناچتی ہوئی موت کا سایہ چھایا ہی رہتا۔ لیکن
اس وقت ان کی حالت قابل رحم تھی۔ ان دونوں امریکیوں نے سہمتے سہمتے باہر کی طرف جھک کے
لوہے کے روزن سے جھانک کر دیکھا، جنگل کی پہاڑی ڈھلوان کی طرف —— ادھر سے
سیاہ جنگلوں سے بہت آگے پہاڑی کی چڑھائی کے پاس سے سرخ سرخ روشنی چھن چھن کر نکل
رہی تھی۔ یہ روشنی ڈوبتے سورج کی شفق رنگ ضو معلوم ہوتی تھی جو گھنے اور وحشی درختوں کے
کوہستانی سلسلوں سے کترا کر عجیب عجیب گرد دھندلکے میں درختوں کی شاخوں، پتیوں اور
صحرائی بیلوں پر منعکس ہو رہی ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ جوت تھی زور دار پٹرول جیلی سے جلتے
ہوئے شہر اور جنگل کی۔ ہاہا! جلتے ہوئے جنگل میں پتہ نہیں کتنے انسان جھلس رہے تھے۔ اس جنگل
میں پتہ نہیں کتنے چھاپہ مار چھپے ہوئے تھے۔

دونوں امریکی سپاہیوں نے دوسری طرف جھانک کر دیکھنا چاہا اور اپنی گھبراہٹ اور
جلد بازی میں انھوں نے اسٹریچر پر پڑے ہوئے ایک انگریز سپاہی کو کچل دیا۔ وہ بڑے
زور سے چیخ پڑا۔ آف! اس کی چوٹ کھائے ہوئے کتے کی سی چہاتی آواز۔ مجھے جھرجھری

آگئی ــ وہ دونوں اچھل کر اپنی اپنی جگہوں پر لیٹ گئے۔ جیسے ان کے سر پر کسی زندہ بم پھٹ گئے ہوں۔ وہ مجروح انگریز سپاہی (جس کا نام جانسن تھا) دیر تک زیر لب گالیاں بکتا رہا اور کوستا رہا ــ "

"اوہ ! ہی ای ای ــــ یو بیسٹ ــــ رفین ــــ سن آف اے بچ ــــ یو سوائن ــــ ہوا ــــ ۔ اوہ ہی ای ای ــــ"

دونوں امریکی سپاہی سکتے میں آگئے ۔

لیکن اس کی گالیاں سن کر انھیں قہقہہ لگانے کی سوجھی ۔ اس حرامی پن پر مجھے تو بہت غصہ آیا لیکن میں کیا کر سکتا تھا ۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا ۔ البتہ دور جلتے ہوئے جنگل کی جھلملاہٹ کبھی کبھی بھڑک کر اس جنگلی گوشے کو بھی داغ دار روشنی بخش دیتی تھی اور درخت کے پتے بھُن کے بے شمار دھوؤں کی طرح سلگ اٹھتے تھے ۔ ایسی چتکبری روشنی میں میں نے پلٹ کر دیکھا ــ لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا ــــ مگر میں نے انھیں دن کی روشنی میں پہلے بھی دیکھا تھا ۔ ان دونوں کی عمر بہت کم تھی (جیسی انتھنی آئی کی تھی) ان میں سے ایک ذرا گول مٹول بچپن سا گدیلے بدن کا ۔ دوسرا چھریرے جسم کا نوجوان تھا ۔ اس کی آنکھیں کان گوجے کے رنگ کی معلوم ہوتی تھیں ۔ ویسی ہی کترائی ہوئی ، گھبرائی گھبرائی اور چمکیلی ۔ دوسرے کی آنکھیں اس کی بیٹھی ناک کی طرح کشش سے خالی تھیں لیکن ان کا رنگ کافی دلکش تھا ۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر اپنے گاؤں کے تالاب پر جمی ہوئی کائی کے دو سبز نقطے تر بہ قریب تیرتے ہوئے یاد آجاتے تھے ۔

تھوڑی دیر کے بعد گولیوں کی الان کا رُخ بدل گیا اور درختوں کی جھرجھراہٹ ذرا دور چلی گئی ــــ رفتہ رفتہ ان دونوں امریکیوں کی آواز میں سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا ــ

ــــ فلپ ، ــــ اوہ جیو ، میں تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا ! ــــ کب کدھر سے حملہ ہو جائے گا پتہ ہی نہیں چلتا ــــ غضب کے لڑاکو ہیں یہ بھیڑیے ــــ معلوم ہوتا ہے شفٹی دن کرسمس بھی یہیں جنگلوں میں منانا ہوگا ــــ ۔

" اور اس وقت کون زندہ رہے گا اور کون نہیں ــــ اس کا کیا بھروسہ ہے ــــ جم "

مارلو نے تھوڑی دیر چپ سادھے رہنے کے بعد جواب دیا ۔

" فلپ ــــ اب امبولنس والی یہاں سے نکال لے جانے کی کوئی تدبیر سجھائی نہیں

دیتی - سڑک دور چھوٹ گئی ہے ـــــ اور اس طرف تو موت کا کنواں ہے ۔ دشمنوں کی گولیاں زیادہ برس رہی ہیں ـــــ اور آہستہ آہستہ ہماری فوجیں (D aeens daeon) ہٹتی جا رہی ہیں ۔ لگتا ہے سیول پھر ہاتھ سے نکل جائے گا ـــــ"

"فک ان سیول ـــــ فک ان سیول ـــــ" اندھیرے میں مارلو کی آواز کتے کی غرغراہٹ سے کم نہ تھی ۔ مارلو چپ ہو گیا ۔

"یس فک ان سیول ـــــ زیپ سیول ـــــ اوہ ـــــ آور لائف از ان اسٹارک ڈینجر (OURLIFE IS IN STARK DANGER)

"ٹیل دی فرتھ ـــــ اوہ ـــــ آئی ایم مارٹلی افریڈ" (I AM MORTALLY AFRAID)

گولیوں کا طوفان پھر رخ بدل رہا تھا اور درختوں میں پھر ہلکی ہلکی جھرجھراہٹ شروع ہو گئی تھی ۔ جیسے اولوں کی بارش ہو رہی ہو ۔ تھر تھر تڑ تڑ ـــــ!

دونوں امریکیوں کی آواز تپتے ہوئے گھاؤ کی طرح ختم کر رہ گئی ۔ خود میری رگوں میں خون جمنے لگا ۔ جیسے پورے جسم میں برف کی سوئیاں تیر رہی ہوں ۔ میں نے اپنی ٹوپی کو اپنی پیشانی پر جھکا لیا اپنے دستانوں میں اپنا منہ چھپا کر اپنی دونوں کہنیوں کو اپنی رانوں پر ٹکا کر اسٹیرنگ کی طرف جھک گیا ۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ قریب سے قریب تر آ رہی تھی اور دونوں امریکیوں کی آواز بند ہو گئی تھی ۔ اچانک وہی مجروح انگریز ایمبولنس وان کے پچھلے حصہ میں کتے کی طرح پھر چیخا اور میں چونک گیا ۔ میں نے سر اٹھایا اور پلٹ کر دیکھا ۔ اندھیرے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا ۔

گولیوں کی آواز پھر دور ہو گئی ۔ سڑک کی طرف سے دھماکے کی تیزی بڑھ گئی اور سیول کی طرف شعلوں کا پورا چمن لہلہا اٹھا ۔ میں نے حملہ آوروں کا رخ بدلتا دیکھ اطمینان کی سانس لی میں نے جیب سے سگریٹ نکالا اور لائٹر سے جلایا اور لائٹر ہی کی جھلملاتی روشنی میں پلٹ کر دیکھا تو دونوں امریکی غائب تھے ۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پچھلے حصہ میں آیا ۔ ہوا کے جھونکے سے لائٹر بجھ گیا اور میں اسٹریچر میں اٹک کر گرتے گرتے بچا ۔ میں نے دوبارہ لائٹر کی گھرنی گھمائی اور ایک چھوٹی سی لو جھٹ میری انگلیوں کے اوپر آئی ۔ تھرتھراتی ! لرزتی لو ـــــ اور میں نے اس کی خوف زدہ زرد روشنی میں اس انگریز مجروح کو جھک کر دیکھا ۔ اس کے منہ سے خون

رس رس کر نکل رہا تھا اور اس کی پیشانی پر بوٹ سے کچلنے کا نشان موجود تھا۔ دونوں امریکی سپاہیوں
نے جلدی میں خوف سے بھاگتے ہوئے اسے بری طرح کچل دیا تھا۔ اب اس کے لب آہستہ آہستہ
کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے اور بہت غور سے سننے سے جو بات سمجھ میں آئی تھی وہ یہ تھی ———
——— بیٹ ——— کینل ——— سوان ——— لک اوی بیٹ ———"
میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس مجروح جانسن، انگریز سپاہی کو فوراً ہسپتال کے
برآمدے پر نہیں پہنچایا تو یقیناً وہ جان بحق تسلیم ہو جائے گا۔ میں تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ میں برابر سگریٹ
پھونکے جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اس انگریز سپاہی کے لئے جس کا نام جانسن تھا، رسک
لینا چاہیئے یا نہیں۔ اس سے میری بہت گہری ملاقات تھی ——— بہت گہری اور پرانی! ———
شروع کی ملاقات میں وہ مجھ سے بہت ہلکی پھلکی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن ایک روز ہم دونوں ایک چٹان
پر بیٹھے جنگل کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کا خونی ناچ دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت جذبات میں آگیا۔
اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اچانک مجھ سے بہت بے تکلف ہو گیا ——— کہنے لگا۔
ڈیر ——— ڈیر ——— تمہارا جانسن کوئی معمولی نوجوان نہیں ہے۔ جانتے ہو ———"
اس کی آواز رازدارانہ سرگوشی میں بدل گئی۔" جانسن کی ایک بڑی حسین سی کبوتری ہے ———
ہو ہو ——— میری محبوبہ پھول کی طرح چھونے میں نرم ہے، لیکن ہے بڑی ناک لڑکی ——— یوں ہو جاتی
ہے۔ ہاپ، ہو ہو ——— وہ شفق کو دیکھتے ہوئے بولے جا رہا تھا اور میں اس کے چادر سے
بھرے گلنار چہرے کو دیکھ رہا تھا۔" وہ لندن کے ٹیلیفون اکسچینج میں اپریٹس ہے وہ مجھے بہت
چاہتی ہے۔ ہو ہو ——— میں آدمی ذرا کھٹو اور خشک ہوں ——— لیکن وہ بڑی ذہین شاعرہ
ہے۔ وہ اپنی نظمیں سناتی۔ میں اکثر اس کی معمولی نظموں کی بھی تعریف کر دیتا ——— دیکھو جھوٹ
بولنا تو میں پاپ سمجھتا ہوں لیکن حسن کی خوشامد میں ایک آدھ جھوٹ بول لینے میں بگڑتا کیا ہے۔
جبکہ حسن کی طرح جھوٹ بھی معدوم ہو ———"
اس نے اس کے بعد جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے میریا کی تصویر
نکل آئی۔ اس وقت ایمبولنس وان میں، جب میں جانسن کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر رہا تھا
میری آنکھوں میں جانسن کی محبوبہ میریا کی تصویر جھلک اٹھی۔ میریا بیٹ منٹن کا ریکٹ لئے

اندھیرے میں ابھر رہی تھی ——— اس کی مکھن کی طرح نرم مسکراہٹ۔ اس کی بانہوں کا دلآویز خم آنکھوں میں جلتی ہوئی روشنی۔ پیشانی پر ابھرے ہوئے خم بخم آراستہ بال ——— مجھے ایسا معلوم ہوا ایک دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے ریکٹ گر گیا۔ اس کی ریشمی قمیص یخ کر مرغی کے پروں کی طرح اڑ گئی۔ اس کے لبوں کا تبسم کھرچ کر کہیں گر گیا ——— اور ان نیلی آنکھوں میں گرد ہی گرد بھر گئی

اب ان کی نیلی چمک آنسوؤں کے تار میں بہہ رہی تھی ——— میریا، میریا،

"تمہارا جانسن کوئی معمولی نوجوان نہیں ہے ——— اس کی محبوبہ بڑی حسین ہے ———

——— وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے ——— وہ لندن ٹیلیفون ایکسچینج میں"

میں نے اسٹارٹر دبایا۔ انجن سنسنانے لگا۔ درختوں اور چٹانوں کے تیز دانتوں سے پڑے گاڑی نکال کر میں تھوڑی دیر تک رکا۔ لڑائی کا مرکز دور ہو گیا تھا۔ اور اب جنگ کی رفتار میں تھکن پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں طرف سے گولیوں کی آندھی کی شدت کم ہو رہی تھی۔ میں بائیں طرف موڑ کر گاڑی دوڑانے لگا۔ میں نے ہیڈ لائٹ نہیں جلائی۔ لیکن فٹ لائٹ جلانا ضروری تھا ورنہ گاڑی ادھر ادھر ہوئی کہ میرا جنازہ تیار سمجھو۔

مجروح جانسن اب اور زیادہ کراہنے لگا تھا۔ اس کی کراہ میں موت کا کرب شامل تھا۔ اور جیسے جیسے مجھے اس کی موت کا یقین ہوتا جاتا تھا۔ میرا دم حلق میں اٹکنے لگا تھا۔ چند ہی دن پہلے تو اس نے مجھے اپنی محبوبہ کی تصویر دکھائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کیسی بھولی درخشندگی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی لمبی لمبی اجلی انگلیاں تصویر کے گالوں اور بالوں پر کتنی نرمی سے تیر رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس جنگ کے بعد واپس جائے گا۔ میریا بیوی بن کر اس کی آغوش میں چلی آئے گی ——— میریا اور جانسن نے اپنے بچے کے بارے میں ابھی سے بازی لگائی تھی۔ اس کے بال سنہرے ہوں گے۔ آنکھیں بھوری میریا کی طرح، بال جانسن کی طرح گھنگھریالے اسے یقین تھا وہ میریا سے بازی جیت جائے گا ——— ہا ہا ——— اس کا قہقہہ پہاڑیوں سے گونج کر دور سے دور صدائے بازگشت کی حمایت وصول کر رہا تھا۔

ہسپتال کے پلاٹ پر جب اس کا اسٹریچر نکالا تو اس نے گیس کی روشنی میں آنکھیں کھولیں اور ایک دلخراش چیخ ماری۔ اس کی آنکھیں ڈراؤنی ہو گئی تھیں اور بیچی کی طرح باہر نکل آئی

تھیں۔ اس نے چاروں طرف بیقراری سے دیکھا۔ تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے اس نے اپنی جیب
سے تصویر نکالی۔ اس نے تصویر کو دیکھنا چاہا لیکن وہ اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ میں نے اٹھا کر
اس کے ہاتھ میں تصویر پکڑا دی ——— اکھڑی ہو سانس کے ساتھ اس نے کہا۔

"تھینک یو"

اور پھر اس نے ایک صدیوں سے تشنہ انسان کی طرح تصویر کو اپنے منہ پر ل لیا جیسے
وہ تصویر نہیں تھی بلکہ اس کے خوابوں کی ٹھنڈی حسین اور کومل دنیا تھی۔ اس کے پورے بدن
کی لرزش اچانک رُک گئی اور وہ پتھر کے گرے ہوئے مجسمے کی طرح ساکت ہو گیا۔ تصویر اس کے
ہاتھ سے چھوٹی اور میرے بوٹ کے پاس آکر گر گئی۔ میں نے تصویر اٹھائی۔ میریڈا کی تصویر تھی۔
وہی بانکپن، کنوارا تبسم۔ چیک کی ہوا میں اڑتی ہوئی قمیص، بیڈمنٹن کا ریکٹ۔ کمر کا دلفریب خم
اور بالوں کا لہردار اہتمام جیسے آہنا سکی تہ بہ تہ گہری ہوتی ہوئی شام، ——— آنکھوں کی شوخی
لیکن یہ سب میں اپنی یاد کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ——— اس لئے کہ پوری تصویر
خون سے رنگ گئی تھی صرف ریکٹ کا ایک حصہ بے داغ تھا ——— میں نے تصویر
ہسپتال کے پڑاؤ کے انچارج کے حوالے کر دی۔ ایک بار مڑ کر ڈرتے ڈرتے جانسن کی طرف دیکھا
اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ زبان اور آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ اب خون کا ٹپکنا بند ہو گیا تھا۔ ان نکلی
ہوئی آنکھوں میں کیسی گھٹن تھی کیسی مری ہوئی آرزو، محبت کی کتنی پیاس ——— اس کی آنکھیں
واقعی ازل سے ہی پیاسی تھیں ——— اب وہ اپنی محبوبہ سے کبھی بھی بازی نہیں جیت سکے گا۔
میں نے اپنے امبولنس وان میں بیٹھ کر اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی جنگلی راستوں سے محاذ
کے رُخ پر دوڑنے لگی۔ رات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اندھیرا موت سے زیادہ بھیانک معلوم
ہوتا تھا۔ گاڑی اچھلتی اور پھر ٹھیک سے بھر ہموار طور سے چلنے لگتی۔ جانسن کی آنکھیں
اس کی زبان، اس کا قہقہہ ——— انجن میں اس کا قہقہہ جیسے جکڑ گیا تھا۔
"——— وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے ——— شفق کی لالی کو دیکھ کر اس کے گال
جل اٹھتے تھے ——— وہ بہت معصوم ہے ——— سارا حسن، ساری رعنائی،
ساری شاعری معصومیت میں ہے، زندگی کی معصومیت اور علامت میں"

کوئی زخمی ہے ۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کو پلٹ کر چت کر دیا ۔ جس نے دل کی دھڑکن کا پتہ چلانے کے لیئے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا ـــــ ارے اوہ ـــــ یہ تو کسی عورت کا جسم تھا ۔ ٹھنڈی اور بے جان چھاتیوں نے بے دھڑک مجھے بتا دیا تھا کہ ان کے اندر سے زندگی کی آخری چنگاری بھی چھین لی گئی تھی ۔ اور وہ جسم محض راکھ کا ڈھیر تھا ۔

میں ڈر سے لرز گیا ۔ میں نے اپنے چاروں طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھا ۔ اپنی آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھا ۔ گولیوں کی بوچھاڑ رک گئی تھی ۔ اور اب دور سے ہوائی طرف سے دھماکوں کی آواز آرہی تھی ۔ درختوں کی چھت میرے سر پر خالی تھی ۔ اور آسمان صاف نظر آرہا تھا ۔ دور آکاش پر ستاروں کا غبار اڑ رہا تھا ۔ میں تھوڑی دیر تک ان ستاروں کو اسی طرح تکتا رہا ۔ گھن گھن ـــــ شاید ہوائی جہازوں کا بیڑا شمالی کوریا کی طرف پرواز کر رہا تھا ۔

میں نے فلیش لائٹ جلا کر اپنے سامنے ۔ ۔ ۔ ۔ پڑی ہوئی ننگی مردہ عورت کو دیکھا ۔ اس کے پاس ایک اور عورت کی لاش تھی ۔ اس کی بھری بھری چھاتیاں اُدھڑی پڑی تھیں ۔ جیسے کسی بھیڑیئے نے اپنے دانتوں سے نوچ کھایا ہو ۔ اس کی ناف کے نیچے ایک بڑی گیند کی طرح سطح پھول ہوئی تھی ۔ جس پر سنگین سے ناسور سا بنا دیا گیا تھا ۔ اس میں سے جھلی کی سی کوئی چیز نکل آئی تھی ۔ اور خون کی تہیں خشک چھلکے کی طرح اس کی ستر پوشی کر رہی تھیں دونوں مردہ عورتوں کے بیچ ایک بچہ پڑا کلبلا رہا تھا ۔ اس کی دونوں ٹانگیں کچلی ہوئی تھیں شائد میری ایمبولنس گاڑی اسے کچلتی ہوئی گزر گئی تھی ۔ میں نے جلتی ہوئی فلیش لائٹ کو اس کا رخ اپنی طرف کر کے ایک بڑے سے پتھر پر رکھ دیا ۔ اور اس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا وہ ہلکے ہلکے ذبح ہوتے ہوئے بکری کے بچے کی طرح ممیایا ۔ میں نے فلیش لائٹ اٹھا کر اس کے چہرے کو روشنی میں دیکھا ۔ کوئی ڈھائی سال کا بچہ ہوگا ۔ اس کی آنکھیں کھلیں اس کے ننھے ننھے لب تھرتھرائے اس نے اپنی دونوں باہیں پر تولتی ہوئی چڑیا کے پروں کی طرح پھیلائیں ـــــ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک انسان کی گود میں ایک انسان کا ننھا بچہ بغیر کچھ کہے ، بغیر روئے ، بغیر تھنکے کس طرح مسکراتا ہوا مر جاتا ہے ۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا ۔ مسکراتے ہوئے مر جانا ـــــ بچہ خواب میں ماں کو چمکارتے ہوئے دیکھ کر مسکراتا ہے ۔ لیکن اس وقت وہ کیوں مسکرایا میری

سمجھ میں آج تک نہیں آیا ہے -

بس اسی طرح بیٹھا کسی چیز کا انتظار کر رہا تھا ـــ ابھی ابھی جو بچہ مسکرایا تھا، کیا وہ پھر بھی سکتا ہے، شاید اس کی آنکھیں کھل جائیں، شاید اپنی بے بس بانہوں کو پھر پھیلائے۔ شاید اس کی کچلی ہوئی ٹانگوں میں پھر زندگی دوڑ جائے اور وہ دوڑتا دوڑتا اپنی ماں کی بھری بھری چھاتیوں پر منہ گاڑ دے اور دودھ پینے لگے۔ لیکن اس طرف ماں کی چھاتیاں خون میں لت پت اُدھڑی پڑی تھیں اور اس طرف بچہ میری گود میں ٹھنڈا پڑا تھا۔ میں نے اس بچہ کو اسی طرح دونوں عورتوں کے بیچ سلا دیا۔ اور فلیش لائٹ بجھائے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا ـــ ابھی میں ان مردوں کو پار کر کے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ میرے گھٹنے میں ایک جلتی ہوئی سلاخ گھس پڑی، ـــ جلتی ہوئی گولی ـــ بس تیورا کر گر پڑا۔ میرے ہاتھ سے فلیش لائٹ دور جا پڑی اور میں اندھیرے میں غرق ہو گیا۔ اندھیرے کی دلدل میں ـــ اندھیرے میں ـــ اندھیرے میں ـــ

ایک ہفتے سے میں ہسپتال کے عارضی پڑاؤ میں پڑا ہوا ہوں ـــ مجھے انڈین میڈیکل مشن کے لوگ بچا کر یہاں لائے ہیں ـــ میں چھ روز تک بیہوش رہا۔ کل صبح مجھے ہوش آیا۔ بھور کا وقت تھا میں نے آنکھیں کھولیں۔ کان میں طیاروں کے گونجنے کی آوازیں آ رہی تھیں ـــ شاید شمالی کوریا اور چینی سپاہی ہماری فوجوں کو ڈھکیلتے ہوئے بہت آگے آ گئے تھے۔ ـــ میرا سر ملنے لگا اور میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میں نے محسوس کیا کہ میرے سر میں بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے جب سر اٹھا کر اپنے پیر کی طرف دیکھا تو مجھے سفید پٹیوں نکلی ہوئی روئی اور گاز سے آگے جھانکتی ہوئی انگلیاں اور پلستر کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا۔ میرا پیر بری طرح متورم ہو گیا تھا۔ اور اس میں جیسے لوہار کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ اور کیا بتاؤں مجھے وہ جھانکتا ہوا پیر کا... اگلا حصہ نہ جانے کیوں رسیلے میٹھے ٹکڑے کی طرح نظر آیا۔ سرخ اور پیلا، اور انگلیاں سجے ہوئے جامن کی طرح ـــ یہ یہ ـــ ماں ـــ میرے پاس پہنچ کر ڈاکٹر نے ہمت بندھائی اس کی اُداس اور بے نیاز مسکراہٹ نے بڑا کام کیا ـــ بنگالی ڈاکٹر بولا ـــ کیوں بھائی ـــ" اب تو تم چنگا ہو جائے گا ـــ پیر ٹھیک ـــ تھوڑا کاٹنا ہوگا۔

گاڑی کسی پتھر سے ٹکرا کر پھر ایک بار اچھل گئی۔ میں نے سنبھال لیا۔ اور راستہ کاٹ کر اپنے خیال میں زیادہ ہموار راستے سے گزرنے لگا۔ لیکن گاڑی کا رہ رہ کر ہچکولے کھانا بند نہیں ہوا۔ تب میں نے گاڑی روک دی۔ جنگل کے پیٹ میں میں نے گاڑی کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا۔ بار بار میں اس اندھیرے میں راستے کے بارے میں سوچنے پر زور دینا چاہتا تھا لیکن بار بار مجھے جانسن یاد آ رہا تھا۔ اس کا اکڑا ہوا قہر سے بھرا ہوا فریادی جسم، اس کی اینٹھی ہوئی، باہر کو نکلی ہوئی زبان جس میں لپٹا ہوا خون جم کر آہستہ آہستہ سیاہی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے ایک اور سگریٹ سلگایا اور فلیش لائٹ ہاتھ میں لیکر ایمبولنس گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے سمت کا پتہ لگانے کے لئے بٹن دبایا۔ روشنی کا فوارہ درختوں اور چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹیلوں پر سے ہوتا ہوا اس سمت میں مڑ گیا، جدھر سے میں آیا تھا۔ میں اسی راستے پر بڑھنے لگا۔ اسٹین گنوں اور مشین گنوں کی دھوم دھڑاک پھر تیز ہو گئی تھی۔ معرکے کی جنگ ہو رہی تھی۔ خون آشام دانت کاٹی جنگ۔ جیسے کوریا کی زندگی اور موت کا فیصلہ اسی رات ہونا تھا۔ امریکی فوجیں اپنی حاصل کی ہوئی فتح کی سرحد سے نیچے اترنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ اور دوسری طرف شمالی کوریا کے سپاہی جنگ کا پانسہ پلٹ دینے کی قسم کھائے ہوئے تھے —— دو تین گولیاں ایمبولنس گاڑی سے آ کر ٹکرائیں۔ اور میرے خطرے کا احساس بڑھ گیا۔ میں نے فلیش لائٹ گل کر دی۔ اور اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ پھر گولیوں کا انتظار کرنے لگا۔ سوکھے ہوئے گرے پتے اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چرمرائے تو میں سمجھا کسی کی چاپ کی آہٹ ہے۔ لیکن پھر وہ آواز بند ہو گئی گولیاں نہیں آئیں۔ میری ناک میں زمین سے اٹھتی ہوئی جلتے ہوئے زندہ گوشت کی بو گھسنے لگی جیسے کہیں قریب میں چمڑے یا چکڑے کا پورا ڈھیر جلا یا گیا ہو۔ میں نے اس قے کرانے والی بو سے بچنے کے لئے بائیں طرف منہ پھیر لیا۔ اندھیرے میں ہر طرف منہ پھاڑے ہوئے خوفناک سائے سے نظر آئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بائیں طرف جیسے کوئی غار تھا میں فلیش لائٹ کا بٹن دبانا ہی چاہتا تھا کہ گولیاں پھر برس پڑیں۔ سانس جیسے تیز دانت والے چاقو کی ضرب لگتے ہی درمیان سے کٹ کر آدھا اندر اور آدھا باہر رہ گئی ہو میں نے دم سادھ لیا۔ میں چند قدم آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اور آگے بڑھا تاکہ ایمبولنس وان سے میں دور نکل جاؤں۔ ہوا زور سے جھکڑ کی طرح چلنے لگی تھی

اور اپنی طرف ان دیکھے غار سے سرسراتی بدبو کا تعفن اور تیز ہو گیا تھا۔ میرا بدن پسینے سے لت پت تھا۔ اور میرا فوجی لبادہ میرے گردن تک چپک گیا تھا۔ لیکن پسینہ کی نمکین کھٹاس بھی سڑاند کی تلخی کو مٹانے میں ناکام تھی۔

میں سچ کہتا ہوں۔ اسوقت میں کتے کی طرح ہانپنے لگا تھا۔ اور میں بد حواسی سے چل رہا تھا۔ سر کے بال آگے کو جھک آئے تھے — ٹوپی کہیں گر گئی تھی۔ اور میں اس ٹوپی کیلئے روشنی جلانے کو تیار نہ تھا۔ (اور اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یقینی اپنی زندگی کی اتنی ہی قدر کرتے۔ نہ ایک انچ کم نہ ایک انچ زیادہ) میں چند گز اور بچھو کی طرح رینگتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھتا رہا۔ میرے ہاتھ درختوں سے گرے ہوئے پتوں، گھاس کی نرم تلواروں اور پتھریلے روڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ گولیاں کچھ کچھ وقفے پر آ کر ایمبولنس وان سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہر آواز مجھے موت کے خطرے سے آگاہ کرتی۔ اور لگتا کہ گولیاں خود میرے سینے سے گزر رہی ہیں۔ اور میں ہر ہر قدم پر دم بخود رہ جاتا۔

گولیوں کی یورش اور گھنی ہو گئی — تڑاتڑ — تڑخ — تڑاتڑ — درختوں میں طوفان سا مچ گیا۔ سینکڑوں پتے جھڑ جھڑ کر میرے اوپر گر پڑے۔ خوف سے میری سانسیں نوکیلی سی ہو گئیں اور وہ سینکڑوں پتے گویا میرے حلق میں پھنس گئے تھے۔ اب میں کیا کر سکتا تھا۔ چڑیاں چہچہاتی ہوئی اڑیں اور پھڑپھڑانے لگیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا کیسی گھٹی گھٹی ہوئی بے بسی تھی۔ جیسے میں بندوق کی سیاہ نال سے رینگ کر نکلنا چاہتا تھا۔ کاش میں اس تنگ اندھیرے کی نالی سے نکل کر بندوق کی گولی کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا دوسری طرف کی سمندر پار پرامن سالم پر پہنچ جاتا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں لپا ہو گیا ہوں — اور میرے ہاتھ پیر جواب دے رہے ہیں۔ پھر بھی میرا رینگنا بند نہیں ہوا — میں چند قدم اور آگے بڑھا — اوہ رے میرا ہاتھ ایک انسانی جسم سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے ڈر کر اپنے دونوں بازوؤں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ میری ناک پتھریلی زمین سے ٹکرا گئی۔ اور میرے منہ میں نوک دار گھاس کے چند تنکے گھس گئے۔ میں نے جھٹ سے اپنا منہ اوپر اٹھا لیا۔

میں نے اندھیرے میں پھر انسانی جسم پر ہاتھ رکھا — ننگی پشت — میں ہاتھ اوپر نیچے سرکا رہا تھا۔ میرا ہاتھ گزرتا ہوا ہنڈلیوں پر آ کر رک گیا۔ میرا اوم گھٹنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے

یہی تو ہوتا ہے، ہیں؟

مجھے وہ زمانہ یاد آرہا ہے۔ جب میری ملاقات جان سے شروع شروع ہی ہوئی تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ندی میں برف جم گئی تھی اور درختوں سے شبنم سفید سیب کی طرح جھڑ رہی تھی۔ پچھلی شام سردیوں کی یاد اس برف بار سردی کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔ خود ٹھنڈے ملکوں میں رہنے والوں کا کلیجہ ہر سانس کے ساتھ جمتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ —— اسی زمانے میں جب کہ امریکنوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کرسمس سے پہلے پہلے منچوریا کی سرحد تک کوریا فتح کر لیا جائے گا۔ اچانک شمالی کوریا اور چینی سپاہیوں نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ اور پھر جو بھگدڑ پڑی ہے، اس کا حال تو تمہیں اخبار سے معلوم ہی ہوا ہوگا۔ میں بھی بڑی مشکل سے جان بچا سکا تھا۔

بھاگتی ہوئی فوجوں کے ساتھ جانسن کا دستہ بھی تھا۔ اس نے اپنی خوبصورت پھیلی ہوئی اجلی سبز آنکھوں کو بھینچ کر اور سگریٹ کا بھر منہ دھواں نکال کر کہا تھا۔

"تم ہندوستانی ہو —— ہندوستانی گڈ —— ہندوستان گڈ —— ویری گڈ —— میں نے ہندوستان دیکھا ہے، —— تاج محل —— ایلورا کا غار، —— کشمیر، سنا ہے کہ کشمیر بھی پنجاب کی طرح، بنگال کی طرح —— کوریا کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا —— اوہ، بٹ وی بلاڈی کوریا ——"

"کیوں کوریا میں کیا ہوا؟"

"Terrible fighters! —— اوہ ....."

"اچھا —— اور ہندوستانی؟"

"وہ بھی —— لیکن ان کا کوئی تجربہ نہیں —— وہ تو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔"

پھر وہ لرز گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ اس کی آنکھیں سلوٹوں میں اس طرح چھپ گئیں کہ اس کی آنکھوں کی سبزی کا رنگ غائب ہو گیا۔ اور ہلکی ہلکی ٹمٹماہٹ معلوم ہونے لگی، جگنو کی طرح ٹمٹماتی ہوئی۔!

"میں نے سوچا تھا کہ کرسمس تک واپس چلا جاؤں گا —— میریا سے شادی کر لوں گا —— اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے —— محبوب کے پیار میں کتنی جنت چھپی ہوئی ہے۔ تم جانتے ہو؟"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میری آنکھیں سول سے آگے اس چھوٹے سے شہر پر تھیں۔ جہاں دھوئیں کے بڑے بڑے درخت زمین سے اکھڑ کر آسمان کی طرف اڑتے چلے جا رہے تھے۔

اس نے سوچا تھا وہ اپنی محبوب کے ساتھ بیڈ منٹن کھیلے گا۔ اس کے ساتھ جھیلوں میں تیرے گا۔ اور برف پر اسکیٹنگ کرے گا۔ اور اسے لے کر حسین مرغزاروں میں چلا جائیگا۔ انگلینڈ کی پرسکون اور خوبصورت گودیں ——— چڑیوں کی چہچہاہٹ کے سائے میں۔ برف کی وادیوں میں، جہاں نیم منجمد چشمے نرم روی کے ساتھ، حاملہ عورت کی طرح آہستہ آہستہ نشیب میں اترتے ہوں گے۔ شیری اور سیب کے پیڑ آہستہ آہستہ گنگنائیں گے۔ فاختہ اڑ کر ایک درخت سے دوسرے درخت پر جا بیٹھیگی ——— اور وہاں، تھپک کر سلانے والی اور جذبات میں ترنگ بھرنے والی وادی میں۔ اس کی حسین، معصوم اور ملائم باہوں والی میریا اسے اپنی شاعری سنائیگی۔ اور وہ اس کے گالوں کو تھپتھپائے گا۔ اور آنکھیں موند کر اور بادلوں کے پر لگا کر شفق زاروں کی طرف اسے اپنے سینے سے لگائے اڑ جائے گا۔ خوابوں کے سلونے سیل میں بہتا چلا جائے گا۔

اس کی باتیں خواب ناک رومان سے بھری ہوئی ہوتی تھیں ——— لیکن وہ تو نہیں بتا سکا ہوں کہ بادلوں کے پر سے پہلے اسے موت کے پر نکل آئے اور وہ اپنی میریا کو چھوڑ کر کہیں اور سدھار گیا ——— اور اس وقت اس بڈ پر، ایک بھر، اس کی پتھرائی اوپر کی طرف نکلی نکلی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ اور مجھ سے پھر وہی کہانی کہہ رہی ہیں۔ لیکن ان میں وہ تمنا سے بھری بے قراری نہیں ہے۔ ان لبوں کے باہر زبان نکلی ہوئی ہے، وہ اس وقت سگریٹ کے سرمئی کش نہیں لگا رہا ہے۔ اب تو اس کا جسم بھی وہ نہیں۔ بھاری لمبا، ترنگا چھ ہاتھ کا جسم، برف کی طرح سفید اور ہوا کے جھونکے سے لڑتی ہوئی چٹان کی طرح اٹل۔

میں جانسن کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں اس وقت ہر چیز کو بھول جانا چاہتا ہوں ماضی اور مستقبل دونوں سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتا ہوں۔ لیکن دونوں سمتوں سے مقناطیسی تار اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، اور میں اپنی اس عجیب زندگی کو سمجھنے میں ناکام ہوں، یہ کیسی عجیب زندگی ہے۔ شاید تم سمجھ سکو۔ تم کافی ذہین طبع اور درد مند انسان ہو۔ ضرور سمجھ جاؤ گے۔

—ہم بولتا ہے گنگرین بڑا ڈینجرس — نو ڈیلے، یس ،،

اس کے بعد پیر کی گولی نکل کر ٹھیک میرے دل میں لگی۔ ذرا سوچو مجھے کتنا دکھ ہوا ہوگا
یں کتنا گھبرایا ہوں گا — یہ سنتے ہی ہر وقت ایک بیساکھی میری آنکھوں میں جھولنے
لگی — فقیر کی بیساکھی — میں ایک مجروح ہرن کی طرح ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ میں نے
سر اٹھا کر اپنے سوجے ہوئے پیر کو دیکھا۔ جامن کی طرح سیاہ انگلیاں مجھے اشارے
رتی ہوئی معلوم ہوئیں — "ہمیں بچاؤ — ہمیں اپنے آپ سے مت جدا کرو۔
— ہم تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں —" میں نے آخری بار بے بسی میں ڈاکٹر کی طرف
یکھا۔ مجھے اس کی مسکراتی ہوئی غمگین آنکھوں میں اس وقت جلاد کا عزم صمیم نظر آیا۔
"ہاہا — تم گھبراتا ہے — ڈرتا ہے — ہاش — ساب
ٹھیک ٹھاک — ہاں "

اور دوپہر تک ساب ٹھیک ٹھاک ہو گیا — گھٹنے کے پاس سے میری ٹانگ
کاٹ دی گئی۔ وہ موٹی، بھرپور، مضبوط ہندوستانی ٹانگ مجھ سے چھن گئی۔ میری ٹانگ
یا چھنی، مجھ سے میری امیدوں اور حوصلوں کی دنیا چھن گئی۔

ٹانگ کے کٹنے کے بعد زہریلی ٹیس سے تو قدرے نجات مل گئی ہے، لیکن میرے اندر
ب اور انسان ہے جس کا دل سوستا رہتا ہے، کیسی پیاری حسین اور توانا ٹانگ تھی! وہ
ں ٹانگ نے میرے ساتھ کتنی وفا کی تھی۔ وہ مجھے کہاں کہاں لئے پھری تھی، کھیتوں میں
لیانوں میں، شہروں میں کھیل کے میدانوں میں اور موعزاعدوں میں۔ شادی کے وقت
وڑے پر جب بائیں پیر کی رکاب ٹوٹ گئی تھی تو اسی پیر نے تمام جسم کا بوجھ سہار کر مجھے
ت کے منہ سے بچا لیا تھا — ایک بار میں نے اپنے گاؤں کے پاگل کتے کو اسی ٹانگ
، دہ رد دیا تھا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا تھا — اور اب اسی ٹانگ سے میں مبولنس
ن کا اسٹارٹر دبایا کرتا تھا — اور اب میرے پاس میری دیرینہ رفیق میری پیدائشی
ن ساتھی، میری ٹانگ نہیں رہی — کوریا کی جنگ اسے کھا گئی تھی۔ کرسٹن
جو تو — اب مجھے بیساکھی پر چلنا ہوگا۔ میں ڈرائیو نہیں کر سکوں گا۔ کتنی محرومی
ہے میری۔ کتنی اذیت ہے مجھے۔ میں کیا بتاؤں۔ آنسو تو میری آنکھوں میں دریا سے

پاروے پانی کی طرح جم گئے ہیں ـــــ اور میں ہر طرف اپنی غم آگیں آنکھوں کو نچاتا ہوں۔ اور یہ
دیکھ کر اور بھی غمزدہ ہو جاتا ہوں کہ میری طرح کتنے ہیں جن کے رفیق ان سے چھن گئے ہیں۔ کسی کی
ناک اڑ گئی ہے۔ کسی کے ہاتھ کاٹ دئے گئے ہیں۔ کسی کی آنکھ کی جگہ صرف خول رہ گیا ہے
اندوہ اور محرومی۔ یہ ظلم نہیں، ظلم سے بھی زیادہ خوفناک چیز ہے ـــ کل سے آج تک
اپنی زندگی کے اس موڑ میں اکیلا پڑا سوچ رہا ہوں۔ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور
مجھے اپنی پچھلی زندگی کی یادیں ستا رہی ہیں۔ اور میں جیسے سینما دیکھ رہا ہوں۔ یہیں
اپنے پلنگ میں پڑے پڑے۔ خود بخود، یادوں کی فلم کا فیتہ کبھی سایہ در سایہ اور کبھی آفتاب
در آفتاب گزرتا چلا جا رہا ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ تصویریں اور چمک اٹھتی
ہیں۔ تفصیلات میں اور تازگی، ایک پراسرار سی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ
ہی دل پر ایک آرا چلنے لگتا ہے۔ اور یادوں پر چلتا ہے تو قیامت ڈھاتا ہے۔ اس کو تم
میرے پیارے فنکار اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔

میں جب یہاں آیا تھا تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں دنیا میں امن قائم کرنے والی فوج کی
خدمت گزاری کے لئے بھیجا جا رہا ہوں۔ یہاں آکر دیکھا کہ میں اس فوج کے ساتھ ہوں جس میں
امن کا کوئی جذبہ نہیں ـــ شعلوں کے کھلیان، آگ کے کھیت، آگ کے باغ، دھواں
پھینکتے ہوئے ملبے۔ ویران شہروں کے قبرستان ـــ یہی سب تو دیکھا میں نے۔ میں نے دیکھا
کس طرح ایک امریکی سپاہی ملبے میں پڑے ہوئے چھوٹے بچوں کے جسموں پر ـــ کھڑا کتّے
کی طرح پیشاب کرتا ہے۔ کھلکھلاتا ہے۔ اور قہقہہ لگاتا ہے۔ اور اس کی گردن میں اسٹن گن
ہار کی طرح جھولتی ہے ـــ پھر میں نے دیکھا منہدم مکان کے تنہا دھواں پھینکتے ہوئے
ستون سے ٹنگی ہوئی ایک سرخ فراک پر نشانہ لگانے کی بازی لگائی جاتی ہے۔ اور، اور
جس کی گولی فراک کے ٹھیک سینے میں پڑتی ہے وہ اس کوریائی عورت کو جیت لیتا ہے
جس کے لئے حق کا تصفیہ کھڑا ہو جاتا ہے ـــ کوریائی عورت چیختی ہوئی امریکی سپاہیوں
کے پنجے میں چلی جاتی ہے۔ فراک چھلنی ہو کر رہ جاتی ہے، اور یہ سب تماشہ بیر، گوشت
شراب اور عورت کے درمیان ناچتے ہوئے بہکتے ہوئے امریکی قہقہوں میں پیوست ہو کر
رہ جاتا ہے ـــ تو یہ سب دیکھا میں نے ـــ دنیا میں امن قائم کرنے والی لڑائی میں

وہ کیسی خوفناک رات تھی جب امریکی، ترکی اور امریکی فوجیں اڑتیسویں خط متوازی سے نیچے دھکیل دی گئی تھیں اور میک آرتھر کی ساری چنگیں ٹائیں ٹائیں فش ہو گئی تھیں سب جیالے جانباز سپاہیوں کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے ۔ اپنے ساحل پہ انوس فضاؤں میں محبوباؤں کے گال پر گال رکھ کر مسکرانے کا خواب ماؤں اور بہنوں کے جلو میں قہقہہ لگانے کا خواب، شراب پینے اور رقص کرنے کا خواب ——— سارے خواب سوڈا کی بوتل کے کھلتے ہی گیس کی طرح اڑ گئے تھے ۔ان کے اندر موت کی اداسی اور بے کیفی پیدا ہو گئی تھی ——— اب امریکی سپاہی اپنی شکست کا بدلہ ہر کوریائی جاندار اور غیر جاندار چیز سے چکا رہے تھے ۔ ہاتھ میں انھیں گرما گرم سنگینیں تھیں ۔ پھر تکلف کیا تھا ——— ہاں اسی رات کی صبح ہو رہی تھی ۔ بادل نیچے جھکے جھکے تھے ۔ فوج میں بعد انتشار اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی ۔

پہاڑی علاقہ تھا ۔ تقریباً سو سوا سو، کوریا کے باشندے قریبی گاؤں سے ڈھور ڈنگر کی طرح ہنکا کر وہاں لائے گئے تھے ۔ تمام سپاہی ان کو طرح طرح کی اذیت پہنچا رہے تھے ——— ——— وہ نشے میں دیوانے ہو رہے تھے ——— وہ وحشیوں کی طرح اچھل کود رہے تھے ۔ گا رہے تھے نعرے بلند کر رہے تھے ۔ بے ہنگم چیخوں کے نعرے ——— لانگ لیو میک آرتھر ——— ——— لانگ ، لانگ ، لانگ ——— انھوں نے گانا بنایا تھا ۔

کوریا کتوں کا ملک ہے ، سوروں کا ملک ہے ۔
اور کتیاں ہمارے عیش کے لئے پیدا کی گئی ہیں
کوریا ——— کوریا ——— کتوں کا ملک ہے ۔

جانسن میرے پاس ہی ایک ٹیلے پہ بیٹھا تھا ۔ وہ اسٹین گن پہ دونوں ہاتھ رکھے جھکا ہوا تھا وہ غور سے ہم نو دان لوگوں کو گھور رہا تھا ۔ ان گرفتار شدہ لوگوں کو ابھی کود ... سپاہی کبھی سنگینیں چبھوتے ۔ کبھی دانت کاٹتے کبھی قہقہہ لگاتے عورتوں کے لباس تار تار تھے ۔ وہ ننگی تھیں وہ یکجا ہو گئی تھیں اور مرد کندھے کھا کھا کر پیچھے ہو گئے تھے ۔ میں تو اپنی سانس روک روک کر امریکی تہذیب کا ۔ کو کو کولائی تہذیب کا نادر اور لاجواب رقص دیکھ رہا تھا ۔
جانسن جیسے کہیں اور پہنچ گیا تھا ۔ اسکی آنکھیں جلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں ، کئی دنوں کی

سوئی تھی۔ نیند تو اڑ گئی تھی غریب کی۔ بھگدڑ میں نیند کس کمبخت کو آتی ہے۔ اس نے جماہی لی اور میری طرف دیکھا۔ اس نے اپنی آستین کو لپیٹ کر اپنی کہنیوں کے اوپر سمیٹ لیا۔ حالانکہ دانت کٹکٹانے والی ٹھنڈک تھی۔ اس نے پھر جماہی لی اور جیب سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر مجھے پیش کیا۔ میں نے سگریٹ سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ میری طرف دیکھا اور پھر پیکٹ جیب میں رکھ لیا۔ اس کے ہاتھ کی دو انگلیوں کے دو شاخ کے پاس آخری پور تک سگریٹ عادت گیا تھا۔ وہ حصہ دھوئیں سے رنگ کر حقے کے تمباکو کی طرح رنگین ہو گیا تھا ——— بوڑھی عورتوں، بچوں اور مردوں کو لیکر سپاہیوں کا ایک دستہ کھائی کی طرف بائیں جانب چلا گیا۔

ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں سے وہ کھائی صاف دکھائی دیتی تھی لیکن ہمیں جنگل سے منہ پھیر کر بائیں بازو پر ذرا جھکنا پڑتا تھا۔ اس کے بغیر کھائی کا پورا نظارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میری متجسس نگاہیں اس طرف پھر گئیں۔ ساری عورتیں بچے اور مرد اس کھائی میں اتار دیئے گئے۔ تقریباً ایک درجن سپاہی اپنی اسٹین گنوں سے کھائی کو گھیرے ہوئے تھے وہ کھائی کے ابھرے ابھرے مستطیل دہانے پر کھڑے تھے۔ وہ مشتعل ہو ہو کر ان کو گھٹنے کے ٹیکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ پہلے کچھ عورتوں نے گھٹنے ٹیکے۔ کچھ بچوں کو اپنی گود میں چھپا لیا اور ان کے بال آگے جھرنے کی طرح گر گئے۔ جیسے جنگل کی چراگاہیں گائیں شیر کی آہٹ پا کر اپنے بچھڑوں کو اپنے سینے میں لے کر کان پھڑپھڑا رہی ہوں۔ مردوں میں کچھ بوڑھے اور کمزور مردوں نے جھکتے ہوئے سر جھکا دیئے۔ چند لیے جیالے بھی تھے جنھوں نے سینہ تان دیا۔ ان میں دو تین ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی تھیں وہ بالکل ننگی تھیں۔ لیکن انھوں نے بھی سینہ تان رکھا تھا اور وہ بھی اسٹین گن تھامے امریکی سپاہیوں کو حقارت آمیز تنفر اور شعلہ بار نگاہوں سے گھورے جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایک جھنک ابھرنے لگی۔ وہی جھنک بتدریج ایک تیز رفتار نغمے میں بدل گئی۔ دہانے پر کھڑے سپاہیوں نے اسٹین چھتیاں نغمے کی لے میں تلواروں کی دھار پیدا ہو گئی تھی ——— سپاہیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ——— تڑ تڑ تڑ ———

——— تڑ تڑ تڑ ——— تڑ تڑ تڑ!

کھائی میں انسانوں کا ڈھیر لگ گیا ——— نغمہ بجھ گیا ——— بندوق کا نغمہ دیر تک پہاڑیوں کے سینے سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتا رہا۔

تالیاں پیٹتے گیت ——— شیکسپیر کے ڈرامے، شا کے طنز، شیلے کی نظمیں سوچتا ہوں سوچتا ہوں۔
اور میرا سر دکھنے لگا WHAT A HEADACHE ? تم ٹھیک سوچتے
ہو میرے دوست ——— تمہاری ہیروشیما کی شاعری کا مقبرہ بن جاتا اور اس کا سارا سلطان بن،
ساز حسن اور ساری معصومیت دھواں بن کر اڑ جاتی ——— کیوں کیسا ہوتا یہ کھیل؟ اس کھیل کی
قیمت؟" ——— میں جواب دے رہا تھا جانسن کے سوال کا لیکن سوچ رہا تھا وہی
باتیں اپنے گھر، اپنے وطن کے بارے میں۔ اور اپنی آنکھوں سے اس بربریت کا تماشا دیکھنے پر
مجبور ہونے کے بارے میں، اس گندگی اور انسان دشمنی کے بارے میں جس نے مجھے کوریا کے جہنم میں
اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

اور اس وقت مجھے یہ تمام باتیں یاد آ رہی ہیں اور ایسی سیکڑوں باتیں۔ بم۔ بزدلی، شکست، انتقام، زنا اور لوٹ کی باتیں یاد آتی ہیں تو سانپ کی طرح ذہن کو، نظر کو ڈستی چلی جاتی ہیں۔ یہ غلط نہیں ہے۔ یہ زندگی بھی نہیں ہے۔ یہ اس سے بڑھ کر کوئی اور شے ہے۔ یہ ایٹم بم نہیں، یہ ہائیڈروجن بم نہیں۔ یہ اس سے بھی زیادہ کوئی خطرناک بم ہے۔ یہ انسانیت کے موت کا بم ہے۔ میرا خیال ہے انسان دشمنی سے زیادہ ٹرومین کے خزانے میں کوئی اور خطرناک بم نہیں۔

لیکن میں نے دوسری طرف کبھی نہ مرنے والی انسانیت کو بھی دیکھا ہے وہ انسانیت جو موت کی کھائی میں اتر کر سینہ تان دیتی ہے اور زندگی کے ولولے سے بھرا ہوا گیت گانے لگتی ہے۔ وہ انسانیت جو بچے کے پر تولتی ہوئی باہوں اور ایک اجنبی ہندوستانی کی گود میں مسکرانے میں ہے بتاؤ کرشن! اس انسانیت کو کہیں اسٹیمی گن اور سبز دل جیلی سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اب اس حماقت کا کیا جواب ہے تم ہی بتاؤ ——— تم سوچتے ہو گے۔ میں تمہیں وہی تفصیل کو دے رہا ہوں جن کو تم نے سیکڑوں بار مختلف اخبارات میں پڑھا ہو گا۔ پھر ان کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں اپنے دل سے جو مجبور ہوں۔

میں دراصل اپنی ٹانگ کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں وہ ٹانگ جو میری روح کا ایک حصہ تھی اور جواب مجھ سے الگ کر دی گئی ہے میں نے اسے کوریا میں دفن کر دیا ہے۔ ہندوستان کا یہ
وہ برف زدہ کوریا کے ہزاروں کٹے جلے ہاتھوں پیروں اور دودھ سے بھری چھاتیوں کے ساتھ

کیا اہمیت رکھتا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ جب میں واپس اپنے وطن پہنچوں گا تو میں ایک بیروزگار ہوں گا اور میری بیوی مجھے ویسا ہی پریشان دیکھ کر چیخ پڑے گی وہ تو زار و قطار روئے گی۔ اور میں اسے چپ بھی نہ کرا سکوں گا۔ میری کومل بچی خوف سے میرے پاس نہیں آئے گی ——— اور اب تو وہ اتنی ہی بڑی ہو گئی ہوگی جتنی میری کٹی ہوئی مرحوم ٹانگ تھی۔

پھر تم میری جگہ اگر سوچو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ ایک پیرکٹے شوہر کو بیوی کی اس افسردہ چیخ سے کیا تعلق ہوتا ہے اور خود اپنے کلیجے کے ٹکڑے کی خوف زدہ سہمی سہمی نظروں سے سینے پر کتنی بھاری سلسلاتی ہوئی دیواریں بیٹھ جاتی ہیں ——— میں نے ڈی ماب سپاہیوں کو فاقہ اور بیکاری سے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں جب ہندوستان چھوڑ رہا تھا تو وہاں فاقہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں میرا کیا انجام ہوگا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میری بیوی پہلے سے مریض ہے ——— اور اب میری بچی ہمارے خوابوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم نہیں پائے گی ——— وہ تو شاید ابھی تتلا کر ماں سے کہتی ہوگی:۔

" امی ——— میں نے تو پہلی کتاب ختم کر دی ——— ایں ——— مٹھائی!" اور ماں اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کو چوم لیتی ہوگی۔

اپنے گاؤں کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے، وہ چھوٹا سا کچی مٹی کا مکان۔ اتھلا سا آنگن۔ آنگن کے بیچ میں امرود کا بوڑھا درخت اور اس کے نیچے چوڑے منہ کا کنواں —— اور قریب ہی پیال چباتی ہوئی کھونٹے سے بندھی لال اور اجلے گلوں والی بھینس گائے۔ میری بیوی پتلی دبلی، ہر وقت ہونٹ چباتی ہوئی۔ برتن مانجھتی اور بچی کے میلے کپڑے دھوتی ہوئی ——— اور گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی میری بچی، ناک سڑسڑاتی، زبان نکالے ہوئے۔ گود میں کپڑے کی گڑیا دبوچے اور پھر میری بوڑھی ماں کی چیخ۔ کنوئیں میں نہ گر پڑنے کی تاکید اور بچی کا شرارتاً گر پڑنے پر اصرار ——— یہ سب باتیں یاد آرہی ہیں ——— یہ فلم بھی کتنی حسرت اور کم نصیبی سے بھری ہوئی فلم ہے۔

کچھ ہی دنوں بعد وہاں برسات آجائے گی۔ چھوٹے نالوں اور نہری گلیوں میں پانی ایسے زور سے بہہ رہا ہوگا کہ معلوم ہوگا جیسے بوڑھا آدمی نما من پانی سے غرارہ کر رہا ہے۔ لڑکے ٹمول ٹپہ کھیلنے

لگیں گے کھیتوں میں ہلوں کی فوج نکل پڑے گی اور خوب مینہ برسے گا مٹی کی خوشبو دھم دھم اٹھے گی۔ ——— ہنڈولے لگ جائیں گے اور بسنتی ساریوں کی لمبی لمبی پینگیں اٹھیں گی ——— اور میں دیکھتا ہوں میری بیوی اپنی نرم ہتھیلیوں میں مہندی رچائے گی اور میری ننھی بچی بھی مہندی لگانے کی نقل اتارے گی اور شام کے وقت جب کڑوا تیل مل کر ہتھیلی سے مہندی چھڑائی جائے گی تو درخت کے کچے دودھ کی بو پھیل جائے گی اور ماں بیٹی کی ہتھیلیاں دپ دپ لہک اٹھیں گی چھوٹے بڑے حنائی چراغ کی طرح۔

لیکن تمہاری جان کی قسم، میں یہ سب بھول جانا چاہتا ہوں، میں اب ایک پیر کا آدمی ہوں۔ میری بیوی ایک ٹانگ کے شوہر سے کیا پائے گی؟ اب میری بچی کو کیا مل جائے گا۔ مجھ سے؟ لیکن میں یہ باتیں بھول کیوں نہیں جاتا؟ میں اپنے آپ کو ——— لیکن آخر میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہا ہوں بھلا؟

ہاں ——— میں آج بھی اپنے وطن سے، اپنے گاؤں، اپنی بیوی اور بچی سے محبت کرتا ہوں اور یہی چیز میرے سینے میں جینے کی تمنا جگاتی ہے۔ لیکن اس جنگ اور موت کی دنیا میں جینے کا کیا فائدہ۔ کوریا میں کوئی لڑنا نہیں چاہتا۔ سب اپنے وطن لوٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ گولیاں چلا رہے ہیں، خون بہا رہے ہیں۔ بم گرا رہے ہیں ——— ڈالر کی خدائی ان کے اندر بیٹھے ہوئے انسان کو مار دیتی ہے۔ !

دیکھو دیکھو، بیچارا جانسن زبان نکال کر مر گیا ہے۔ کوریا کی کھائیوں میں لڑکیاں اور عورتیں بھی پڑی ہیں جو اپنی جوانیوں کی کلیوں اور آرزوؤں کی خوشبو سمیت دفن ہو گئی ہیں ——— وہ دو کوریائی عورتیں، جو مجھے اس رات اندھیرے میں ملی تھیں، زخمی اور مردہ ——— ان کے درمیان ایک نو بہار پھول جو خود اپنی بہار میں چھپ گیا تھا۔

میں یہ سب بھول جانا چاہتا ہوں ——— اور یہ کتنا خوفناک ہے، یہ سب کچھ؟

کرشن ——— تم نے جس کو اپنے قلم سے چھو دیا ہے وہ امر ہو گیا ہے۔ تم میری ٹانگ کو بھی اپنے قلم سے چھو دو۔ میں اپنی ٹانگ کو کوریا میں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں۔ تم ایک کہانی بطور تحفہ کوریا کو پیش کرو۔ میں چاہتا ہوں تم اپنی کہانی سے جنگ کی دھار اور موڑ سکتے ہو۔ تم اس خونی نلوق

کو روک سکتے ہو۔ میری ٹانگ تو ختم ہو گئی ۔ لیکن جو ٹانگیں اب تک سلامت ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ میری کٹی ہوئی ٹانگ کی کہانی سن لیں ! کیا تمہیں کچھ اختلاف ہے ؟

اگر تم چاہتے ہو تو جانسن کی محبوبہ، اس کے انار کی شاخ کی طرح لچکدار جسم کی، اس کی مجروح کی، کوریا کی عورتوں کی، ان کے درمیان مسکراتے ہوئے مردہ بچوں کی، کھائیوں میں دفن جیالے گیتوں کی کہانیاں ساری دنیا کو سنا سکتے ہو۔ اور کون ناتجر انسان ہے ۔ جو یہ کہانیاں سن کر کوریا کی جنگ کو روکنے کی قسم نہیں کھائے گا ـــــ تاکہ کوریا کے کھلیانوں، کھیتوں شعلوں میں جلتے ہوئے شہروں، گیتوں سے پلٹے ہوئے غاروں سے پھر زندگی انگڑائی لیکر باہر نکلے، گائے ۔ ناچے ، ہنسے اور جھوم جائے ۔

کیا تم اب بھی میری شہید ٹانگ کے بارے میں کہانی نہیں لکھو گے ؟

اوہ ـــــ کاش یہ بات تمہارے قلم کے خون سے رچ کر ایک حسین سی کہانی بن جائے تمہاری تخلیق کی دنیا میں، تمہارے فن کی کہکشاں میں پہنچ کر درد کی طرح جگمگا اٹھے، اس لئے کہ یہ بات ، صرف بات نہیں بلکہ ایک دکھی انسان کی ، ایک نہیں لاکھوں دکھی انسانوں کی روح ہے ـــــ ان گنت نامراد آرزوؤں اور ناآسودہ خواہشوں کی روح ـــــ !

اوہ ! میرا پیر سر ٹڑا رہا ہے ـــــ نرس، نرس، ہاہا ـــــ ڈاکٹر کیا کہا سرسام ، ڈیلیریم ـــــ نو نو ـــــ مجھے سرسام نہیں ہو سکتا ۔ میں جانسن کو، اس کی محبوبہ کی خون میں لتھڑی تصویر کو مردہ عورتوں، ان کے گیتوں، ان کے مسکراتے بچوں کو نہیں بھول سکتا ـــــ نہیں نہیں نہیں ـــــ مجھے سرسام نہیں ہے ۔

میرے پیارے کرشن چندر، مجھے بچاؤ ۔ دیکھو یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں

کہتے ہیں مجھے سرسام ہے ـــــ کہتے میں کمیونسٹ ہوں ـــــ کمیونسٹ ؟

میں تو صرف ایک امبولنس ڈرائیور ہوں جس کی ٹانگ کاٹ لی گئی ہے۔

کیا تم میری ٹانگ کے بارے میں کہانی نہیں لکھو گے؟

کیا تم میری دوسری ٹانگ کے لئے ، میری بیوی کی مہندی رچی ہتھیلیوں کے لئے ، لیکن اب وہ مہندی نہیں لگائے گی ـــــ وہ میری ٹانگ کا

سوگ نہیں منائے گی !

میری جابجی کی تنلائی ہوئی شریر باتوں کے لئے ——— جنگ نہیں کروگے !

تم چاہو تو کیا نہیں کر سکتے۔

لیکن میں جانتا ہوں۔ یہ خط سنسر کے بعد تمہیں پہنچے گا ——— یہ باتیں

دل ہی دل میں دفن رہیں گی۔

نہیں، ڈاکٹر مجھے سرسام نہیں ہے ———————

——————— نہیں نہیں نہیں ———!

⁂

پرکاش پنڈت

ایک کہانی جو مکمل نہ ہو سکی

جیسے تیسے اس ایک نشست میں ہی مجھے ایک مزیدار چٹ پٹی کہانی گھڑنا اور گھسیٹنا ہے۔ کہانی عریاں نہ ہونی چاہئے لیکن شوخ ہونا شرط ہے، عاشق و معشوق محبت کی پینگیں بڑھاتے بڑھاتے لبِ بام تک تو پہنچ جائیں لیکن دو چار ہاتھ ادھر ہی کمند ٹوٹ جانی چاہئے، عاشق کو محبوب کے سنگِ آستاں تک تو ضرور پہنچایا جائے لیکن اگر اس نے سر پھوڑنے کی جسارت کی تو معاف فرمائیگا کہانی شوخ کے بجائے عریاں ہو جائیگی۔ اور "اٹھارویں صدی" کے معیار پر پوری نہ اتر سکے گی اور آپ جانتے ہیں "اٹھارویں صدی" کا معیار ...... اور اگر صبح دس بجتے بجتے میں ان تمام خوبیوں کی حامل ایک کہانی اور دو گھنٹے کی قصیدہ خوانی اور اپنی ازلی بے سروسامانی لے کر "اٹھارویں صدی" کے دفتر میں نہ پہنچا تو اس کا مالک اور مدیر مجھے دس روپے نقد عنایت کرنے سے معذور ہوگا۔

اور یہ کہانی لکھنا اس لئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ابھی ابھی جب میں چاندنی چوک میں سیر گشت کر رہا تھا اور مجھے کسی شوخ لڑکی کی تلاش تھی کہ جسے میں اپنی شوخ کہانی کی شوخ ہیروئن بنا سکتا اور میری جیب میں چار روپے اور چودہ آنے کی ریزگاری تھی اور لوگ باگ کل کی دیوالی کے لئے مٹھائیاں اور برتن بھانڈے اور غبارے خرید رہے تھے اور میں اس بھیڑ بھڑکے میں بے طرح گھر گیا تھا۔ کسی منچلے نے کمال صفائی سے میری جیب کاٹ لی تھی۔ جیب کے کٹ جانے کا مجھے اتنا ملال نہیں کیونکہ بقول شخصے جو چیز بنی ہے بگڑے گی — جو پیدا ہوا ہے مرے گا۔ ہر شے کا ایک وقت ہوتا ہے جو اپنے مصرف کے بعد ختم ہو جاتی ہے یعنی موت کا ایک دن

متعین ہے۔ اب اس قمیص ہی کو لیجیے، گذشتہ دو برس سے میں اسے اپنے مصرف میں لا رہا تھا۔ سردی، گرمی، جاڑا، لو ہر رنگ اور ہر حال میں یہ بڑی سعادتمندی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی رہی، آخر اسے بھی فنا ہونا تھا۔ جب اس کی آستینیں نہ رہیں۔ بالآخر اپنی موت آپ مر گئے تو اس بیچاری جیب کی اوقات معلوم، بحسرت آن چار روپے چودہ آنے پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

یہ چار روپے چودہ آنے اگر میری جیب میں رہتے تو شاید میں یہ کہانی لکھنے نہ بیٹھتا لیکن کل دیوالی ہے۔ لکشمی پوجا اور گھر میں بھونی بھانگ نہیں، گھر کی لکشمی چار روپے چودہ آنے کے غم اور غصہ میں تینوں بچوں کو پیٹنے کے بعد لگے ہاتھوں اپنا سر بھی پیٹ رہی ہے، اس بری گھڑی کو کوس رہی ہے جب مجھ ایسے پاجی کے ساتھ اس نے چار چکر لیے اور رہ رہ کر چھت کی طرف دیکھ رہی ہے جس کے اوپر بھگوان رہتا ہے اور جو اس کی آہ و زاری کی تاب نہ لا کر فوراً یم دوت جی کو بھیج دیگا۔ اور اسے تمام دکھوں سے مکتی مل جائے گی۔ کل دیوالی ہے اور گھر میں تین بچے ہیں اور اللہ کا نام ہے اس لئے میں یہ کہانی ضرور لکھوں گا۔ اگرچہ اس بیسویں صدی میں اٹھارویں صدی کے معیار پر پوری اترنے والی مصالحہ دار، چٹپٹی، لیموں نچڑی کہانی لکھنا کسی بھی پاجی کے بس کا روگ نہیں۔

جیب کٹنے سے پہلے میں خاصے اچھے موڈ میں تھا۔ موڈ تو اب بھی برا نہیں لیکن وہ بات کہاں کہ منہ میں کینچی کا سگرٹ، کلوں میں بنارسی پان کی گلوریاں، جیب کے چار روپے چودہ آنے کا خمار، اور چند گھنٹوں کی قلم گھسائی کے دس روپوں کا تصور اور پھر کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں کی تلاش۔

میرے ارد گرد بہت سی لڑکیاں تھیں لیکن کہانی کوئی نہ تھی۔ یہ کہانی اگر مجھے اٹھارویں صدی کے بجائے بیسویں صدی کے لئے لکھنا ہوتی تو اس کے برعکس میں یہ کہتا کہ میرے ارد گرد کہانیاں تو بہت تھیں لیکن لڑکی کوئی نہ تھی۔ آپ کہیں گے پاجی پن کی حد ہے۔ نئے اعداد و شمار کی رو سے عام حالتوں میں بھی چاندنی چوک میں ہر شام چار بجے سے آٹھ بجے تک کے عرصے میں چار ہزار آٹھ سو باسٹھ لڑکیاں موجود ہوتی ہیں اور دن تہوار کے موقع پر تو ساری دلی امڈ آتی ہے چاندنی چوک میں لیکن اے اٹھارویں صدی کے شوخی پسند قارئین شوخی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے جس طرح مجھ ایسا کوئی مسخرا شوخی کا وہ معیار قائم کرنے سے معذور ہے جو کہ میرے محترم ایڈیٹر صاحب نے عرصہ ایک چوتھائی صدی سے اٹھارویں صدی کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں پر مسلط کر رکھا ہے۔ اور انھیں دنیا کی ہر لڑکی شوخ صرف محبت کے سہارے جینے والی اور اپنے محبوب سے دو چار ہاتھ ادھر کھڑی رہ کر سرد آہیں بھرنے والی دکھائی دیتی ہے اسی طرح مجھے لڑکیوں کے جم غفیر میں بھی

کوئی لڑکی دکھائی نہیں دیتی۔ اس بیسویں صدی میں لڑکی نام کی مخلوق عنقا ہے۔ یہاں عورت بھی نہیں ہے۔ چاندی کے تاروں سے بندھی ہوئی اور انگلیوں کی جنبش پر ناچتی ہوئی کٹھ پتلیاں ہیں۔ یہ فرق صرف نظر کا فرق نہیں ہے منک بیلنس اور کٹی ہوئی جیب کا فرق ہے۔ کیا آپ نے کبھی پتلیوں کا تماشہ دیکھا ہے؟ نہیں مجھے آپ سے اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔ آپ نے تو اس توقع سے یہ کہانی پڑھنا شروع کی ہوگی کہ اس میں کسی ایسی لڑکی کا ذکر ہوگا کہ زلفیں جس کی ناگن ہوں گی۔ ہونٹ بلوریں جس کے ہوں گے اور گلرو و گلبدن اور آہو چشم پری صورت ہوگی۔ اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی شبنمی کنج میں اپنے عاشق دلنواز کی بغل میں بیٹھی ہوئی ...... لیکن نہیں، اس سے آگے تو شوخی ختم ہو جاتی ہے، اور حقیقت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور حقیقت ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور اٹھارویں صدی تک میں عریانیت ..... معاف فرمائیے مجھے اپنے دس روپوں کا خیال ہے۔

صبح دس روپے ملتے ہی میں سیر بھر تیل کی گرم گرم جلیبیاں، پاؤ آدھ پاؤ نمک پارے اور اتنے ہی بجی اور ماد رے کے لڈو خرید دوں گا۔ ونود کے لئے کوک سے چلنے والا موٹر، تشتی کے لئے مومی کاغذ میں لپٹی ہوئی رنگین گڑیا۔ اور آدرش کے لئے منہ سے بجنے والا سات سروں کا باجا۔ بیوی کئی مہینے سے سلولائیڈ کی ریشمیں چوڑیوں کے لئے کہہ رہی ہے کل اس کی بھی مراد بر آئے گی، دسوں بار سمجھا چکا ہوں کہ سلولائیڈ کی چوڑیاں ملنگ طبقے کی عورتوں کے لئے نہیں ہوتیں، کہ مرد جن کے دن بھر بھاڑ جھونکتے ہیں اور خود دن رات چولھا۔ انہیں تو بتیس دانتوں میں زبان کی طرح رہنا چاہیے لیکن نہیں مانتی —— یہ اس میں بہت بڑا نقص ہے کہ وہ عقل اور قاعدے کی کوئی بات نہیں مانتی۔ پچھلے سال آدرش کے لئے جب اس کا پیٹ پھولا تو میں نے اسے سمجھایا کہ موجودہ حالات میں ہر برس ایک بچہ پیدا کرنا پیٹ پر پتھر باندھ کر درخت اگانے کی مہم میں شامل ہونے سے کم خطرناک نہیں اور فدائے حکیم آنند نرائن جی کی خدمات حاصل کرنے کے لئے کہا کہ عرصہ انچاس برس سے دلی، جالندھر اور حیدر آباد سے ایک ساتھ چھپنے والے کثیر الاشاعت ہر اردو اخبار میں "حمل کا گرانا پاپ ہے" کے زیر عنوان اشتہار دے رہے ہیں۔ اور اس عرصہ میں کئی انچاس سو اسقاط کر چکے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے وہ عمل اور حمل کے بنیادی فرق کو نہیں سمجھتی۔ اور راج رشی ٹنڈن جی کے افلاطونی فلسفہ پر خطرناک حد تک ایمان رکھتی ہے جبر کے جوتے نہیں پہننے چاہئیں، نمک ہی تمام بیماریوں کی جڑ ہے، دودھ، دہی، مکھن وغیرہ صحت کے لئے مضر ہیں۔ تمام دوائیاں بیکار ہیں اور فائدے کے بجائے نقصان کرتی ہیں — مکانوں

میں رہنے سے صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے، کھلے آسمان کے نیچے ڈیرے جمانے چاہئیں، دن میں یکبار
کھانا کھانے سے ہاضمہ ٹھیک رہتا ہے۔ اور اگر ایک بار بھی نہ کھایا جائے اور ننگا رہا جائے تو آتما کو بڑی
شانتی ملتی ہے، شاید اسے معلوم نہیں کہ باپو جی تو حال ہی میں کانگرس کے پردھان بنے ہیں اور قد آدم کے لمبے
کا تجربہ نصف صدی کا تجربہ ہے، "حمل کا گرانا پاپ ہے" یعنی یہ حمل گرانے کی تیر بہدف دوا ہے۔ اور
اس مقصد کے لئے ہمارے یہاں کوالیفائیڈ نرسیں ہر وقت موجود رہتی ہیں "بلیک مارکیٹ کرنا
پاپ ہے" یعنی بلیک مارکیٹ ایک لاثانی دھندا ہے۔ "تشدد کرنا پاپ ہے" یعنی ہمیں صرف گولی
چلانے کی سعادت حاصل ہے۔ "ہڑتال کرنا پاپ ہے" ہمیں تین سونئی جیلوں کے ٹنڈر مطلوب ہیں
خیر کل ہی اسے سلولائیڈ کی ریشمی چوڑیاں ضرور لا دوں گا خود ہی جل مرے گی ایک دن۔

آپ ان باتوں پر لعنت بھیجئے اور اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے لبوں کی کہانی سنئے کہ جس سے
آپ کو روحانی فیض حاصل ہوگا اور مجھے دس روپے نقد۔ ادھر ادھر لڑکیوں کو گھورنے کے بعد جب
اتفاقاً میری نظر اس پر پڑی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ چونکا دینے والی شبیہہ کی مالک تھی۔ گندھی ہوئی
سیاہ عنبریں زلفوں کا حالہ اس کے نورانی چہرے کے پیچھے رکا ہوا تھا۔ اور سیاہ حالے میں نیلراج کی نازک
سی ڈنڈی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے اندر کے دربار کی ایک اپسرا دکھائی دی جو غلطی سے زمین پر اتر آئی
تھی۔ نازک گداز بدن پر آبی ریشم کی بیش قیمت ساڑھی موجود تھی۔ لیکن جسم کے عضو عضو پر اجنتا کے
غاروں کی عریاں رنگینیوں کے اعضاء کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ مسکرائی اور مجھے محسوس ہوا جیسے ساری کائنات
جلترنگ کے شیریں نغمے سے گونج اٹھی ہو۔ وہ ہنسی اور مجھے محسوس ہوا جیسے ساری کائنات جلترنگ کے
شیریں نغمے میں ڈوب گئی ہو اور کچھ بھی باقی نہ رہا ہو صرف جلترنگ کا نغمہ اور نغمے کے دوش پر بہتی ہوئی
ایک اپسرا۔ ایک عورت، ایک نور، ایک شعلہ جوالا۔ دوسری نظر میں وہ مجھے فوارہ چوک میں کھڑی
چاٹ کا پتہ چاٹتی ہوئی دکھائی دی۔

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ مسکرا کر سیٹھ
کھیوا نارائن کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر سیٹھ کھیوا نارائن تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھنے لگے اور انھوں
نے پیکارڈ کے الٹرا ماڈرن ماڈل کا پٹ کھول دیا۔ اور پیکارڈ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اور میں
اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا کسی دوسری کار آمد لڑکی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

سوچنے لگا کہ اگر کوئی دوسری لڑکی نہ ملی تو اسی لڑکی کے چہرے پر سے میکس فیکٹر کا میک اپ

کھرچ کر اس پر شوخی کا غازہ مل دوں گا اور سیٹھ کھوا نارائن کی جگہ مضبوط محنتی ہاتھ پاؤں اور خوبصورت
خط وخال کا کوئی البیلا نوجوان کھڑا کر دوں گا۔ دونوں فوارہ چوک میں بیکانڈ کے الٹرا ماڈرن
ماڈل کے قریب کھڑے ہونے کے بجائے کسی کھیت میں دھان کی پنیری لگا رہے ہوں گے اور لڑکی
کے ہاتھ میں پنیری کے ننھے ننھے پودے ہوں گے۔ چاٹ کا پتہ نہ ہوگا اور اس کی آنکھوں میں دبے دبے
حرامی کا عکس نہ ہوگا۔ اور اس کی جوانی کے تبسم پر پہرے نہ ہوں گے اور نوجوان کے ہاتھ میں بھی
بلیک اینڈ وائٹ کا سگرٹ نہ ہوگا۔ اور توند میں بلیک اینڈ وائٹ کی شراب نہ ہوگی۔ اور چہرے
کی جھریوں میں سے ذاتی ملکیت کی نئی نئی بلڈنگوں، کارخانوں، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کے بلیو پرنٹ
نہ جھانک رہے ہوں گے لیکن پھر فوراً ہی مجھے اپنا ارادہ ترک کر دینا پڑا کہ ایسے محبوب اور محبوبہ
کی کہانی بھی اٹھارویں صدی کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی "اٹھارویں صدی کے معیار پر
اس آسانی اور سادگی سے پورا نہیں اترا جا سکتا" اٹھارویں صدی کے لئے کوئی اور لڑکی تلاش
کرنا ہوگی چنانچہ میں نے بزن کہا اور چوک پتھر والا کا رُخ کیا۔
اب میں چوک پتھر والا میں کھڑا اپنا سر پٹک رہا تھا۔ کوئی لڑکی — کوئی مستقل، مسلسل، متواتر
شوخ لڑکی لیکن مجھے کوئی عارضی شوخ لڑکی بھی دکھائی نہ دی۔ جامع مسجد سے آنے والی سڑک کے
ساتھ میری بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن ادھر سے بھی خداوند کی مستقل، مسلسل، متواتر بارپیٹ
اور پانچ چھ اور سات بچوں کے کمر توڑ پالن پوشن سے چڑمری، چڑچڑی اور نحوست زدہ عورتیں
ہی ابھر رہی تھیں۔
میں نے سوچا، کس قدر بے وقوف ہیں یہ عورتیں مجھے اور مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب
کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جدید فیشن کے شوخ لباس نصیب نہیں ہوئے تو سالہا سال پہلے کی
شادی کے جوڑے نکال کر پہن لئے ہیں۔ لپ اسٹک خریدنے کی توفیق نہیں نہ سہی ماتھے کی لعابی
بندیا ہی کو ہونٹوں پر تھوپ لیا ہے اور کڑوے تیل سے تیار کردہ چیپ چپے کاجل سے اپنی آنکھیں چندھی
کر لی ہیں اور ملکۂ حسن کا خطاب پانے اور میرے شوخ افسانے کی شوخ ہیروئن بننے سر بازار آ نکلی ہیں
لا سر پھوڑنے کے لئے میں نے چوک پتھر والا کا بنیادی پتھر کہ جس کی رو سے اس چوک کا نام پتھر والا
پڑا تھا، ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوک بھی دراصل چوک
نہ تھا ایک تراہا تھا۔ ایک راستہ لال قلعے سے شہنشاہوں کے رعب دبدبے اور شاہی احکام لے کر نکلا تھا۔

ایک جامع مسجد کا ایمان اور خدائی احکام لے کر چلا تھا۔ اور یہ دونوں راستے یہاں آکر ایک دوسرے میں مدغم ہوکر اور اپنا نام چاندنی چوک بتاکر اور اپنے دائیں بائیں کارخانے، بینک اور تجارت کے گھو اسے تعمیر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ لوگ لال قلعے کی طرف آ رہے تھے۔ لوگ جامع مسجد کی طرف سے آ رہے تھے اور چاندنی چوک کی طرف جا رہے تھے۔ پھر کچھ لوگ مجھے ایک اور رستے کی طرف بھی جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔

یہ راستہ چند قدم کا راستہ تھا اور ایک شراب خانے میں جاکر ختم ہو جاتا تھا اس مختصر سے راستے کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے ہی کسی پیر مغاں نے اس تنگنائے کا نام چوک رکھا ہوگا — وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو وہ ایک چوک تھا اور چونکہ وہ چوک تھا اس لئے چوک پتھر والا کی رو سے، وجہ تسمیہ سے قطع نظر وہاں چھوٹا موٹا پتھر ہونا بھی لازمی تھا۔ میں نے پھر پتھر کی تلاش شروع کی اور پھر یکایک میرا سر اس سے ٹکرا گیا لیکن ٹکرا گرنے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ پتھر نہ تھا ایک شرابی تھا اور شراب خانے سے نکل کر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جائے کون سا راستہ اختیار کرے۔

میں نے اسے جامع مسجد کی طرف جانے کی تلقین کی۔

اس نے کہا میں جامع مسجد کی طرف سے آیا تھا میں نے رم پی ہے اس لئے اب ادھر نہیں جانا چاہتا۔"

"تو ادھر، لال قلعے کی طرف جاؤ" میں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اس نے پیار سے میرے گال پر چٹکی بھری "کیا ادھر کوئی لڑکی ملے گی؟"

لڑکی!

میرے کان کھڑے ہو گئے میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ممکن ہے میری طرح اسے بھی "اٹھارویں صدی" کیلئے کہانی لکھنا ہو "میں خود لڑکی کی تلاش میں ہوں"

"کیا تم نے بھی رم پی ہے؟"

"نہیں"

"اسکاچ؟" اس نے میرے تار تار لباس کا جائزہ لیتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں"

"ٹھرا؟"

"پار سال دسہرے کے موقع پر پیا تھا"

"آج کیا پیا ہے تم نے؟"

"آج مجھے اٹھارویں صدی کے لئے کہانی لکھنا ہے"

اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے سنے چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گیا اور میں "اٹھارویں صدی" کی کہانی اور رم کے باہمی تعلق پر غور کرنے لگا۔ کس قدر ہم آہنگی تھی۔ دونوں میں... استعمال اگرچہ مختلف تھے۔ لیکن لڑکی لازم و ملزوم تھی اور پھر میں اسکاچ، رم اور ٹھرّے کے فرق پر بھی غور کرنے لگا۔ ذائقے مختلف تھے، رد عمل مختلف تھا۔ تین طبقوں کا مکمل تضاد، یکمل، وہ بیدا تھی، اسکاچ، رم اور ٹھرّے میں، لیکن ایک چیز سب میں مشترک تھی، زندگی کی بے ماصنی اور انتشار سب میں پایا جاتا تھا۔ اور یہ انتشار اسکاچ کی شکل میں پیٹ میں پہنچ کر اوپر کی طرف رخ کرتا تھا اور رم کی شکل میں نیچے کی طرف اترتا تھا اوپر اور اوپر لاکھوں کروڑوں اربوں روپیوں، بنگلوں، موٹر کاروں اور حرم کی مرمریں داشتاؤں کی طرف نیچے اور نیچے پیشہ ور عورتوں کے خفیہ اڈوں، تنگ و تاریک گلیوں اور رنڈیوں کے چکلوں کی طرف اور پھر غریب نواز ٹھرّا! بھبکے کی طرح چڑھتا تھا اور بھبکے کی طرح اتر جاتا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے غم کے بادل چھٹ جاتے تھے۔ لمحہ بھر کے لئے زندگی نور میں ڈھل جاتی تھی، دوسرے لمحے میں پھر ہاتھ میں جوتا آجاتا تھا اور بیوی چڑیل نظر آنے لگتی تھی۔

معاف کیجئے گا میں بھی کیا بھوتوں چڑیلوں کا قصہ لے بیٹھا ہوں۔ دراصل مجھ میں بھی یہ بہت بڑی خامی ہے کہ میں موقع محل دیکھے بغیر اندھا دھند ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتا ہوں بھلا آپ ہی بتائیے کہاں یہ تن، نازک بدن، نازک اندام شوخ لڑکیاں جو "اٹھارویں صدی" کا دل بلکہ جان بلکہ روح ہیں، اور کہاں دن رات ہڈیاں تڑوانے اور چمڑی ادھڑوانے کی دلدادہ پھوہڑ بیویاں۔ کسی اور پرچے کی بات ہوتی تو کہتے چلو بھائی تھوڑا بہت تو چل جائے گا۔ لیکن "اٹھارویں صدی" میں ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب اگر ایسی باتیں چلنے دیتے تو ان کا پرچہ اور پرچے کے ساتھ پلنگ توڑ گولیوں کا کاروبار کب کا "چل" چکا ہوتا۔

ہاں تو جب وہ شرابی مہاشے لڑکی کی تلاش میں چاندنی چوک کی سڑک پر گئے تو میں نے سوچا اگر یہاں ایک شرابی کو لڑکی مل سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں

کہ ایک صاحب ہوش و حواس اس سے محروم رہے، میں بھی چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گیا۔ فوارہ چوک میں میں نے پھر چند کالڑکی پتلیوں کو چاٹ اور گول گپے کھاتے دیکھا لیکن ان کی طرف متوجہ ہونے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی اور چوراہے میں فوارے کی پھوار کے نیچے جا کھڑا ہوا ـــــ ایک پنتھ دو کاج، دماغ کو بھی ٹھنڈک پہنچے گی اور چاروں طرف نظر بھی دوڑائی جا سکے گی۔

یہ چوک بھی در اصل پھتروالا کی طرح ایک تراہا ہی تھا۔ چاندنی چوک کی سڑک میں سے صرف ایک سڑک پھوٹتی تھی۔ جو صبح سفر، ہر شام سفر، اس دنیا کا انجام سفر کی تلقین کرتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔ لیکن جس طرح سے ایک مختصر سے راستے نے شراب خانے میں داخل ہو کر زندگی کی بے حاصلی اور انتشار کو وقتی طور سے تھام کر، ایک تراہے کو چوک میں تبدیل کر دیا تھا اسی طرح اس جگہ بھی ایک مختصر سے راستے نے پولیس چوکی میں داخل ہو کر انتشار کو ختم کرنے کا ڈھونگ رچا کر، ایک تراہے کو چوک بنا دیا تھا۔

میں نے سوچا، یہاں وہاں کتنے ہی چوک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن انتشار ختم نہیں ہوتا۔ انتشار تھمتا بھی نہیں اور بڑھتا ہے اور شدت اختیار کرتا ہے اور جب تک یہ طویل و مختصر راستے کبھی انتشار تھامنے کے نام سے، کبھی انتشار ختم کرنے کے نام سے، کبھی خدا کے قہر سے ڈرانے اور عبرت دلانے کے نام سے چاندنی چوک کی سیدھی اور ہموار سڑک کو کاٹتے رہیں گے تب تک انتشار بڑھے گا اور بڑھے گا، اور بڑھے گا۔

فوارے کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار نے غریب پر خدا کی مار کے مصداق میرے تمام کپڑے نمی سے بھر دیئے تھے اور میرا ذہنی انتشار بدستور قائم تھا۔ پھر جب آتے جاڑے کی خشک اور خطرناک خنکی جسم میں نمونیہ کے احساس کی سوئیاں گھونپنے لگی اور لڑکی وہی ڈھاک کے تین پات رہی تو میں نے ہفتوں سے سنبھال کر رکھا ہوا پانچ روپے کا نوٹ بھنوا لیا۔ اور جسم کو حرارت پہنچانے کیلئے

پان کے بیڑے میں پیپرمنٹ کی تریاں ڈلوائیں اور کیپسٹن کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا ـــــ
کہ جان ہے تو جہان ہے ـــــ

فوارہ چوک سے جب میں نے چوک گھنٹہ گھر کا رخ کیا تو مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھٹنے لگے تھے اور آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالت عجیب ہونے لگی ـــــ سامنے کیبن کو کین تو نہیں ڈال دی میں نے اپنے تمتماتے ہوئے چہرے سے پسینے کا لیپ پونچھا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھا ایک دوکان کی پیشانی پر "ویران پور" کے نام کی جلی حروف کی زبان میں چاروں طرف نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے غول کے غول تھے کہیں نور کی طرح امڈ چلے آ رہے تھے۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ اے نادان لڑکی اب میرے ہاتھوں سے بچ کر کہاں جائے گی میں نے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

ایک مختصر وقفے کے لئے آپس میں کھینچا تانی ہوئی۔ اس نے کسمسا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہاتھ پاؤں پٹخے چیخی چلائی لیکن میں اسے اتنا سستے چھوڑنے کا نہ تھا اور آخر میری بھرپور گرفت نے اسے نڈھال کر دیا اور میں مال غنیمت کی طرح اسے کشاں کشاں اپنے گھر کی طرف لے چلا

گھسٹتے گھسٹتے اس نے کہا: "اب میں تمہارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوں لیکن مجھے اتنا تو بتا دو کہ میرے اغوا سے تمہیں کیا ملے گا"؟

"دس روپے نقد" میں نے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں کی طرف دسویں بار دیکھتے ہوئے کہا
"تو کیا مجھ سے پیشہ کراؤ گے"؟ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں تم پر کہانی لکھوں گا"

اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر جو شاید ابھی تک اچھوتے تھے ایک دلآویز تبسم مچل گیا "مجھ میں ایسی کون سی بات ہے"؟

"تمہارے ہونٹ بے حد خوبصورت ہیں ــــ ان میں شوخی ہے"
"اور آنکھیں"؟ وہ اپنی آنکھیں مٹکانے لگی۔

میں نے اسے روکا "مادام اپنی آنکھوں کو ناحق تکلیف نہ دو۔ آنکھیں میرے پاس ہیں۔ ابھی ابھی ایک لڑکی اپنی پلکوں پر سوئے ہوئے خوابوں کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کی آنکھیں نکال

بس زلفوں کی گھنیری سیاہ گھٹائیں، ابروؤں کے چلّہ چڑھے کمان، رخساروں کے جنگلی گلاب کے پھول۔ کانوں کی سنگرفی لویں اور بدن کی چمپئی مہک تک ہر چیز میرے پاس محفوظ ہے صرف ہونٹوں کی کمی تھی سو تم لے آئیں، اور میری جان! تم دیکھنا۔ صبح جب میں تمہیں ایک شوخ و شنگ محبوبہ بنا کر مکرمی و محترمی ایڈیٹر صاحب کے حضور میں پیش کروں گا تو وہ سیدھی انگلیوں گھی نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دینگے"

"تم مجھ سے پیشہ کراؤ گے" وہ پھر سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے شاید اب وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اپنے مفاد کو، اپنی مجبوری کا نام دے کر اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بہت اونچے دام لے کر اسے دس روپے میں فروخت کرکے دم لوں گا۔

میں نے اسے ڈھارس بندھانا ضروری نہ سمجھا کہ عورت ذات ہے از خود حالات سے سمجھوتہ کر لے گی بڑی نیک واقع ہوئی ہیں ہندوستان کی عورتیں اور یقین جانئے میرا اندازہ غلط نہیں ہے کیونکہ اس وقت جب میں اسے اپنے گھر اٹھا لایا ہوں اور اپنے مقصد کے لئے اس کا بے دریغ استعمال کر رہا ہوں، اس کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ چہرے پر سے امید و بیم کے آثار بھی رفتہ رفتہ مٹتے جا رہے ہیں اور اس نے ہلکا ہلکا مسکرانا بھی شروع کر دیا ہے ——— ابھی ہنسنے لگے گی نیک بخت!

سکونت اور ولدیت درج کر چکنے کے بعد میں نے اُسے اپنا معاشقہ بیان کرنے کو کہا۔

وہ شرما گئی۔

"مائی ڈیر شہزادی تخیل" میں نے اس کی جھجک کو نظر انداز کرتے ہوئے ذرا ڈپٹ کر کہا" تمہیں اپنا معاشقہ بیان کرنا ہوگا"۔

وہ اور بھی شرمانے لگی۔

"میری پیاری ——— مختصر کہانی" لہجے میں لوچ پیدا کرتے ہوئے میں نے اسے اس کے فرض کا احساس دلایا یہ ضروری نہیں کہ تمہارا معاشقہ فی الواقع کوئی معاشقہ ہو۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا سسی پنوں ——— اس قسم کے تمام قصوں کی مدد سے تم اپنا تو سیدھا کر سکتی ہو"

مارے لاج کے وہ لاجونتی کے بوٹے میں تبدیل ہونے لگی۔

"کیا غضب کرتی ہو" میں نے اس کے پیر پکڑ لئے" میرے بیوی بچوں پہ رحم کھاؤ۔ کل دیوالی ہے اور گھر میں ٹھن ٹھن گوپال ہے اور تمہاری تلاش میں میں نے رہی سہی پونجی بھی لٹا دی ہے اور میں نے

لاکھوں کے بول ہیں سنگر! تیرے لیے"۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ ستم ڈھانے پر تلی ہوئی تھی بولی "تم میرے ہونٹ لے لو اور مجھے جانے دو"
میں نے کہا "تم اپنے کپڑے اتار دو اور جاؤ ــــــ ایسے کپڑے مجھے کہاں ملیں گے"۔
اب کے شرم سے اس کا نچلا دھڑ زمین میں گڑ گیا اور میرے ہوش اڑ گئے۔
بیوی اور تینوں بچوں کی مدد سے بڑی مشکل سے میں نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور مسکرانے کی درخواست کی
وہ مسکرائی اور میری جان میں جان آئی۔
مسکرا چکی تو ہنسنے لگی پھر ہنستے ہنستے رونے لگی اور اس کے ساتھ ہی پھر میری روح فنا ہونے لگی۔
"اے شہزادی گلفام" میں نے گلوگیر آواز میں کہا "بتا کہ یہ تبدیلی طبیعاتی ہے یا کیمیاوی، ذہنی ہے یا مادی، داخلی ہے یا خارجی۔ تمہارے ایک ساتھ ہنسنے اور رونے کا سبب کہ فی زمانہ بغیر سبب کے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی"۔

"میں ہنسی اس لئے ہوں" اس نے کہنا شروع کیا "کہ مجھے حاصل کرنے کے لئے تم نے اتنی صحرا نوردی کی اور روئی اس لئے ہوں کہ اتنی صحرا نوردی کے باوجود تم مجھے حاصل نہ کر سکو گے ابھی آندھی جھکڑ اور بارش کا ایک طوفان آئیگا اور وہ لنگڑا دیو جس نے صدیوں سے مجھے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے آدم بو آدم بو کرتا آدھمکے گا اور پھر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں محترمہ نہیں" اس بار میں نے اسے خوف کے گڑھے میں گرنے سے روکتے ہوئے کہا "میں بچہ نہیں ہوں"

"نہیں؟" اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔

"یعنی کہ تم میری نانی اماں نہیں ہو کہ مجھے ایسی کہانی سے خوف دلا کر اور تھپک تھپک کر سلا دو گی اور فرض کرو مخزن و منطقی ایڈیٹر صاحب بھی ایسے بچے نہیں ہیں جو تمہارے جھرے میں آجائیں گے انھیں تو ایک تو رنج، جھنجل، چلبلی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس نے کہا میں جانتی ہوں لیکن میری تمام شوخی، چنچلتا اور چلبلاپن اس لنگڑے دیو نے غصب کر ۔۔۔ ہے۔ صدیوں سے میں اس کے سنہری جال میں پھنسی ہوئی ہوں وہ مجھے بیش قیمت ملبوسات اور ۔۔۔ لاکر دیتا ہے اور بڑی بے دردی سے مجھے چومتا چاٹتا ہے اور کسی آدم زاد کو میرے قریب نہیں

پھلنے دیتا۔۔۔"

"کیا یہ پیدائشی لنگڑا ہے"؟ میں نے یوں ہی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" ایک لمحہ کے لئے وہ رکی، جیسے صدیوں پہلے کا کوئی واقعہ یاد کر رہی ہو۔ "پہلے یہ بہت خوب صورت تھا بالکل آدم زاد معلوم ہوتا تھا اور اس لئے جب اس نے مجھے اپنے گھر ڈال لیا تو مجھے کچھ زیادہ برا نہ لگا لیکن رفتہ رفتہ اس کی صورت مکروہ ہوتی گئی، نیت میں فتور آ گیا اور اسے انسانی خون پینے کی لت پڑ گئی......"

"تو پھر تو اس نے اپنی ٹانگ کو بھی عمداً لنگڑا کر لیا ہوگا" میں نے خواہ مخواہ کی تفصیل سے تنگ آ کر کہا۔

نہیں" وہ پھر ایک لمحہ کے لئے رکی، جیسے کوئی اور واقعہ یاد کر رہی ہو" جب مجھے اس سے گھن آنے لگی اور اس نے مجھے چھوڑ چھاڑ کر نیم جان کر دیا اور خون چوسنے میں میری آڑ لینے لگا۔ تو میں اسے مارنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اس سے پہلے کئی خوبرو نوجوان سورما صعوبتیں اٹھا کر مجھے اس کے پنجۂ ظلمات سے نجات دلانے کے لئے آ چکے تھے لیکن مجھے اس کی موت کا راز معلوم نہ تھا۔ آخر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ شمال مشرقی علاقہ میں......"

"بس بس" میں نے چیخ کر کہا "آگے میں سب جانتا ہوں تمہارے سیاست بگھارنے کی ضرورت نہیں"

"سیاست" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں سیاست، سوتی صدی سیاست، مشرق اور مغرب کی سیاست ——— سر شام اٹھ کی ہوش کی دوا کر کے میں نے مغربی سیاست کے لئے نہیں، دس روپوں کے لئے پھانسا تھا لیکن اس نے ہوش کی دوا نہیں کی بلکہ دونوں مٹھیاں تان کر میرے ہوش و حواس اڑا دیئے"

میں سر پیٹنے میں بیوی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"کل دیوالی ہے" اپنے سر میں آخری ڈھول جماتے ہوئے بیوی نے گوہر افشانی کی۔

"پرسوں دیوالہ ہے" دھپوں کا آغاز کرتے ہوئے میں گنگنایا۔

دیویندر ستیارتھی

جوت سے جوت جلے

کروٹ بدل کر وہ کھڑکی کے باہر جھانکنے لگا جہاں پورنماشی کے چاند نے اپنی باہیں پھیلا رکھی تھیں جیسے اس سے پوچھ رہا ہو ——— ہاں جناب اتنا تو بتا دیجئے اگر آپ کے ہاتھوں میں تھوڑا کام آجائے تو کون سی تصویر بنائیں گے؟ ——— آج وہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ کیسا سوال ہے؟ جب تک تصویر بن نہیں جاتی اس بارے میں کچھ بھی کہنا بے کار ہے۔

اسے یہ چاندنی بھی آج کیوں نہیں اچھی لگتی۔ درد کے مارے آج اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا گویا جیسے کوئی اس کے کان کے قریب منہ لگا کر کہہ رہا ہو ——— "تصویر کا موضوع تو پہلے سے ہے!!" "ٹھیک کہا جناب۔ آخر ہمیں بھی تو علم ہو کہ اتنی تصویریں بنانے کے بعد وہ کونسی تصویر ہے، جسے تیار کرنے کی خواہش ابھی تک کلاکار کے دل میں انگڑائیاں لے رہی ہے" قدرے گھبرا کر وہ پھر کروٹ بدلتا ہے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ اب مجھے پورنماشی کے چاند سے کچھ غرض نہیں رہی۔ جیسے پورنماشی کا چاند بھی اس کے منہ پر سوئیاں سی چبھو رہی ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اپنی تصویروں میں پورنماشی کے چاند کو وہ ہرگز نہیں آنے دے گا۔

اس کے دل کے کسی کونے سے، جیسے شہنائی کی کوئی لے ابھر کر کہتی ہے "کہیے جی! میری تصویر بنا دیجئے!"

سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے —— کوئی نہیں، کمرے میں تو کوئی بھی نہیں —— پھر بھی اس کے دل میں متواتر یہی خیال آ رہا ہے کہ یہ سوال ضرور کسی کے ہونٹوں سے ابھر کر اس کے کانوں تک پہنچا ہے۔ بار بار وہی سوال —— آہ کتنا درد ہے اس لے میں۔ ایسے تو شہنائی پوچھ رہی ہے کہتے جی! میری تصویر بناؤ گے؟ —— شہنائی کو یہ سوال کرنے کی کیونکر جرأت ہوئی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے یاد آیا کہ بچپن ہی سے اسے شہنائی کے سروں سے محبت رہی ہے۔ اسی لئے تو آج شہنائی میں یہ جرأت پیدا ہوئی کہ کلاکار کے کانوں کے قریب منہ لگا کر یہ سوال پوچھ سکے۔

شہنائی کے سر —— عنوان تو برا نہیں۔ وہ سوچتا ہے۔ کیونکر نقش کیا جائے ان سروں کو۔ سچ مچ یہ تصویر بہت اعلیٰ ہوگی۔ آج کے دور کی مکمل جھلک شہنائی کے سروں میں دکھائی جا سکتی ہے۔ بس ایک بار تو دیکھنے والے کا دل رو اٹھے۔ یہ کیسا چہرہ ہے جو اس کے سامنے آ رہا ہے۔ ارے یہ تو ایک لڑکی کا چہرہ ہے جسے زبردستی کسی کے ساتھ باندھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ارے کیا۔ یہی مثال مل سکتی تھی آج کے پورے دور کو ظاہر کرنے کے لئے۔ شہنائی بولو —— اب تم چپ کیوں ہو۔ کیا بس تم یہی ہو۔ بس اتنا ہی ہے تمہارا اثر۔ یہی ہے تمہاری ٹیس۔ یہی ہے تمہارے درد کی گہرائی؟ —— اور وہ اسی سوچ میں کھو جاتا ہے۔ اچانک شہنائی کے سروں کا دھیان آتے ہی آج اس لڑکی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ساری دنیا کا درد بھی اس لڑکی کے چہرے میں آ کر سمٹ گیا ہو۔ یہ کیسا درد ہے۔ ایسے خوبصورت چہرے پر۔ یہ الم کی لکیریں کہاں سے آ گئیں اور پھر ادھر سے اپنا دھیان ہٹا کر مریض سوچنے لگتا ہے کہ وہ اس سے کہیں اعلیٰ تصویر بنا چکا ہے۔ اس کی تصویریں کتنی ہی نمائشوں میں رکھی گئیں کئی تصویری مجموعوں میں شامل کی گئیں۔ آئندہ یقیناً میرے برش کو نہیں بھلا سکیں گی اور لوگ سوچا کریں گے، کہ کیسا تھا وہ کلاکار۔ جس نے یہ سب تصویریں بنائیں۔ اس کی بائیں پسلی میں ایک بھیانک درد اٹھتا ہے۔ مریض چاہتا ہے کہ ذرا کروٹ بدل کر درد کو دبانے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ درد تو ایک لہر کی طرح اٹھ رہا ہے جیسے آج ہی اسکی زندگی کو ختم کر کے چھوڑے گا۔ یہ درد؟ آہ! کوئی ہے جو اس درد کو پل کی پل روک دے۔ کوئی نہیں۔ یہاں

کوئی نہیں۔ اندر آنے نہیں دیا جائے گا۔ باہر کے آدمیوں کو۔ کیونکہ ڈاکٹر کا یہی حکم ہے، اور اندر کے آدمیوں کو یہ فکر نہیں، کہ مریض کے پاس رہیں۔ پھر اس ہر گھڑی کی پرانی بیماری سے اندر آنے والے تنگ تو آ ہی جاتے ہیں۔ نہ جانے یہ بیماری کب ختم ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب تو یہ جان کے ساتھ ہی ختم ہوگی۔

اب تو سونا چاہیئے۔ مریض کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاند کی طرف سے منہ پھیر لینا ہی ٹھیک رہے گا۔ چاند کا تو کام ہے بے کار چلے چلے جانا جیسے کلاکار ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری اور پھر چوتھی تصویر بناتا چلا جاتا ہے —— آخر یہ سب کچھ کس لئے؟ سرجن کا یہ لالچ کبھی ختم بھی ہوگا۔ کیا (سرجن) کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے انسان کو کبھی چین بھی مل سکے گا چین تو دور کی چیز ہے۔ کاش تھوڑی دیر کے لئے نیند ہی آجاتی۔ یہ چاند کی کرنیں تو آج سوئیوں کی طرح چبھ رہی ہیں۔ کہتے ہیں جب موت نزدیک آجاتی ہے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ چاند کو مخاطب کرتے ہوئے مریض کہنا چاہتا ہے "چاند میاں! تجھے بھی آج ہی یہ بات سوجھی، کہ مریض کو ستایا جائے۔ اتنا ہی سوچ لیا ہوتا کہ میں نے ان گنت تصویروں میں تیری شکل اتاری ہے تجھے چین اور سکھ کا مجسمہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور آج تو مجھ کو ہی ستا رہا ہے"

مریض چاہتا ہے۔ کہ کسی کے پیروں کی آہٹ ہی سنائی دے جائے۔ اچک کر وہ چھوٹی میز کی طرف دیکھتا ہے جس پر پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ، چینی کی پلیٹ سے ڈھکا رکھا ہے۔ اونہہ اتنا بڑا جگ، اتنا پانی جیسے کوئی بیمار رات کی رات میں اتنا پانی پی ہی تو جائے گا۔

اب کوئی نہیں آئے گا۔ وہ دیکھتا ہے کہ شیشے کے جگ کے قریب ہی دوائی کی شیشی بھی رکھی ہے۔ بڑی ہمت سے اٹھ کر وہ شیشی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اور نزدیک پڑی ہوئی پیالی میں شیشی سے دوا انڈیل کر حلق میں اتار لیتا ہے، چلو چھٹی ہوئی —— اب تو سونے کے سوائے کوئی کام نہیں رہ گیا۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی دروازے پر دستک نہیں دے گا۔ فوراً ہی اسے خیال آتا ہے کہ کوئی بھی نئی تصویر بنانے سے پہلے اسے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اس کے دماغ پر دستک دے رہا ہو —— اب تو رنگوں کو چھوئے ہوئے بھی بہت دن ہوگئے، یہ بھی سوچتا ہوگا، کہ بس ختم ہوگیا کلاکار کا فن۔ کسی نمائش میں اب اس کی نئی تصویریں دیکھنے کو نہیں ملیں گی۔ جیسے اس کے دماغ پر کسی نے مکا دے مارا ہو۔ اے بوڑھے کلاکار! جاؤ۔ دنیا سے رخصت

ہوجاؤ۔ جیسے کوئی اسے ہی مخاطب کر رہا ہو۔ بڑی دیر تک چلا چکے۔ اپنی انا کی تسلی کر چکے، اب جاؤ۔ اب تو نیا زمانہ آگیا ہے۔ نئے نئے کلاکار میدان میں آچکے ہیں۔ اب نمائشوں میں لوگ نئے اسلوب کی تصویریں ہی زیادہ پسند کرتے ہیں . . . . آج تم اپنی تصویر وہاں بھیج بھی دو۔ تو چاہے عقیدت کے مارے اس کی تعریف کردیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ارے! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ میرے کان میں یہ تیر کون چلا رہا ہے۔ تو کیا میرا یہ طویل اور بھرپور آرٹ واقعی بے کار گیا؟ کیا واقعی آج کسی کو میری ضرورت نہیں رہی . . . . مریض تھوڑی دیر کے لئے مطمئن ہوکر پھر سے کچھ سننا چاہتا ہے۔ کہو کہو آرام سے تم اپنی بات کہو سچی تنقید تو بہت مفید رہتی ہے۔ ہائیں کیا کہا؟ ذرا صاف صاف کہو نا! تمہیں پوری آزادی ہے۔ لیکن کوئی بھی تو آواز سنائی نہیں دیتی۔ چاند کی کرنیں اب قدرے تسکین دینے لگی ہیں۔ پورنما کا چاند آخر مہربان ہی نکلا۔ تیر انداز بھی دماغ کے کسی کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ شاید اسے بھی کسی طرح خیال آگیا ہو کہ ناحق اس بوڑھے کلاکار پر تیر چھوڑنے سے فائدہ! بس یہی سوچتے سوچتے مریض نیند کی لہروں پر بہہ گیا۔۔

اگلی صبح مریض کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کافی اونچا اٹھ آیا تھا۔ سچ مچ آج اس کی آنکھ کھلی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے بری طرح جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ لیکن کمرے میں تو وہ تنہا ہی پلنگ پر پڑا تھا۔ جیسے اس کے دماغ میں کوئی بار بار کہہ رہا ہو — اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔ یوں پڑے پڑے ایڑیاں رگڑنے سے کیا فائدہ؟ مرنے سے پہلے تمہیں آخری تصویر بنانے کے لئے تیار ہوجانا چاہیئے۔

دیا سلائی جلا کر اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور سوچا۔ ہاں مجھے اپنی آخری تصویر بنانے کے لئے تیار ہوجانا چاہیئے۔ کہاں پڑے ہیں میرے رنگ۔ کہاں ہے میرا برش۔ پھر مریض خود ہی ان سوالوں پر ہنس دیتا ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح کلاکار بھی پیدا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ پھر بہت جلد اسے بھلا دیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مرنے سے پہلے وہ یہ سوچتا ہے کہ آنے والی نسلیں اسے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ اس لالچ میں کیا رکھا ہے۔ سورج کی کرنو! اسی طرح چمکتی رہو۔ بس یہی کافی ہے۔ ہماری دیکھ بھال میں دم نکل جائے۔ اوہ! اب ہاتھوں میں اتنا دم کہاں کہ پھر سے برش اٹھا کر تصویر بنانے کی بات سوچوں۔

سگریٹ کا کش لگانا بھی تو آج آسان نہیں رہا۔ مریض کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں گول گول ہوکر چکر لگاتا ہے۔ جیسے یہ دھواں بھی کہہ رہا ہو۔ اب سمجھ لو کہ یہ آخری سگریٹ ہے۔ کیونکہ اب ایک مزے کا کش لگانا ہمارے بس کا روگ نہیں رہا

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ مریض نے خالی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا ہونٹوں سے ایک لفظ نکلا . . . کون ؟"

"۔۔۔ میں ریکھا" کہتے ہوئے ایک نوجوان لڑکی اندر آئی۔

"آخر تمہیں میرا خیال رہتا ہے نا؟ ریکھا!" مریض نے پلٹ کر کہا "میں جانتا ہوں کہ تم میری خدمت کرتے کرتے تنگ آگئی ہو اس لئے میں کہتا ہوں . . . "

"کیا کہتے ہو بڑے دادا!" ریکھا نے پاس آکر مریض کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ اب میں اس دنیا سے رخصت لے لوں"

ریکھا کے چہرے پر پریشانی کا رنگ گہرا ہوگیا۔ بولی "ایسا بول مت بولو بڑے دادا! بھگوان ہم سب لوگوں کی عمروں میں سے ایک گھنٹہ کاٹ کر آپ کی عمر ضرور لمبی کرسکتے ہیں اور وہ اس لئے کہ آپ اپنی آخری تصویر بنا سکیں۔ کیا میں جھوٹ کہتی ہوں ؟"

مریض ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ تمہارا وہم ہے ریکھا! اب وقت نہیں رہا کہ میں رنگوں سے کھیل سکوں"

ریکھا اٹھ کر کمرے سے دوائی کی شیشی اٹھا لاتی ہے اور پانی میں تھوڑی سی انڈیل کر مریض کے پاس آتے ہوئے کہتی ہے "اٹھو بڑے دادا! دوائی پی لو، میرا دل کہتا ہے آپ اچھے ہوجائیں گے"

مریض اٹھنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ سوچ کر کہ ریکھا دوائی پلائے بغیر نہیں ملنے گی۔ تو سے ایک کردوائی کی پیالی سے حلق میں دوائی انڈیل لیتا اور پھر سے پلنگ پر لیٹ جاتا ہے۔

"کیا کھاؤ گے بڑے دادا؟"

"کچھ بھی نہیں ریکھا!"

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ سلیقے کا یہی تقاضا ہے ریکھا!"

"مجھے بھی کچھ نہ کچھ کھانا ہی ہوگا بڑے دادا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ ایک بار تو آپ کو رنگوں کو چھونا ہی پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے ریکھا نے مریض کے سرہانے کی طرف پڑے ہوئے BAST کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا غرور جھلک رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ یہاں ایک حقیقت ہے کہ کلاکار کو اس کے دیش باسیوں نے پوری طرح نہیں پہچانا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کی شخصیت کی آنے والے دور کے آرٹ پر اور بھی گہری ہوتی جائے گی۔

"کیا سوچ رہی ہو ریکھا!" مریض نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تھوڑا سا دودھ لے آؤ!"

ریکھا کا چہرہ کھل اٹھا۔ جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ مریض بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ رسوئی کے اندر گئی اور دودھ لے کر آ گئی۔ بولی "اٹھو۔ بڑے دادا! آج تمہاری بیماری کا آخری دن ہے۔"

مریض نے بہ مشکل کروٹ بدل کر پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں برابر پھیل رہی تھیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ہو سکتا ہے، یہ دودھ کی آخری پیالی ہو جسے میں پی رہا ہوں۔ اس کے تصور میں وہ سبھی تصویریں گھوم گئیں جنھیں اس نے وقتاً فوقتاً اپنے برش کے ذریعے منقش کیا تھا۔ اور جیسے وہ تصویریں کہہ رہی ہوں۔ "ہمارا سلام قبول کرو، ہم تمہیں کبھی نہیں بھولیں گی۔"

دودھ پی کر مریض پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔

ریکھا اٹھ کر الماری سے وہ تصویر نکال لائی جسے بڑے دادا نے بیمار ہونے سے پہلے شروع کیا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیوار گیر پر رکھ کر گھورتی رہی۔ اسے یاد تھا کہ کس طرح اسے بڑے دادا نے گتے پر کاغذ چڑھایا تھا اور پھر کیا سے کہا تھا۔ "ریکھا! اگر تم کہو، تو تمہیں اپنی اس تصویر میں لافانی کر دوں۔" سچ مچ ریکھا نے اسے بڑے دادا کا مذاق ہی سمجھا تھا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی، جب بڑے دادا نے اسے سامنے بٹھا کر پنسل سے اس کے نین نقش تیار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ پنسل سے کھینچی ہوئی اس تصویر میں ریکھا سے ملتی جلتی ایک لڑکی کو کھنڈر میں کھڑے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ وہ کمر سے نیچے تک لٹکتے ہوئے سر کے لمبے لمبے بال، وہی لمبوترا سا چہرہ، آنکھیں

میں ایک سوال سا۔ جیسے ریکھا پورے سماج پر زہر خند بنی ہوئی ہو ـــــ یہ کھنڈر کیا کہہ رہے ہیں؟ اسے یاد تھا۔ کہ کس طرح دادا نے قسم قسم کے رنگوں سے اس تصویر میں جان ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے اس تصویر پر مہینوں لگا دیئے۔ ہر شام تصویر کو پانی سے صاف کر دیتے۔ دوسرے دن پھر برش کے ذریعے ان دھندلی لکیروں کو ابھارنے کا جتن کیا جاتا۔ بڑے دادا نے کہا تھا کہ ابھی اس تصویر میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں کو یہ تصویر موجودہ شکل میں بھی بُری نہیں لگ رہی تھی۔

بڑے دادا کی نظر اچانک دیوار گیر پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ گئی۔ انھوں نے اٹھنا چاہا۔ بولے "ریکھا! رنگ اٹھا لاؤ، دیکھیں، شاید آج یہ تصویر مکمل ہو سکے!"

ریکھا رنگ اور برش اٹھا لائی اور بولی "بڑے دادا! میں نے کہا تھا نا کہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔ کیوں کیسی طبیعت ہے بڑے دادا!"

بڑے دادا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بولے "معلوم ہوتا ہے، بھگوان کی یہی مرضی ہے کہ پہلے میں اپنی آخری تصویر مکمل کر لوں۔ اور اس کے بعد ہی موت میرے دروازے پر دستک دے سکے گی!"

ریکھا سمجھ گئی۔ فوراً لپک کر دیوار گیر سے تصویر اٹھا لائی اور بڑے دادا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی "یہ رہے رنگ، یہ رہا برش اور یہ رہی تصویر۔"

بڑے دادا پلنگ پر بیٹھ گئے، جیسے ان کا درد، ڈربے میں گھسے ہوئے کبوتر کی طرح اندر سمٹ گیا ہو۔

رنگ اٹھا اٹھا کر تصویر میں لگائے جا رہے تھے۔ ریکھا نے یہ منظر دیکھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر یہ تصویر مکمل ہو گئی تو دنیا اسے بڑے دادا کا ماسٹر پیس سمجھے گی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بڑے دادا کے برش میں تو جادو ہے جادو۔ اس لئے انھوں نے اس کی کشش میں اور بھی خوبصورتی سمو دی ہے۔ نہایت عظمت کے ساتھ۔ آنکھوں میں جیسے اس کے لہو کی بوند چنگاریاں دی ہے۔ شاید بڑے دادا نے اسے کسی کی منگیتر کے روپ میں منقش کیا ہے۔ یہ کھنڈر شاید اپنے منہ سے جنگ کے دنوں کی بربریت کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ کھنڈروں کے ایک

ایک گوشے میں کھڑی ہوئی دوشیزہ شاید اپنے منگیتر کی راہ دیکھ رہی ہے ۔ اس کا منگیتر جنگ کے میدان میں مارا جا چکا ہے . . . . . اس نے پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھا ۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ شاید بڑے دادا کی یہ تصویر جنگ سے پیدا ہونے والی غارتگری کی منظر ہو اور پھر اسے دل ہی دل میں جنگ چھیڑنے والوں پر ہنسی آ گئی۔ پہلی بڑی جنگ ، دوسری بڑی جنگ ، اور اب یہ تیسری بڑی جنگ کا طوفان اٹھ رہا ہے بڑے زوروں سے ۔

بڑے دادا کے ہاتھوں میں نہ جانے کہاں سے طاقت آ گئی تھی جیسے موت نے انھیں تھوڑی سی مہلت دینا مناسب سمجھی ہو۔ ریکھا ۔ نرے پیار سے اس تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں دادا کا برش برابر رنگ بھرے جا رہا تھا ۔

اچانک اس کا دل اس خیال سے کانپ اٹھا کہ بڑے دادا ہمیشہ کی طرح آج بھی اس تصویر کو پانی سے نہ دھو ڈالیں اسے بڑے دادا کے اس فعل پر دل ہی دل میں بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی ۔ یہ تو حماقت ہے کہ اتنی محنت سے بنائی ہوئی تصویر کو پانی سے دھو ڈالا جائے ۔ یہ سوچتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ میں کوئی کیل ٹھونک رہا ہو۔ بڑے دادا کے ہاتھ سے تصویر لے کر ریکھا نے کرسی پر رکھ دیا ۔ رنگ اور برش اٹھا کر ایک اسٹول پر رکھ دیئے اور بولی ـــ
ـــ تھوڑا سا آرام کر لو بڑے دادا ! آج یہ تصویر پوری ہو گئی !"

"نہیں ریکھا ! ابھی تو بہت سا کام باقی ہے ۔ آج ایک "واش" اور دیا جائے اور کل اسے مکمل کر دیا جائے ۔"

"نہیں بڑے دادا !" ریکھا نے چمک کر کہا ۔ "آج میں "واش" نہ دینے دوں گی ۔ رنگ کا کام آپ خوشی سے کیجئے لیکن وہ بھی قدرے آرام کرنے کے بعد !"

بڑے دادا پھر پلنگ پر لیٹ گئے اور جلد ہی ان کی آنکھ لگ گئی ۔

دادا کو سوتے دیکھ کر ریکھا بھی کمرے سے باہر چلی گئی ۔

اب مریض کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج ڈھل چکا تھا ۔ اس نے تصویر کی طرف آنکھیں گھمائیں ۔ لیکن تصویر وہاں نہیں تھی ۔ اس نے سوچا ریکھا تصویر لے گئی ہوگی ۔ پھر اس نے اسٹول پر رکھے ہوئے رنگ اور برش پر نظر دوڑائی لیکن یہ چیزیں بھی وہاں نہیں تھیں ۔ انھیں بھی ریکھا

اٹھا دیے گئی ہوگی۔ یہ سوچ کر بڑے دادا کو تھوڑا تھوڑا غصہ آنے لگا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ ریکھا میں عقل کی
کمی ہے۔

تصویر کا خیال اس کے دماغ میں طوفان کی طرح اٹھنے لگا۔ کاش! اس کے ہاتھ میں برش ہوتا
تو شاید یہ تصویر آج ہی مکمل ہو گئی ہوتی۔ سلیٹ جیسے رنگ بھرتا ہوا اس کا برش آج اپنی منزل کو چھو لیتا۔ یہ
بات چڑیل ریکھا کو کون سمجھائے؟ ریکھا اور تھرڈ کلاس لڑکی ہے۔ ایک دم پگلی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ریکھا نے
بڑے دادا کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ بڑے دادا کی تمام کوششیں
[illegible] ایک [illegible] ہے تب اس کی نظروں میں آرٹسٹ کی کوئی قیمت ہے۔ آرٹ کی گہرائیوں میں تو وہ کیا
پہنچ پائے گی، [illegible] اسے [illegible] اور شاید انسانی کشش ہی میں اسے ایک عظیم سنسار [illegible] دکھائی دیتا ہے۔

وہ [illegible] اپنی [illegible] حالت کا خیال آنے لگتا ہے۔ میرے لڑکے کو میری کوئی فکر نہیں ہے
نہ جانے کل سے کہاں چلا گیا ہے؟ اسے کچھ خیال ہی نہیں ہے میرا۔ میں یہاں پلنگ پر پڑے
پڑے [illegible] جب بھی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ ایسے میں لے دے کر ایک ریکھا ہی ہے
جو میری خدمت کر رہی ہے۔

اسے اپنی بیوی کا خیال آیا جو پچھلے سال چل بسی تھی۔ [illegible] اتنی ہمت نہیں کہ [illegible]
لڑکا پچھلے تین مہینوں سے بیکار ہے۔ اس نے بھی اچھی اچھی تصویریں بیچ ڈالیں۔ جو بچ گئی ہیں انھیں
بھی اٹھا لے جائیگا۔ یہ سوچ کر اسے قدرے تسکین ہوئی، کہ ریکھا وہ تصویر اٹھا کر لے گئی۔ شاید کمبخت
لڑکا اگر دیکھ لیتا تو آج ہی لے جا کر اسے بازار میں بیچ دیتا۔

اس نے اچانک ریکھا کو پکارا لیکن اس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔

اسے اپنے لڑکے پر غصہ آنے لگا۔ بدذات کہیں کا! اتنی بھی پروا نہیں، کہ گھر میں بیمار بوڑھا
باپ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا ہے۔ کل سے ڈاکٹر بھی تو نہیں آیا۔ سب پیسے کا کھیل ہے۔ شاید ڈاکٹر
کو فیس ملنے کی امید نہیں رہی ہوگی اس لئے کنی کتراتا ہے۔

[illegible] کا جی باہر کے کسی آدمی سے ملنے کے لئے بے طرح للچا اٹھا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ ڈاکٹر
نے باہر کے آدمیوں سے ملنے کو منع کر رکھا ہے۔

[illegible] بہت ہی [illegible] کہ اب کوئی نہیں آتا۔ [illegible] پر لیٹے لیٹے ہی جان نکل جائیگی۔

اس نے دوبارہ چیخ کر ریکھا کو آواز دی۔ لیکن اب کے بھی اس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔

ایک ایک کر کے اپنی عمر کے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اسے سب سے بڑا صدمہ اس بات کا تھا کہ اس کا لڑکا آرٹ کی دنیا سے کوسوں دور تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ اس کا لڑکا برش پکڑ کر رنگوں کی مشق کرنے لگے لیکن اس نے دس دس کر ہی مشق سیکھی کہ باپ کی تصویریں بنائے وہ انہیں چوری چھپے اٹھا کر بازار میں اونے پونے بیچ آئے۔ کوٹھوں کے بھاؤ پر اشرفیاں لٹاتے ہوئے اسے شرم نہیں آتی۔ اور آج وہ گھر سے غائب ہے جبکہ بیمار باپ موت کی راہ دیکھ رہا ہے۔
اچانک اسے محسوس ہوا کہ پلنگ کے نیچے کوئی گھسا ہوا ہے۔ کئی طرح کی آوازیں نکال نکال کر اس نے کتے کو بھگانے کی کوشش کی لیکن کتا پلنگ کے نیچے سے نہ نکلا۔
اس کے جسم میں کمزوری کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ کوشش کرنے پر وہ پلنگ کے نیچے نہ جھانک سکا۔

اس نے ریکھا کو آواز دی۔ ریکھا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

بڑی ہمت سے وہ پلنگ پر اٹھ بیٹھا اور پلنگ کے نیچے جھانکتے ہی اس نے جو منظر دیکھا۔ اس سے وہ دنگ رہ گیا۔

"باہر نکل، بندو کے بچے!" — وہ چلایا

پلنگ کے نیچے بندو کا بچہ نہیں تھا۔ خود بندو تھا۔ جو ہمیشہ اسے تصویر بناتے دیکھ کر اس کے پاس آکر بیٹھا کرتا تھا۔ آج وہ خود تصویر بنا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب کمرے میں گھس آیا تھا اور کرسی سے اٹھا کر تصویر پلنگ کے نیچے لے گیا تھا۔ سٹول سے رنگ اور برش اٹھاتے وقت ذرا بھی آہٹ نہیں ہونے دی تھی۔

پلنگ سے اتر کر بڑے دادا نے بندو کو نکالا اور تصویر کو ہاتھوں میں لے کر کھوئی نظروں سے اسے گھورنے لگے۔ جگہ جگہ سے کئی رنگ بری طرح پوت دئے گئے تھے۔ ریکھا کی شکل پہچانی تک نہیں جاتی تھی۔ بندو چپ چاپ کھڑا تھا اور اسے سچ مچ ایک بہت بھاری چپت کا انتظار تھا۔

ایک لمحے کے لئے جیسے بڑے دادا کے دل سے برسوں کا بوجھ اتر گیا۔ کیا ہوا۔ گر تیرا اپنا بیٹا مجھ سے آرٹ کی ریت لے کر کلاکار نہیں بن سکا۔ کیا ہوا، اگر میرا اور تیرا رچا ہوا فن ہماری خاندانی روایت نہیں بن سکا۔۔۔۔

بڑے دادا نے اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "وارے بندو بیٹا! جوت سے جوت جلے۔۔۔۔۔۔"

(سالنامہ ماحول ۱۹۵۱ء)

* * *

رضیہ سجاد ظہیر
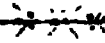
نیلی گٹھری

وہ ایک نیلے رنگ کی گٹھری تھی۔ کپڑا تو معمولی تھا۔ شاید پاپلین کو نیلا رنگوا دیا ہوگا پر سلی تھی بڑی نفاست سے۔ چاروں طرف سفید مارکین کی پٹی، سفید ہی مارکین کے بند، ایک کونے پر چھوٹے چھوٹے نقطوں کو ملا کر سفید ریشم سے ایک دائرہ کاڑھا ہوا تھا اور اس کے بیچ میں سفید ہی ریشم سے کڑھا تھا —

"نمبر ۲۳" —

آنند نے گٹھری سے کپڑے نکالنے شروع کیے۔ چھ شلواریں۔ چار لٹھے کی دو ساٹن کی۔ پانچ قمیصیں طرح طرح کے کاٹ کی مختلف رنگوں کی پھولدار، بندکی دار، دھاری دار ——— ایک قمیص سفید وائل کی بنی تھی جس کے گریبان کے چاروں طرف گلابی ریشم سے ایک نازک سی بیل کڑھی تھی۔ ایک دوپٹہ ململ کا، دو جالی کے، ایک نینوں کا اور ایسے ہی کچھ اور کپڑے۔ چادر، غلاف وغیرہ۔ ہر ہفتہ وہ گٹھری آتی۔ کپڑے کبھی ایک دو زیادہ ہوتے کبھی کم۔ اب اسے ہر ہفتہ اس گٹھری کا انتظار رہنے لگا تھا۔ دیکھیں اب کے وہ انگوری رنگ کی قمیص آتی ہے یا نہیں۔ گلابی جالی کا سیاہ ریشم سے کڑھا ہوا دوپٹہ کیا اب تک اس نے نہیں اوڑھا؟ معلوم ہوتا ہے وہ رومال کھو گیا جس کے کونے پر گلاب کی کلیاں کڑھی تھیں ——— اس ہفتے بہت کم کپڑے آئے ——— کہیں بیمار تو نہیں ——— ضرور ہے جبھی تو رومالوں سے یوکلپٹس کی بو آ رہی ہے۔ بے چاری! بھلا کالج میں کون اس کی دیکھ بھال کرتا ہوگا!

آنند کا دل چاہا کہ اسے دیکھنے چلا جائے ۔ پھر اس نے سوچا گر لیے گا کیا ؟ پھر اسے ہیڈ ماسٹر یاد آگئے جو نئی نئی آنکھیں۔ یاد آئیں جن میں ہر دم شک اور شبہ کے سائے منڈلایا کرتے تھے اور ویسے بھی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آپ کسی کو جانیں نہ پہچانیں اور چلے جا رہے ہیں مزاج پوچھنے صرف اس بنا پر کہ اس کے سینے والوں سے پولیس کی پٹائی پڑ رہی تھی اور آپ نے اندازہ لگا لیا کہ اس کو ضرور سخت نزلہ ہوگا ۔ آنند کو اپنی حماقت پر خود ہی ہنسی آنے لگی ۔

اگلے ہفتے آنند نے جو گٹھری اٹھائی تو کاغذ کا ایک پرچہ اس میں سے گر پڑا ۔ لکھا تھا "منیجر صاحب کلین آل لانڈری ——— ان کپڑوں میں آپ کو بسنتی رنگ کی ایک ریشمی قمیص ملے گی اس پر کافی گر گئی ہے مہربانی کر کے ایسا کیجئے گا کہ دھبہ بالکل چھوٹ جائے "۔

آنند نے قمیص نکالی ۔ بالکل نئی تھی اور بہت ہی حسین تراش کی ۔ اس نے اس پر سرخ پنسل سے "ارجنٹ" لکھا اور میٹ کے حوالے کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کافی کیسے گری ہوگی ؟ شاید وہ کافی ہاؤس گئی ہوگی اس قمیص کو پہن کر ۔ آنند نے اس کی شکل تو کبھی نہیں تھی ۔ پھر بھی وہ سوچنے لگا کہ اس کا رنگ ضرور ملیح ہوگا جبھی تو بسنتی رنگ اس پر اچھا لگتا تھا ۔ قمیص کی لمبائی سے معلوم ہوتا تھا کہ قد درمیانہ ہے ورنہ موٹی تو ہرگز تھی ہی نہیں ورنہ اس کاٹ کی قمیص اسے کیسے آتی ! تو پھر اس قمیص کو پہن کر وہ کیسی لگی ہوگی ۔ کافی ہاؤس میں وہ اپنے ساتھی کے لئے کافی بنانے لگی ہوگی کہ اس کی انگلیاں کانپی ہوں گی اور کافی چھلک کر قمیص پر آ رہی ہوگی ۔ پر اس کی انگلیاں کیوں کانپی ہوں گی ۔ کیا اسے اپنے ساتھی سے محبت رہی ہوگی ۔ کیا اس لڑکی کی زندگی میں محبت آ رہی تھی ؟ آنند کا اشتیاق اور بڑھ گیا دیکھیں اب کیا ہوتا ہے ۔ پر بہت دن گذر گئے اور کچھ نہ ہوا ۔ گلابی جاڑے ہو گئے اور اس کے کپڑوں میں ایک ہلکا سا کریم کوٹ بھی آیا ۔ آنند نے کوٹ کو جھاڑا جیبیں ٹٹولیں ۔ ایک جیب سے کاجو کے چند ٹکڑے ، ایک ہیئر پن اور ایک مقامی اخبار کا تراشا نکلا ۔ جو طالب علموں پر لاٹھی چارج کے متعلق تھا ۔ دوسری جیب سے ایک بہت ہی چھوٹا سا پرچہ نکلا ۔ بالکل مڑا تڑا ۔ اور اس پر مردانے خط میں بہت ہی جلدی میں لکھا ہوا تھا ۔ "ہاں ٹھیک ہے "۔

آنند ہنس پڑا ——— حالانکہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا ٹھیک ہے ۔

تو کیا یہ اسی کا پرچہ تھا جس کے ساتھ وہ کافی ہاؤس گئی تھی کیا ان دونوں نے کہیں ملاقات

کا پروگرام بنایا تھا؟ کیسی ملاقات ہوگی یہ! کسی باغ میں، کسی ریسٹوران میں یا . . . . اور اس کی نگاہ ایک دم سے اخبار کے تراشے پر پڑی۔ اس کے دل میں خلش سی ہونے لگی۔ کیا یہ لڑکی سیاسی کاموں میں دلچسپی رکھتی تھی؟ تو پھر شاید کسی میٹنگ کا پروگرام طے ہوا ہوگا۔ طالب علم اکٹھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے دلوں میں اپنے ساتھیوں پر لاٹھی چارج کے خلاف غم و غصہ رہا ہوگا۔ وہ زور زور سے بحثے ہوں گے اور بڑی بحث کے بعد ایک ریزولیوشن پاس ہوا ہوگا۔ پھر شاید کوئی جلوس نکلا ہو —— اس کی کہنی سے یکایک کوئی چیز ٹکرائی۔ بیبٹ لسبنی قمیص نے کھڑا تھا۔ صاف ہو کر آگئی تھی۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور "گرلز نمبر ۲۴" لکھ کر بنڈلوں کے کڈے میں رکھ دیا۔

اگلے ہفتے گٹھری میں دو ساریاں بھی آئیں۔ ایک ہلکے نیلے وائل کی تھی۔ ورا ایسا لگتا تھا کہ صرف ایک ہی مرتبہ پہنی گئی ہے۔ کیونکہ تقریباً بالکل صاف تھی اور کر کی پلیٹوں کے نشان بھی اس میں بدستور موجود تھے۔ اس کے ایک سرے پہ جو کندھے پر رہا ہوگا پن سے ہوئے سرخ کاغذ کا ایک گول بیج لٹکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جلدی میں ساری اتارتے وقت وہ ساتھ ہی اٹکا چلا آیا۔ آنند نے بیج کو نکال لیا اور غور سے دیکھا —— اس کے اندر دو دائرے اور کھنچے ہوئے اور ان کے درمیان والی جگہ میں برش اور پانی کے رنگوں سے موٹا موٹا لکھا تھا۔ "امن کانفرنس" —— بیچ کے چھوٹے دائرے میں لکھا تھا "والنٹیر"۔ آنند سن سے رہ گیا۔ تو واقعی یہ لڑکی سیاسی کارکن ہی تھی —— ارے نہیں۔ وہ کیا سیاسی کارکن ہو سکتی تھی، کافی ہاؤس جانے والی، رنگین لباس پہننے والی، محبت کرنے والی، پر امن کی تو سب کو ضرورت ہے۔ کافی ہاؤس کو بھی، رنگین لباسوں کو بھی۔ محبت کو بھی وہ خود تو سیاسی کارکن نہیں تھا۔ پر امن کی تو اسے بھی ضرورت تھی۔ کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکی استریاں اسی طرح دہکتی رہیں، اس کی لانڈری کی چمنی سے دھواں روز اسی طرح نکلتا رہے امن کی تو اسے بھی ضرورت تھی، اپنے لئے، اپنی لانڈری کے لئے اس نیلی گٹھری کے لئے جس کا اسے ہر ہفتے انتظار رہتا تھا۔ پھر اسے یکایک خیال آیا کہ ایسی ساریاں تو اس نے حال ہی میں بہت سی دیکھی تھیں۔ ٹھیک ہے۔ پرسوں جب وہ کوئلے کا پرمٹ ٹھیک کروانے کے لئے شہر سے گذرا تھا تو ایسی بہت سی ساریاں اسے ایک پنڈال کے آس پاس دکھائی دی تھیں، —— تو وہی تھی امن کانفرنس! کاش وہ اندر چلا جاتا۔ ٹکٹ تو تھا نہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پہ ایک عورت

کی آواز برابر چلائے جا رہی تھی۔" ہمارے گھروں کو خطرہ ہے۔ ہمارے بچوں کو خطرہ ہے۔ ہر شخص اس کانفرنس میں شریک ہو۔ ہر انسان اس اپیل پر دستخط کرے۔ سب مل کر امن کے لئے لڑو۔ ہم تیسری جنگ نہیں ہونے دیں گے!" شاید وہ وہی تھی۔ شاید اسی کی آواز تھی، پر وہ چلا بھی جاتا تو اس ازدحام میں اسے پہچانتا کیسے۔ بیج پر نمبر ۱۲ تو لکھا نہیں تھا۔ اس کے بیج پہ نام کہاں! نمبر کہاں! وہ تو ہر طالب علم کے لئے ہے۔ ہر دستکار کے لئے ہے۔ ہر فن کار کے لئے ہے۔ ہر انسان کے لئے ہے۔ سامنے میز پر ساری ڈھیر کی ہوئی رکھی تھی۔ آنند نے وہ بیج اس پر رکھ دیا اور ذرا دور ہٹ کر اسے غور سے دیکھا۔ کیسا اچھا لگتا تھا وہ جیسے صبح کے شفاف نیلے آسمان پر ابھرتا ہوا سرخ سورج!

اگلے ہفتے گٹھری نہیں آئی۔ آنند نے مہیش سے کئی بار پوچھا۔ پر مہیش کو کیا معلوم کہ کیوں نہیں آئی۔ اس کی بلا سے نہیں آئی تو۔ تیسرے ہفتے آنند سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے کالج جا کر معلوم کرنے کی ٹھان ہی لی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سائیکل باہر نکال ہی رہا تھا کہ ایک اور سائیکل سامنے سے آئی۔ دونوں کے پہیے رک گئے اور کوئی چیز گری۔ آنند حیران رہ گیا۔ نیلی گٹھری زمین پر پڑی تھی ——— سائیکل والے نے جلدی سے اسے اٹھایا۔ لانڈری میں پھینکا اور آناً فاناً ہوا ہو گیا۔ صرف اتنا دکھائی دے سکا کہ وہ نوجی کپڑے پہنے تھا۔ کون تھا یہ! ——— اونہہ ہوگا کوئی ——— ذرا تمیز نہیں اجڈ کہیں کا۔ آنند نے استری والی میز پر گٹھری رکھ دی اور جلدی جلدی کھولی۔ وہی کپڑے تھے جانے پہچانے کپڑے۔ بہت سے ایسا لگا جیسے کوئی بچھڑا دوست مل گیا ہو۔ کپڑوں کے بیچوں بیچ ایک کاغذ کا بنڈل تھا اور اس پر لکھا تھا" صرف استری کیلئے"۔ اس نے بنڈل کھولا ——— بھک سے خوشبو کا جھونکا آیا اور لال ساٹن کی شلوار کا ایک پائنچہ سرسنے پھسل کر میز کے کنارے کے نیچے جھولنے لگا جیسے کسی دلہن نے اٹھلا کر اپنا منہ دوسری طرف کر لیا ہو۔ اوہ ——— یہ بات تھی! تو یہ ہو رہا تھا دو ہفتے سے! شلوار کے نیچے لال ہی ریشم کی قمیص تھی۔ اس پر ننھی ننھی سنہری بندکیاں، لال جالی کا دوپٹہ جس کے کنارے پر پتلا سچا گوٹا سنگا اور آنچلوں میں کرن جھلملا رہی تھی۔ آنند نے بڑی احتیاط سے سب کپڑوں کو لپیٹا اور الماری میں رکھ دیا۔

اگلے ہفتے سوموار کو جب لانڈری کھلی تو آنند کو پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ اس نے لانڈری میں قدم رکھا تو پانی کے سائیں سائیں بجنے کی آواز فضا میں دوائیوں کی پھیلی ہوئی بو سے وہ سمجھ گیا کہ سیٹھ آگیا ہے۔ اس نے رسیدوں کا رجسٹر اٹھایا اور الٹنے پلٹنے لگا۔ ارے یہ رسید کیسی۔ یہ تو اس نے نہیں کاٹی تھی۔ کہاں سے آئی یہ؟

"سیتل —— یہ رسید کس نے کاٹی؟" اس نے سیٹھ سے پوچھا۔

"صاحب میں نے کاٹی ہے۔ ارجنٹ آرڈر تھا۔ صبح آئے تھے یہ کپڑے۔"

"پر ہمارے ہاں تو ملٹری کا ٹھیکہ نہیں ہے۔ یہ فوجی کپڑے کس گاہک کے ہیں؟"

اتنے میں سیٹھ نے نیلی گٹھری لا کے سامنے رکھ دی۔ اس میں فوجی کپڑوں کا انبار اتنا بڑا تھا کہ کھلنے میں ایک دوسرے تک پہنچ نہیں رہے تھے معلوم نہیں کس مشکل سے بندھ پائی ہوگی —— پر نیلی گٹھری میں یہ فوجی کپڑے! رنگین سر سرا آنچلوں کے ساتھ یہ خاکی کھردرا لباس! اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک جھٹکا تو اسے دو ہفتے پہلے بھی لگ چکا تھا۔ پر وہ سائیکل کے پہیے کا جھٹکا تھا۔ ارے ہاں وہ سائیکل والا! تو کیا اس رنگین لباس پہننے والی نے اس اجڈ فوجی سے شادی کر لی تھی۔ آنند تو سوچ رہا تھا کہ وہ کسی شاعر سے شادی کرے گی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ شاعر بھی کیا ہی چیز ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں محبت ہی محبت ہوتی ہے۔ پھولوں سے، حسن سے، بچوں سے، زندگی سے۔ وہ حیات کی خوشیوں سے لبالب، زندگی کو آسودگی سے بھرپور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر دنیا میں حسن نہ رہے۔ پھول نہ رہیں، بچے نہ رہیں —— آبادیاں بن ہو جائیں۔ بستیاں ویران ہو جائیں تو شاعری کا بسیرا کہاں رہے؟ تو شاعری بھی خاک میں مل جائے۔ اسی لئے تو کبھی کبھی شاعر بھی خاکی لباس پہنتے ہیں کہ زندگی کی چہل پہل سلامت رہے کہ پھول، رنگ، نغمہ، حسن اور بچے سلامت رہیں، اس کی شاعری سلامت رہے تو یہ خاکی لباس پہننے والا بھی شاید کوئی شاعر تھا! اس کھردرے لباس کے اندر شاید کوئی شاعرانہ دل دھڑکتا تھا؟ اس نے برش اٹھا لیا اور فوجی کپڑوں کو جھاڑنے لگا۔ خاکی خاکی غبار لانڈری کے پچھواڑے سے لپٹ گیا اور چھت کی طرف گھٹنے لگا۔

چھ مہینے کے بعد ایک دن یکایک نیلی گٹھری میں خاکی اور رنگین کپڑوں کے ساتھ کچھ اور

کپڑے باہر آگئے۔ عجیب سے کپڑے۔ اس نے الٹا پلٹا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا! تھیلے کی طرح۔ ادھر ادھر بند
کھلے ہوئے۔ دو طرف بٹن لگے ہوئے۔ یہ کیا ہے بھئی! اوہو! آرام کرسی کا غلاف۔ فیروزی زمین
پر بڑے بڑے نارنجی اور اودے پھول۔ کچھ کلیاں بکھری ہوئی، کچھ بیلیں پھولوں اور کلیوں کو جوڑتی
ہوئی ادھر ادھر لٹکتی ہوئی۔ آنند نے دونوں غلافوں کو سمیٹا۔ ان کے نیچے دو نارنجی رنگ کے
پردے تھے جن میں اودا حاشیہ لگا ہوا تھا۔ پردوں کے نیچے ایک فیروزی ساٹن کا میز پوش جس پر
اودے اور نارنجی پھول کڑھے تھے۔ سب سے نیچے گلابی ساٹن کی ایک ٹکوزی تھی جس پر ایک
کونے پر ایک ننھی سی سیاہ بلی اون سے بنی ہوئی تھی۔ بلی کی پیلی آنکھیں دیکھنے کے لئے آنند نے
اس پر ہاتھ پھیرا۔ دو موتی ٹکے تھے۔ ہوں! تو گویا گھر بن گیا تھا۔ چار دیواریں، دیواروں پر
دو ایک تصویریں۔ ایک دیوار سے لگی کتابوں کی الماری۔ دو کرسیاں ایک میز، اس پر چائے
گلابی ٹکوزی کے ایک کونے سے ننھی سی سیاہ بلی کے پیلے دیدے جھانکتے ہوئے ——
اور وہاں اودے اور نارنجی پھول اور سرسراتے پردوں کی وسعتیں، محبت کی سرگوشیاں،
زندگی کا تسلسل —— کاش آنند وہ گھر دیکھ سکتا۔ شاید اگر وہ جاتا تو وہ اس سے کہتی
"بیٹھئے نا۔ ایک پیالی چائے تو پیتے جائیے۔" پھر وہ گلابی ٹیکوزی نکل آتی۔ اس کا شوہر خاکی
کپڑے پہنے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا اور وہ سب باتیں کرنے لگتے۔ آنند انھیں بتاتا کہ راولپنڈی
میں وہ بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ کہ وہ انجینئر بننا چاہتا تھا۔ کہ اسے بھی نقشوں، تصویروں اور
کتابوں سے محبت تھی —— اونہہ —— اس نے میٹ کو آواز دی اور جلدی جلدی
گننے لگا۔

اس دن لانڈری میں داخل ہوا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ صبح صبح نوکر سے جھگڑا
ہوا —— اور پھر گھر سے خط آگیا کہ ماں کی طبیعت خراب ہے اور بہن کی سسرال والے
تقاضا کر رہے ہیں کہ لڑکی کو جلدی بدا کرو۔ اس نے سبزی کا تھیلا میز پر پٹکا اور دھم سے
کرسی پر گر پڑا۔ ایک کونے میں میٹ بیٹھا کچھ چیتھڑے بٹور رہا تھا ——
"یہ کیا بےکار کام کر رہے ہو؟" وہ جھنجھلا پڑا۔
"صاحب کپڑے الگ کر رہا ہوں۔" میٹ نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"یہ کپڑے ہیں؟ نہ جانے کہاں سے گٹھری کا گودڑ لا کے جمع کیا ہے بے کار آدمی۔" وہ اور بھی جھنجھلایا ——— میٹ نے کچھ جواب نہیں دیا! بکھرے ہوئے چیتھڑے سمیٹے۔ الماری کے اوپر سے نیلی گٹھری اتاری، اور سب گڈمڈ اس میں رکھ کر جلدی جلدی باندھ دی۔

تو یہ چیتھڑے نیلی گٹھری میں آئے تھے! ادھر تو مدتوں سے اس نے گٹھڑی کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کیا دیکھتا۔ وہی خاکی رنگین، رنگین، خاکی! پر یہ چیتھڑے کیسے؟

"دیکھیں" اس نے ہاتھ بڑھایا ——— میٹ نے گٹھری پکڑا دی۔ آنند نے گٹھری کھولی، اسے یہ گڈمڈ کئے ہوئے چیتھڑے تو خوب ہی نکلے! ایک بادامی رنگ کی منی سی ریشمی فراک، جس کے ایک کونے میں چھوٹی سی جیب جھانک رہی تھی اور جیب پر ایک ننھا سا خرگوش پھدک رہا تھا۔ ایک بب جس سے دودھ کی بو آ رہی تھی۔ دو چار ململ کے کرتے۔ دو چار لنگوٹے، کھانے کے نہیں۔ پہننے کے۔ ایک آسمانی رنگ کا اونی سوئٹر۔ ایک احمق سی ٹوپی جس کے اوپر والے سرے پر تُک نکلی ہوئی تھی۔ اسی رنگ کے چھوٹے چھوٹے موزے اور ان میں اسی رنگ کا ریشمی ربن ——— بھئی واہ! ——— آنند کی ساری جھنجھلاہٹ الٹی ہو گئی۔ اس نے ننھے سے موزے کو اٹھایا اور اس کے ریشمی ربن پر ہاتھ پھیرنے لگا ——— پھر اسے یکایک وہ وقت یاد آیا جب اس کا سب سے چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا ——— وہ خود بیر کے درخت کے نیچے گولیاں کھیل رہا تھا کہ اس کی بڑی بہن نے آکر چپکے سے کہا تھا

"جاؤ دیکھو"

"کیا؟"

"ایک چھوٹا سا آدمی آیا ہے" اس کی بہن نے اپنی ہنسی چھپا کر بتایا۔

"کہاں" تب وہ نہیں سمجھا تھا۔

"وہاں" اس کی بہن نے ماں کے کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یکایک وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا اور گچھے میں اپنی گولیاں چھوڑ کر بے تحاشا بھاگا تھا۔ ننھے سے بھیا کے گال کیسے ملائم تھے۔ اس کی آنکھیں تو بند تھیں۔ پر آنند نے جب اپنی انگلی اس کے ہاتھوں میں دی تھی تو اس نے کس کر پکڑ لی تھی۔ اب وہ بھائی جوان ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آخری خط میں لکھا

تھا کہ اگر کہیں اور نوکری نہیں ملی تو آپ مجھے فوج میں کیوں نہیں جانے دیتے؟ کب تک آپ
میری انگلی پکڑ کے چلاتے رہیں گے۔ مجھے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونے دیجئے بھیا! ——
آنند نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور گٹھری کو باندھ کر میز کے ایک کونے پر رکھ دیا۔ اسے
گٹھری سے شرم سی آ رہی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو! کیسی رہی! تم سمجھتے تھے اب میں کوئی
نئی چیز لا ہی نہیں سکتی! مجھ سے مایوس ہو گئے تم! پر دیکھو تو —— پہلے حسن پھر رنگینی، پھر
محبت، پھر جد و جہد، پھر فکر پھر زندگی! —— پھر اور حسن، پھر اور محبت، پھر اور زندگی! ——
حیات نئے نئے روپ میں ابھر کر ابھرتی ہے، زندگی نئی نئی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ سلسلہ
ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اس تسلسل سے کبھی مایوس نہ ہونا —— آیا
سمجھ میں!۔

اس نے گٹھری کو بڑی محبت سے اٹھایا اور الماری پر رکھ ہی رہا تھا کہ اس کے کان
میں شور کی آواز آنے لگی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ہزاروں آدمیوں کا ایک
بڑا سا ہجوم نعرے لگاتا چلا آ رہا تھا۔ ابھی وہ لوگ ذرا دور ہی تھے۔ پر آنند کے کانوں میں ان کے
نعرے صاف سنائی دے رہے تھے۔

"ہم امن چاہتے ہیں۔"

"امن کی فوج زندہ باد۔"

"ہم تیسری جنگ نہیں ہونے دیں گے"

تیسری جنگ! آنند نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ لانڈری غائب ہو گئی
چاروں طرف آگ لگی ہوئی دکھائی دینے لگی —— کٹے ہوئے سر، چیختی ہوئی کھوپڑیاں۔
بکھرے ہوئے ہاتھ پاؤں، آبلے پڑے ہوئے جسم، اندھی آنکھیں۔ ٹٹولتے ہوئے ہاتھ
ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، بین کرتی ہوئی آوازیں۔ اس کے اپنے بھائی کے کٹے ہوئے
پاؤں میں آدھا جلا ہوا فوجی پتلون —— وہ پاؤں جن پر اس کا بھائی خود کھڑا ہونا چاہتا تھا
اور انگلیوں پر سیاہ خون جم گیا تھا جنھوں نے اس کی انگلی کو برسوں گزرے، کبھی پکڑا
تھا۔ اس کی ماں کے کھچڑی بالوں میں سیندور کی جگہ مٹی اور بسنتی قمیص کے سینے میں گولیوں

کے چھید، سُرخ بند کی دار قمیص پر یا ردد کی جمی ہوئی سیاہی جو کسی لانڈری میں چھڑائی نہیں جا سکتی تھی، ـــــ وہ تو انجنیر بننا چاہتا تھا نا۔ وہ تو زمین کے سینے کو پھاڑ کر انسانوں کے لئے حسین چار دیواری بنانا چاہتا تھا نا؟ پر یہ اُسے کیا دکھائی دے رہا تھا۔ کہ دیواریں بیٹھ رہی تھیں۔ کواڑ جل جل کر گر رہے تھے۔ نارنجی پردوں اور فیروزی میز پوشوں کو شعلے چاٹ رہے تھے سلگتا ہوا ایک شہتیر گرا۔ گلابی ٹیکوزی اس کے نیچے کچل گئی۔ بلی کے بچے دیدے باہر کو اُبل پڑے۔ ایک باریک سی چیخ سنائی دی ـــــ کیا بلی میں جان پڑ گئی تھی ـــــ نہیں ـــــ شہتیر کے نیچے سے دو ننھی ننھی مٹھیاں پل بھر کے لئے ہوا میں کانپیں۔ باریک چیخ ایک بھنچی ہوئی کراہ میں بدلتی رک گئی ـــــ اب وہ مٹھیاں کسی انگلی کو کس کر نہیں پکڑ سکتی تھیں۔ کیونکہ احمق سی ٹوپی کا پھندنا جل چکا تھا۔ دودھ سے بھری ہوئی بب خون میں ڈوب چکی تھی اور منی سی جیب پر پھدکتا ہوا خرگوش سلگتے ہوئے شہتیر کے نیچے سسک سسک کر دم توڑ چکا تھا ـــــ تیسری جنگ!

جلوس لانڈری کے سامنے آگیا تھا۔ آنند نے چونک کر سر اٹھایا۔ جلوس نے زور کا ایک نعرہ لگایا ـــــ "ہم تیسری جنگ نہیں ہونے دیں گے" مجمع سے ایک دبلی پتلی لڑکی نکلی اور گود کے بچے کو سنبھالتی ہوئی اس طرح آنند کے پاس آگئی جیسے وہ ہمیشہ سے اُسے جانتی تھی ـــــ اس نے ایک کاغذ آنند کی طرف بڑھایا "اس پر دستخط کیجیے ـــــ یہ امن کی اپیل ہے۔"

"آپ ـــــ آپ کون ہیں؟" آنند کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"میں؟" لڑکی مسکرائی "میں ایک عورت ہوں، ایک ماں ہوں، ایک انسان ہوں ـــــ پھر اس کے چہرے کی رنگت یکا یک بدل گئی۔ خوف کی زردی اور غصے کی سرخی ـــــ دونوں رنگ اس کے رخساروں پر جھلکنے لگے۔ "میرے ماں باپ ہیں میرے بھائی بہن ہیں، میرا ایک شوہر ہے، میرا ایک بچہ ہے، میرا ایک گھر ہے ـــــ آپ بتائیے کیا ہمیں زندہ رہنے کا حق نہیں۔"

"ہے ضرور ہے" آنند کے لب جذبات کی شدت سے کانپنے لگے "ہے

بھی ماں باپ ہیں، میرے بھی بھائی بہن ہیں ——— تمہارا گھر ہے اور میرا گھر ہوگا۔
——— جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوگا اس کے لئے ہمیں زندہ رہنے کا حق ہے"
"تو کیجئے اس پر دستخط ——— امن کی عالمگیر آواز بھی ملا دیجئے"
آنند نے قلم نکالا۔ وہی قلم جس سے وہ ہمیشہ نیلی گٹھری کے کپڑے ناپا کرتا تھا۔
——— بچے نے ہاتھ بڑھایا اور اپنی ننھی انگلیوں کی مٹھی میں قلم کو کس کے مضبوط پکڑ لیا۔
جیسے اس کی زندگی کا رشتہ اس قلم ہی سے بندھا ہو۔
آنند مسکرایا ——— اور بچے کے ننھے سے ہاتھ پر اپنا بڑا سا ہاتھ رکھ کر
قلم کو کاغذ پر کھسکا دیا ———

(شاہراہ جولائی ۱۹۵۰ء)

راجندر سنگھ بیدی

نورا

ابھی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اوپر تلے تین آوازیں سنائی دیں۔

"آج پھر پلیٹیں گیر دیا۔ اُلّو ہیں کے! . . . . ارے چولھا ہی سلگا لیا ہوتا . . .

. . . اور نہیں تو بھوسی ہی نکال لی ہوتی! ————" اور تینوں آوازیں ایک ہی آدمی کے منہ سے نکلی ہوئی معلوم دیتی تھیں۔ جن کا جواب خاموشی کے سوا اور کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ سننے والا یا تو کہنے والے کا ذلیل تھا اور نہیں تو وہ کہنے والے کو بالکل جاہل سمجھتا تھا۔ تیسری وجہ خاموشی کی کوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بہرحال میں یہ بات محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ سننے والا ایک فاش غلطی کر رہا ہے۔ خاموشی اور شرافت کی فی زمانہ قدر ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ آوازیں درمیانی کوٹھری سے آ رہی تھیں۔ زمین اور پہلی چھت کے درمیان ایندھن اور فروعات رکھنے کی جو جگہ تھی وہاں میں نے لکڑی کے لٹھوں اور چند ٹوٹے ہوئے کواڑوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ واللہ اعلم وہ پتھر اور کواڑ ہی بولنے لگے تھے۔ ان دنوں میں کسی خاص مقصد کے پیش نظر پریوں کی کہانیاں پڑھ رہا تھا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ دیو پری کے قصے پڑھنے کے بعد کیا کیا دنیائے ممکنات ہے جو آپ کے سامنے کھلتی ہی چلی جاتی ہے۔

پہلی چھت پر ہم کالج کے چند چھوکرے اکٹھے رہتے تھے۔ باقی کے کمبخت یا تو گرینڈ کیبرے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور یا پھر بین الصوبائی میچ دیکھنے گئے ہوں گے۔ اس وقت ان میں سے وہاں ایک بھی نہیں تھا۔ میں نے ہمت جمع کی اور قدم آگے بڑھایا۔ روشنی واقعی درمیانی کوٹھڑی سے آرہی تھی۔ ایک ماضی سا دیہ جرمن سلور کی ایک کٹوری میں سرسوں کا تیل اور بتی ڈال کر اور اُسے اکڑوں رکھ کر جلا دیا گیا تھا جس میں سے ایک کالی لاٹ اٹھ کر اوپر کی دیوداری تختی کو سیاہ کر رہی تھی ۔الے کھلے پھول تختی کے ساتھ چپٹ رہے تھے اور کچھ دیر کے بعد کٹوری کے اندر یا بتی پر گرتے ہی مدھم ہو کر ٹمٹمانے لگتی لیکن پھول پھر بھی بتی کا حصہ ہو کر جلنے لگتے۔ قریب ایک شخص چارپائی پر لیٹا ہوا ایک میلے کچیلے چیتھڑے لپیٹے پیچوان کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ بڑا پسند تھا اُسے اپنا پیچوان۔

ہم کو اپنی گڑگڑی اور پیچوان پر ناز ہے

خدا کی قسم! ——— یہ تو اپنا نورا ہی ہے۔ میں نے ایک لمبی سی "اوہو" کے بعد کہا اور اس کے ساتھ جہاں تھا نورے کا سایہ۔ اس کے وجود کا نتیجہ صریح جس کی مونچھیں متواتر تیل لگانے اور کھینچنے سے اور بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کے غیفب اور چاہ زنخداں والے سیاہ چہرے پر ایک عجیب لعنت سی برس رہی تھی جیسے خوبانی اور آلو بخارے کے پیچواں سے نکلے ہوئے سینے بدبودار اور بے حد چکنے تیل نے اور بھی چمکا دیا تھا اور اس کے سامنے نورا بیٹھا تھا۔ کھلے کھلے ہاتھ پاؤں چار چار پیڑھیاں پھلانگنے والا خوبرو اور ڈرپوک جو چند ایک لقمے زہر مار کر رہا تھا۔ جہاں ایک پیر تسمہ پا تھا جو ہر وقت نورے کی گردن پر سوار رہتا مثلاً اٹھاؤ چولھا سلگائے نورا آٹے میں سے بھوسی نکالے تو نورا برتن مانجھے تو وہی اور جو کھنگالے تو وہی ———
رہما سا بھی بچھائی پر آٹپکے اور پکی پکائی کھائے تو وہ بھی گویا نورے پر احسان کرے۔ میں اور ساتھی اسنین ان کی قبر تک سے واقف تھے۔ اس سے پہلے یہ برادر تعلیم الفرقان والوں کے ...تے تھے جہاں ایک سفلہ بنگالن ہمیشہ اوپر سے گوبھی کے ڈنٹھل، پیاز کے چھلکے پھلیاں ...ھی ...ات ان کی منڈیا پر پھینک دیتی تھی اور یہ ہمیشہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتے تھے ...گی نورا ویسے ہی جہاں کا دبیل تھا۔

...ر ایسا کیوں تھا؟ یہ اسنین اور میرے دوسرے ساتھی کئی بار سوچتے۔ لیکن ہمیں آخر دم

تک پتہ نہ چل سکا۔ البتہ نورے کی فطرت کا مطالعہ کرتے وقت ہم اکثر حظ اٹھایا کرتے۔ نورا سخت جذباتی تھا۔ اس کے جذبات کا خزینہ کانوں اور آنکھوں کے اس قدر قریب تھا کہ ادھر کانوں نے بات سنی اور ادھر ساون بھادوں کی جھڑی ہے کہ لگ رہی ہے چھم چھم چھما چھم اور ختم ہونے کا ہی نہیں لیتی تا وقتیکہ زمین میں کوڑیاں نہ دبائی جائیں یا کوٹھے کی منڈیر پر چیتھڑوں کا بڈھا کھڑا کیا جائے بس اس کے جذبات کے خزینہ کو ذرا چھیڑنے کی ضرورت تھی۔ یا پھر اس کے ماتھے کی راکھ میں چند اور کوئلے تھے جنہیں وہ اکثر موقع بے موقع اگلتا پھلتا رہتا اور جنہیں سرد کرنے کے لئے وہ آنسوؤں کا سیلاب بہا دیتا۔ ہمیں اس لم دھڑنگے چھ فٹ لمبے مسنڈے اور ہمیشہ کمر کمان کر کے چلنے والے انسان کو رلا کر مزا آتا تھا ـــــ

میں تین چار سیڑھیاں اتر کر عین نیم کے چھپّر کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اور کہا "اے نورے" میاں جماں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا ـــــ تعظیماً! اور اپنے بیچ ان کی نے کو چارپائی کے نیچے پھینسا دیا۔ نورے نے روٹی کا لقمہ سالن ہی میں رہنے دیا اور ہاتھ ماتھے پر لے جاتے ہوئے بولا "بابوجی' ساہ سلام! (صاحب سلامت)

"سلام!" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "ارے یار تم لوگ بالکل چودروں کی طرح اکیلے اور کیا دیت تھوڑے ہی ہوتے!" جماں نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے کہا۔ دراصل ہم بلکہ مونچھوں کا یہ خوشگوار پھیلاؤ اور ماتھے کے ناگوار شکن ل جل کر ظاہر کرتے تھے کہ اس کی مسکراہٹ میں مسکراہٹ کم اور رشوت زیادہ ہے تاکہ میں اس کے اجلے سے جواب کا برا نہ مانوں۔

"شاید میں تمہاری کچھ مدد کر دیتا" میں نے کہا اور درمیانی کوٹھڑی کے چاروں ابرو سوالیہ نشان بن کر مجھے گھورنے لگے۔ میں نے ان شرمندۂ نطق سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں چودھری کو کہہ کر میاں سپیدی ہی کروا دیتا اور نہیں تو کرائے میں ہی کچھ رعایت ہو جا

اب یہ بات واقعی قابل غور تھی۔ جماں اور نورا سوچنے لگے۔ سادہ لوح نورا اس چہرے سے واقعی ممنون نظر آرہا تھا لیکن جماں ابھی تک دل میں کہہ رہا تھا ـــــ یہ لوگ کتنے چالاک ہوتے ہیں۔ یہ مجھے بھی بتادیا ہوتا" کا انداز اسی وقت اختیار کرتے ہیں کسی کی بیل اپنے آپ منڈھے چڑھ جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسنین تو ان لوگوں کا یہاں آنا کبھی بھی برداشت نہ کرتا۔ وہ فلسفے کا طالب علم تھا
دماغ کا خبطی تھا۔ بالوں میں تیل کم لگاتا جس کی وجہ سے بال ہمیشہ سیاہ گوش کے کانوں کی طرح کھڑے
رہتے اور دوسرے کو اتفاقاً چھو جانے سے اُسے سزا دیتے۔ کچھ اُن کے خشخشے اور گھونگریالے پن سے
پتہ چلتا کہ ملکہ سبا کی نسل سے ہیں۔ وہ فلسفے کا طالب علم ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لئے مجسم غلو
ہوتے اور اپنے لئے مجسم سکون مانگتے۔ اسنین کو بھلا جیاں اور نورا کا یہاں آنا کیسے بھاتا۔ لیکن وہ
خاموش محض اس خیال سے ہو رہا کہ شاید جیاں اور نورا میرے کوئی عزیز ہیں۔

اکثر نیچے سے گالیوں کی آوازیں ہیجوان کی گڑگڑاہٹ ہونے پیٹ کے خرّاٹے اور کھنکار
کی شاق سنائی دیتی اور اسنین اپنے سلوجرم گنگناتا ہوا بکا اٹھتا۔ وہ نورے کی پڑ رہی ہیں بے بھاؤ
کی اور پھر وہی سلوجرم" —— کچھ دیر کے بعد —— ارے بچاؤ یار خدا کی قسم مار ڈالے گا بیچارے
کو وہ موچھل لیکن افسانہ نگار داؤد اور وہی رفیق کو مجھ سے اس بات میں اتفاق تھا کہ ان لوگوں
کے یہاں آنے سے ہماری زندگی میں رومان کی جگہ مسئلہ حیات نے لے لی تھی۔ داؤد سوچتا تھا کہ جنہیں
مار پڑتی ہے وہ ہمیشہ مار کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ اسنین اور داؤد اس بات پر جھگڑنے لگتے ——
—— اور میری حالت اس جنگ میں ایسی ہوتی جیسے دو بڑے ملکوں کی جنگ میں کسی غیر جانبدار
یا (BUFFER) ریاست کی ہو سکتی ہے۔

ایک بات پر ہم چاروں متفق تھے کہ ماں باپ سے دور، نظم و نسق سے کوسوں پرے، رات
کے ایک ایک بجے ہم گلیاں جھانکتے، ہانپتے کانپتے اپنے مکان کی طرف آتے تو ہماری سیڑھیاں
اُن لوگوں کی وجہ سے آخری تنکا ثابت نہ ہوتیں۔ درمیانی کوٹھری کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا۔ اور
دیئے کی روشنی نورِ ہدایت کی طرح ہمیں ہمارے ازلی گھر کی راہ دکھاتی جہاں ہمیشہ دُنیا سے بانارکے
ڈھول دھپے، گالی گلوچ سردی اور گرمی کے خلاف دوستوں کی محبت۔ والدہ کے پیار سے بھرا
ہوا خط۔ لحاف اور بجلی کا پنکھا میسر آتے ہیں۔ جیاں اور نورا خدا جانے کوئی مغ بچے تھے جو سلاں
رات آتش پرستی کرتے تھے لیکن کچھ بھی ہو ہمیں رات کو سیڑھیوں میں دیئے کی روشنی چاہیے تھی اور
اس سلسلے میں ہم مغ پرستی تک کے لئے تیار تھے اور خلاف اس کے نوکروڑ صلواتیں اس چودھری
کو سناتے جو ہمیں سیڑھیوں میں ایک بجلی کا ہنڈا تک لگوا نہیں دیتا تھا۔ خدا جانے میرے

کہنے پر چودھری، جماں اور نورے کی درمیانی کوٹھری میں سپیدی اور کرائے میں تخفیف کیے کر دیتا۔
ایک دن میں اور اسنین رات کے دو بجے گھر لوٹے، ان دنوں شہر میں ایک صنعتی نمائش آئی ہوئی تھی۔ بس اس کی کارنیوال میں ہم "تیر و تفنگ" کا ایک کھیل کھیلتے رہے گھر لوٹے تو نہ صرف نیم چھتے کا دیا جل رہا تھا بلکہ منا بچے جاگ بھی رہے تھے۔ جرمن سلور کی کٹوری کے عین اوپر دیوداری تختی پر ایک سیاہ سیٹلنگ ٹائپ یعنی شولنگ سانچے کی طرف امنڈ رہا تھا —— اور نورا جماں کی ٹانگ دبا رہا تھا —————— اسنین ایک اشتراکی بھی تھا اور آپ جانتے ہیں کہ اشتراکی خواہ وہ عملی ہو یا کرسی نشین ڈبیل ہونے یا لفظ ایکسپلائیٹیشن سے کتنی نفرت کرتے ہیں —— "تیرا زہر بند ہو جائے" اسنین نے آنکھیں نکالتے ہوئے زیر لب کہا۔ "سارا دن بیچارہ روڑی کوٹتے کوٹتے تھک گیا ہوگا۔ پھر گھر کا دھندا کیا ہے اور اب ہے کہ رات کے دو بجے تک اس کے پاؤں داب رہا ہے۔

شاید اسنین بول پڑتا لیکن جماں نے اس کے کانوں میں ایک خوشخبری ٹھونس کر بات آئی گئی کر دی اور وہ خوشخبری یہ تھی کہ ڈاکیہ اسنین کا منی آرڈر لے کر آیا تھا۔ اگرچہ اسے نہ پا کر لوٹ گیا۔ اسنین پیسوں کے متعلق سوچنے لگا — اشتراکی کو بھی کسی ڈبیل کے بجانے سے جو تسکین ملا ہوتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ باعث راحت اسے گھر سے آیا ہوا منی آرڈر ہوتا ہے۔

کتنے کا تھا۔ اسنین نے اس امید پر سوال کیا کہ شاید منا بچوں میں سے کسی کو پتہ ہو۔ دراصل ہم دونوں کو امید نہ تھی کہ مالیت کے متعلق یہ لوگ جانتے ہوں گے لیکن پچاس کا ہے"۔ . . . . اور میر پور خیر سے آیا ہے۔ نورے نے قدرے اونچی آواز سے کہا "واہ رے نورے!" ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیے۔ "اوئے بڑا بدمعاش ہے تو تو"

اس کے بعد ہم رات کے سناٹے میں چنختے جوتوں سے شور مچاتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ رنبو دادو نے کھولا تھا۔ اندر گھستے ہوئے اسنین کے دماغ میں پھر نورے اور اس کے پاؤں دابنے کی تصویر گھوم گئی۔ اس نے اپنی گزی کی قمیص کا بٹن کھولتے اور اسی گزی کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا —— "میرے بس کی بات ہو تو جماں کو اسی مکان کی کنگنی پر کھڑا کر کے نیچے دھکا دیدوں اور صبح سب سے پہلے اس کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے زندگی کی صحیح تصویر

شیا کردوں۔" ہے نا؟ اور دیکھو کمبخت نورے کو کہ مالیت کس طرح یاد ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ پیسے
یہاں سے آئے تھے۔

بعد میں میں نے کہا کون جانے اُسے یہ بھی پتہ ہے کہ کہاں پیسے رکھے جاتے ہیں۔

اسنین نے اپنے سیاہ گوشت سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" ارے یار سچ مچ ــــ
ہیں ہم پر بھی ہاتھ صاف نہ کر جائیں۔"

اس کے بعد میں داؤد کے بستر میں گھس گیا۔ میری چارپائی کی پائنتی ٹوٹ گئی تھی اور چارپائی
چھا خاصا کنواں بن گئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی بے تحاشا گالیاں اور مار دھاڑ کی آواز سنائی دی اور
پھر تی ــــ" ارے تم نے اتنی کتنی ضائع کر دی ہے۔ کھچڑی کے لئے تو اتنے سے چاول ہی
افی تھے ــــ سالے اور کتے کے بچے ــــ"

اسنین بولا" بھئی اب مجھ سے رہا نہیں جاتا" داؤد کا نظریہ بدستور رجعت پسندانہ تھا
ــــ جو مار کھانے کے لائق ہوتے ہیں انھیں مار پڑنی چاہیے۔ لیکن آج وہ بھی میرے اور اسنین
ے ساتھ متفق ہو رہا تھا کہ بیچارے کے ساتھ صریحاً زیادتی ہو رہی ہے۔ داؤد نے ایک افسانہ
میز پر رکھا اور دوسرا افسانہ چھیڑ دیا۔

"ارے بلاؤ تو اس نورے کو" اس نے مجھے تحکمانہ انداز میں کہا۔

لحاف کا اندرونی حصہ باہر کی برفانی سردی کے مقابلہ میں کم تکلیف دہ تھا۔ لیکن اس تحکمانہ
ندا نہ اور نورے کے پس جانے کے خیال نے اس میں وہ گرمی پیدا کر دی کہ میں لحاف کو پھینکے بغیر
نہ رہ سکا اور میں نے نورے کو بلایا۔ نورا منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ لیکن داؤد کے سامنے آکر وہ
یوں کھڑا ہو گیا جیسے اردلی اپنے صاحب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔

داؤد نے بات شروع کی ــــ" ابے نورے تمہارے کتنے ہاتھ ہیں؟" اور ہمیشہ
یسی بات سے سلسلۂ گفتگو شروع کرتا تھا جس میں حیرت کا عنصر موجود ہو۔ فوراً اس سوال پر
نورے حیران ہوا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کتا زمین پر بیٹھنے سے پہلے
سے سونگھ لیتا ہے اور پھر وجدانی طور پر ایک موافق ماحول کی بو پا کر بولا۔" دو!"

"جناں کے کتنے کان ہیں؟"

"دو!"

"تمہاری کتنی آنکھیں ہیں ؟"

"دو!"

"اور جماں کی ؟"

"دو!"

"تم کیا کماتے ہو ؟"

"یہی بس ساڑھے بیس روپے کے قریب بنالیتا ہوں مہینے میں !"

"اور جماں کیا بناتا ہے ؟"

"سولہ سترہ روپے"

"تو بھاگ جاؤ، یہاں سے احمق کہیں کے تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ مار کھاتے رہو۔ راستے میں پڑے ہوئے پتھروں کی طرح راہ گیروں کی ٹھوکریں کھاؤ —— جاؤ ——!"

نورے نے چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے چلا گیا۔ اسنین نے اور میں نے داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بلند اور ناشائستہ قہقہہ لگایا —— اسنین بولا داؤد تم بھی عجیب آدمی ہو۔ باتیں کرنے میں بھی تمہارے اپنے افسانے کا یہی انداز ہے ایک نفسیاتی اختتام پر آکر بس کر دیا۔ ارے نورے کے سے آدمی کو سیمرنگ چاہیئے —— سیمرنگ —— سمجھے ؟ —— عوام سیمرنگ چاہتے ہیں۔ بات ان پر واضح اور دھڑا دھڑ کر ٹھونسنی چاہیئے۔ ان کی نفسیات یہی ہے کہ زیادہ نفسیات سے کام نہ لیا جائے۔ صاف کہو بھئی اس طرح کے ہاتھ کان اور کمائی ہوتے ہوئے بھی جماں سے کیوں دب رہے ہو ——؟

اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا۔ رفیق ہنستے ہوئے اس مرغے کی طرح اچھلا جس کی گردن ایک ہی ضرب میں بدن سے الگ کر دی گئی ہو۔ ہم نے پھر نورے کو بلایا اور جماں کے خلاف اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ نورے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو گئی۔ اس کے جسم کے پٹھے پھڑکنے لگے۔ چادر میں سے اس نے اپنے لمبے لمبے بازو نکال لئے اور جماں کے ساتھ لڑائی کا تصور ذہن میں لاتے ہوئے بولا —— "سچ مچ اس نے مجھے نامرد سمجھ رکھا

ایک دفعہ وہ چکری ودن . . . . . . کہ" اور آج نورے پر حقیقت کا انکشاف ہونے لگا اور وہ جان سکا کہ منہ سے مار پڑ رہی ہے۔ اس کے منہ کے ایک طرف کہنی کی ایک نفرت انگیز گرہ تھی جو کہ نحر بی گمر تعمیری سی تحریر دکھائی دینے لگی۔ آئینے نے بالکل لینن کا سا کام کیا۔ ایک آدمی کے ذہن نا شعور میں یہ احساس بھر دیا کہ اُسے دبایا جا رہا ہے۔

نورے کے جانے کے بعد رفیق ہمیشہ کی طرح پوچھنے لگا۔ تمہارا کیا خیال ہے پھنسی تو نمودار نہیں ہو گی؟ ڈاکٹر پال نے کہا تھا کہ تین ہفتہ سے چھ ہفتہ تک میعاد ہوتی ہے اور اب چوتھا ہفتہ جا رہا ہے اور کوئی نشان نہیں۔ اور میں کل کی نسبت آج کمزور دکھائی نہیں دیتا کیا؟ میں نے رفیق کو یقین دلاتے ہوئے کہا ۔۔۔ ۔۔۔ کبھی پھنسی نہیں ہو گی۔ لیکن وہ کہنے لگا۔ تم صرف میرا جی رکھنے کے لئے کہہ رہے ہو ۔۔۔ خدا کی قسم کھاؤ۔ ۔۔۔ میں نے تنگ آ کے ہمدردی سے عاری اتنی ویٹی اور تنبیہ آمیز میں قسم کھائی کہ رفیق نے مغموم و مایوس ہو کر اس کا ذکر بند کر دیا ۔۔۔ لیکن صرف اسی دن کے لئے۔

بڑے مزے کی بات ہوئی۔ نورا یہاں تو سیخ پا ہوا۔ لیکن جتاں کے پاس گیا تو بولا ۔۔۔ دیکھو بھیا یہ بابو لوگ مجھے تمہارے خلاف اکساتے ہیں۔ کہتے ہیں تم اس کے دلیل ہو۔ اب بھیا میں کہاں ہوں تمہارا دلیل ۔۔۔؟" اور بدستور اٹھا کر چولھا صبح کی ٹاپوں کے لئے سلگانے لگا۔

داؤد کہنے لگا۔ اس میں سارا قصور لینن یا آئینے کا ہے۔ اگر میرا افسانوی طریقہ برتا ہوتا تو بات پھر لوٹ کر اس کے ذہن میں آتی چوٹیں لگاتی اور لپس جاتی اور جہاں جتاں کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ پڑتی ۔۔۔ یہ فرق تھا لینن اور گورکی میں ۔۔۔ رنین اور داؤد میں۔ رفیق نے پاس آ کر دیکھا ہیں اور برا ٹھائیں اور موضوع کو ٹانگ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا :-

تہذیب حاضر جسم اور روح کی بیماریاں پیدا کرنا جانتی ہے۔ اس کے پاس پھٹکار ہے لیکن لیکن علاج اور تشفی نہیں۔ مریض کے دوسرے سوال کا جواب دینے کا صبر اور حوصلہ بھی نہیں اور یہ آئینہ کہاں تک مددگار ہے۔ دیکھو اس میں سبھی اپنا رنگ زرد دکھائی دیتا ہے۔ میں اسے توڑ ڈالوں گا ۔۔۔ اور خوب پھینک" رفیق نے آئینہ کو باہر پھینک کر اس کے ٹکڑے کر دیئے۔

اب ہم جتاں سے جھینپنے لگے لیکن جتاں ۔۔۔ "بیٹا باہر تو نکل" کے انداز کی سی

باتیں کرنے لگا۔ ہم نے بھی ڈنڑ پیلے، مالش کی۔ موگدر اٹھا کر پٹھوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا
—— لے نکلتے ہیں۔ کوڑے جو کرنا ہے اور جماں مرعوب ہوگیا۔ نورے کے متعلق ہم نے سوچا۔ نورا
جائے جہنم میں، ہمیں اس سے کیا غرض؟ داؤد کا نقطۂ نگاہ درست ہے بلکہ اُسنے جتنی پڑھیں
تھوڑی سی ہیں ——!

ہمیں نورے کی اس بیماری کے متعلق ابھی تک حیرت تھی لیکن ہم نے احساس کمتری کا سا
رسوائے عام نام دیکر کمال بے صبری اور بے حوصلگی سے اپنے ذہن کو فارغ کر دیا —— ایکاایکی
ایک دن جماں نورے کو اپنی دوستی اور رفاقت کے قابل نہ سمجھ کر علیحدہ ہوگیا۔ اس وقت نورے
نے جماں کی منتیں کیں آنسو بہائے۔ لیکن جماں تھا کہ برابر کہے جا رہا تھا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے
ساتھ کوئی رہے۔

داؤد جینجا اسٹین نے نفسیات کی ایک کتاب جلائی اور ہم دونوں نے مل کر ایک بے ربط
اور بے سری آواز میں قومی ترانہ "سلامت رہے ہمیشہ فرماں روا ہمارا" گایا۔ گانے کے بعد رفیق نے
کہا دیکھو بھائی سستی ہی جان چھوٹتی ہے مگر نورا ہے کہ مانتا ہی نہیں —— ابے نورے ——
پھر آہستہ آواز میں دانت پیس کر —— ابے نورے —— اور نورا ہے کہ صدیوں سے غلام چلے آنے والوں
کی طرح غلامی ہی میں نجات سمجھنے لگا ہے۔ اپنے پاؤں کی بیڑی کو ہی اپنا زیور سمجھتا ہے۔

جماں چلا گیا اور ایک شخص فرد کا (فاروق) نے جماں کی جگہ لے لی۔ وائے قسمت! اب نورا
فردکے کا غلام تھا لیکن تعجب کی بات تھی کہ ایک دن نورے نے احتجاج کیا۔ بات یوں ہوئی کہ فردکے
نے کسی بات سے دکھی ہو کر نورے سے کہا —— "جا تیرا خانہ خراب ہو۔"

نورے کو کچھ یاد آگیا۔ آنسو تھے کہ بے تحاشا امڈ رہے تھے۔ ایک بات کا اضافہ ہوا۔ روتے
روتے گھگھی بندھ گئی۔ نورا بار بار یہی کہتا تھا کہ تو نے مار لیا ہوتا، پیٹ لیا ہوتا لیکن یہ الفاظ مجھ سے
نہ کہے ہوتے۔ فردکے نے نورے کو دلاسا دیا لیکن نورا تھا کہ برابر روئے جا رہا تھا۔ ہائے تو نے
مجھے یہ نہ کہا ہوتا۔

اُسے منانے کے لئے فردکا گھر بیٹھ رہا۔ اور کیرج شاپ جہاں وہ کام کیا کرتا تھا نہ گیا۔ ہم نے
بھی کالج سے چھٹی کی اور نورے کو کریدنے لگے۔ جب نورا بولنے کے قابل ہوا تو کہنے لگا —— دیکھو نے

ہوتے میرے ماں باپ مر گئے۔ بھائی نے پالا پوسا اور جوان کیا۔"

اور نورا پھر رونے لگا۔ اس کی آنکھیں درمیانی کمرے کے ایک شیشے پر جمی ہوئی تھیں لیکن گردشِ ایام پیچھے کی طرف دوڑ گئی تھی اور نورا تصور میں اپنے بھائی کے پاس کھڑا تھا۔ کچھ دیر کے بعد خود ہی نورے نے بات ختم کرنے کی اکساہٹ محسوس کی اور بولا "مجھے مرغے پالنے کا بہت شوق تھا تو بڑے بھیا نے مرغ مہیا کئے۔ میں انڈا بوسکی کی بھانت بھانت دار قمیص پسند کرتا تھا تو اس نے بہت سی ایسی قمیصیں سلا دیں گھر میں بھاوج کو زیادہ باجرے کی روٹی پکانے کا حکم ہوتا تھا کیونکہ وہی روٹی مجھے پسند تھی لیکن میں اس کے پاس نہ رہا اور بھاگ گیا۔ ایک کمانے کی مشین پر چھ ماہ گزار کر لوٹ آیا۔ پھر بھاگا۔ پھر لوٹ آیا اور آخر میں نے بھائی کو اس حالت میں چھوڑا جب کہ اس پر فالج گرا تھا۔ اس نے تنگ آکر مجھے بددعا دی جو کہ آج مجھے یاد آ رہی ہے۔ اس نے کہا "نوری! تو زندگی میں کسی کا سگا نہیں بنا۔ جا تیرا سگا بھی کوئی نہیں بنے گا۔"

اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی جس کے بعد نورے نے کہا: "وہ دن اور آج کا دن میرا تو کوئی سگا نہیں بنتا اور آج فرد کا کہہ رہا ہے جا تیرا خانہ خراب ہو ــــ میں اپنے دوست کے لئے کیا نہیں کرتا کیسے سے کمینہ کام بھی کرتا ہوں۔ اور جب میرا کوئی دوست مجھے چھوڑ جاتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ سب بھیا بلاتی کی بددعا کا اثر ہے ــــ!"

رفیق، داؤد، اسنین اور میں چاروں نے یہ بات سنی اور دم بخود ہو کر رہ گئے۔ "اسے نورا کہتے ہیں۔" داؤد بولا۔ اسنین نے گہری سوچ سے سر اٹھایا اور بولا:-

"اپنی دق سے مرتی ہوئی ماں کی میں نے خدمت کی اور مرنے سے پہلے اس نے کہا "جا بچہ! تو زندگی میں بڑا سکھ پائے گا۔" اور اسنین نورا کے ہی انداز میں بولا ــــ "وہ دن اور آج کا دن جب کوئی پرمسرت لمحہ میری زندگی میں آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ماں کی دعائے خیر کا اثر ہے ــــ!"

رفیق بولا "لوگوں کو منہ سے بات نکالتے ہوئے کچھ سوچ لینا چاہیے۔ تم نہیں جانتے۔ مجھ جیسے نیور ستھینگ" کے لئے ایک معمولی سا فقرہ کیا معنی رکھتا ہے" ــــ اس وقت داؤد اور میں خاموش تھے ــــ شاید ہم بھی اپنی ماضی کی راکھ میں چند سلگتے کوئلوں کو الٹ پلٹ رہے تھے ؛

(افکار خاص نمبر)

شوکت صدیقی

تیسرا آدمی

دونوں ٹرک سنسان سڑک پر تیزی سے گذرتے رہے!

چتمبر پور روڈ، مشرق کی طرف مڑتے ہی ایک دم سے نشیب میں چلی گئی ہے۔ اور جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان کسی زخمی پرندے کی طرح ہانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رات اب گہری ہو چکی ہے اور آغازِ سرما کی بپھری ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دونوں ٹرک ڈھلوان پر کھڑکھڑاتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا ہے۔ ایکا ایکی اندھیرے میں سے کسی نے چیخ کر کہا

"کسے کون جا رہا ہے، ٹرک روک لو!"

رات گئے۔ سناٹے میں یہ آواز بڑی پراسرار معلوم ہوئی۔ لیکن ٹرکوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پکار پر توجہ نہ دی۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے اور دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں تیزی سے گذرتے رہے۔ اس دفعہ ذرا دور سے آواز سنائی دی "روکو، روک لو ٹرکوں کو!" اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گھڑگھڑاہٹ ابھرنے لگی۔ انسانی تیز روشنی بھی کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصوں پر لہرا جاتی ہے۔ لیکن ٹرک رک نہیں سکتے۔ اس لئے کہ یہ خطرے کا الارم ہے۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سڑک بالکل

ویران ہے اور دونوں ڈرائیور بڑے اکسپرٹ ہیں۔

موٹر سائیکل کی روشنی قریب ہوتی جارہی ہے۔ اور قریب! اور قریب!! اور اس کا شور ٹرکوں کے نزدیک ہی دھڑکنے لگا ہے۔ ان کی رفتار اب زیادہ نہیں بڑھ سکتی۔ اس لئے کہ ڈھلوان پر ٹرکوں کے بے قابو ہو جانے کا پورا اندیشہ ہے۔ دونوں ڈرائیوروں کے سہمے ہوئے چہرے خوف زدہ ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن نیلی آنکھوں والا وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ پھر ایک بارگی کوہستانی ٹیلوں کی گہرائی میں ریوالور چلنے کی آواز بڑے بھیانک انداز سے گرجنے لگی اور گولی ٹرک کے پچھلے پہیوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گذر گئی۔ ایک بار پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"روک لو ٹرکوں کو، نہیں تو میں ٹائر برسٹ کر دوں گا"

اور اس وارننگ کے ساتھ ہی دونوں ٹرک ٹھہر گئے۔ ٹرک کے اندر سے صرف وانچو اتر کر نیچے آیا۔ باہر ریت بھری شوریدہ سر ہوائیں چل رہی تھیں اور ان کی تیز خنکی جسم میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وانچو نے اپنے لمبے اوور کوٹ کے کالروں کو درست کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو جھنجھلاہٹ کے انداز میں ٹرک پر پھینک کر جوتے سے مسل ڈالا۔ اور بڑے تیکھے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"اس طرح ٹرکس کو رکوا لینے کا مطلب۔ کیا چاہتے ہیں آپ؟"

لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر وانچو کے اس انداز سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ بلکہ بڑی بے نیازی سے کہنے لگا "میں اینٹی کرپشن کا انسپکٹر ہوں۔ ان دونوں ٹرکوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں!"

وانچو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا کرخت معلوم ہو رہا تھا۔ اور ریوالور ابھی تک اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ وانچو نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر، پوری طرح دہشت زدہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے جھٹ سے کاروباری پینترا بدلا اور ذرا بے تکلفی سے کہنے لگا۔ "اچھا تو آپ ہیں۔ اور پھر مسکرا دیا۔ "اگر آپ آفیشلی پوچھتے ہیں تو دیکھئے دونوں ٹرکوں میں آلو کے بورے

لدے ہوئے ہیں۔ میں ثبوت میں ڈسٹرکٹ آکٹرائے آفس کی رسید پیش کر سکتا ہوں۔ چونگی کا
یہ محصول ابھی پچھلے ناکہ پر ہی ادا کیا گیا ہے اور جو کچھ اصلیت ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے
اس لئے کہ آئرن شیٹس کو اس طرح سے لے جانے کا یہ کوئی پہلا اتفاق تو ہے نہیں۔ یہ سلسلہ تو ایک مدت
سے چل رہا ہے۔"

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا "جی ہاں سنا تو کچھ میں نے بھی یہی ہے اور اسی لئے کئی گھنٹوں سے
اس سڑک پر تپسیا کر رہا تھا۔"

وانچو ہنسنے لگا۔ "یہ تپسیا تو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر مول لی۔ میں نے آپ کو دو مرتبہ ٹیلیفون
کیا۔ اگر آپ دفتر میں مل جاتے تو آپ کو اس طرح پریشانی اٹھانی نہ پڑتی اور خود مجھے بھی یہاں اس سردی
میں نہ آنا پڑتا۔ مگر چلئے یہ بھی ٹھیک ہی رہا۔ اس بہانے آپ کے درشن تو ہو گئے!" اور وہ تین سو
روپے جو احمد پور کے اس قرب میں بچا لینا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ان کرنسی نوٹوں کو اندرونی جیب
میں سے نکالا اور انسپکٹر کی طرف ان کو بڑھا کر کہنے لگا۔

"آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔ لیجئے
ان کو رکھ لیجئے۔ زمانے اور کیا سیوا کی جائے۔"

ایٹی کرپشن کا انسپکٹر روکھے پن سے بولا "اس مہربانی کا شکریہ۔ اب اتنی اور
مہربانی کیجئے کہ ان کو اپنے ہی پاس رہنے دیجئے۔"

وانچو ذرا سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے رہے اور
کوہستانی چٹانوں میں سپت جٹا کی بھری ہوئی ہوائیں چیختی رہیں۔ آگے کھڑے ہوئے ٹرکوں کے
اندر سرگوشیوں کی دبی دبی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں۔ وانچو غور کرنے لگا کہ یہ آسانی سے ماننے والی
اسامی نہیں ہے۔ اس سالے کو ابھی کچھ اور بھی دکشنا دینا پڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ
ہر کامیاب جرم کی سازش پہلے پولیس اسٹیشن کے اندر ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ سودا
بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب مایا کے کھیل ہیں اور مایا کے روپ نیارے
ہیں۔ اسی لئے جرائم کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ جیب کاٹنے والا زیادہ سے زیادہ ہسٹری شیٹر
بن سکتا ہے اور کارہائے نمایاں انجام دینے والا سرمایہ دار ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے

کہ مہٹری شیٹر بننے کے لئے پولیس کی سرپرستی درکار ہوتی ہے اور سرمایہ داری کے لئے گورنمنٹ سے ساز باز کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ وانچو نے جیب کے اندر سے کچھ اور کرنسی نوٹ نکالے اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"انسپکٹر تیواری جب تک اس سرکل میں تعینات رہے۔ ہمانی انڈسٹری کی طرف سے ان کو اسی حساب سے ان کا حق برابر پہنچتا رہا۔" پھر خوشامد کرنے کے سے انداز میں مسکرا کر بولا "لیکن آپ کو اس طرح جاڑے پالے میں آکر پریشان ہونا پڑا ہے۔ اب اس پریشانی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔ لیجئے یہ دو سو اور ہیں۔ دیکھئے اب کچھ اور نہ کہیئے گا اور اپنا یہ ریوالور تو آپ اب اندر رکھ لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

مگر بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر اسی طرح ناراضگی کے انداز میں بولا:

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں ان دونوں لڑکوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے بغیر باز نہ آؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا بھی وقت خراب کر رہے ہیں اور خود بھی پریشانی اٹھا رہے ہیں۔" اور وہ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس دفعہ وانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اس نے بڑی جھکی نظروں سے انسپکٹر کو گھور کر دیکھا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اس کو خطرے کی نوعیت کا احساس ہوا تھا۔ اس لئے کہ دونوں لڑکس کسی طرح پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے تھے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا۔ یہی ہدایت تھی اور اس ذمہ داری کے لئے کمپنی سے اس کو نو سو روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ منیجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے چھ سو روپے اکسٹرا الاؤنس بھی ملتا تھا۔ وانچو کئی ماہ سے اپنی اس ڈیوٹی کو بڑی مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔ کمپنی اس کی کارگذاریوں کو سراہتی رہی ہے اور بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ میں بہت سی باتوں کے لئے اس کو جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے اور اکثر ایسے بے تکے سوالوں سے اس کو سابقہ پڑتا ہے کہ وہ بدحواس سا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ پانچ سو روپے سے زیادہ دو لڑکوں کے لئے رشوت نہیں دے سکتا۔ ورنہ آئندہ میٹنگ میں اگر کوئی ڈائرکٹر الجھ گیا تو بہت ممکن ہے کہ زائد رقم اس کو اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ دراصل ابھی تک فیکٹری کی تعمیر کے لئے کمپنی اپنے پاس سے صرف روپیہ لگا رہی ہے۔ شوگر

پلانٹ کا کانسٹرکشن ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ البتہ کمپنی کے وہ فارم جن میں ایکھ کی کاشت ہوگی، اُن میں ٹریکٹر چلنے لگے ہیں اور آلو کی فصلیں تیار کی جا رہی ہیں اور یہ آلو بوگی بیگس بھر کر قصباتی بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ آلوؤں کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں اور آئرن شیٹس بھی ٹرکوں میں لاد کر پوشیدہ طور پر بلیک مارکیٹ میں جاتے ہیں۔ کمپنی کو اپنی انڈسٹری کی تعمیر کے لئے سیمنٹ اور آئرن کا بہت بڑا سرپلس کوٹا مل گیا ہے جس کی سمگلنگ سنسان راتوں میں بڑے پراسرار طریقہ پر ہوتی ہے اور اس سازش میں پولیس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی کمپنی کے شریک ہیں۔

وانچو غور کرنے کے سے انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں اور چہرے کے تیکھے نقوش مجسموں کی طرح ٹھوس نظر آ رہے ہیں۔ پھر ایک بارگی اس نے طے کر لیا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ انھیں وحشت ناک موقعوں کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ کہنا ہے اس کے فیصلے کے لئے منٹ بھر کا عرصہ بہت ہے اور جو لوگ صرف انجام ہی پر غور کرتے ہیں وہ کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ آگے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا۔

" نیل کنٹھ، اے نیل کنٹھ مہاراج "

اور ٹرک کے اندر سے مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ دھنسی ہوئی آواز میں بولا۔

" کیا ہے سکریٹری ساب ؟ " پھر وہ اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کا آبنوسی جسم رات کے گہرے اندھیرے میں پرچھائیوں کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وانچو کہنے لگا۔

دیکھو نیل کنٹھ یہ سالا انسپکٹر تو کسی طرح مانتا نہیں اور تم جانتے ہو کہ دونوں ٹرک تھانے پر بھی نہیں جا سکتے "!

" وہ سینہ تان کر بولا " تو جو حکم ہو! "

گہری نیلی آنکھوں والے وانچو نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر سازش کرنے کے سے انداز میں اس نے ایک آنکھ دبا کر آہستہ سے کہا " مجھ کو تو صرف لائین کلیر کی ضرورت ہے زیادہ جھنجھٹ نہیں چاہیئے " پھر مڑتے ہوئے اتنا اور کہا " میں جا کر اس سے باتیں کرتا ہوں

تم ٹرکوں کی پشت پر سے گھوم کر آجانا سمجھ گئے نا!" اور ڈینیل کنھڑ جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں جرائم پیشہ لوگوں کی طرح خونخوار نظر آنے لگیں۔ وانچو وہاں سے سیدھا اینٹی کرپشن کے انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کو آتے ہوئے دیکھ کر تیزی سے بولا:

"آپ نے ٹرکوں کو اسٹارٹ نہیں کروایا! بلاوجہ دیر ہو رہی ہے۔"

وانچو بڑی سنجیدگی سے بولا "آپ تلاشی لیں گے یا ٹرکس اسی طرح چلیں گے؟"

وہ کہنے لگا۔ "بظاہر تو اب کوئی ایسی ضرورت نہیں۔ یوں جیسے آپ کی مرضی۔"

وانچو ایک بار پھر کاروباری انداز سے مسکرا دیا "انسپکٹر صاحب مرضی ہماری کہاں مرضی تو آپ کی ہے۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر آپ کی ناراضگی ختم ہی نہیں ہوتی۔"

وہ بے نیازی سے بولا "دیکھئے ان بے کار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا آپ کو جو کچھ کہنا ہو، آپ تھانہ پر چل کر کہہ دیجئے گا۔"

وانچو سنجیدہ ہو گیا "بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آئرن شیٹس اور سیمنٹ کا سرپلس کو ٹال لے سکتے ہیں۔ جو اس کو سمگل بھی کرا سکتے ہیں وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہی ہوں گے۔ چور چوری کرنے جاتا ہے تو باہر نکلنے کا رستہ پہلے دیکھ لیتا ہے۔" اور اس میں شک بھی نہیں کہ وانچو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس لئے کہ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ" کے ڈائریکٹر ایم۔ ایل سیٹھ ہیں اور ان میں سے ایک تو ریونیو منسٹر کا داماد بھی ہے اور اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر بھی ہے اور زور بھی ہے۔ لیکن بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ان رازہائے سربستہ کو نہیں جانتا۔ اس سرکل میں ابھی اس کا نیا نیا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اس لئے پورے علاقہ میں وہ اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا ہے۔ اور اس لئے ایک آدھ ٹرا کیس بنائے بغیر بات نہیں بنتی۔ اور پولیس کی ٹکنیک کے مطابق ایک بار جہاں ہوا بندھ گئی پھر تو لکشمی آکر خود قدم چومتی ہے اور اسی لئے وہ کسی طرح باز نہیں آ سکتا۔ وانچو کی باتوں پر جھنجھلا کر اس نے جواب دیا۔

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ ذرا چل کر حوالات میں ٹھہریئے

پھر دیکھیں گے کہ آپ لوگ اپنے بچاؤ کا کونسا طریقہ جانتے ہیں۔"

اس دفعہ وانچو بھی بپھر گیا۔ اس نے تیزی سے کہا "انسپکٹر صاحب مجھے کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ میں تھانے تک جانے سے پہلے بات کو یہاں بھی طے کر سکتا ہوں۔ آپ کے ایسے اینٹی کرپشن کے انسپکٹروں سے اکثر سابقہ پڑا کرتا ہے۔ اگر ان میں آپ کو کوئی مل گیا ہوتا تو اس طرح مونچھ اونچی کر کے آپ کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔"

انسپکٹر کے چہرے پر اور بھی خشونت آگئی۔ وہ اس کو بڑی تیکھی نظروں سے گھورنے لگا اور اسی وقت آبنوسی جسم والے نیل کنٹھ نے اندھیرے میں سے نکل کر اس کے سر پر آہنی راڈ اٹھا کر زور سے دے مارا۔ انسپکٹر نے دبی ہوئی کراہ کے ساتھ ہائے کر کے پھٹی ہوئی بھیانک آواز نکالی۔ اور لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا۔ وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے بوجھل جوتے سے رگڑ دیا۔ اور ریوالور کو چھین کر ٹیلوں کی طرف پھینک دیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک بھرپور لات مار کر بڑبڑانے لگا۔

"دھت تیرے کی۔ سالا کسی طرح مانتا ہی نہ تھا" اور پھر وہ نیل کنٹھ سے کہنے لگا۔

"بھاڑ میں ڈال دو سالے کو ادھر کنارے کی طرف!" اور پھر اطمینان سے ایک سگرٹ سلگا کر پوچھنے لگا "ہاں یہ دیکھو زخم گہرا تو نہیں۔ ورنہ بلا وجہ بات اور بڑھ جائے گی۔"

نیل کنٹھ کہنے لگا "ہاتھ بھرپور نہیں پڑا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

پھر نیل کنٹھ نے سڑک پر بے سدھ پڑے ہوئے بھاری بھرکم جسم والے انسپکٹر کا بازو پکڑا اور اس کو گھسیٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا کرخت چہرہ خون میں ڈوب کر بڑا بھیانک نظر آرہا تھا۔ اور سانس سہمی ہوئی سی چل رہی تھی۔ وہ اسی طرح جھکے ہوئے کوہستانی ٹیلوں کے دامن میں کسی لاش کی طرح بے جان پڑا رہا اور آغاز سرما کی تھکی ہوائیں پتھریلی چٹانوں میں ہانپتی رہیں اور ایک بارگی کہیں نزدیک ہی گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

دونوں ٹرکوں کے اسٹارٹ ہونے کی گھڑگھڑاہٹ سنسان رات میں ابھرنے لگی۔ اور وہ موٹر سائیکل کو بری طرح روندتے ہوئے سڑک پر پھر چلنے لگے۔ لیکن احمد پور جانے کی بجائے اب وہ جنوبی ٹیلوں کی طرف مڑ رہے تھے اور کوئی ستر میل کا چکر کاٹنے کے بعد دونوں ٹ

پھر اسی چوراہے پر پہنچ گئے۔ جہاں لوہے کے کھمبے پر لگے ہوئے بورڈوں پر لکھا تھا:۔

بلبیر گھاٹ، اکیاون میل۔

بھجنواں کلاں، اٹھارہ میل

نرہام باڑہ ، چوراسی میل

احمد پور ، ایک سو باون میل

قریب ہی ڈسٹرکٹ ایکسائز ٹیکس آفس تھا جس کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا اور بوڑھا محرر رجسٹروں کو کھولے ہوئے کھانس رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں پر دونوں ٹرکوں کی چنگی کا محصول ادا کیا گیا تھا۔ وانچو ٹرک پر سے اترا اور سیدھا سائبان کے نیچے چلا گیا اور سرگوشی کے لہجے میں آہستہ سے بولا:

"منشی جی میرے خیال میں، آپ کے رجسٹروں میں ٹائم تو درج نہ ہوتا ہو گا" اور پھر بغیر جواب کا انتظار کئے ہوئے اس نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تیس روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے "لیجئے ان کو رکھ لیجئے۔ اگر کوئی دریافت کرنے آئے تو کہہ دیجئے گا کہ دونوں ٹرکس کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے۔ سمجھ گئے نا آپ!"

اور بوڑھے محرر نے اپنی گردن ہلا دی "ایسا ہی ہو جائے گا۔ پر کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں!"

وانچو ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر کہنے لگا "جب تک ہم موجود ہیں اس وقت تک بھلا آپ پر کوئی آنچ آسکتی ہے"

وہ بھی ہنسنے لگا "سو تو ہے۔ پر بات اتنی ہے سرکار کہ اب زمانہ بڑا خراب ہو گیا ہے ذرا ذرا سی بات میں سسر بال کی کھال نکالتے ہیں"

اور پھر چونگی کے بوڑھے محرر کو مطمئن کر کے وہ مسکراتا ہوا ٹرک کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک پھر روانہ ہو گئے۔ سامنے پتمبر پور روڈ اندھیرے میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ مگر دونوں ٹرک پھر اس طرف جانے کی بجائے راہیل روڈ کی طرف مڑ گئے۔ وانچو نے گھڑی میں وقت

دیکھا۔ اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اور پھر دو بجنے سے پہلے ہی دونوں ٹرک امیر گڈھ پولیس اسٹیشن کے قریب جاکر ٹھہر گئے۔ وانچو تھانہ کے اندر چلا گیا۔ اور ڈیوٹی انسپکٹر کو ڈیڑھ سو روپے دیکر اس نے ایک ٹرک کا چالان کرا دیا۔ روزنامچہ میں درج کر دیا گیا۔

"ٹرک نمبر ۳۱۲۳، نو بجے شب کو راہیل روڈ پر سے گذرتے ہوئے بغیر ہیڈ لائٹس کے پایا گیا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری خراب تھی۔ ٹرک مذکور، یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے اور اس میں آلو کے بورے لدے ہوئے تھے"۔

اور اسی طرح کھیم پور کے تھانہ پر اور مزید ڈیڑھ سو روپے رشوت دے کر دوسرے ٹرک کا بھی چالان کرا دیا گیا۔ اور ہیڈ کانسٹیبل سرکاری روزنامچہ میں اندراج کرنے لگا۔

"پونے دس بجے شب کو ٹرک نمبر ۲۲۴۸ راہیل روڈ پر اتنی تیز رفتار سے گذر رہا تھا کہ کسی حادثہ کے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ڈیوٹی انسپکٹر ہر نام سنگھ نے اسکوٹر کو اگر تحقیقات کی تو یہ بھی دریافت ہوا کہ ڈرائیور مسمی نظر محمد کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا — !"

اس کے بعد دونوں ٹرک پھر راہیل روڈ پر تیزی سے گذرنے لگے۔ اور صبح کاذب کی گہری دھند میں دونوں ٹرک بلبیر گھاٹ پہنچ گئے۔ پھر چھ بجے سے پیشتر ہی وانچو بھارت انجنیرنگ ورکس کی نئی اسٹوڈی بیکر پر واپس لوٹ پڑا۔ اور ابھی دھوپ اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی کار فیکٹری کے پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔

وانچو اپنے دفتر میں جاکر حسب معمول کمپنی کے کاموں میں الجھ گیا۔ اور رات کے حادثہ کی اہمیت سنیچر کے روز ہونے والے اس ڈریلمنٹ سے زیادہ نہ رہی جس میں ریلوے کی ایک کیرج فیکٹری کے یارڈ کے اندر ڈیچ ہو گئی تھی اور اس نقصان کے لئے ریلوے نے کوئی چار ہزار روپے کا کلیم کیا تھا اور عدالتی کارروائیوں کے لئے ہر مندر پرشاد ایڈووکیٹ کمپنی کے مشیر قانونی موجود ہی تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی تفتیش برابر ہوتی رہی۔ اور انٹی کرپشن کا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر، ہسپتال میں پڑا کراہتا رہا۔ اور مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ بھنگ چڑھا کر ٹھاٹھ سے

گالیاں بکتا۔ اور اپنے کوارٹر کے اندر لیٹا ہوا رات گئے تک اونچی آواز میں آلہا گایا کرتا۔
"اور اگر تمہاری بات نہ مانی جائے تو؟"
"پھر تو کنور صاحب اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔"
"لیکن دلیپ چند تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں کمپنی کا منیجنگ ڈائرکٹر ہوں۔"
کمرے کے اندر اسی طرح تیز لہجہ میں باتیں ہوتی رہیں۔ آتش دان میں کوئلے چٹخ رہے تھے دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں لانچو کا گنجا سر چمکنے لگا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا بھدا سا پائپ پیتا رہا۔ دریچہ سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے اندر آ رہے تھے اور فیکٹری کے ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ باہر ہلکی نیلگوں کہر کے لچھے منڈلا رہے تھے۔ اور اس دھند میں لپٹی ہوئی منیجنگ ڈائرکٹر کی خوبصورت کوٹھی اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے باہر برآمدے میں نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ کو ٹکائے ہوئے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ برآمدے میں بالکل اندھیرا تھا اور اس گہری تاریکی میں نیل کنٹھ کا سیاہ آبنوسی جسم آسیب زدہ سائے کی طرح ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔
نیل کنٹھ اس طرح اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا اور جب کبھی دلیپ چند تیزی سے بولتا تو وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف گھبرا کر دیکھتا۔ جیسے اب کچھ نہ کچھ ہونے ہی والا ہے۔ لیکن دلیپ چند اندر بیٹھا ہوا اطمینان سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے "سیڈ" کی پرچھائیں پڑ رہی ہے اور اس دھندلی روشنی میں اس کا منحنی جسم ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر نظر آ رہا ہے۔ مگر دلیپ چند کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہے اور کمپنی کی غیر قانونی سازشوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ بات نیلی آنکھوں والا لانچو بھی جانتا ہے اور اس کی اہمیت منیجنگ ڈائرکٹر کو بھی معلوم ہے۔ جس کو فیکٹری کے اندر سب لوگ کنور صاحب کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیردار ہے۔ وہ کاروباری ٹکنیک سے زیادہ گھوڑوں کی نسلیں اور عورتوں کی مختلف قسموں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے زندگی بھر ریس میں گھوڑے دوڑائے ہیں اور عورت کے جسم پر کسی کیمیاگر کی طرح کوک شاستر کے تجربے کئے ہیں اور جب سے جاگیرداری پر زوال آنے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت

کرنے لگی ہیں۔ اس نے بھی اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لئے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا اور اس دور اندیشی نے اس کو کنور شیو راج سنگھ سے ایک باسگی یونائیٹڈ انڈسٹریز کا منیجنگ ڈائرکٹر بنا دیا ہے۔ لیکن کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے بڑی بے نیازی سے کہہ دیا:۔

" اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔ سارے رجسٹر میرے ہی پاس رہتے ہیں "

منیجنگ ڈائرکٹر ایک بارگی برافروختہ ہوکر بولا " ٹھیک ہے کہ تمام رجسٹر تمہاری نگرانی میں رہتے ہیں مگر اس بات سے تمہارا مطلب ؟"

وہ کہنے لگا چوٹ کھایا ہوا انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کنور صاحب آپ میرے ساتھ حق تلفی کریں گے تو میں بھی سارے رجسٹروں کو کل ڈائرکٹروں کی میٹنگ میں پیش کر سکتا ہوں"

منیجنگ ڈائرکٹر کے سانس کی رفتار ایک دم سے تیز ہو گئی اور وہ منحنی جسم والے دلیپ چند کو عقابی نظروں سے گھورنے لگا۔ لیکن دلیپ چند بیٹھا ہوا مزے سے اپنی کنپٹی کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ منیجنگ ڈائرکٹر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے، دیپ چند اس کی سازش کے اتنے بڑے راز کا محافظ ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سیمنٹ اور آئرن جن داموں پر چور بازار میں فروخت ہوتا ہے۔ کمپنی کے رجسٹروں میں ان کی قیمت بہت کم درج کی جاتی ہے۔ اور اس طرح اب تک منیجنگ ڈائرکٹر نے پوشیدہ طور پر کوئی دو لاکھ روپیہ غبن کر لیا ہے۔ لیکن دیپ چند کو اپنے اعتماد میں رکھنے کے لئے اس نے دس فیصدی کا شریک دار بنا لیا تھا۔ اور اس بیس ہزار روپے کی ادائیگی کے لئے اس کی نیت بدل گئی۔ اور دیپ چند کے اکثر توجہ دلانے پر بھی وہ برابر ٹالتا رہا۔ لیکن دیپ چند یہ طے کرکے آیا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کرکے جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی بڑی لڑکی کرشنا وتی کے بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے سے طے پا چکی ہے۔ گھر اچھا ہے اس لئے کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر لگن ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے کائستھوں کے رواج کے مطابق ابھی اس کو دس ہزار روپیہ تلک

میں دیتا ہے ۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہو سکتی ۔ لیکن منیجنگ ڈائرکٹر چاہتا ہے کہ بورڈ آف ڈائرکٹرز سے سفارش کرے اس کی تنخواہ کو ڈھائی سو روپے ماہانہ سے ساڑھے تین سو کروا دے مگر دیپ چند کو یہ رشوت منظور نہیں ہے ۔ اسے بیس ہزار روپیہ چاہیئے ہے اس لئے کہ وہ اپنی لڑکی کا بیاہ جلد ہی کر دینا چاہتا ہے ۔

منیجنگ ڈائرکٹر کا چہرہ جھنجھلاہٹ کے اثر سے برابر غضبناک ہوتا جا رہا ہے ۔ اس کی کاروباری زندگی پر جاگیرداری کا روپ برابر حاوی ہوتا جا رہا ہے ۔ پھر یکبارگی وہ کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر سے صرف رانی بانسارہ کے علاقہ کا کنور شیوراج سنگھ رہ گیا۔ اس نے میز پر زور سے گھونسہ مار کر کہا :

"تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ" اور پھر وہ چیخ کر زور سے بولا "جاؤ جو تمہارے جی میں آئے کرو"

اور منحنی جسم والا نا ملک کا منجرہ مسکین سی شکل بنائے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر دروازے کے باہر چلا گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی ۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے کوئلے کبھی کبھی چٹخنے لگتے ہیں ۔ اور باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے

پھر وانچو نے اپنا مجلد ایپ میز پر رکھ دیا ۔ اور منیجنگ ڈائرکٹر سے کہنے لگا :۔

"کنور صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا ؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہے ۔ کل سویرے ہی اس کو نوٹس دے کر نوکری سے علیحدہ کر دو ۔"

وانچو گھبرا کر بولا "لیکن اس طرح سے تو کام نہیں چلے گا ۔ بلکہ اب تو وہ اور بھی آسانی سے ہم کو بلیک میل کر سکتا ہے ۔ اس لئے کہ اس کے پاس ہمارے خلاف بہت سے ڈاکومینٹری ثبوت موجود ہیں ۔"

کنور شیوراج سنگھ گہری خاموشی میں کھو گیا اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا پھر اس نے بڑی بے چارگی سے کہا "اچھا تو اب کچھ تم ہی کرو ۔"

وانچو کہنے لگا "آپ ذرا اندر کوٹھی میں تشریف لے جائیں ، سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا

میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر کوئی حرف آسکتا ہے"؟

کنور شیو راج سنگھ نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر سے اٹھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو اندر کمرے میں بلایا اور اس سے کہنے لگا:۔

"نیل کنٹھ مہاراج، دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دور نہ گیا ہوگا۔ تم جا کر اس کو بلا لاؤ، کہنا کہ سکریٹری صاحب نے بلایا ہے"۔ اور نیل کنٹھ تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہمراہ دیپ چند بھی تھا۔ نیل کنٹھ پھر جا کر ورانڈے میں ٹھہر گیا اور وانچو دیپ چند سے کہنے لگا:

"اکاؤنٹنٹ صاحب آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ بوڑھے ہونے کو آ گئے۔ مگر مزاج پہچاننا آپ کو ابھی تک نہیں آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے"!

لیکن دیپ چند بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا "ترپ" ٹھیک پڑا ہے اور اب وہ اس کے قابو سے نکل کر جا نہیں سکتے۔ اس دفعہ وہ بھی ذرا نرمی سے بولا۔ "مگر سکریٹری صاحب یہ تو دیکھئے کہ کنور صاحب تو سیر اگلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کرتا بھی کیا"؟

وانچو اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگا۔ "کمال کر دیا آپ نے۔ اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کاروباری بکھیڑے میں آکر پھنسے ہیں۔ انھوں نے تو ہمیشہ حکم چلائے ہیں اور اپنی جاگیر میں من مانی حکومت کی ہے۔ دیکھئے رئیسوں سے بات کرنے کا اور ہی گُر ہوتا ہے۔ ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں کرتے جائیے۔ پھر جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجئے"۔

اور دیپ چند نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا ہو۔ ذرا پشیمانی کے سے انداز میں کہنے لگا "اب کیا عرض کروں سکریٹری صاحب۔ مجھے بھی اس وقت نامعلوم کیا سوجھی کہ ان کے سامنے ذرا تیزی سے بات کہنے لگا۔ دراصل میں اپنی لڑکی کی سگائی کے سلسلے میں ادھر بڑا پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بواسیر کا پرانا مریض ہوں۔ روز بروز تندرستی گرتی جا رہی ہے

اپنی زندگی میں ہی اس کے ہاتھ پیلے کردوں۔ بس اب تو یہی اُلجھن ہے۔"

وانچو ہمدردی کرنے لگا "جی ہاں! اس لڑکی کا ہونا بھی اس سوسائٹی میں ایک بڑی مصیبت ہوتی ہے لیکن بات کے اس پہلو پر آپ نے زور دیا ہوتا تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ ریس بازی پر تباہ کیا ہے۔ کیا اس کنیا دان کے لئے وہ کچھ نہ کرتے۔"

"اچھا تو آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟"

وانچو کہنے لگا "کہئے گا کیا۔ کنور صاحب نے جب آپ سے وعدہ کیا ہے تو آپ کو پچاس روپیہ ملے گا۔"

نحیف جسم والے دیپ چند کے روکھے چہرے پر ایک انوکھی زندگی کی رمق پیدا ہوگئی۔ وہ مسکرا کر بولا "آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں۔" پھر اس نے میز کی دراز میں سے کنجی نکالی اور دیپ چند کے سامنے اس کو ڈال کر کہنے لگا "لیجئے ذرا سیف میں سے چیک بک نکال دیجئے میں آپ کے لئے ابھی چیک تیار کئے دیتا ہوں۔ اس وقت تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ سویرے آفس پہنچنے سے پہلے ہی ان سے دستخط کروا کے آپ کو چیک دے دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔"

اور دیپ چند جیسے واقعی مطمئن ہوگیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور چپ چاپ گھبرائے ہوئے انداز میں کنجی اٹھائی اور دیوار کے پاس کھڑے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دیپ چند نے اس کے اوپر لگے ہوئے گہرے سبزی مائل چھوٹے بلب کو دیکھا جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ گویا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے تالے کو کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچ لیا۔ آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آنے لگا اور وانچو گردن موڑے ہوئے مجرمانہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور جیسے ہی دیپ چند نے آہنی سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر اس کو کھولنا چاہا اسی وقت وانچو نے دیوار میں لگے ہوئے سوئچ کو دبا دیا۔ دیپ چند ایکا ایکی بڑی بھیانک آواز سے چیخا۔ پھر اس کے کراہنے کی دبی، دبی آوازیں گہری خاموشی میں ہانپنے لگیں اور وانچو نے جھٹ سے کمرے کو اندھیرا کر دیا۔ آتش دان کی گہری سرخ روشنی میں اس کا بے ہنگم سایہ سامنے والی دیوار پر

بڑا ہیبت نظر آنے لگا۔ دیپ چند کے حلق کے اندر سے بلیوں کے غرانے کی سی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں اور باہر فیکٹری کے ورکشاپ میں لوہے کے ٹکرانے کی جھنکاریں دھڑک رہی تھیں۔ ہر طرف کہر بار دھند لکا چھائے ہوئے تھا اور کمرے کی آسیب زدہ تاریکی میں کھڑا ہوا وانچو بڑا پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کے گنجے سر پر پسینہ کی نمی آ گئی تھی۔ پھر وہ خواب میں بھٹکنے والے سایوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا آہنی سیف کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ اور ذرا دیر تک بالکل ساکت کھڑے رہنے کے بعد اس نے دیپ چند کی طرف دیکھا۔ جس کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل سے الجھا ہوا تھا۔ اور وہ فرش پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں بڑی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وانچو خونخوار لگا ہوں سے کھڑا ہوا اس کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیل کنٹھ کو آواز دی۔ اور نیل کنٹھ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا حکم ہے سکریٹری ساب؟"

وانچو کہنے لگا "جاؤ ورانڈے میں لگے ہوئے سوچ کو 'آف' کر دو، اور اس کے بعد کمرے کے اندر چلے آنا۔"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر آہنی سیف پر جلتا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب بھی بجھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی اور اس کے ساتھ ہی دیپ چند کا ہاتھ ہینڈل سے چھوٹ گیا اور اس کا بے جان جسم فرش پر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور نیل کنٹھ اندر آ گیا۔ وانچو اس سے کہنے لگا:۔

"اس کو اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں۔" اس کی آواز میں دبی ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔

نیل کنٹھ نے ایک بار بھرپور نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ مر گیا؟ پھر اس نے دیپ چند کی لاش کو اٹھا کر اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لاد لیا اور کسی کبڑے کی طرح کمر کو جھکائے ہوئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ پھر وانچو نے دیوار پر لگے ہوئے آہنی سیف کے سوئچ کو احتیاطاً دبا کر "آف" کر دیا اور اپنی کوٹ کی جیب میں سے ٹارچ

نکال کر اس کو روشن کیا۔ پھر اس تیز روشنی میں وہ سیف کے پاس پہنچا اور اس کی پشت پر لگے ہوئے فلکس ایبل وائر کو علیحدہ کر دیا اور دیوار پر لگے ہوئے برہنہ الیکٹرک وائر پر لڈ ٹیسٹ جوڑ کر دونوں اسکرو، اچھی طرح کس دیئے۔ لیکن ابھی تک آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ اور جب وہ اس کے دروازے کو بند کرنے لگا تو ایک بار گی اس کو دیپ چند کی پھٹی ہوئی آنکھیں یاد آ گئیں۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا اور آتش دان کے اندر دہکتے ہوئے انگارے کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح چٹخنے لگے۔ وانچو کی سانس اب تیزی سے چلنے لگی اور وہ بدحواس سا کمرے کے باہر چلا گیا۔ کوٹھی کے اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے مین سوئچ "آن" کر دیا۔ اور ایک دم سے دریچوں پر روشنی کی ہلکی ہلکی لہریں جھلملانے لگیں۔ اس وقت کوٹھی کے اندر سے کنور صاحب کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا باہر لان میں چلا گیا۔ جہاں نیل کنٹھ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وانچو نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کو دھیرے سے آواز دی اور دونوں گہری دھند میں کھوئے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ان کے قدموں کی دبی دبی آہٹ سنسان راستہ پر دور تک سنائی دیتی رہی!

رات گئے جب نیل کنٹھ اپنے کوارٹر پر واپس آیا تو دھندلی روشنی میں اس نے ایک دبلے پتلے بچے کو دیکھا جو سردی سے سکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ دیپ چند اکاؤنٹنٹ کا لڑکا منا تھا اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں بوڑھے چوکیدار کو پکار رہا تھا "پربھو بابا، اے پربھو بابا" اور پھر پربھو بابا اندر سے کھانستا ہوا باہر نکلا اور اور اس کو دیکھتے ہی حیرت سے بولا۔

"ارے تم اس سمے کہاں نکل پڑے۔ ہائے رام، کتنے زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے!"

سردی سے سکڑا ہوا منا کہنے لگا۔ "بابوجی ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ماں جی گھبراتی ہیں۔ سو انھوں نے مجھ کو پوچھنے کے لئے بھیجا ہے اور کرشنا دیوی تو رات کو نکلتی نہیں۔"

بوڑھا چوکیدار کہنے لگا کہ وہ کنور صاحب کی کوٹھی پر گئے ہوں گے۔ میں ابھی جا کر ان سے کہہ دوں گا۔ چلو پہلے میں تم کو کوارٹر تک چھوڑ آؤں۔ اور وہ لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر چل دیا۔

نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا ہوا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر ایک بارگی اس نے سنا کہ منا اٹھ کر کہنے لگا تھا:
”نیل کنٹھ نانا! تم جا کر بابوجی کو لے آؤ۔ میں کوارٹر پر جا نہیں سکتا۔ جلدی سے آ جانا۔ وہ ننھی بلو بھی بابوجی کے بنا اس کو نیند نہیں آتی۔ خوب زور زور سے روتی ہے۔“

اور جیسے نیل کنٹھ کے کان کے پاس کوئی سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا۔ جا منا۔ اب تمہارے بابوجی کبھی نہیں آئیں گے۔ اور ننھی بلو روتے روتے ان کے بغیر ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے اندر چپ چاپ پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں، نہ کسی کی کچھ سنتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان تک نہیں پہنچ سکتی۔

اور نیل کنٹھ محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم موم بتی کی طرح پگھلنے لگا ہے اور اس کے چاروں طرف جیسے دبی دبی سسکیاں دھڑک رہی ہیں۔ پھر وہ خواب کے سے عالم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچا اور اس کو کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اس شور سے وہ اچانک چونک پڑا اور اس کو یاد آ گیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ پھر کوارٹر کی پشت پر جا کر صحن کی پچھلی دیوار کو پھاند کر اندر آ گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی پتھروں والی اونچی دیوار کو پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گشت کرنے والے پہریداروں کی بھیانک سیٹیاں دیر تک چیختی رہیں۔ اور پھر اپنے کمرے کے اندر لیٹا ہوا وہ بڑی رات تک نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹ بند رہے۔ اس لئے کہ چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند کی اچانک موت ہو گئی تھی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس کے اندر پائی گئی۔ اس نے الیکٹرک بجلی کے پر سوئچ "لیس بار" کو غلطی سے چھو لیا تھا اور اس حادثہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی فیکٹری کے یارڈ میں یہ بھی سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ دیپ چند نے خودکشی کر لی ہے اور اس کی وجہ جاننے کے لئے کتنی ہی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن سہ پہر کو پروگرام کے مطابق ڈائرکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور کنور شیو راج سنگھ کی سفارش پر دیپ چند کے بے سہارا خاندان کے لئے پانچ ہزار کی رقم گزارے کے لئے منظور کر دی گئی۔

فیکٹری کی تعمیر ایکا ایکی سست پڑتی جا رہی ہے۔

پھاگن کی بھیگی ہوئی ہوائیں چلنے لگی ہیں اور ان تیز ہواؤں میں سرسوں کے گہرے زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگتی ہیں۔ اور کھیتوں میں جیسے بسنتی آنچل لہرا جاتے ہیں۔ کھیتوں میں رات گئے تک ڈھولک اور جھانجھنیں بجا کرتی ہیں اور ہولی کے راگ اونچے سروں میں گاتے جاتے ہیں۔ پھر گاؤں کے اندر بڑے بڑے الاؤ دہکنے لگیں گے اور عبیر و گلال اڑنے لگے گا۔ پھاگن کی ہوائیں چیختی پھر رہی ہیں کہ ہولی آ رہی ہے، ہولی آ رہی ہے۔ پھر گیہوں کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی اور دور کے شہروں میں کام کرنے والے گاؤں کے لوگ موسم سرما میں جھیلوں پر اکٹھا ہونے والے آبی پرندوں کی طرح اپنی بستیوں میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی فیکٹری کے یارڈ میں مزدوروں کا شور روز بروز مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ فصلوں کی کٹائی کرنے کے لئے کمپنی کے سارے قلی دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتہ کی مزدوری روک لی ہے۔ اس بات سے قلیوں کے روکھے چہروں پر ہر وقت جھنجھلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ وہ ٹائم کیپر آفس میں اکٹھا ہو کر زور زور سے چلاتے ہیں۔

"یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ سب کیا ہے؟ ہولی کا تہوار آ رہا ہے، ہم کو پیسہ چاہیئے ہے!"

"ہاں ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے، ہم کو اپنی مزدوری چاہیئے ہے!"

لیکن مزدوری ابھی نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ کمپنی چاہتی ہے کہ شوگر کا پلانٹ جلدی تعمیر ہو جائے۔ نہیں تو کمپنی کا بہت نقصان ہو جائیگا۔ مگر مزدور لوگ اس کے باوجود بھی نہیں ٹھہرتے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں، سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ پھر کسی روز تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر اپنی بستی کو چل دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بورڈ آف ڈائرکٹرز کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی اور یہ طے ہوا کہ قلی لوگوں کا ریٹ بڑھا دیا جائے۔ اس لئے کہ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اس کے بعد مزدوری کے ریٹ بڑھنا شروع ہو گئے۔

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

ایک روپیہ چودہ آنے یومیہ!

مگر ان تینوں ہفتوں میں ریٹ بڑھانے کا تجربہ بھی کچھ کارگر ثابت نہ ہوا۔ بلکہ ہولی کا الاؤ دیکھتے ہی مزدوروں نے اور بھی تیزی سے کام سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ہر روز ٹائم کیپر رجسٹر لے کر مینیجنگ ڈائرکٹر کے آفس میں جاتا اور سہمی ہوئی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینیجنگ ڈائرکٹر جھنجھلا کر مزدوروں کے ساتھ سہمے ہوئے ٹائم کیپر کو بھی گالیاں دینے لگتا۔ پھر ایک روز اس نے وانچو کو اپنے دفتر میں بلایا اور پریشانی کے عالم میں کہنے لگا:

"مسٹر وانچو آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا؟"

مگر وانچو بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کنور صاحب! بات یہ ہے کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس دفعہ بھی سن رہا ہوں کہ فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے ٹھاٹھ ہو گئے ہیں۔ اب انھیں یہ فیکٹری کی نوکری کیا اچھی لگے گی اور یہ زمینداری بالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔"

وہ اور بھی پریشان ہو کر بولا" تم نے تو پوری کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یہ بتاؤ کہ لیبر کا کیسے بندوبست ہو۔"

وانچو ذرا دیر تک مینیجنگ ڈائرکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولا "میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے لیکن اس میں خطرہ بھی ہے اور روپیہ بھی اچھا خاصا خرچ ہوگا۔"

مینیجنگ ڈائرکٹر جلدی جلدی کہنے لگا" ذرا اپنے کو بچا کر کام کرنا اور روپیہ کی تم فکر نہ کرو میں ڈائرکٹروں سے نبٹ لوں گا اور یوں بھی کچھ کم خرچ ہو رہا ہے۔ اگر آئندہ سیزن تک فیکٹری اسٹارٹ نہ ہوئی تو یہ سمجھ لو کہ کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔"

وانچو پوچھنے لگا" آپ کے خیال میں یہ بنگالی کیمسٹ سانیال کیسا آدمی ہے۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

وہ گردن ہلا کر بولا" میں سمجھتا ہوں کہ آدمی تو وہ کام کا ہے۔ انارکسٹ پارٹی میں بھی سال تک رہ چکا ہے۔ انہیں دنوں پولیس نے ایک بار گرفتار کر لیا تھا۔ بہت بری طرح اس کو ٹارچر کیا

مگر اس نے ذرا بھی سراغ نہ دیا۔ تم اس پر اعتبار کرسکتے ہو۔"

پھر وانچو نے چپراسی کو آواز دی اور اسکو سانیال کے بلانے کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بھدے چہرے والا کیمسٹ دفتر کے اندر آگیا۔ وانچو نے خاموشی کے ساتھ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور پھر پوچھنے لگا "مسٹر سانیال نومبر کے مہینہ میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی بھیجے گئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہاں آپ نے گورنمنٹ لیباریٹری سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔ وہاں کوئی آپ کا جاننے والا تو نہیں ہے ؟"

بھدے چہرے والا سانیال ذرا دیر تک غور کرنے کے بعد بولا "جی ہاں! میرے ایک رشتہ دار اس میں کام کر رہے ہیں، جن کے فلیٹ میں دو روز تک میں ٹھیرا بھی تھا۔"

اور وانچو کا گھبرایا ہوا چہرہ ایک بارگی جیسے دمک اٹھا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا "پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ دیکھئے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیے اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعہ بمبئی پہنچ جائیے، آپ کو گورنمنٹ لیباریٹری کے ذریعہ ایک بڑا اہم کام کرنا ہے۔" اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ٹیلیفون اٹھا کر دہلی کے واسطے سیٹ کی ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی اور سہ پہر تک دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر اس کو دیدیا۔ پھر شام کے وقت منیجنگ ڈائرکٹر کی کوٹھی پر سانیال وانچو کے ساتھ بند کمرے کے اندر دیر تک راز دارانہ باتیں کرتا رہا اور پروگرام کے مطابق شب کی ٹرین سے دہلی روانہ ہوگیا۔

پانچویں دن فیکٹری میں سانیال کا بمبئی سے ٹیلیگرام آیا۔ لکھا تھا "ہارڈویئر کا بازار بہت خراب ہے۔ کرشنگ سلنڈر ابھی تک نہیں ملا۔" وانچو نے تار کو کئی بار پڑھا اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا اس "کوڈ نیوز" پر غور کرتا رہا۔ پھر کئی روز اور گذر گئے لیکن کوئی اطلاع نہیں ملی اور وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور بدنما معلوم ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک روز فیکٹری کا کیمسٹ سراسیمگی کے عالم میں اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش گھبراہٹ سے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔ وانچو کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا خبر لائے ہو؟"

"کام تو بن گیا؟"

وانچو مسکرانے لگا "تو پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

سانیال دروازہ کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب جھک کر کہنے لگا "مجھے ایک شخص پر شبہ ہوا ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔" وانچو لحظہ بھر کے لئے گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا:

"اچھا آپ جاکر ذرا نہا دھوکر کچھ آرام کیجیے۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

سانیال ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دفتر سے باہر چلا گیا۔ اور وانچو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ بھدے چہرے والا کیمسٹ فیکٹری کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ وانچو چپ چاپ کھڑا ہوا دیکھتا رہا اور جب ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پھر اپنی میز پر آ گیا اور ٹیلیفون اٹھا کر منیجنگ ڈائرکٹر کو رنگ کیا۔ وہ کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے بنگالی کیمسٹ کے آنے کی اس کو اطلاع دی اور خود بھی دفتر سے نکل کر کنور صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

اور جب رات ذرا ڈھل گئی اور گہرے سناٹے میں ہواؤں کا شور تیز ہو گیا تو وانچو نے فیکٹری کی جیپ اسٹارٹ کی جس کی پچھلی سیٹ پر آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ خاموش بیٹھا ہوا تھا فیکٹری کے احاطے سے نکل کر جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ تیرہ میل تک پختہ سڑک ہے اس لئے جیپ سنسناتی ہوئی تیزی کے ساتھ گذرتی رہی۔ مگر جب ناہموار پتھریلی سڑک آگئی تو جیپ کو جھٹکے لگنے اور وہ کھڑکھڑانے لگی۔ لیکن وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا اس کو ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بڑا پراسرار سکوت چھایا ہوا ہے۔ اور نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ باہر پھاگن کی ہوائیں چل رہی ہیں پھاگن کی ہوائیں جو ہولی کا سندیسہ لاتی ہیں۔ اور ہولی جاب ختم ہو چکی ہے۔ اب گیہوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں اور ہنسیا کی تیز باڑھ سے لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں کھیتوں

میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ جانے اشیر آدمی کے خوبصورت گاؤں میں اب بھی نیل کنٹھ مہاراج کو کوئی یاد کرتا ہے جس کی کشادہ چوپال پر بیٹا چرچا رہا کرتا تھا اور ایکا ایکی بانسی کی لے پر جھومنے والے ناگ کی طرح وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"میں ایک کسان ہوں، ہاں میں کسان ہوں۔!"

پھر کسی نے فوراً ہی اس کا گلا دبوچ لیا، نہیں تو مجرم ہے، تو مجرم ہے۔ پولیس تیرا وارنٹ لئے ابھی تک تلاش کر رہی ہے۔

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا۔ سامنے وانچو اطمینان سے اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور پتھریلی سڑک پر جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور ستاروں کی مدھم روشنی میں کوہستانی چٹانیں سایوں کی طرح کوسوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر ایک بارگی وانچو نے جیپ کو نیچے ڈھلوان پر گھما دیا۔ نیل کنٹھ گھبرا کر اپنی سیٹ سے چمٹ گیا۔ لیکن جیپ ڈگمگاتی ہوئی آہستہ آہستہ گنجان درختوں کے نیچے کچھ دور تک چلتی رہی اور پھر گہرے اندھیرے میں جا کر ٹھہر گئی۔ اور دونوں اتر کر نیچے آ گئے۔ وانچو نے آگے والی سیٹ کے نیچے سے ڈائنا مائٹ کے بھاری کیس کو باہر نکالا۔ یہ ڈائنا مائٹ جس کو فیکٹری کا کیمسٹ بمبئی سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ جس کو گورنمنٹ لیبارٹری سے سمگل کیا گیا تھا اور جس پر کمپنی کا نو ہزار سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا۔ پھر نیل کنٹھ نے اس کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیا اور دونوں اندھیرے میں چلنے لگے ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور درختوں سے الجھتی ہوئی کوہستانی ہوائیں ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اندھیرا بہت گہرا تھا اور پتھریلی چٹانوں میں بہنے والی کوکیلا ندی کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ دونوں اسی طرح کئی فرلانگ تک چلتے رہے۔ پھر ایک جھکے ہوئے ٹیلے پر سے گزر کر جب وہ نشیب میں پہنچے تو پتھروں سے ٹکراتا ہوا دریا کا شور بڑا ہیبتناک معلوم ہونے لگا تھا۔ اس وادی میں کوکیلا ندی کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ دونوں طرف سربلند کوہسار ہیں اور جہاں پر دریا کا دھارا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اسی مقام پر سرکاری ڈیم بنا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے اس کو تعمیر کروایا ہے۔ اس باندھ کے پاس پانی گرجتا ہوا اونچائی پر سے گرتا ہے اور قریب ہی ندی میں پتھریلی

کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے جس کے سامنے دو پہرے دار سنگینوں کو سنبھالے مستعدی
سے کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وانچو کی ہدایت کے مطابق نیل کنٹھ ڈائنا مائٹ کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ
بکھرے ہوئے پتھروں پر چلنے لگا۔ اور پھر وانچو اس کے وائر کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے پتھریلی
چٹانوں کے اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ اس کی ٹکٹکی نظریں سامنے پتھروں پر جاتے ہوئے نیل کنٹھ
کا پیچھا کرتی رہیں۔ ڈیم کے پاس پہنچ کر اچانک وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا اور دریائے گیلا
کا تیز دھارا ڈیم کے نیچے گرجتا رہا۔ اس مہیب شور میں پھاگن کی ہوائیں جیسے سو گئی تھیں اور
سربلند کوہسار خوابوں میں ڈوبے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایکا ایکی ڈیم کے اوپر دھندلی
روشنی میں ایک انسانی سایہ لہرایا اور اسی وقت پتھریلی عمارت کے نزدیک کھڑے ہوئے
پہرے دار نے چیخ کر کہا۔

"ہالٹ!"

"ہے کون ہے، ٹھہر جاؤ"

اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی تیز آواز وادی کے اندر دھڑکنے لگی۔ لیکن نیل کنٹھ
آہنی گارڈر سے چپٹا ہوا ڈائنا مائٹ کو "فٹ" کرتا رہا۔ گولی اس کی کنپٹی کے پاس سے ایک بار
زن سے گذر گئی۔ وانچو اندھیرے میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے ڈیم کی طرف
دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بندوق کی آواز کوہستانی چٹانوں میں چیخنے لگی اور اس کی دھڑکن
کوہساروں کی گہرائی میں دیر تک ہانپتی رہی۔ وانچو کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ پھر ایک دم سے
ڈائنا مائٹ کا وائر زور، زور سے ہلنے لگا۔ گویا اب اسے اپنا کام شروع کر دینا چاہیے
مگر نیل کنٹھ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا

کوئی ایک منٹ اس کے انتظار میں گذر گیا۔

پھر کئی منٹ بڑی بے چینی کے عالم میں گذر گئے۔!!

وانچو نے ایک بارگی جھنجھلا کر سوچا کہ وہ ڈیم کو اڑا دے۔ اس لئے کہ اب زیادہ تاخیر
کرنا بہت خطرناک تھا۔ لیکن خطرے کے شدید احساس کے باوجود بھی وہ کچھ طے نہ کر سکا

اسلئے کہ اگر نیل کنٹھ ڈیم کی تباہی کے ساتھ وہیں مرگیا اور بعد میں اس کی لاش شناخت کرلی گئی تب تو بہت بڑا خطرہ پیدا ہوجاتا۔ اور یہی سوچ کر وہ بڑے اذیت ناک لمحوں سے گذرتا رہا۔ اور سامنے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر رات کی مدھم روشنی میں نیل کنٹھ کا کبڑا جسم نظر آیا۔ وہ پتھروں سے جھکا ہوا آہستہ آہستہ آرہا تھا۔ جب وہ بالکل قریب آگیا تو وانچو نے آہستہ سے صرف اس قدر پوچھا "سب ٹھیک ہے!" اور نیل کنٹھ نے اثبات میں اپنی گردن ہلادی۔ وانچو نے مزید تاخیر کئے بغیر ایک بارگی ڈائنا مائٹ کو آن کردیا اور پھر کوہستانی وادی میں بڑی ہیبتناک گھڑگھڑاہٹ پیدا ہوئی اور خوابوں میں ڈھکی ہوئی سربلند پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ سرکاری ڈیم چیتھڑوں کی طرح بکھر کر رہ گیا اور دریائے کوکیلا کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ نشیب میں بہنے لگا۔

نیلی آنکھوں والا وانچو، نیل کنٹھ کو اپنے ہمراہ لے کر درختوں کے گہرے اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ مگر نیل کنٹھ ہر قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کے کندھے پر سے برابر خون بہہ رہا تھا جو گولی سے بری طرح زخمی ہوگیا تھا اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچا تو اس کے پیر بالکل بے قابو ہوچکے تھے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا بے جان ہوکر پچھلی سیٹ پر گر پڑا۔ اور جیپ اسٹارٹ ہوگئی۔ راستہ بھر وہ کراہتا رہا اور اس کے زخم سے خون بہتا رہا۔ جیپ ہچکولے کھاتی تیزی سے گذرتی رہی اور جب وہ فیکٹری کے اندر پہنچی تو نیل کنٹھ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہوگیا تھا۔ اور اسی لئے کوارٹر بھیجنے کی بجائے منیجنگ ڈائرکٹر کی کوٹھی پر ٹھیرا دیا گیا۔

دریائے کوکیلا پر بنے ہوئے ڈیم کے اس طرح تباہ ہوجانے پر ترائی علاقہ میں بڑی سنسنی پھیل گئی ہے اور سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس لئے کہ اس "باندہ" کی تعمیر پر گورنمنٹ کا کئی کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ تحقیقات کرنے کے لئے تمام سرکاری افسروں نے بڑی دوڑ دھوپ شروع کردی ہے۔ ڈاک بنگلہ کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے فیکٹری کے گیسٹ ہاؤس میں سب لوگ ٹھیرے ہوئے ہیں اور بڑی سرگرمی کے ساتھ تفتیش ہو رہی ہے۔ ہر مشتبہ آدمی کو حراست میں لے کر پولیس بری طرح "ٹارچر" کر رہی ہے اور انہیں دونوں

اچانک ریونیو منسٹر کا داماد نرائن ولبھ فیکٹری میں آگیا ۔ وہ کمپنی کا سب سے اہم ڈائرکٹر ہے ۔ رات کو مینجنگ ڈائرکٹر کے پرائیویٹ کمرے میں جب وہ اس کے پاس پہنچا تو ایک دم سے اس پر برس پڑا ۔

" کنور صاحب یہ آپ نے سب کیا کر کے رکھ دیا ہے ۔ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ فیکٹری اب برباد ہونے والی ہے ۔"

مینجنگ ڈائرکٹر پہلے ہی سرکاری افسروں کی آمد سے بوکھلایا ہوا تھا ۔ نرائن ولبھ کی باتوں پر اور بھی بدحواس ہو گیا ۔ آہستہ سے بولا " بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے ۔ میں تو یہاں سے بڑا عاجز آگیا ہوں ۔"

مگر وہ کہتا ہی رہا " اب تو آپ ایسا کہیں گے ہی ۔ مگر آپ کو کم سے کم یہ تو سوچنا چاہیئے تھا کہ گورنمنٹ کا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اتنا احمق تو نہیں کہ اتنی بڑی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتا ۔ ہوم سکریٹری کے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے اس میں فیکٹری پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے ۔ اس لئے کہ ادھر جو لیبر کی بالکل کمی پڑ گئی تھی ۔ اور جس طرح یہ مشکل خود بخود ختم ہو گئی ہے اس بات پر کون نہیں شبہ کر سکتا ہے ۔ در اصل ہوا بھی ایسا ہی ہے ۔ اس لئے کہ اب کمپنی کو قلیوں کی تلاش میں اپنے ایجنٹ گرد و نواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑتے بلکہ اب تو فیکٹری کے بڑے پھاٹک کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے ۔ کمپنی کا لیبر آفیسر ہر روز سویرے صرف پچاس آدمیوں کو اندر بلاتا ہے اور وہ اس کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ وہ ہر ایک کا جسم ٹٹول کر گوشت کے مضبوط پٹھوں کا اندازہ لگاتا ہے اور جس آدمی کو وہ فٹ سمجھتا ہے اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر کھریا سے سفید نشان بنا دیتا ہے ۔ اس کا مطلب ہے کہ اب اس کو فیکٹری میں کام مل گیا اور ہر روز آنے روز مزدوری ملے گی ۔ اس کا نام اور پتہ ٹائم کیپر کے رجسٹر میں درج کر دیا جاتا ہے ۔ پھاٹک کے باہر کھڑے ہوئے لوگ جانوروں کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سہمے ہوئے لہجہ میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں ۔

مینجنگ ڈائرکٹر اور بھی گھبرا گیا ۔ وہ بڑے شکست خوردہ لہجے میں کہنے لگا " مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائیگا ۔ وانچو تو مجھ سے برابر یہی کہتا رہا کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں ، سب ٹھیک

ہو جائیگا " اس طرح وانچو پر سارا الزام رکھکر جیسے وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ اور اس کی بات کا اثر بھی ٹھیک ہی ہوا۔ یوں بھی کمپنی کا مینجنگ ڈائرکٹر ہونے کے علاوہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیردار بھی تھا۔ اس لئے نرائن ولبھ اسی ایک دم وانچو پر بگڑنے لگا۔

" وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وانچو مجھ کو بڑا خطرناک آدمی معلوم پڑتا ہے۔ آپ اسکی سازشوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دیکھئے اب بھی سب سے بہتر طریقہ ہے کہ وانچو کو اسی اسٹوع پر فیکٹری سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک وہ یہاں موجود ہے ہر وقت خطرہ سامنے ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں میں سب کچھ سنبھال لوں گا "

مینجنگ ڈائرکٹر گہری خاموشی میں کھو گیا اس لئے کہ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتا کہ وانچو اس کے خلاف ہو جائے۔ وہ اس کے ہر خطرناک راز کو جانتا ہے۔ اس طرح نوکری سے برطرف ہو جانے پر اس کے برگشتہ ہو جانے کا پورا خوف تھا۔ تھوڑی دیر تک اس طرح چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگا "میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بات پر اگر وہ کمپنی کا مخالف ہو گیا تو سرکاری گواہ بنکر بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے میرا خیال ہے کہ کسی اور طریقہ سے اس کو یہاں سے ابھی ہٹا دیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا " اور یہ بات نرائن ولبھ ایم۔ ایل۔ اے کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اور پھر دونوں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دیر تک کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

اور جب نرائن ولبھ کمرے سے باہر چلا گیا تو کنور صاحب نے وانچو کو بلوا لیا اور ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ پھر یہ طے ہوا کہ وہ نیپال کی راجدھانی کاٹھمنڈو چلا جائے۔ سرحد کو پار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔ اس لئے کہ راناد لیر جنگ جو ریاست کے اہم رکن تھے وہ کنور صاحب کی شکارگاہوں میں اکثر شکار کھیل چکے تھے اور دونوں کے آپس میں بڑے اچھے مراسم تھے اور جب تک وہ کاٹھمنڈو میں رہے گا اس کو برابر ایک ہزار روپیہ ماہانہ مینجنگ ڈائرکٹر کی طرف سے ملتا رہے گا۔ پھر ایک روز فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ کمپنی کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کلکتہ جا رہا ہے اور وانچو کار میں خاموش بیٹھا ہوا دور ہوتی ہوئی فیکٹری کی عمارت کو دیکھتا رہا جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازشیں کی تھیں۔ اور وہ فیکٹری

اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بڑی پراسرار معلوم ہوتی تھیں۔

سرکاری ڈیم کے تباہ ہو جانے سے کوکیلا ندی میں بڑا بھیانک طوفان آگیا ہے۔ بپھری ہوئی لہریں ترائی کے میدانی علاقوں میں شب خون مارنے والے غنیم کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں پانی کے بہاؤ میں بہہ گئی ہیں۔ ساری بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں اور تباہ حال کسان اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں اور واہیل روڈ پر مریل انسانوں کے قافلے گزرا کرتے ہیں۔ اسلئے نے سیلاب زدگان کے لئے امیر گڈھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ پریس نوٹ شائع ہوا ہے۔ اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس تباہی میں کمیونسٹوں کی دہشت پسندی کو دخل ہے جو اپنے سیاسی مفاد کیلئے ملک میں بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی لئے پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپہ مار کر کتنے ہی کسان ورکروں کو حراست میں لے لیا ہے۔

نیل کنٹھ کنور صاحب کی کوٹھی کے ایک مختصر سے کمرے میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اور اس کا مضبوط پٹھوں والا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا ہے۔ خون کے زیادہ بہہ جانے سے اس پر بار بار غشی کے دورے پڑتے ہیں۔ اور کنور صاحب نے کمپنی کی طرف سے کمشنر کے اعزاز میں اپنی خوبصورت کوٹھی پر ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا ہے۔ جس کا ہنگامہ رات گئے تک فیکٹری کے اندر گونجتا رہا ٭

(سویرا نمبر ۹ لاہور)
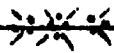
صدیقہ بیگم

بے پالک

اس کے رہن سہن کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ لے پالک ہے بلکہ ریشماں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سدا ہی سے اس گھر میں پلی بڑھی ہے پھر شکل وصورت بھی ماشاءاللہ ایسی تھی کہ دیکھتے سینے اور اب تو سن کا تقاضا بھی تھا۔ سولہ سترہ برس کی ہونے کو آئی تھی۔ لڑکی ذات سیلاب کی طرح بڑھتی ہے۔ دن دونی رات چوگنی۔ یوں تو پہلے ہی سے اس کا رنگ گورا چٹا تھا اور اب تو اس میں سرخی بھی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اور چہرے کا تو کہنا ہی کیا۔ روز بروز اس کے گالوں میں جھلک آتی جا رہی تھی لیکن اس عمر کے باوجود اس میں وہی بچپنا تھا۔ دس بارہ سال کی لڑکیوں کی سی اچھل کود۔ سارے گھر میں دھما چوکڑی مچائے رہتی لیکن کام میں اتنی تیز کہ ادھر زبان سے نکلا اور ادھر ریشماں کام میں جت گئی۔
جس دن سے گھر میں قدم رکھا تھا خوب بے تکلف ہوگئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھول گئی تھی کہ کہیں اور پیدا ہوئی ہے۔ بات بات میں بچوں کی سی ضد۔ بچوں کی طرح ٹھنکنے لگتی اور جس بات کی بھی ضد کرتی کرا کے چھوڑتی ——— طلعت کے لئے سینڈل آیا۔ بس اس نے اپنے پرانے چپل اتار کر پھینک دیئے۔
"میں تو نہیں لٹکائے پھروں گی ان لیتھڑوں کو ——— مجھے تو سینڈل چاہیئے۔ ایسے ہی جیسے طلعت باجی کا سینڈل، بس میں تو ایسے ہی سینڈل لوں گی" اب سب نے بہتیرا سمجھایا کہ اگلے مہینے میں

آجائے گا مگر اس کی ایک نہیں ہزار نہیں ـــــــ دوپہر کو اس غم میں اس نے کھانا بھی نہیں کھایا ـــــ
آخر مجبور ہو کر لانا ہی پڑا اور اس کی ایسی ہی باتوں پر سارے گھر کو اس پر پیار آتا تھا ـــــــ
اور اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو بچہ سمجھ کر چپ ہو جاتے آخر عقل ہوتی تو ایسی باتیں کرتی ـــــ
اور پھر وہ شوخ بھی اتنی کہ ادھر چائے کی پیالی ہاتھ میں لی ادھر ـــــ اور وہ چپ چھوٹ کر
چھناچھن بکھر گئی ـــــ مگر جب بیگم غصہ ضبط کرتے ہوئے کہتیں ۔
" ارے کیسے ٹوٹ گئی یہ پیالی منحوس ! "
جواب میں اس نے نورجہاں کی طرح دوسری تو نہ توڑی لیکن ایسا بھاڑ سا منہ کھول دیا جیسے
اس کے ٹوٹنے سے وہ گھبرا گئی ہو ۔
" کیا بتاؤں بھابی ۔ بس ہاتھ سے چھوٹ ہی گئی " اس کی سہمی ہوئی شکل دیکھ کر بھابی کو بھی
رحم آگیا ـــــ اور وہ پگھل گئیں ۔
اونھ ـــــ پرے کو ٹوٹ جانے بھی دو ، چینی کی پیالیاں ٹوٹا ہی کرتی ہیں " اور
اب جو اسے شہ ملی تو بس پھر کیا تھا اس کے ٹکڑے کوڑے میں پھینکتے پھینکتے اس کے جسم میں بجلی کی
سی پھرتی آگئی ۔
" بڑی کمزور ہوتی ہیں یہ ہٹ گئی پیالیاں " ـــــ اور بیگم کا پارا پھر چڑھنے لگا ، اس کا جملہ
سن کر سارا گھر ہنسی سے لوٹ پوٹ گیا ۔ بیگم کا غصہ بھی اتر گیا نسیم کا تو یہ حال تھا کہ مارے ہنسی کے
پیٹ میں بل پڑ گئے ۔
" اری للشیماں بڑی کمزور ہوتی ہیں یہ پیالیاں " ـــــ پھر تو طلعت اور نسیم نے کئی دن اسکو پریشان
کیا ۔ ایک آدھ بار تو اس نے کہہ بھی دیا کہ کمزور نہ ہوتی تو ایسے ایک اشارے میں ٹوٹ جاتیں ۔
پھر اسکو اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا اور چڑھنے لگی اور بیگم یہ کہکر چپ ہو گئیں ۔
" بیچاری یتیم ہے ، اس کا دنیا میں بیٹھا ہی کون ہے جو کچھ ہیں ہم ہی ہیں ۔ اب اس پر
ڈانٹ ڈپٹ کر کے کون اس یتیم کا صبر اپنے اوپر لے ـــــ اور یہ للشیماں کی سب سے بڑی
ڈھال تھی ۔ کتنا بڑا نقصان کر دے مگر کوئی اسے کچھ نہ کہتا ۔ آخر اللہ ماری یتیم جو ٹھہری ـــــ
پھر یہ بھی کہ جہاں یہ بات تھی وہاں یہ بھی تھا کہ کسی کام سے تامل نہ تھا اور پھر اتنی پھرتی سے کام کرتی

کہ سارا گھر دیکھتا رہ جاتا ——— تھکنا کسے کہتے ہیں یہ تو وہ جانتی ہی نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ آج آٹھ سال اس کو اس گھر میں آئے ہوئے ہو گئے تھے اور چوبیس گھنٹے گھر میں اس کے نعرے لگتے تھے اور وہ دو پیروں پر گھنی کا ناچ ناچتی تھی۔ کسی نے آواز دی فوراً اس کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ایک کام چھوڑنا اور دس کام میں ہاتھ ڈالنا تو اس کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا اور جسم میں پھرتی اس غضب کی تھی کہ برتن مانجھ رہی ہے اور طلعت نے آواز دی "اری ریشماں ذرا ادھر تو سننا" اور وہ برتن چھوڑ چھاڑ انھیں ہاتھوں سے اس کے کمرے میں پہنچ گئی اور اس کے کام میں لگ گئی۔ لیکن ابھی وہ کام ختم بھی نہ ہوا تھا کہ تبسم نے آواز دی "اری ریشماں کدھر ہے یہاں تو آنا" اور گھر میں خاموشی کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی اس کے دندناتے ہوئے پیروں کی آواز سنائی دیتی۔ اس کے قدموں کی آواز سن کر سب لوگ سمجھ جاتے کہ یہ ریشماں ہوگی جو نہ جانے زمین سے کب کا بدلہ لے رہی ہے۔ تبھی تو جب بیگم بہت خوش ہوتی تو "ارے ریشماں سنبھل کر چل، آخر یہ زمین بھی کیا کہتی ہوگی۔ کوئی اس پر اس طرح چلتا ہے۔" لیکن ریشماں کو بھلا ایسی باتوں کی کہاں پرواہ ہوتی، وہ تو بس ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے اڑا دیتی جیسے کسی نے کچھ کہا ہی نہیں اور پھر ذرا سی دیر میں دیکھو تو یہاں کوئی بے کام کا کام لئے بیٹھی ہے۔ بے کار تو اسے کسی نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ایسی لڑکی کو بھلا ڈانٹنے سے کیا فائدہ۔ بس اسے تو اپنے کام سے کام ——— سمجھانے کی تو بات ہی اور ہے اگر کوئی ڈانٹ بھی دے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چکنا گھڑا تھی وہ تو جس پر ایک بوند بھی پانی کی ٹھہر جائے تو بات ہے

ریشماں کی سب سے بڑی کمزوری اس کا نہانا تھا۔ چنانچہ آج جب بیگم نے اسے نہانے پر زور دیا تو بس . . . . . .

"بھابی تمہارا احسان مانوں گی، مجھے نہانے کے لئے مت کہا کرو، سردی۔ گرمی میں تم [illegible] کرنا کے نیچے بیٹھی رہو ریشماں تو سچ کہتی ہوں۔ اگر ایک منٹ کو بھی اٹھوں تو کسے کھینچ سے جھنڈ لگا دو میری ——— مگر بس جاڑے میں مجھ پر رحم کیا کرو۔"

لیکن بیگم اس کی عادت سے واقف تھیں۔ انھیں جب اسے نہلانا ہوتا تو پھر کسی شرط [illegible] ہٹتیں۔ وہ کتنا ہی منہ بناتی، جاڑے کا واسطہ دیتی، بخار چڑھا لیتی —

"بھابی! ـــ نہ جانے مجھے کیوں سردی لگ رہی ہے۔ کہیں بخار تو نہیں ہوگیا۔" وہ زکام سے
سوں سوں کرنے لگی "زکام ہوگیا ہے بھائی جان سے دوا منگوا دینا۔" اور بیگم اس کی ان چالبازیوں
سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھیں۔

"ہاں آنے دے بھیا کو ـــــــ میں آپ ساری دوا منگوا دوں گی۔ لے بس تو نہا لے۔
پانی چولہے پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے ـــــــ اور ہاں دیکھنا بالوں کے لئے کھلی بھی بھگو رکھی ہے
خوب اچھی طرح بالوں کو صاف کر لینا۔ کتنے گندے ہو رہے ہیں سارے کے سارے الجھے ہوئے
ہیں ـــــــ" مگر اس کے جواب میں اس نے اپنے سر کو اس زور سے جھٹکا دیا جیسے بھابی کوئی
بڑی بے وقوفی کی بات کر رہی ہیں۔ اور آہستہ سے اس نے کہا "بس تمہاری سمجھ میں نہیں آنے کی میری
بات۔" اور پھر ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا "بھابی! بس آج کے دن معاف
کرو۔ کل کے دن ضرور نہا لوں گی ـــــــ اور بال بھی خوب اچھی طرح دھولوں گی۔ پھر دیکھنا
سوکھ کر کیا نکھرتے ہیں یہ بال۔"

"اچھا نہانے نہیں جائے گی۔ کمبختوں پھر بڑی باتیں بنانی آگئی ہیں۔ کہ پھر کی زبان
ہوگئی ہے۔ کچھ کہتی نہیں۔ اسلئے یہ حال ہے۔" اور اب تو وہ اور بھی مجبور ہوگئی اور جب اُسے
معلوم ہوا کہ اب یہ کام کرنا ہی ہے تو پھر وہ ریشماں ہوگئی اور اس کے جسم میں ایک پھرتی آگئی۔ اور
اپنی عادت کے مطابق جلدی جلدی کپڑے لیکر پانی رکھ غسل خانے میں پہنچ گئی۔ اور کسی نہ کسی طرح
اس مصیبت کو بھی حل کر ڈالا۔ چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر ہی جب کہ بیگم ابھی صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں
وہ چھپاک سے جو بھاگی ہے تو بیگم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اری ریشماں ـــــــ یہ کیا آفت آگئی ہے تیرے اوپر ـــــــ بس میاں چھٹ کر
نکل بھاگی۔" اور ریشماں کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا ـــــــ اس نے انگوٹھے بھر کی زبان
نکالی اور ہائے اللہ کہکر اُلٹے پاؤں غسل خانے میں پہنچ گئی اور بیگم نے چلانا شروع کر دیا

"کیا مصیبت ہے یہ لڑکی بھی۔ جوان جہان لڑکے لڑکیوں کا گھر ہے۔ اللہ اس کو ذرا بھی شرم
حیا بھی نہیں رہ گئی۔ آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ مانا کہ ہر کام جلدی ہو مگر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ
ہر کام ادھورا ہو ـــــــ اب بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ قالی ننگیاں پیٹ چھپڑی بنا کے

نکل کھڑی ہوئیں۔" اور اس وقت ریشماں کا حال کچھ نہ پوچھو۔ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" پھر جو
چپ چاپ نکلی ہے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کئی دنوں کے لئے فرصت ہو گئی۔ خاموشی سے سر جھکائے
بھوں چڑھائے ہوئے طلعت کے کمرے میں جا پہنچی۔ ادھر طلعت کا یہ حال کہ تکئے میں منہ دیئے اوندھی
پڑی ہنسی کے مارے برا حال ——— ریشماں کا منہ لال ہو رہا تھا، سارا جانٹا کافور ہو چکا
تھا۔ "ارے طلعت باجی کیا ہو گیا ہے؟"

"بہن آئیں تھیں ——— بڑی اچھی لگتی ہو دلہنیا بن پہنے۔"

"نہیں مانو گی تم کہوں بھائی سے۔"

ادھر بیگم صاحبہ نے آواز دی۔ "اری ریشماں کہاں گھس گئی تھی جا کے۔ چل ادھر بال اٹھا لے تو میں کنگھی کروں۔"

"اب پھر ایک اور آفت ہو گئی۔" وہ جھنجھلا گئی ——— مگر اسے ایک نئی ترکیب سوجھی۔

"جا بابی! تم اپنا کام کرو۔ میں طلعت باجی سے کرا لوں گی کنگھی۔" لیکن جب
مصیبت آتی ہے تو کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ طلعت نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا۔

"جاؤ امی سے ہی گندھواؤ اپنا جھونڈا ——— مجھے اب فرصت نہیں ہے اور
پھر جوئیں بھری ہوں جس سر میں اس میں تو میری جوتی ہاتھ لگاتی ہے۔ بس چلو یہاں سے۔" اور
اب اس کے سامنے کوئی چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ کمرے سے چپ چاپ نکل جائے۔ جی
ہی دل میں وہ طلعت کو کوستی جا رہی تھی ——— "مجھ سے بھی تو کوئی کام پڑے گا بتا دوں گی
تم کو بھی" ——— اور وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی بیگم کے سامنے آکر بیٹھ گئی ——— اور
پھر بیگم کے ہاتھ میں اس کے لمبے لمبے بال آ گئے تھے اور وہ انھیں سہلایا کرتی جا رہی تھی۔
ساتھ ہی ساتھ ان کا لکچر بھی شروع ہو گیا۔

"سن ریشماں ——— اب جوان ہو گئی ہے بچی نہیں رہی ذرا عقل کے ناخن لیا کر۔
ابھی تو بڑی ہے وہ دن نہیں رہے کہ جہاں چاہے پھرا کرے۔ آخر یہ ڈھائی گز کا دوپٹہ کس دن
کے لئے ہے۔ اور یہ جوتے جس کے لئے اتنے قصے بکھیرے تھے انھیں بھی پہنا لیا کر، یا خصم
نے سر پر جانے کے لئے رکھے ہیں ——— تو سمجھ گئی نا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا کر۔"

"مگر بھابی تم کچھ کہو یہ دوپٹہ مجھ سے نہیں اوڑھا جاتا۔ کام کاج میں برابر الجھتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ ہر وقت کیسے گلے میں ڈالے رہوں"!

یہ سننا تھا کہ بیگم کا پارا چڑھ گیا۔

"دیکھو ریشماں سمجھائے دیتی ہوں کہ اب جو میں نے تجھے بغیر دوپٹے کے دیکھا کام ہو یا نہ ہو مگر دوپٹہ ضرور ہونا چاہیے۔ کبھی طلعت کو بھی بغیر دوپٹے کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے ـــــ تجھے نام کو بھی شرم نہیں رہی، اب دیکھوں کیسے نہیں اوڑھا جاتا ـــــ"

"اونہو ـــ طلعت باجی کا اور میرا مقابلہ ـــــ ان کی بات اور ہے" وہ ٹھنکنے لگی۔

"نہیں ریشماں! اب میں نے کہہ دیا ہے اور بس یہ میرا فیصلہ ہے۔ اب دیکھوں تجھے بغیر دوپٹے کے" ـــــ اب تو مجبوراً اُسے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ بیگم کا غصہ وہ اچھی طرح جانتی تھی یا تو کبھی غصہ آتا ہی نہیں یا جب آتا ہے تو کسی کے قابو کی نہیں رہتیں اسی لئے ریشماں نے چپ چاپ رہنے ہی میں اپنی بھلائی سمجھی۔ لیکن بیگم کا بھی تو یہ ہے کہ ایک بات ختم نہیں کہ دوسری شروع کر دیتی ہیں۔

"اور ہاں دیکھو اب نسیم کے کمرے میں بھی اس طرح بے دھڑک نہ گھس جایا کر اکیلے"

"اکیلے نہیں تو پھر جب کام ہو تو کسے لے جایا کروں۔ کوئی اللہ تو ان کے کام کو ہاتھ لگاتا نہیں، اب اسی دن مجھے بخار آگیا۔ اور ان کے کالج جانے کا وقت ہوگیا مگر کسی نے بھی تو ان کو کھانا نہ دیا جب خود جاکر باورچی خانے سے نکالا ـــــ میں نے اٹھنا چاہا مگر طلعت باجی نے جو ڈانٹ بتائی تو میں بھی پڑی دیکھتی رہی آخر کیا کرتی تم ہی بتاؤ ـــــ اور طلعت باجی بس کرسی پر بیٹھی سوئیٹر بنتی رہیں۔ ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اون اور سلائی ایک طرف رکھ کر کھانا ہی نکال دیں۔ اب تم ہی بتاؤ پھر کیسے لے کر جاؤں۔ پھر سچ بھی کیا ہے اللہ ماری کوئی ایسی آفت آرہی ہے" اس نے بے خبری میں گردن کو جھٹکا دیا اور بیگم نے جھنجلا کر کہا" اسے ڈھیک سے سر کر گھمائے چلی جارہی ہے سر اِدھر اُدھر ـــــ بڑی آئی ہے کام کرنے والی سدا سے تو نے ہی تو اس گھر کا انتظام کیا ہے ـــــ تو نہ ہوتی تو بس گرد

کام تھوڑا ہی ہوتا۔ بڑی بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگی ہے ــــــــ" اور وہ چپ تھی کہ طلعت کمرے سے نکل پڑی۔

"کیا چغلی ہو رہی ہے میں سمجھتی ہوں اس رشیاں کی بچی کو ــــــــ ذرا موقع ملا اور بیٹا اِدھر کی اُدھر لگا دیتی ہے۔ کس روز نہیں ملا تھا بھائی جان کو کھانا۔ اِدھر آ بتاؤں تجھے۔"

یہ سننا تھا کہ بیگم نے بھی رُخ بدل دیا

"اچھا چلو اپنے کمرے میں۔ چلی آئیں لڑنے کے لئے۔ سچ تو کہہ رہی ہوں۔ تم سے کوئی کام ہوتا ہے بس اون اور سلائی لئے بیٹھی رہو ــــــــ یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح و شام بھیا کو کھانا ہی کھلا دیا کرو۔ اور اب میں کہے دیتی ہوں کہ آج سے نسیم کا سارا کام تجھے کرنا پڑے گا، رشیاں نہیں کرے گی۔"

مگر یہ سن کر تو رشیاں بجائے خوش ہونے کے اور الجھ گئی، اُسے تو بھائی جان کا کام کرنے میں خوشی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ نسیم اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتا تھا اور کوئی کام ہوتا تو بڑے پیار سے کہتا تھا یہ نہیں کہ طلعت کی طرح کہ جیسے ٹوکری میں بھر کر کوئی کوڑا گھورے پر اُنڈیل دے ــــ

"رشیاں! لے یہ دوپٹہ جا کر دھوپ میں ڈال دے۔" کیسا ہی ضروری کام کر رہی ہو مگر بیگماں کا حکم ہے ٹال تھوڑا ہی سکتی ہے چاہے کسی کا کام ہو یا نہ ہو، مگر ان کا ضرور ہو۔ اگر کہیں کہہ دیا کہ "باجی ذرا ٹھیر جاؤ ابھی تھوڑی دیر میں کر دوں گی ــــــ" تو بس آفت . . . .

"بس آ نا میرے کمرے میں تو میں تمہیں بتاؤں گی۔" جیسے سارے گھر میں ان کا ہی تو ٹھیکہ ہے اور اِدھر بھائی جان، اللہ میاں کی گائے، کیسی ہی غلطی ہو جائے۔ مجال ہے جو کچھ کہہ جائیں . . . . اب اسی روز ساری سیاہی میز پوش پر الٹ گئی، لیکن اُن کے تو جیسے پرواہ ہی نہیں ــــــ بس یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

میز پوش اس وقت تک پاک ہی نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر سیاہی نہ گرے یہ لے کر لوٹنے میں ڈال دے، اور بکس میں سے نیا نکال لا۔ جس روز اتنی کہیں جائیں گی بس

خاموشی سے بھولانا ———"

اور وہ چور ہوگئی تھی کتنی دیر اُسے اپنے ہاتھوں پر غصہ آیا جنھوں نے ابھی بھلی رکھی ہوئی دوات الٹ کر رکھدی ——— بلکہ اگر بھائی جان اس روز غصہ میں ناراض ہو لیتے تو شاید اس کو خیال بھی نہ ہوتا لیکن آج کے کچھ نہ کہنے سے اُسے دن بھر الجھن ہوتی رہی حالانکہ ایسا کوئی نقصان بھی نہ ہوا تھا مگر نہ جانے کیوں اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی بڑا نقصان ہوگیا۔ تمام دن اسے وہی خیال بار بار آتا رہا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کی زبان پر ٹافی رکھی ہوئی ہر میٹھی میٹھی اور وہ اسے بیٹھی چوس رہی ہے کتنی خوش ذائقہ ہوتی ہے یہ کمبخت ٹافی بھی ایک دو ٹافی میں جتنا چاہے کام کرالو اور وہ خوشی خوشی ہر کام کر ڈالتی اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ سب کے سامنے کھاؤ اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی کیا کھا رہا ہے ——— اب ایک روز جب نہ جانے کس خیال میں بیٹھی وہ ٹافی چوس رہی تھی کہ طلعت نے دیکھ لیا۔ طلعت بھلا کہاں معاف کرنے والی تھی۔ پوچھ ہی تو بیٹھی ——— "کیا کھلائی ہو رہی ہے بیگم صاحبہ" اور رشیماں نے ایک ہی مرتبہ اس کو تھم کرایا اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ دو منٹ کوئی بات ہی نہ کی آخر بیگم کو پوچھنا پڑا کہ کیا بات ہے۔

"کچھ نہیں طلعت باجی کی عادت جانتی ہی ہو، ہر بات میں مین میخ نکالتی ہیں۔ اب دیکھو لگا دی چوری نہ کیا کر رہی ہو ——— سچ مچ اللہ کی قسم، میں نے باورچی خانہ سے ایک لقمہ بھی جو چھپا کر کھایا ہو تو سمجھو زہر کھایا ہے" اور اس نے سپاٹ سا منہ کھول لیا ———

"لو دیکھو کیا کھا رہی ہوں" لیکن وہاں دھرا کیا تھا۔ ساری جیب صاف کی صاف رکھی تھی پانی سے دھلی ہوئی ——— اور طلعت بات کہکر چپ ہوگئی اور وہ بھی کوئی چوری تھوڑا ہی کر رہی تھی مگر چور کی ڈاڑھی میں تنکا تھا ——— الٹا بیگم نے طلعت کو ڈانٹا

"طلعت بڑی بدزبان ہوگئی ہو۔ بھلا ایسے بھی کوئی کہتا ہے مانا کہ چھوکری اچھال چھکا ہر مگر ایسی عادت اپنی رشیماں کی نہیں ——— پھر اگر کھا بھی لیا تو کوئی غیر تھوڑا ہی ہے تمہاری اپنی بہن ہے۔ گھر میں رہتی ہے تو کیا پیٹ کہیں اور سے کاٹ کر آئے گی ———" اور رشیماں خوش ہوگئی اور پھر ——— دوسرے لمحے اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ طلعت نے اسے کچھ

کہا تھا۔ وہ توطلعت سے اتنی محبت کرتی تھی کہ ذرا سا بھی گھڑی بھر کو اُسے اداس یا پریشان دیکھا بس لپٹ گئی اس کے گلے میں اور وہ منہ تکتی رہ جاتی۔

"ارے ہٹ پرے کو جو میں چڑھاؤ تیرے ہے"

اور وہ بس یہی کہے جاتی

"میری اچھی سی باجی ناراض ہو گئیں تم تو —"

"چل دور ہو ——— میں ناراض واراض نہیں ہوں ——— میں تو پوچھ رہی تھی کہ کیا کھا رہی ہو ———؟"

"بس اتنی سی بات تھی ——— مگر سچ باجی تم نے کہا تو ایسے ہی تھا۔ جیسے چھپ کر کھا رہی تھی کوئی چیز" اس نے منہ پھلاتے ہوئے کہا جیسے اس کے تصور ہی سے اس کو کوئی کچوکا لگا ہو۔۔۔

"اچھا کہا تو کیا کیا کرتی ہے، بڑی آئی وہاں سے اتنی باتیں سنوا دیں امی سے اور اب بھی چین نہیں ہے ———" وہ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ کہتی۔

"اچھا بس چپ رہو، طلعت باجی معاف کر دو مجال ہے جواب کچھ کہوں" اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی ——— اور طلعت کی ہنسی چھوٹ گئی "بس اب تو چھوڑ دے میرا پیچھا، جاؤ معاف کر دیا" اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے بغیر جواب سنے ہی اپنے کام میں مشغول ہو گئی اور طلعت کو بھی اس کے سامنے ہار ماننی پڑی کا اور کام کرنے کی اسی انتھک عادت کی وجہ سے نسیم کہا گیا تھا۔

"طلعت، اپنی ریشماں تو بس یہ سمجھو کہ جو ہے اپنے قبضے میں، وہی علاؤالدین والا کہ آواز دو۔ اور سامنے پھر پوچھا کہ جو کام کہو منٹوں میں کر کے رکھ دیتی ہے اور تم سوچتی ہی رہ جاؤ کہ اب کونسا کام بتایا جائے وہ تو سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔ میں تو سوچتا ہوں ایک کتا پال لوں اور جب ریشماں کو کوئی کام نہ ہو اور کام کو پوچھے تو بس یہی کہہ دو کہ "جاؤ کتے کی دم سیدھی کر دو" اور نسیم نے ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ ریشماں ہٹاڑ سے بول پڑی "ہاں بھائی جان ضرور پالو اور ایک بلی بھی پالنا۔ مجھے بلی بڑی اچھی لگتی ہے۔ نرم نرم میاؤں میاؤں

کری ہوئی پوسی، سچ مچ بڑی اچھی لگتی ہے۔ تم پال لو۔ بس میں اس کی دیکھ بھال کیا کروں گی"۔ اور وہ تو کچھ اور بھی بولتی کہ بیگم کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ گئی ——" اچھا بلی پالیں گی نواب زادی —— چل تو کسی چڑیل کہیں کی، گیہوں بکھرا ہوا پڑا ہے اور تجھے بلی پالنے کی لگی ہوئی ہے اور بس ایسے وقت میں اسے یہ زبردستی کا کام برا لگتا وہ محسوس کرنے لگتی کہ گھر میں وہی اکیلی کام کرنے والی ہے جیسے نوکر ہی تو ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ کمرے میں جاکر چارپائی پر اوندھی ہوکر گر پڑے اور خوب دھاڑیں مار مار کر روئے۔ بھلا کوئی بات بھی ہے ایک منٹ کو بھی آرام نہیں جیسے وہ کوئی انسان تھوڑا ہی ہے۔ ایک تو تھوڑی دیر کے لئے بھائی جان بات کرتے ہیں اور بھابی ایک نہ ایک کام لے کر بٹھا دیتی ہیں۔ ایسے ہی وقت انھیں کام بھی سوجھتا ہے —— اور اس کا جی بس الجھ ہی تو جاتا، طلعت باجی سے تو کام لے لیں اس طرح بیٹھے سے نہ منع کردیں تو بات نہیں۔ اسے پان والی بات یاد آجاتی جب امی نے آواز دی تھی " ارے طلعت ذرا مجھے ایک پان تو بنادے" تو اس نے کیسا الٹا اسی پر ٹال دیا تھا اس لئے کہ بیگم صاحب خود تو اپنی سہیلیوں، ہمجولیوں سے گپ لڑا رہی تھیں اور الٹا اسی پر حکم چلا دیا۔

" اری ریشماں کہاں مرگئی۔ ذرا دیکھو امی بلا رہی ہیں " اور خود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی اور کیوں ہوتی وہ کوئی ریشماں تھوڑا ہی تھی جو ہر کسی کا کام کردے اور دو منٹ کسی سے ہنس کر بات بھی نہ کرسکے۔

مگر ایسی باتیں ریشماں کتنی دیر سوچتی۔ ایسی باتوں کے سوچنے میں وہ دو تین منٹ سے زیادہ وقت ضائع نہ کرتی اور پھر جو کام میں لگتی تو بس پھر اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہتی۔ بس کام سے کام پھر دو من گیہوں اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتا تھا وہ تو بات کی بات میں صاف کر کے رکھ دیتی اور اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ ابھی ذرا سی دیر پہلے اسی گیہوں کے پیچھے اسے بیگم نے ڈانٹا تھا یا یہ کہ اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی کام لیا ہے —— اور گیہوں صاف کرتے وقت تو اگر اسے کوئی فکر رہتی تو بس یہی کہ کسی طرح یہ ختم ہو اور وہ دوسرے کام میں لگے۔ دراصل اس سے بہت دیر تک ایک جگہ بیٹھا بھی

نہ جانا تھا اور پھر یہ بھی کہ ہر ننھے کام کو وہ دلچسپی سے کرتی تھی اور جہاں دلچسپی کا سوال ہو وہاں ہر کام اچھا ہوتا ہے ——— اور پھر بھائی جان کا کام! وہ بڑے فخر سے کہتی :-

طلعت باجی! اپنے بھائی جان سب سے اچھے ہیں۔ بڑے سیدھے ہیں۔ کبھی کچھ نہیں کہتے ایک تمہارا کام کرو تو دس باتیں الگ سے سنو ——— اور پھر بھائی جان ٹافی "
وہ کہتے کہتے رک گئی ——

"کیسی ٹافی ——" طلعت چونک پڑی جیسے کسی نے سوتے سے کچی نیند میں جگا یا ہو۔

"ارے باجی، ٹافی تم نہیں جانتیں، اچھا اب ملے گی تو میں تم کو ضرور کھلاؤں گی۔ بڑے مزے کی ہوتی ہے ٹافی ——— بھائی جان بڑے شوق سے کھاتے ہیں مجھے بھی کبھی کبھی دے دیتے ہیں ——— بڑے مزے کی ہوتی ہے یہ ٹافی طلعت باجی ———" وہ ٹافی کا ذکر کچھ اس طرح کر رہی تھی جیسے اس کا مزا بار بار اس کے منہ میں آ رہا تھا۔

"اچھا ——" طلعت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بات کرنے کے بجائے کچھ سوچ رہی ہے اور "اچھا" بھی اس نے کچھ اسی بےخیالی میں کہا ——— رشیاں کیلئے کسی بات کا چھپانا تو جیسے بالکل ہی ناممکن تھا اس لئے نہیں کہ وہ جھوٹ بول نہیں سکتی تھی بلکہ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ جھوٹ بولنا کسے کہتے ہیں اور پھر یہ بات اسکی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ اس کو کیا چھپایا جائے یہ اور بات ہے کہ کسی کے فوری غصے کے ڈر سے وہ یہ کہہ دے کہ "کچھ نہیں کھایا ہی ہوں۔" اور اس کے ثبوت میں ٹافی سالم کی سالم نگل جائے۔ مگر یہ بات اس کے ذہن میں کبھی نہ آ سکتی تھی کہ وہ ٹافی کو چھپا کر کھائے بلکہ اگر اس کو کچھ ڈر تھا تو بس یہ کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس نے نعمت خانے سے کبھی کوئی چیز نکال کر نہیں کھائی تھی۔ چنانچہ ٹافی کو چھپا کر کھانا اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا یہ اور بات ہے کہ خواہ مخواہ دوسروں کو دکھا کر کھانے میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب جب کہ طلعت سے بھائی جان کی تعریف کر رہی تھی تو ٹافی کا ذکر نہ کرنا اس کی نظر میں اتنی ایک بڑی اچھائی پر پردہ ڈالنا تھا اور اس طرح کسی کی بات پر پردہ ڈالنا اس نے کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ چنانچہ جب طلعت نے منہ بنا کر پوچھا۔

"اور کیا کہا تھا بھائی جان نے "

"کچھ نہیں کہتے کیا ——— بس دیدہ ثانی ——— میں ان کا اتنا کام بھی تو کرتی ہوں۔ اب مجھے چوڑیاں لا کر دینے کو کہا تھا بھائی جان نے ——— کہنے لگے ایسے ننگے ہاتھ اچھے نہیں لگتے ——— تم اتار کر دیکھو اپنی چوڑیاں، ننگے ننگے ہاتھ۔"

اور طلعت نے مسکرا کر کہا "اچھا تو چوڑیاں آ رہی ہیں آپ کے لئے"

"اور کیا! تم بھی منگوا لو گی کیا، کہہ دینا بھائی جان سے، نہیں تو میں کہہ دوں گی ایک ساتھ آجائیں گی دونوں کے لئے" اس نے انتہائی معصومیت سے طلعت کے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے کہا ویسے بھی وہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ طنز کسے کہتے ہیں۔ چنانچہ جب طلعت نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں، میرے لئے منگوانے کی، بس تم ہی منگواؤ۔ بڑے پیر نکل رہے ہیں۔" تو کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ طلعت کس بات پر اس سے ناراض ہو گئی۔ آخر اس میں ناراض ہونے کی بات ہی کیا تھی۔ پھر چوڑیوں میں ایسی کونسی بری بات تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ طلعت کو ہو کیا گیا ہے۔

"اچھا جاؤ کہہ دینا ——— ہم بھی دیکھ لیں گے، اپنے بھائی جان ہی تو لا کر دیں گے۔ کوئی غیر نہیں، بڑی آئیں شکایت کرنے والی ———" بھلا ریشماں کسی سے دبنے والی تھی۔ اور پھر جب کہ یہ بات اپنی جگہ پر سچ تھی کہ اس کے ہاتھ ننگے تھے۔ کتنے دن ہو گئے چوڑیاں پہنے۔ بیگم نے کئی بار کہا کہ ابھی ریشماں کے ہاتھ میں چوڑیاں نہیں ہیں اور چوڑیوں والی آتی نہیں۔" اور یہ طلعت باجی ہیں کہ ان کا بس چلے تو بس یہی گھر میں رہیں جیسے اور کسی میں جان ہی نہیں ہے اور کسی کا جی چاہتا ہی نہیں اور پھر یہی نہیں طلعت نے بیگم سے کہہ بھی دیا لیکن بیگم کے مزاج کو سمجھنا بھی آسان نہیں تھا۔ وقت کی بات ہے۔ کون سی بات کیسی پڑتی ہے۔ جب انھوں نے سنا تو انھیں بھی کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس لئے ان کے سامنے یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ الٹا طلعت ہی پر بگڑ گئیں۔

"اچھا جاؤ اپنا کام کرو، کونسا عیب ہے۔ اگر اس کے لئے چوڑیاں لا بھی دے گا۔ آخر ریشماں کے اور رکھا ہی کون ہے جواب اس کا خیال کرے گا۔ جو کچھ ہیں وہ ہم ہی ہیں ——— ارے اپنے گھر میں ہے تو بھی برابر ہے، تم کو تو آپ اس کا خیال رکھنا چاہئے۔

مر نسیم کا کام بھی تو کرتی ہے ۔ تم سے ہوتا نہیں ، برابر اس کا خیال رکھتی ہے ۔ کسی قسم کی تکلیف
ہونے نہیں دیتی ـــــــ" اور طلعت اپنا سا منہ لے کر رہ گئی ۔ حالانکہ اس کے جی میں آیا کہ وہ
کہے " امی تم نہیں سمجھتیں کیا بات ہے ۔ بڑھیا ہونے کو آئیں ۔ اب یہ بات بھی مجھے بتانی
پڑے گی کہ کیوں لا کر دیتے کو کہہ رہے اور پھر چھپا کر اسے ٹانی بھی تو کھلاتے ہیں ـــــ" مگر
سب وہ سوچتی رہ گئی ۔ اس کی زبان سے کچھ بھی نہ نکلا ۔ مگر اسے یہ تو تسلی ہو ہی گئی تھی کہ اس نے
نا فرض پورا کر دیا ہے ۔ امی کے کان میں بات تو ڈال دی ، اب یہ اُن کا کام تھا کہ وہ اس رکشاں
کو روک تھام کرتیں مگر ان کے کچھ عقل بھی ہو تو بات ہے ۔ وہ جل بھن کر رہ گئی ۔ پھر نسیم نے سب
کے سامنے اس کو چوڑیاں لا کر دیں ، باریک باریک رنگین چوڑیاں اور اس وقت کچھ نہ پوچھو کہ
رکشاں کا کیا حال تھا ۔ اسے اچھی سے اچھی چوڑیاں پہن کر بھی کبھی اتنی خوشی نہ ہوتی تھی جتنی آج نسیم
کی دی ہوئی ان چوڑیوں کو دیکھ کر ۔ طلعت نے بہتیرا منہ بنایا مگر جب امی کا سہارا ہو تو پھر کون
روک سکتا تھا اور رکشاں نے جلدی سے نسیم کا کوٹ اپنے ہاتھ میں لیا اور کمرے میں جا کر لٹکا آئی
اور یہی نہیں اس نے نسیم کے منہ دھونے کے لئے پانی بھی لوٹے میں رکھ دیا " اور کچھ کام
ہے بھائی جان " اور بھائی جان نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ " امی
رکشاں جا پہلے چوڑیاں پہن لے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوڑیاں لے کر طلعت کے کمرے
میں پہنچ گئی ۔ " طلعت باجی لو پہنا دو مجھے چوڑیاں " اور طلعت کو بھی اس کی اس معصومیت پر
ہنسی آ گئی ۔ وہ چوڑیاں پہن کر پھر اسی طرح اچھل کود میں لگ گئی ۔ اب ایسی لڑکی کو آخر کوئی کیا
کہے اور بیگم کا حکم تو اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا ۔

" ہاں رکشاں دیکھ اب تو نسیم کے کمرے میں نہ گھس جایا کر اکیلی "

" طلعت باجی جو جاتی ہیں " بھلا رکشاں خاموش ہونے والی تھی ۔ اور پھر اس کا کہنا بھی
ٹھیک تھا ۔ مگر بیگم نے تو طلعت ہی کو حکم دیا کہ " اب نسیم کا سارا کام اُسے کرنا پڑے گا ۔ رکشاں
نہیں کرے گی "

رکشاں کا منہ اتر گیا ۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے گھر کے سارے کام ختم ہو گئے ۔ کوئی کام
رہ ہی نہیں گیا ۔

"تو پھر میں کیا کروں گی؟"

"اری پگلی تیرے لئے گھر میں کوئی کام ہی نہیں رہ گیا" اور وہ چپ ہو گئی۔ اب اس کا جواب بھی کیا دیتی ــــ

ادھر طلعت نے کہا "اچھی بات ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے گھور کر ریشماں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو" ہاں مجھے بھی دیکھنا ہے تم سے ان کا کام کیسے ہوتا ہے۔ پہلے اپنا کام تو کر لو" وہ چوٹی گندھوا صحن سے اٹھکر چلی گئی مگر اس کا دھیان طلعت کی طرف لگا رہا بڑی بنی پھرتی ہیں! ہر کام کے لئے تو ریشماں ہے۔ اٹھکر ایک گلاس پانی تو پیا ہی نہیں جاتا کام کریں گی ــــ" اری ریشماں بہن ذرا میرا بلاؤز تو صحن سے اٹھالا۔" کام کے لئے کیا "ریشماں بہن" کہتی ہیں اور جب کام نکل جائے تو پھر وہی ریشماں کی بچی" کتنی مرتبہ منع کیا کہ نام ٹھیک سے لیا کرو مگر بیگم صاحب کی سمجھ ہی نہیں آتا۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اب چلی ہیں بھائی جان کا کام کرنے انھیں تھوڑا وہ ٹافی دے دیں گے ــ کبھی جی لگا کر تو کوئی کام نہیں کرتی اور چلی ہیں ٹافی کھانے۔ اس کا دماغ الجھنے لگا اور ٹافی کا ذائقہ اس کے منہ میں پھرنے لگا۔ وہ دیر تک یہی باتیں سوچتی رہی۔

پھر جب وہ اپنے کام میں لگ گئی تو اسے خیال بھی نہ رہا کہ کوئی بات ہوئی تھی۔ سارا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ اور وہی پہلے والی ریشماں تھی اور وہ اپنا اسی چستی سے کام میں سارا دن لگی رہی۔ یہاں تک کہ جب شام کو سب کھا پی چکے تو چپکے سے طلعت کے کمرے میں جا پہنچی۔

"کیا کر رہی ہو باجی، سر میں درد ہے کیا جو پڑی ہو" اور پھر حسب دستور اسی کلفت سے اس کے سرہانے جا کر بیٹھ گئی اور ہلکے ہلکے طلعت کا سر دبانے لگی۔

"باجی آج کوئی اچھی سی کہانی سناؤ۔ وہی شہزادے والی"

"اری کونسی شہزادے والی"

شہزادے والی اور کون سی

"چل دور ہو بڑی آئی شہزادے والی"

"سچ سچ طلعت باجی مجھے اس طرح دتکارا مت کرو۔ جیسے کوئی کتے کو دور کرتا ہو۔ بس

مجھے بھی بات بُری لگتی ہے۔ اب تمہارا سر دباؤں اور اوپر سے مجھے دو روپے بھی دو ہو"
اور یہ سن کر طلعت نے اپنے سر کو اور زور سے جھٹکا دیا۔
"میں نے کب کہا تھا کہ تم میرا سر دباؤ۔ بس آ گئی اوپر سے احسان کرنے، جاؤ بھائی جان کا سر دباؤ وہی تم کو ٹافی کھلاتے ہیں۔ چوڑیاں لاکر دیتے ہیں۔ میں کہاں سے ٹافی لاکر دوں گی"
اور طلعت کا یہ طعنہ وہ سمجھ گئی۔ جس ماحول میں وہ رہتی تھی وہاں طعنہ سمجھنا کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ صبح سے اسی قسم کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، مگر وہ اور باتوں کی طرح اس کی کبھی پرواہ نہ کرتی اگر بھائی جان کا نام بیچ میں نہ آ جاتا۔
"تمہیں طلعت باجی نہ جانے بھائی جان سے کیوں چڑ ہے۔ تم بھی کہہ دو لا دیں گے۔ چوڑیاں رہ گئیں، ٹافی کی بات، تو اب ٹافی ہی ٹافی کھانا۔ آخر بھائی جان کا کام کروں گی۔ آپ کھلائیں گے ٹافی۔ تمہیں تو نہیں آپ کہہ رہی تھی" وہ کھسیانی ہو کر بول رہی تھی۔ چنانچہ بات آئی گئی ہو گئی رات آنکھ جھپکتے گذر گئی۔ دن نکلا اور ریشاں حسب دستور اپنے کام میں لگ گئی۔ اس کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا۔ کیاریوں میں پانی دے رہی تھی کہ بھائی جان نے آواز دی۔ بس وہ بالٹی چھوڑ چھاڑ پہنچ گئی اس کے کمرے میں ــــ "کیا ہے بھائی جان"
"ارے بھئی ریشم، کالج کا وقت ہو گیا اور ابھی تک کھانا نہ لا رہی، اس طرح میرا خیال رکھو گی۔ اچھا جاؤ ٹافی نہ دوں گا" نسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ابھی لائی بھائی جان، آپ ہاتھ دھو لیجئے" اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ ادھر نسیم نے ہاتھ بھی نہ دھوئے تھے کہ وہ کھانا لے کر پہنچ گئی اور میز پر لگا کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرانے لگی "کہیے بھائی جان اور کچھ" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔
"بس ریشاں! تم ہو تو سب کچھ ہے" نسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ہاں ہیں ہوں ہی مگر یہ تو بتائیے کہ اور کچھ بھی چاہیئے" اور یہ کہہ کر یہ جا وہ جا۔ خوشی کے مارے اس کا بُرا حال تھا اور وہ جلدی جلدی پانی نکال رہی تھی کہ اس کی نظر طلعت پر پڑی جو بڑے اطمینان سے انگڑائی لیتی ہوئی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی اور اُسے دیکھتے ہی ریشاں کو کچھ یاد آیا۔ اس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی سلوٹ پڑ گئی۔ جیسے اُسے کچھ یاد

آگیا ہو۔

"طلعت باجی —— لو یہ بانی بھائی جان کو دے آؤ۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ یا پھر میرے ساتھ چلو۔ میں رکھ آؤں گی" اور طلعت کو ہنسی آگئی۔ لیکن ریشماں کے چہرے پر گھبراہٹ کے بھی کوئی آثار نہ تھے۔ وہ اسی طرح خوش تھی اور آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

"اچھا جا رکھ آ" طلعت نے ہنستے ہوئے کہا۔ اتنا سننا تھا کہ بس اس کے جسم میں پھر بجلی سی دوڑ گئی اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ گلاس لے کر نسیم کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"بس اب کچھ نہیں" اس نے ٹانی نکال سامنے رکھ دی "لو یہ کھالو۔ شاباش بڑے کام کی ہے اپنی ریشم"

"اور ریشماں نے بڑی مرجھائی ہوئی شکل بناتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں لیتی دیدیجئے گا طلعت باجی کو"

"کیوں طلعت کو کیوں" نسیم نے لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔

"جلتی ہیں جو ——" وہ کچھ سمجھ کر چپ ہو گیا اور ریشماں نے سر جھکا کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "نہ جانے انھیں میرا ٹانی کھانا کیوں برا لگتا ہے، وہ بھی کیا روز روز کھاتی ہوں اب انھیں کھلا دیا کیجئے میں نہیں کھاؤنگی۔ اب وہی آپ کا کام کیا کریں گی" ریشماں کو سچ مچ غصہ آنے لگا تھا۔ اُسے کل کی بھولی بسری بات یاد آگئی تھی۔

"اچھا خیر —— لو یہ کھالو —— میرے کہنے سے پھر دیکھا جائیگا"

اس نے مسکرا کر ٹانی منہ میں ڈال لی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"مت بتانا طلعت کو ——"

"اچھی بات ہے" اس نے کچھ سوچ کر کہا اور آج پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ طلعت سے ہر بات نہ بتانی چاہئے اور اس نے ٹانی کو منہ میں کچھ اس طرح رکھ لیا جیسے کوئی راز منہ میں بند کر لیا ہو اور تھوڑی دیر کے لئے تو غیر ارادی طور پر اس نے بھی محسوس کیا جیسے وہ نسیم سے بھی کوئی راز رکھے ہوئے ہے۔ اس نے ٹانی کو اور زوروں سے ہونٹوں میں بھینچ لیا اور ایک بار اچھل کر وہیں ریشماں ہو گئی۔۔

ادھر بیگم نے جو اُسے جو نسیم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو انھیں کچھ یاد آگیا۔ انھوں نے آہستہ سے کہا " اری ریشماں! تجھ سے کیا کہا تھا کہ مت جایا کر نسیم کے کمرے میں اور تو اچھل کر پہنچ جاتی ہے۔ ذرا بھی تو تجھے ہوش نہیں "

" ارے بھابی بس کھانا ہی تو دینے گئی تھی۔ طلعت باجی اپنے کمرے میں تھیں۔ بھائی جان کو کالج جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ انھوں نے مجھے آواز دی اور میں چلی گئی —— اور ہاں جو پانی کے لئے طلعت باجی سے کہا تو انھوں نے کہہ دیا کہ جا تو ہی دے آ —— اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں " ریشماں کافی سے زیادہ زور سے بول رہی تھی —— چنانچہ بیگم بھی ایک طرف خاموش ہو کر چل دیں۔ یہ سوچتی ہوئی —— ابھی نادان ہے۔ ذرا بڑی ہوگی تو خود ہی یہ حرکتیں چھوڑ دے گی۔ سن کا تقاضا ہے ——

مگر آج جب نسیم نے اپنی شادی کی بات پر صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کہیں شادی نہ کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو اسی لے پالک لڑکی سے جس کا نام ریشماں ہے تو جیسے سارے گھر کی انسان دوستی مشعل کر صاف ہو گئی۔ وہ اپنی ریشماں جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے کون تھا جو بیچاری تھی۔ اب ایک دم پوری حرافہ ہو گئی۔ جس نے سیدھے سادے نسیم پر جادو کر دیا تھا اور بیگم بھی کہتی رہیں کہ ان کا نسیم تو بالکل معصوم ہے۔ اس بد ذات چھوکری نے پھانس دیا ہے —— اور پھر کوئی شکل ہو تو کوئی بات بھی ہے کہ چلو لڑکے کا ایک پری کیا مگر وہ تو کھٹنی ہے کھٹنی ہے۔ رنگ گورا تھا تو کیا، جیسے کوڑھ کے داغ، آنکھیں بڑی کالی کالی جنہیں دیکھ کر دور ہی سے ڈر لگے۔ کون اس کو خوبصورت کہے گا جسم پر کچی کھال جیسے کسی نے مڑھ کر ابھی رکھ دیا ہو اور تیل کی مالش سے خوب چمکا رہا ہو۔ صورت میں صورت ہے۔ کسی طرح برداشت کر بھی لیتے مگر وہ تو لے پالک تھی —— کا داغ کہیں چھوٹ سکتا ہے۔ اب اس سے بیاہ کر کے کون اپنی ہڈی میں بل ڈالے گا۔ رہو تو بھی کچھ تسلی ہو کہ چلو خاندان تو چلے گا۔

اور بیگم نے طے کر لیا کہ جو بھی ہو گا اپنے اکلوتے کی شادی وہ لے پالک سے نہیں

کریں گی۔

دو چار روز میں کونے اترے سارے گھر میں یہی باتیں ہونے لگیں۔ رشیاں بھی اسی گھر میں رہتی تھی، اس سے کوئی کہاں چھپاتا۔ اس نے بھی اڑتی اڑتی سن لی کہ معاملہ کیا ہے — ہائے اللہ اس کا دماغ گھٹن سے رہ گیا، آخر یہ معاملہ ہے۔ بھائی جان کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی۔ لیکن پھر اس کو جیسے کوئی سکون مل گیا — اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نسیم نے اسے آواز دی۔

"اری رشیم ذرا ادھر تو سن" آواز سنتے ہی جیسے اس کے سارے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا جیسے کوئی ہرن شکاری کی چاپ سے اپنے کان کھڑے کرلے مگر اس کو آواز پہچاننے کے لئے اپنے کان کھڑے کرنے کی تھوڑا ہی ضرورت تھی وہاں تو وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ اس نے آہستہ سے قدم اٹھایا، فرش پر رکھا، چھن سے آواز آئی، کیسی آواز — اس کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے دوسرا پاؤں اٹھایا اور بہت آہستہ سے فرش پر رکھا مگر فرش جیسے چینی کا ہو گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر پھر ادھر ادھر دیکھا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے سارے گھر کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں — وہ سب چھپ چھپ کر دروازوں کی اوٹ میں سے جھانک رہے تھے اور جیسے کسی نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں وہ آہستہ آہستہ نسیم کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

"کیا ہے بھائی — جان" اس سے بھائی جان بھی تو ٹھیک سے نہیں کہا گیا۔

"اری رشیاں — کیا بات ہے تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے"

مگر وہ کیا بتاتی — اس کو تو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں گھبرائی ہوئی تھی۔

"کوئی بات بھی بتاتے ہو یا جاؤں"

"ارے آج کیا ہو گیا رشیم بی"

"تم کام بتاتے ہو یا پھر جاؤں — بھابی اور طلعت باجی نہ جانے کیا ..."

"بھابی اور طلعت باجی — کیا بات ہوئی"

"کچھ بھی تو نہیں — اچھا میں جاتی ہوں" اور یہ کہکر مڑی ہی تھی کہ نسیم

روک لیا۔

"اچھا لو ـــ یہ ٹافی تو کھا لو۔"

"نہیں ـــ میں نہیں لیتی یہ ٹافی، کوئی دیکھ لے گا۔"

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا کرے گا۔ کوئی کسی کی چوری ہے۔ تجھے آج ہو کیا گیا ہے ریشاں۔"

"اونہہ" ریشاں نے بھویں سکوڑتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ ایسی شکل بنائی جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہی ہو "بھائی جان آپ بھی بڑے بے وقوف ہیں جو اتنی سی بات نہیں سمجھتے" مگر بظاہر اس سے کچھ نہیں کہا بلکہ ٹافی لے لی اور کمرے سے باہر نکل گئی اور اتفاق کی بات بیگم دوسرے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ انھوں نے جو ریشاں کو نسیم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو ٹھٹھک گئیں۔

"اری ریشاں کی بچی ـــ کیا کر رہی تھی کمرے میں؟" اور ریشاں کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ـــ وہ تو وہیں بس جم کر رہ گئی ـــ اس نے ٹافی کو خوب اچھی طرح مٹھی میں بھینچ لیا اور اس کی زبان سے تو جیسے کوئی لفظ ہی نہیں نکل رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دے۔

"جھاڑو دینے گئی تھی کمرے میں۔"

"ایسے دی جاتی ہو گی جھاڑو ـــ ہاتھ منہ صاف دھول کا نشان نہیں ـــ پھر فرش پر جھاڑو بھی سنائی نہ دے۔ ایسے دیتا ہو گا کوئی جھاڑو۔ دیکھو ریشاں میں صاف صاف کہے دیتی ہوں۔ اگر تم کو اس گھر میں رہنا ہے تو عزت کے ساتھ رہو۔ یہ سب چھل فریب نہیں چلیں گے۔ جس ہانڈی میں کھانا اسی میں چھید کرنا۔ ڈائن بھی دس گھر چھوڑ کر کھاتی ہے ـــ تجھے تو نام کو بھی شرم لاج نہیں۔ اچھے بھلے لڑکے کو خراب کر کے رکھ دیا ہے اس حرافہ نے ـــ۔ اور تیرا بھی کیا، غلطی میری تھی جو میں نے پاؤں کی جوتی کو پاؤں میں نہیں رکھا ـــ ورنہ تیری مجال تھی جو آنکھ اٹھا کر دیکھتی میرے لال کی طرف ـــ بھول گئی اپنی اوقات ـــ"

بیگم کا غصہ اور بڑھتا اگر طلعت اس کو ہٹا کر ایک طرف نہ لے جاتی۔

لیکن ریشاں سر جھکائے اسی طرح کھڑی رہی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت سے ٹافی چھوٹ گئی

—— وہ بے خیالی میں اُسے اپنے پاؤں سے روندنے لگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ کسی کے بولنے کا انتظار کرتی رہی جو اس کی طرف سے بولے گا۔ مگر کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ وہ یہ سوچتی ہی رہ گئی کہ اب بھائی جان ضرور بولیں گے —— اس کی طرف سے وہ لڑیں گے اور جلدی سے کمرے سے نکل کر ایک ٹافی اس کے منہ میں ٹھونس دیں گے —— اور آہستہ سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہیں گے۔

"اری پریشان تو مت گھبرا۔ میں موجود ہوں —— تجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت —— میں نے تو طے کرلیا ہے کہ تجھ سے شادی کروں گا چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔"

مگر بھائی جان نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ البتہ اس وقت اس کے ذہن میں یہ خیال بڑی تیزی کے ساتھ آیا کہ وہ ملائن ہے —— حرافہ ہے —— پاؤں کی جوتی ہے —— نے پاک ہے —— ہاں ہاں —— نے پاک ——"

(شاہراہ ستمبر ۱۹۵۱ء)

غلام عباس مولوی

بوجھ

یہ اس وقت کی بات ہے جب گاؤں میں سیلاب آیا تھا۔ آدمی بڑا کائیاں ہوتا ہے۔ ہوا کے تیور پہچانتا ہے۔ صبح ہی صبح ندی کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر سوجھ بوجھ والوں نے فیصلہ کیا کہ فوراً ندی کے اس پار بھاگ چلو۔ ورنہ شام تک سارا گاؤں ڈوب جائے گا۔

کشتیاں کم تھیں اور بھاگنے والے زیادہ۔ ایک کشتی پر مولوی عین اللہ، پنڈت دھرم داس ان کے گھر بار والے اور رنام سنگھ سارتھی۔ سوار ہو گئے۔ گاؤں میں صرف ایک رنڈی تھی۔ کہیں سے وہ بھی دوڑی دوڑی آئی اور اسی کشتی پر سوار ہو گئی۔ لوگ چیختے چلاتے رہے مگر رنڈی کی زبردستی کے آگے کسی کی ایک بھی نہ چلی۔ وقت جھگڑا بڑھانے کا نہیں تھا۔ دیکھتے دیکھتے کشتی پانی میں تھی اور رنڈی کشتی پر!

کشتی میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کسی نے رنڈی کو بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔ مصیبت بول کر نہیں آتی۔ تھوڑی دیر میں ہوا تیز ہو گئی۔ طوفان بڑھ گیا اور کشتی ڈگمگانے لگی۔ کشتی کے ہر ہچکولے کے ساتھ رنڈی اپنا توازن کھو بیٹھتی تھی اور شریف شانوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتی تھی اور شریف مسافر جب رنڈی کے نجس ہاتھوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے تو کشتی اور زیادہ ڈگمگانے لگتی تھی۔ آخر رنڈی گھبرا کے پنڈت جی کے پاس ہی بیٹھنے لگی۔ انہوں نے کراہت سے منہ پھیر لیا اور

مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگے مگر ذرا سا کھسک گئے۔ نہ معلوم کیوں!

کشتی کے سارے مسافر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ مانجھیوں نے بتایا کہ کشتی میں بوجھ اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ اب بچنا مشکل ہے مگر بوجھ ہلکا ہو تو کیسے؟ سب کو اپنی جان عزیز تھی اور اپنا سامان بھی!

مولوی عین اللہ، پنڈت دھرم داس ان کے گھر بار والے اور تمام سنگی ساتھیوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ سارا بوجھ اس رنڈی کا ہے۔ اسی کی بدولت سیلاب نے گاؤں کا رخ کیا اور اسی کی وجہ سے کشتی میں بیٹھے ہوئے گاؤں کے شریف ترین لوگوں اور ان کے معصوم گھر والوں کی جانیں خطرے میں تھیں۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ رنڈی کو اٹھا کر ندی میں پھینک دیا جائے تاکہ سب کی جانیں بچ جائیں اور یہ مستقل پاپ بھی ہمیشہ کے لئے کٹ جائے۔

رنڈی بھی زبردست۔ اس نے کڑک کر کہا "سیلاب میری وجہ سے گاؤں میں نہیں آیا۔ سیلاب رنڈی باز نہیں ہے۔ رنڈی باز آپ لوگ ہیں۔ گاؤں میں اگر آپ لوگ نہ ہوتے تو میں بھی نہ ہوتی۔ اگر آپ اور آپ کی شرافت کا بوجھ نہ ہوتا تو یہ کشتی مجھے کنارے لگا دیتی۔ خدا . . .

. . . انصاف اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

مسافروں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ان کے چہرے نفرت اور غصے سے لال بھبوکا ہوگئے اور قریب تھا کہ سب مل کر رنڈی کو پانی میں پھینک دیں کہ مولوی صاحب کے لڑکے نے مزاحمت کی۔ اس نوجوان نے کہا "اگر ہم اس رنڈی کو پھینک دیں گے تو بھی ہم بچ نہیں سکتے۔ پچیس پچاس شریفوں کی جان کا صدقہ ایک رنڈی کی ناپاک روح نہیں ہو سکتی۔ پھر اگر ہم زندہ بچے تو ہماری باقی زندگی کا ہر لمحہ ایک رنڈی کا احسان مند ہو جائے گا" لوگوں کے دماغ ماؤف ہو رہے تھے۔ کسی نے سمجھا ہی نہیں کہ وہ کیا اور کیوں کہہ رہا ہے اور کسی نے توجہ ہی نہیں دی کہ پنڈت جی کی جوان بیٹی بھی دبی زبان سے مولوی صاحب کے لڑکے کی تائید کر رہی ہے۔

کشتی ڈگمگاتی رہی۔ طوفان بڑھتا رہا۔ رنڈی پنڈت جی کے بیٹے سے پنڈا ملائے بیٹھی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ مسافروں کی آنکھوں میں موت ناچ گئی۔ کشتی میں توبہ و استغفار کی دھوم مچ گئی۔ وہ لوگ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے

جنھوں نے کبھی گناہ نہیں کیا تھا۔

مگر ندی چٹان کی طرح خاموش تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھی اور اس نے جلدی جلدی مسافروں کا بہت سا سامان ندی میں پھینک دیا اور خود بھی کود گئی۔

ڈھائی گھنٹے کے بعد کشتی کے تمام مسافر صحیح وسالم دوسرے کنارے پر اتر گئے۔

وہ تمام لوگ آج بھی سیلاب کا تذکرہ کرتے ہیں اور ندی کو گالیاں دیتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ ان کے کھانے پکانے کے برتن بھی لے ڈوبی ؛

(ادب لطیف)

کرشن چندر
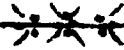
میں انتظار کروں گا

ذی ی دیکھنے میں بڑی نازک اور سبک تھی اس کی خوبصورتی منگ خاندان کی کسی پرانی چینی صراحی کی طرح تھی جو کسی امیر گھر کے منقش طاقچوں یا اونچے اونچے آتشدانوں پہ سجی ہو۔ اسے دریچے میں اپنی صبیح رعنائی سے جگمگا رہی ہو۔ پہلے دن جب میں کاغذ کے پھول بیچنے نکلا تو مجھے وہ بالکل اسی طرح نظر آئی جس طرح میں نے ابھی بیان کیا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ ہانگ کے ساتھ کرافورڈ مارکیٹ کے ترا ہے پہ کاغذ کے پھول شگوفے بیلیں، گملے، شاخیں، ٹوکریاں، ٹوپیاں اور پنکھے لئے کھڑی تھی۔ سردی کا موسم تھا اور اس نے نیلے رنگ کی ایک صدری پہن رکھی تھی اور نیلے رنگ کا ایک پائجامہ جس میں بھی روئی کی تہ سلی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے یعنی وہ ان پرانی چینی عورتوں میں سے نہیں تھی جن کی چال دیکھ کر ہمیشہ سرکس کے تنے ہوئے رسّے کا خیال آتا ہے جس پہ سرکس والیاں چھاتا ہاتھوں میں لے کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔

بڈھے ہانگ کا چہرہ ایک سوکھے ہوئے میٹھے پھل کی طرح تھا۔ زمانہ کے سرد و گرم نے اسے اچھی طرح سے کوٹ پیٹ کر اس پہ طرح طرح کے نشان بنا دیئے تھے اس چہرے کو دیکھ کر آپ ایشیا کے پچھلے پچاس برس کی تاریخ پڑھ سکتے تھے۔ آنکھوں میں ڈر اور چالاکی اور صدیوں کی جہالت، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھریوں کی لکیریں۔ غلامی کی زنجیر در زنجیر بائیں رخسار پہ ایک زخم کا سیاہ نشان جو رخسار کی ہڈی سے شروع ہو کر جبڑے تک چلا گیا تھا۔ یہ زخم اسے ہانگ کانگ میں لگا تھا جب رکشے کو دھیما چلانے کے جرم میں اسے ایک گورے نے دہرے پیٹا تھا۔ ٹھوکروں سے مکوں سے اور چابک سے۔ ایسے ایسے انسان

پیٹھ پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر کئی نشان تھے۔ جبر و استبداد کی تاریخ کے سیاہ ننگ ہیں جو اس کی زندگی میں ایک صیاد کی طرح ابھرے اور ایک جلاد کی طرح اپنی بے رحمی کے نشان چھوڑ کر آگے چلے گئے بہار کیسے آتی ہے۔ شگوفے کیسے پھوٹتے ہیں۔ پھول کیسے کھلتے ہیں شاخ بار ثمر کیسے سر جھکاتی ہے۔ ان چیزوں کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کی زندگی نے پہلے تو ایک بہت بڑی بھوک دیکھی۔ پھر ایک بہت بڑی چٹان دیکھی۔ پھر ایک بہت بڑا سمندر دیکھا اور جب وہ یہاں تک پہنچا تو اس کی ہمت نے اسے جواب دے دیا اور اس نے سوچ لیا کہ جد و جہد کرنا فضول ہے زندگی ایسی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ اس میں بیشمار لوگ پستے ہیں اور چند لوگ مزے کرتے ہیں۔ چند لوگ دولت پاتے ہیں اور بے شمار لوگ بے عزتی سہتے ہیں۔ چند لوگ ظلم کرتے ہیں اور بے شمار لوگ ظلم سہتے ہیں اور اس کا کوئی مداوا نہیں ہے کیونکہ اونچے دیوتاؤں نے جو آسمان کے اوپر رہتے ہیں یہ زندگی ایسے ہی بنائی ہے۔ اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا بھی گناہ ہے اور جب اس نے یہ سوچ لیا تو اس نے اپنے بادبان گرا دیے اپنا مستول جھکا دیا اور اپنی کشتی کو کھینچ کر بمبئی کے ساحل پہ لے آیا۔ اب وہ دس سال سے بمبئی کے ایک گندے محلے کماٹی پورہ میں رہتا تھا۔ یہاں اس نے ایک چینی طوائف سے شادی کر لی تھی۔ وہ اس کا خاوند بھی تھا اور دلال بھی۔ دن کو خاوند کا حق جتاتا تھا رات کو دلالی کرتا تھا۔ افیون کھاتا تھا۔ چانڈو پیتا تھا اور کبھی کبھی ضد آنے پہ اپنی پہلی بیوی کی بیٹی ذی ذی کو پیٹ بھی لیا کرتا تھا آٹھ سال اسی طرح آرام سے گذر گئے مگر آسمان کے اونچے دیوتاؤں کو اس کا آرام و سکون کب گوارا تھا۔ اس لئے انھوں نے اس کی طوائف بیوی کو اس سے چھین لیا اور جب وہ چند دن بیمار رہ کر جہان سے سدھار گئی تو بڈھے یانگ کو اور اس کی بیٹی ذی ذی کو جو اب جوان ہو گئی تھی کاغذ کے پھول اور پنکھے بیچنے کا دھندا کرنا پڑا۔

اور آج آسمان کے دیوتاؤں نے اس پر ایک اور ظلم ڈھایا یعنی مجھے اس کے بالمقابل پھول بیچنے پر مجبور کر کے کرافٹ مارکیٹ بھیج دیا۔ بڈھے یانگ کی آنکھوں میں خوف اور چالاکی اور سازش اور بہتات کی گہری نفرت مجھے دیکھ کر چمک اٹھی اور اس نے اپنی بیٹی سے چینی زبان میں کچھ کہا اور اس نے بھی میری طرف نفرت سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

حالانکہ میں اس نفرت کے لائق نہ تھا۔ مجھے بھی مجبور کر دیا گیا تھا۔ میں دراصل ایک بہت بڑا آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ رنگوں سے مجھے شروع ہی سے بڑی دلچسپی تھی۔

اور دسویں تک مجھے جس کلاس میں سب سے زیادہ دلچسپی تھی وہ یہی آرٹ کی کلاس تھی۔ میں دن بھر تصویریں بناتا رہتا طرح طرح کے پھول اور نقش و نگار دجا گر کرتا رہتا اور دوسرے مضامین کی طرف بہت کم دھیان دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دسویں میں فیل ہو گیا اور میرے چچا نے جو میرے ابا کے مر جانے کے بعد میرے اخراجات کے کفیل تھے مجھے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا اور اس کے تھوڑے دنوں بعد جب ان کے دفتر میں تخفیف ہوئی اور وہ باہر نکال دئے گئے تو انھوں نے بھی اپنے گھر میں تخفیف کی اور مجھے باہر نکال دیا۔ اب مجھے وہاں سونا پڑا جہاں چند ایک رذیلوں کو چھوڑ کر بمبئی کے سارے شریف آدمی سوتے ہیں یعنی فٹ پاتھ پر۔ فٹ پاتھ پر سوتے سوتے پہلے دو چار دن تو مجھے بڑے عجیب عجیب سے خواب آئے مثلاً میں نے دیکھا میرے پاس ایک پیکارڈ گاڑی ہے اور میرے چچا اس کے ڈرائیور ہیں۔ میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں اور ان ممتحنوں کو ڈانٹ رہا ہوں جنھوں نے مجھے دسویں میں فیل کر دیا تھا۔ میں پیرس میں ہوں اور دنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹ مجھے اپنی تصویریں دکھاتے ہیں اور میں حقارت سے ان کی تصویریں دیکھ کے کہتا ہوں ہچے! کیا بیہودہ آرٹ ہے تمہارا۔ لیکن اس کے بعد جب مجھے دو چار فاقے لگے اور رات کو خواب میں بھی روٹیاں نظر آنے لگیں تو میں نے سوچا کچھ کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے میں نے کلرکی کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ کلرکی کے لئے گریجویٹ ہونا اور گریجویٹ ہو کر کسی بڑے آدمی کا سالا ہونا بہت ضروری ہے اس کے بعد میں نے ایک حجام کے ہاں نوکری کر لی۔ حجام بال کاٹتا تھا۔ میں سر پر برش پھیرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں حجام نے اپنی دوکان بند کر دی۔ کیونکہ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بمبئی میں فاقے، بے کاری بھوک اور راشن سے لوگوں کے سر کے بال اڑتے جا رہے ہیں۔ پہلے لوگ حجام سے بال کٹوانے کے لئے آتے تھے اب خالی سر پر برش پھروانے کے لئے آنے لگے اور حجام نے مجبور ہو کر اپنی دکان بند کر دی۔ آج کل وہ وارسا میں مچھلیاں پکڑتا ہے اس کے بعد میں نے مل میں نوکری کی۔ پھر سٹرائیک کی پھر پکڑا گیا۔ پھر تین مہینے جیل میں بند رہا۔ اس کے بعد مل مالکوں نے سب جگہ میرا حقہ پانی بند کر دیا یعنی حبات باہر کر دیا۔ اب مجھے کسی مل میں کام نہیں ملتا تھا۔ ناچار میں نے خوانچے والے کا کام کیا ایرانی ہوٹل والے کے ہاں ملازمت کی۔ مگر کہیں پاؤں نہیں جمے آخر کار سوچ سوچ کر میں نے کاغذ کے پھول تیار کر کے انہیں کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے بیچنے کا کام شروع کیا۔ میں ایک عرصہ سے دیکھ

ساتھا کہ یہاں ان پھولوں کی اچھی خاصی بکری ہو جاتی ہے بہت سے چینی اس کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ چند ایک دیسی لوگ بھی ہیں مگر ہاتھ کی صفائی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے دو چار دن کے بعد ہی کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے سے کہیں اور چلے جاتے ہیں یا شاید نہیں، دور کوئی دھندا کرتے ہوں گے اس کے یہاں جو چینی پھول بیچنے والے نظر آتے ہیں۔ وہ مستقل نظر آتے ہیں۔ مگر اپنے دیسی لوگ جو نظر آتے ہیں وہ بیچ بیچ میں نظر آتے ہیں اور بیچ بیچ میں گم ہو جاتے ہیں۔ دو تین چینی کالا دیوی روڈ کو جانے والی سڑک کی طرف کھڑے رہتے ہیں دو تین ہوری بندر جانے والی سڑک کے سامنے دو چار ہنگل داس مارکیٹ کے سامنے موجود ہوتے ہیں البتہ کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے جہاں ٹرام کا جنکشن ہے وہاں میں صرف بڈھے ہانگ اور اس کی لڑکی ذی ی کو دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا یہاں ذرا مقابلہ کم ہے۔ بکری کی گنجائش زیادہ ہوگی۔ اس لئے میں بھی اپنے پھول پتیاں لے کر وہیں جم گیا۔ میرا جمنا وہاں اتنا ہی ضروری تھا جتنا بڈھے ہانگ اور اس کی بیٹی ذی ی کا مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا۔

خیر بڈھے ہانگ کی نفرت کی تو مجھے اتنی پروا نہیں تھی لیکن ذی ی جیسی جوان خوبصورت لڑکی کی نفرت میں کیسے برداشت کر سکتا تھا اور پھر یہ بات بھی نہیں تھی کہ میرے پھول ان سے برے تھے۔ پھول کاٹنے کا سلیقہ مجھے آگیا تھا۔ اگرچہ جیب کاٹنے کا سلیقہ ابھی تک نہ آیا تھا۔ کرسنتھم کے گچھے دار پھول ایسے اچھے بنائے تھے میں نے کہ رات کی پارٹیوں میں شریک ہونے والے سستے قسم کے جذباتی لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ خرید کے لے گئے۔ میرے گملوں میں جنگلی بیلوں کے سرخ گلاب دیکھ کر آپ بلبل کا چہکنا سن سکتے تھے اور سفید چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ جھالردار پتے اتنے اچھے کترے تھے میں نے کہ لوگ ان سفید پھولوں کو ان جھالردار پتوں کی خاطر ہی لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ کاغذ کے پھول خریدنے والے لوگ بڑے گھٹیا اور احمق ہوتے ہیں یہ لوگ نقلی عورتوں کے سامنے نقلی محبت کرتے ہیں۔ نقلی پھولوں کے ساتھ نقلی خوشبو لگا کے اپنا ڈرائنگ روم سجاتے ہیں اور نقلی اخلاق پر عمل کرتے ہوئے نقلی جنت کو سدھار جاتے ہیں۔ چنانچہ جب شام ہوئی تو میں نے اپنے تمام پھول بیچ دئے۔ خالی گلاب کی ایک ڈنڈی بچی رہ گئی۔ وہ میں نے ذی ی کے حوالے کر دی تاکہ وہ اسے اپنے بالوں میں ٹانک لے مگر ذی ی نے بڑی سختی سے اس ڈنڈی کو توڑ مروڑ کر پرے

پھینک دیا اور بڈھے یانگ نے مجھے غصے سے گھورتے کہا "آج تو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ لیکن اگر تم کو تم یہاں مجھے نظر آئے تو یا غنڈوں سے پٹواؤں گا یا پولیس سے کہہ کے تمہیں گرفتار کروا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ پولیس سب کی ہے۔ پولیس والا تمہارا کیا چچا لگتا ہے۔

یانگ نے کہا۔ میں یہاں خالی کھڑے ہونے کیلئے پولس کے سنتری کو آٹھ آنے دیتا ہوں۔

میں نے اپنی بھری ہوئی جیب کے سکے کھنکھنائے اور اس سے کہا۔ تم اٹھنی دو گے تو میں بارہ آنے دوں گا اور دوسرے دن جب پولیس کا سنتری آیا۔ تو میں نے یہی کیا۔ اس پر دھبلے چارا یانگ بہت مجبور ہو کر رہ گیا اور آخر کار اسے مجھ سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑا۔ سمجھوتے کی پہلی شرط یہ تھی کہ میں اس کی لڑکی کو بھگا کے نہیں لے جاؤں گا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جو پھول وہ بیچتے ہیں وہ میں تیار نہیں کروں گا تیسری شرط یہ تھی کہ میں کاغذ کے پھول والا پنکھے والا کے نہیں بیچوں گا۔ یہ ان کی مناپلی رہے گی۔ آخری دو شرطیں میں نے مان لیں لیکن پہلی شرط جوں جوں دن گذرتے گئے اور مجھے ذی ی اچھی سے اور اچھی سے اچھی لگنے لگی۔ مجھے وہ پہلی شرط اکھرنے لگی۔ لیکن ذی ی میری طرف بالکل توجہ نہ کرتی تھی اور یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ کیونکہ میں اپنی چھوٹی سی زندگی کے چھوٹے سے تجربے کی بنا پر یہ ضرور جانتا تھا کہ جو لڑکیاں پہلی ملاقات ہی میں چپڑ چپڑ باتیں کرنے لگتی ہیں وہ نہایت خطرناک ہوتی ہیں اور کہیں آپ کا ہاتھ غلطی سے ان کے کندھے سے بھی لگ جائے تو فوراً پولیس تک معاملہ لے جاتی ہیں ــ مگر ذی ی ایسی نہ تھی وہ مجھ سے بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اکثر اپنے غلافی پپوٹوں کے اندر سے مجھے یوں دیکھتی تھی کہ میں سوچتا تھا شاید ان غلافی پپوٹوں کے اندر کی آنکھوں کے اندر اور بھی کئی آنکھیں تہہ میں جو مجھ کو نظر نہیں آتی ہیں اور میرا دل اس کی نظر کے سامنے یوں کانپنے لگتا تھا جیسے سکول کا بچہ ہیڈ ماسٹر کے بید کے سامنے۔

بڈھے یانگ نے میرے دل کی حالت کا اندازہ کر کے ایک دن جب ذی ی اس کے ساتھ نہیں آئی تھی مجھ سے پوچھا "تم ذی ی سے شادی کرو گے؟"

شادی؟ میں نے چونک کے کچھ اس سے کچھ اپنے آپ سے پوچھا۔

ہاں! ہاں! بڈھے یانگ نے ایک بڑی ہی چالاک مسکراہٹ کے ساتھ اپنے لوٹتے ہوئے

دانتوں والا منہ کھولتے ہوئے کہا۔ ذی ی سے شادی کروگے۔ اچھا بتم زبھی سکتے ہو۔ کماتے ہو اچھے خاصے، صورت شکل بھی معقول ہے پڑھے لکھے بھی ہو اور میری ذی ی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں ہے، وہ انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے۔ اور چینی بھی۔ سارے کانی پونہ میں اس جیسے پھول اور کوئی تیار نہیں کرسکتا ہے نہ انگریزی ٹوپیاں۔ نہ پنکھے، وہ کوئی اجڈ گنوار نہیں ہے۔

میں نے کہا، اچھا میں ذی ی سے شادی کرلوں گا۔ گو میرا ارادہ اسے بھگا کر لیجانے کا تھا۔

ہانگ بولا۔ وہ میں جانتا ہوں۔ ایسا بدھو نہیں ہوں۔ آدمی کی نظر پہچانتا ہوں۔ مگر تم جیتے جی کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

میں نے کہا۔ کوشش تو کی جاسکتی ہے کامیابی چاہے نہ ہو۔ یہ بات آسمان کے دیوتاؤں پر چھوڑ دینی چاہیئے۔

ہانگ بولا۔ یہ بات تو میں پولیس والوں کے سپرد کردوں گا۔ آسمان کے دیوتاؤں پر اس معاملے میں ذرا کم بھروسہ کرتا ہوں۔

میں نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ تو میں بھگانے کا خیال چھوڑ دیتا ہوں۔ شادی پر رضامند ہو جاتا ہوں۔ کتنے روپے لوگے؟

ہانگ نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ایک بڈھا مالدار چینی جس کا فورٹ میں رستوران بھی ہے ذی ی کے ایک ہزار دیتا تھا۔ میں نے بڈھا سمجھ کر ہاں نہ کی۔ تمہیں چھ سو میں دے دوں گا۔

چھ سو میں کہاں سے لاؤں گا؟

ہانگ نے کہا۔ قسطوں میں دیدینا۔

میں چپ ہوکر کچھ سوچنے لگا۔

ہانگ نے کہا۔ قسطوں میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ آج کل تو ریڈیو، گاڑی، فرنیچر ہر چیز قسطوں پر مل جاتی ہے۔ تم چالیس پچاس روپیہ مہینہ بھی دوگے تو سال بھر میں ادا ہو جائیں گے۔ اگلے سال تم شادی کرلینا۔

میں نے کہا۔ مجھے منظور ہے۔ لاؤ ہات۔

بڈھے نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ آج سے تم سمجھو کہ میرے بیٹے

ہوگئے۔ اس لئے ایک عقل کی بات کہتا ہوں۔ ہر روز اپنی کمائی میں سے کچھ نکال کے مجھے دیتا جا۔
چھ مہینے حساب کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ روز کا روز بچا دو تو بچ جاتا ہے۔ مہینے کے بعد بچانا بہت
مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے تجربہ ہے اس چیز کا۔

میں نے کہا۔ بہت اچھا روز کا روپیہ سوا روپیہ مجھ سے لے لینا۔ باقی مہینے کے آخر میں۔

شاباش کہہ کر بڈھے ہانگ نے پھر مجھ سے زور سے ہاتھ ملایا۔ اور کہنے لگا۔ مگر ذی ی کے
کان میں اس کی بھنک نہ پڑنے پائے۔ نہ تمہارے سلوک سے اور نہ تمہاری کسی بات سے اسے یہ
پتہ چلے کہ ہم لوگ کیا کرنے والے ہیں اور ہاں شادی سے پہلے میں اسے تم سے زیادہ بات چیت
کا موقع بھی نہیں دوں گا۔ ہمارے ہاں یہ دستور نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ہمارے ہاں بھی یہ دستور نہیں ہے۔

بڈھے ہانگ نے کچھ کھانستے کچھ ہنستے کے بیچ میں کہا اور یہ بہت اچھا دستور ہے جب تک
مرد عورت ایک دوسرے سے بات نہ کریں بھرم قائم رہتا ہے۔ مجھی کو لو جب میں نے ذی ی کی ماں
سے شادی کی مجھے پتہ نہ تھا کہ اس کی زبان کتنی تیز چلتی ہے اور اسے بھی یہ پتہ نہ تھا کہ میرے منہ
سے کتنی بو آتی ہے۔ شادی کے بعد دونوں کا بھرم کھل گیا۔ ہاہاہا

ہاہاہا میں بھی خوب ہنسا پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔ ذی ی کی زبان کیسے
چلتی ہے ؟"

وہ بولا۔ فکر نہ کرو۔ چاندی کی گھنٹی ہے۔ چاندی کی۔

اس واقعہ کو چھ مہینے گذر گئے ہیں ابھی تک ہانگ کو ڈیڑھ سو روپے ہی دے سکا تھا کیونکہ
روزگار کئی دفعہ مندا بھی پڑ جاتا ہے مگر ہانگ بیچارا میری مجبوری سمجھتا تھا۔ اس لئے چپکے سے میں جو
رقم بھی دیتا تھا قبول کر لیتا تھا۔ میرا سلوک ذی ی سے اور ذی ی کا سلوک مجھ سے اسی طرح تھا یعنی
کم گوئی اور کم نگاہی۔ بلکہ اکثر تو اس کی طرف سے شدید عدم توجہی کا اظہار ہوتا تھا جو مجھے گاہے گاہے
سخت پریشان کر دیتی اور میں اپنی دلی حالت اس پر ظاہر کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا۔

آخر ایک روز مجھے موقع مل گیا۔ مون سون کے دن تھے موسلادھار بارش ہو رہی تھی میں اپنے
کاغذ کے پھولوں کو لئے ٹرام سٹینڈ کے اندر دبکا کھڑا تھا۔ میرے قریب ہی ایک بڈھا مونگ پھلی کا ٹوکرا لئے

کی چھوٹی سی ہنڈیا رکھے بیٹھا تھا۔ ایک بھک منگا لڑکا اپنے چیتھڑوں سے بدن ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دانت بجا رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے بازوؤں پر اور ٹانگوں پر کھال منڈھی نظر آتی تھی اور اس کا پیٹ آگے کو بڑھا ہوا تھا۔ چاروں طرف زور کی بارش ہو رہی تھی لوگ دکانوں میں دبکے کھڑے تھے۔ سڑکوں پر کہیں کہیں سفید کبوتر سے نظر آجاتی یا پھر سنہ موٹریں شیشے چڑھائے ہارن بجاتی ہوئی ادھر سے ادھر گذر جاتیں۔ کھڑے کھڑے دن ڈھل گیا شام ہو گئی۔ بتیاں جگمگا اٹھیں لیکن بارش بند نہیں ہوئی۔ ٹرام اور بس کا چلنا بھی بند ہو گیا لیکن بارش بند نہیں ہوئی میں چپ چاپ چھپتے ہوئے ٹرام سٹینڈ کے ایک کونے میں اپنے کاغذی پھول لئے ڈی ی اور بڈھے بانگ کے انتظار میں کھڑا رہا۔ آج دن بھر ڈی ی کو نہ دیکھا تھا روز دیکھتا تھا۔ اس لئے نہ دیکھنے کی خلش سے ناواقف تھا آج معلوم ہوا کہ جسے روز روز جی جان سے دیکھا جائے اسے ایک روز کا نہ دیکھنا کتنا کھل جاتا ہے۔ کتنا برا معلوم ہوتا ہے۔ آج بارش کتنی اداس ہے۔ مارکیٹ کے سامنے کے کھمبے کتنے اکیلے ہیں۔ سڑک کتنی سنسان ہے ٹرام کی لائن کتنی دور تک چپ چاپ اپنے سینے میں کسی انجانے غم کو چھپائے چلی گئی ہے زندگی جو کل تک کاغذ کے پھولوں کی طرح کھل اٹھی تھی۔ آج کس طرح ایک کلی کی طرح بند ہو گئی ہے جیسے اس نے محبت کے سارے دروازے مجھ پر بند کر دیئے ہوں اور مجھے باہر سڑک پر ٹرام سٹینڈ پر کھڑا کر کے خود کہیں چلی گئی ہو ....

یکایک کسی نے پیچھے سے قریب آکے مجھ سے پوچھا۔ آج کتنے کے پھول بکے؟

پوچھنے والے نے سوال اتنے قریب سے آکے کیا اس کے سانس کی حدت میرے رخساروں کو چھو گئی اور جب میں نے اسے دیکھنے کے لئے سر اٹھایا تو اس نے جلدی سے اپنا چہرہ پرے کر لیا اور میری آنکھوں میں ڈی ی کی غلافی نگاہوں کی چمک دوڑ گئی۔ ہاں یہ ڈی ی ہی تھی۔ اکیلی بارش میں بھیگی ہوئی خوشبو کی طرح اڑتی ہوئی بھیگے بالوں میں بھیگی خوشبو لئے۔ اس کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پر ایک عجیب سی چمک ہویدا تھی

میں نے کہا۔ اس بارش میں تم اکیلے اس وقت کیسے آگئیں اور بانگ کہاں ہے؟

اس نے کہا۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سوا دو روپیہ لانے کے لئے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر سے دوا لانی ہے۔

میں نے چپکے سے سوا دو روپیہ دے دیا۔

وہ بولی۔ یہ سوا روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ آج تو پھول بکے نہیں ہوں گے۔

میں نے کہا۔ کل کے بچے تھے۔

وہ بولی۔ کل بھی تو سوا روپیہ دیا تھا۔

میں نے کہا۔ تمہیں کیسے معلوم ہے۔

وہ بولی۔ میں سب جانتی ہوں۔

میں چپ رہا۔

وہ بولی۔ کب تک یہ سوا روپیہ آپ دیتے رہیں گے!

میں نے کہا۔ جب تک چھ سو روپے پورے نہیں ہو جاتے۔

ذی ی نے اک آہ بھری۔ بولی۔ وہ آپ سے چھ سو لے رہے ہیں ایک اور سے آٹھ سو پر معاملہ کر رکھا ہے۔ تیسرے سے بارہ سو پر سودا ہوا ہے۔ ذی ی تو ایک ہے شادی تین جگہ کیسے ہوگی۔

میں ہکا بکا ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری حیرت دیکھ کر بولی۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔

میں نے غصہ میں آ کر کہا۔ یہ بہت بری بات ہے۔

ذی ی نے اک آہ بھری۔ بولی۔ اس سے بھی بری بری باتیں ہم نے دیکھی ہیں۔

لیکن میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ میں نے اور بھی برافروختہ ہو کے کہا۔

ذی ی نے ایک بڑے اداس اور بھیگے لہجے میں جس میں بے انداز تھکن موجود تھی میری طرف مڑ کے کہا۔ کیا یہ سودا کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے پوچھ لیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ چینی عورت کے پاؤں اب بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اب وہ اپنے پاؤں سے چل کے کہیں بھی جا سکتی ہے!

جس انداز سے اس نے "کہیں" کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قریب سے اٹھ کے کہیں دور چلی گئی ہے اور شاید وہ کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ ہندوستان سے آگے، برما سے، سیام سے، ہندچینی سے آگے چین کے کھیتوں میں اس کی نگاہ پڑ رہی تھی۔

وہ بولی۔ بہت آہستہ آہستہ ......

آج مجھے اپنا دیس یاد آ رہا ہے۔ جہاں لوگ نئی زندگی کے لئے لڑ رہے ہیں جہاں میری جیسی

لڑکیاں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔ ایک میں ہی یہاں سڑ رہی ہوں۔ کاش کوئی مجھے کہیں سے پر دیدے میں آج ہی اسی وقت اڑ کر پر لگا کر وہاں پہونچ جاؤں جہاں یہ لڑائی ہو رہی ہے۔

یہ کیسی لڑائی ہے؟ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈی ڈی آج بول رہی تھی۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر ایک لمبے وقفے کے بعد بولی۔ تم جانتے ہو میرا اصلی نام ڈی ڈی نہیں ہے کہ نہیں؟

میرا اصلی نام کچھ اور تھا یہ نام میں نے خود رکھا ہے ڈی ڈی ایک بہادر چینی لڑکی تھی جو چیانگ کائی شیک کے ظلم کے خلاف بہادری سے لڑتی ہوئی شہید ہو گئی میں بھی ڈی ڈی کی طرح لڑنا چاہتی ہوں۔

"کس لئے" ؟

وہ بولی۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں ــــ اچھا کوشش کرتی ہوں........ سنو...... جہاں ہمارا گاؤں ہے۔ وہاں ایک ندی بہتی ہے۔ ہمارے گاؤں کا نام ــ کوانگ شا ہے۔ وہاں پرانا شپاتیوں کے جنگل ہیں اور آڑو کے پیڑ ہیں اور ندی کے کنارے کنارے ولو کے درخت اپنی شاخیں ندی پر جھکائے دور تک چلے جاتے ہیں گھاٹی کے اوپر سارے گاؤں کے اوپر نگاہ رکھتا ہوا بوڑھے سردار وو کا گھر ہے۔ اس نے میرے باپ کی زمین چھین کر اسے گاؤں سے باہر نکال دیا تھا اس وقت میں صرف چار سال کی تھی۔

گاؤں سے کیوں نکالا ؟

اس لئے کہ قرضہ نہ دیا جا سکا۔ جو بوڑھے سردار نے میرے باپ کو میری علالت کے موقع پر دیا تھا۔

یکایک مجھے اپنا چچا کے گھر سے نکلنا یاد آیا۔ میں نے کہا۔ اسے اب میں سمجھ گیا۔

کیسے ؟ وہ بولی۔

بس اپنے تجربے سے۔

اپنا تجربہ بہت ضروری ہے۔

اچھا آگے بتاؤ۔

وہ بولی۔ پھر ہم اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں میں آ گئے وہاں ہم دوسرے لوگوں کے کھیتوں

میں مزدوری کرتے رہے۔ میری ماں بہت خوبصورت تھی۔

میں نے کہا۔ اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

ذی ی شرمائی۔ کچھ خوش ہوئی۔ بولی۔ تم تعریف کر چکو تو آگے چلوں۔

اچھا آگے چلو۔

چونکہ میری ماں بہت خوبصورت تھی اور ہم لوگ بہت غریب تھے اس لئے وہ دوسرے لوگ جن کے کھیتوں میں ہم کام کرتے تھے ہم سے کام کرانے کے بعد عیش بھی چاہتے تھے۔ میرے باپ کو یہ منظور نہ ہوا۔ اس لئے ہم اس گاؤں سے بھی نکل آئے۔

پھر؟

پھر بہت سخت کال پڑا۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ میرے باپ نے تنگ آ کر اپنی بیوی کو ایک امیر بڈھے کے پاس دو ہزار میں بیچ دیا۔

تمہاری ماں کو۔

ہاں اسی کو۔

ان دو ہزار ڈالروں سے ہم لوگ ہانگ کانگ آئے۔ سنا تھا۔ وہاں رکشا کا اچھا بزنس ہوتا ہے میرے باپ نے ایک رکشا خریدلی اور رکشا چلانے لگا۔ گورے لوگ شراب پی کے اکثر دنگا کرتے ہیں۔ لیکن ایک دن میرے باپ کو ایک گورے نے اتنے چابک مارے کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ پھر گورے نے اس کی رکشا کو آگ لگا دی۔

دو ہزار ڈالر جل گئے۔ پھر؟ میں نے پوچھا۔

پھر اس نے کہا۔ پھر میرے باپ نے مجھے بیچنا چاہا۔ لیکن میں بہت چھوٹی تھی۔ بہت کمزور تھی۔ بہت دبلی پتلی تھی۔ کوئی مجھے خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ آخر ایک پادری نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ نوکرانی۔ پادری کی بیوی انگریزی پڑھانے لگی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے۔ میں اچھی خاصی تندرست ہو گئی۔ مگر میرے باپ کو کوئی نوکری نہ ملی۔ اس لئے اس نے ایک انگریزی کمپنی کے گودام میں چوری کی اور پکڑا گیا اور دو سال کی اسے جیل ہو گئی۔

میں چپ چاپ سن رہا تھا۔

وہ بولی۔ اس نے چاول چرائے تھے گودام سے کیونکہ وہ بھوکا تھا اور وہ اس لئے بھوکا تھا کہ ان کے چاول اس کے کھیت سے چرا کے چیانگ کائی شیک کی سرکار نے انگریزوں کے گوداموں میں بھر دیئے تھے اور امریکنوں کے گوداموں میں ان لوگوں نے نہ صرف اس کے چاول چرائے تھے بلکہ اس کے کھیت بھی بتیا کے سردار دو کو دیدئے تھے۔

وہ دیر تک چپ رہی۔

میں نے کہا پھر؟

وہ بڑی بے دلی سے بولی۔ پھر ہم سنگاپور آ گئے۔ سنگاپور سے ملایا گئے۔ وہاں ربڑ کے باغوں میں کام کرتے رہے۔

وہاں سے برما آ گئے۔ پھر بمبئی آ گئے۔ آ گے تم جانتے ہو۔

اور اب؟ میں نے پوچھا۔

اور اب میں تم سے یہ کہتی ہوں کہ تم میرے باپ کو سوا روپیہ دینا بند کر دو۔ میں تم سے کیا کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔

کیوں؟

میں واپس چین چلی جاؤں گی۔ جس دن میرے پاس روپیہ ہوا۔ میں چین چلی جاؤں گی۔

تو پھر تو مجھے روز ڈیڑھ روپیہ دینا چاہیئے۔

وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ میں یہ روپیہ لے کر چین چلی جاؤں گی تو تمہیں کیا ملے گا

میں نے کہا "میں انتظار کروں گا۔"

وہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی بولی۔ میں تو اتنی اچھی نہیں ہوں۔ خاک بھی اچھی نہیں ہوں تم میرا خیال نہ کرو۔ دیکھو تمہارے ہندوستان میں کتنی اچھی لڑکیاں ہیں ان کی ناک کتنی اچھی ہوتی ہے آنکھیں کتنی بڑی بڑی نکیلی جیسے ابھی چہرے سے باہر نکل پڑیں گی۔ ہائے ایسی اچھی آنکھیں تو میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ یہ تم کو کیا ہو رہا ہے۔

میں نے کہا۔ تم جاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔"

وہ میرے قریب آ کے بولی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔

میں نے کہا۔ اب میرے پاس صرف مونگ پھلی کے پیسے رہ گئے ہیں۔

میں نے مونگ پھلی والے سے کہا۔ دو آنے کی مینگ: دو

وہ بولی "مینگ مونگ پھلی کو کہتے ہیں؟ بالکل چینی نام معلوم ہوتا ہے مینگ"۔

مونگ پھلی کھاتے کھاتے کئی بار ہاتھوں میں ہاتھ الجھے۔ لیکن الجھ الجھ کر پھر سلجھ گئے۔ اس کی آنکھوں کی کم نگاہی بے حد عمیق ہو چلی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں بھی کانپ رہا تھا اور چاروں طرف بارش ہو رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ چاروں طرف لوگ ہیں۔ پھر بھی کیسی تنہائی ہے۔

میں نے کہا۔ اور کتنی اچھی تنہائی ہے۔

وہ ہنسی۔ بولی۔ اب میں جاتی ہوں۔

میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا۔ اپنے دل سے صرف اتنا کہا۔ اب یہ کہیں بھی چلی جائے اس سے کچھ نہ ہوگا میں اس کا انتظار کروں گا۔

اور بہت سا وقت گذر گیا۔ وقت گذرنے کا پتہ صرف شام کے اخبار سے معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ پتہ چلتا تھا کہ پی پنگ ختم ہو گیا۔ پی کنگ فتح ہو گیا۔ شنگھائی ختم ہو گیا ماؤ کی فوجیں چین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئیں اور ہانگ کانگ کی ساحلی دیواروں سے ٹکرانے لگیں جس روز یہ فوجیں یعنی چین کی فوجیں ہانگ کانگ کی سرحد پر پہونچ گئیں۔ اسی روز ہماری محبت کی سرحد بھی آن پہونچی۔

وہ بولی۔ بس اب کیا یہ ہوگیا۔

میں نے کہا۔ لڑائی تو یہاں بھی لڑی جا سکتی ہے۔

اس نے کہا۔ وہ تمہارا کام ہے۔ میں وہاں جاؤں گی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ ڈی ی۔ دنیا تو جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی ہے۔ اس کام کو تو یہاں سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے آؤ ہاتھ میں ہاتھ دو۔

وہ ہچکچائی۔ کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر تک اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا۔ پھر بڑی نرمی اور ملائمیت سے اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے آزاد کر لیا۔ اور میرا ہاتھ اکیلا رہ گیا۔

اس نے کہا۔ مجھے جانے دو۔ مجھے اپنے وطن جانے دو۔ میں یہاں رہی تو کبھی خوش نہ رہوں گی۔ ہاں وہاں جا کے سوچوں گی۔

میں نے کہا۔ اچھا میں انتظار کروں گا۔

جانے سے پہلے بڈھے ہانگ اور ذی ی میں بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ بڈھا ہانگ واپس جانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی واپس چین چلی جائے۔ اس لئے وہ رویا دھویا اس نے ذی ی کو دھمکایا۔ مارا پیٹا۔ معاملہ پہلے پولیس میں اور بعد میں عدالت تک لے گیا۔ مگر ذی ی بالغ تھی اور اب وہ اپنے وطن جا سکتی تھی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی تھی۔ محبت کے مضبوط ہاتھ بھی اسے روک نہ سکے اور وہ بمبئی سے کلکتے اور کلکتے سے ہانگ کانگ چلی گئی۔ جانے سے قبل کوئی زیادہ بات چیت مجھ سے نہیں ہوئی۔ الوداع کے وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ خوشی کی چمک تھی اور ایک عجیب بے قراری اور بے تابی۔ ہاں بالکل روانہ ہوتے وقت اس نے ایک بار مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے کان میں کہا۔ میں ضرور آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

اور وہ چلی گئی۔

اور اس کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے جہان کی خوشبوئیں پر لگا کے اس کے ساتھ اڑ گئی ہیں اور میرے ہاتھ میں صرف کاغذ کے پھول رہ گئے ہیں۔

بڈھا ہانگ اسے رخصت کرنے کے لئے بھی نہیں آیا۔ اس کے بعد مجھے کبھی نہیں ملا۔ شاید اس نے پھول بیچنے کا دھندا ہی بند کر دیا۔ بعد میں مجھے ایک چینی پھول بیچنے والے سے پتہ چلا کہ اس نے ایک دوسری چینی طوائف سے شادی کر لی ہے اور ہر وقت افیون کی پینک میں مست رہتا ہے۔

بہت عرصے کے بعد مجھے ذی ی کا خط ملا۔

پیارے

یہ خط میں تمہیں اپنے گاؤں سے لکھ رہی ہوں۔ جو ہان ندی کے کنارے واقع ہے جہاں ناشپاتیوں کے جھنڈ ہیں اور ان پر فیروزے اور پکھراج کی سی خوبصورت پتیاں نکھر رہی ہیں۔ آڑو کے درختوں پر سفید سفید پھول کھلے ہیں اور وہاں جہاں سردار دو کا گھر تھا وہاں اب ہمارے گاؤں کا سکول ہے۔ زمین ہم سب کسانوں کو پھر سے مل گئی ہے۔ اپنی ماں کا پتہ بھی میں نے چلا لیا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ جس زمیندار نے اسے قحط کے دنوں میں میرے باپ سے خریدا تھا وہ آج کل وطن سے غداری کرنے کے جرم میں اور بلیک مارکیٹ کرنے کے جرم میں جیل میں بند ہے۔ یہاں مجھے سکول میں استانی کا کام سونپا گیا ہے

جانتے ہو۔ میں اب بچوں کو انگریزی پڑھاتی ہوں۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ تمہاری ذی ی کبھی بچوں کو سکول میں انگریزی پڑھائے گی۔ کبھی کبھی میں خود ایسا سوچتی ہوں تو خوشی سے اچھل پڑتی ہوں ایسی خوشی کیا کبھی ممکن تھی۔ کن مصیبتوں سے ہم نے اپنی آزادی حاصل کی ہے۔ سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے میں نے تو اس آزادی کیلئے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب ساری زندگی بھی اس کام میں لگا دوں تو کم ہے۔

تم یہاں کبھی آجاؤ تو کیسا ہے حیران رہ جاؤ گے یہ دیکھ کر کہ کیا یہ وہی چینی ہیں یہ وہی گاؤں ہے ساری دہرتی بدل گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہمارے گاؤں کی چڑیوں کو یہ احساس ہے کہ ہم لوگ آزاد ہو چکے ہیں۔ اپنے ضمیر کے خود مالک ہیں۔

جب تم یاد آجاتے ہو تو تمہیں یہاں دیکھنے کی خواہش کرتی ہوں یہاں پر ایک لڑکا ہے جو اکثر تمہیں بھلا دینے کی کوشش کیا کرتا ہے۔

تمہاری

ذی ی

میں نے ذی ی کے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا کئی بار خط لکھ کر پھاڑ دیا۔ ادھر کچھ اور پریشانیاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ رنگین کاغذ کے دام بڑھ گئے۔ بیلوں اور شاخوں میں جو تار خرچ ہوتا تھا اس کے دام بیوپاریوں نے بڑھا دئے۔ مہنگائی ہونے سے لوگ کاغذ کے پھول کم خریدنے لگے۔ لوگوں کے پاس اپنے کپڑوں کے لئے پیسے نہ رہے تو وہ کاغذ کے پھول خریدتے کیا کرتے۔ میں اکثر بھوکا اور بیکار رہنے لگا چڑچڑا اور پریشان۔ دو تین دفعہ پولیس والوں سے تو تو میں میں ہوئی۔ مجھے خود آمدنی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس بھلا سنتری کو بارہ آنے روز کہاں سے دیتا سنتری نے مجھے دو تین روز بڑے پیار محبت سے سمجھایا۔ بتایا کہ وہ رشوت خور نہیں ہے رشوت سے اسے سخت نفرت ہے۔ مگر اس کے گھر میں بیوی بیمار ہے دوا کے لئے تنخواہ میں سے پیسے نہیں بچتے۔ مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ خالی خولی ایمانداری سے پیٹ نہیں بھرتا اور پیٹ بری بلا ہے گر میرے پاس پیسے کہاں سے آتے تھے جو میں اسے دیتا ناچار غصے میں آکے اس نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ آوارہ گردی کے الزام میں مجھے پندرہ دن کی قید ہو گئی۔

جب میں قید سے چھوٹ کے آیا تو مجھے ذی ی کا ایک اور خط ملا۔

پیارے

تم نے میرے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔ جلدی لکھو کیا بات ہے یہاں پر اب کے ہمارے گاؤں میں فصل پہلے سے ڈیوڑھی ہے پر کسی زمیندار کو فصل کا حصہ نہیں دینا پڑا۔ ساری کی ساری فصل اپنی ہے چیزوں کی قیمتیں گھٹ گئی ہیں گھٹتی جا رہی ہیں اور معاشی حالات جو بگڑ چکے۔ اپنے آپ ٹھکانے پر آ رہے ہیں۔

کل ہمارا قومی تیوہار کا دن تھا۔ سارے گاؤں میں جھنڈے جگائے گئے چراغاں ہوا۔ ناچ اور گانے سکول کے باہر گاؤں والوں نے مل کے ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس موقع پر میں نے ایک بڑا جھنڈولا تیار کیا جو چکر کھا کر گھومتا تھا۔ جیسے سرکس یا نمائش کے جھنڈولے گھومتے ہیں۔ گاؤں والے میری کاریگری دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مجھے ایک چاندی کا تمغہ انعام میں دیا۔ سکول میں بھی میرے کام کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔
کیا تم میری کسی بات سے خفا ہو؟

تمہاری

ذی ی

اس خط کا میں نے یہ جواب دیا۔

پیاری ذی ی

خوش رہو۔ میں ابھی ابھی پندرہ دن کی جیل کاٹ کے آیا ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ میرا گناہ یہی تھا کہ میں بیکار تھا۔ مجھے میری بیکاری کی سزا ملی حالانکہ سزا اس وزیر کو ملنا چاہیئے تھی جس کے راج میں میں بیکار رہا۔ یہاں کام کا بہت مندا ہے آج کل پھول نہیں بکتے۔ اناج مہنگا ہو گیا ہے۔ کپڑا بھی مہنگا ہو گیا ہے۔ ہر چیز کے دام بڑھتے جا رہے ہیں۔ سوچتا ہوں۔ ایسا یہاں کیوں ہو رہا ہے کہ یہاں قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور تمہارے ہاں گھٹ رہی ہیں، ایسا میں تمہاری محبت کی وجہ سے نہیں سوچتا۔ بلکہ آس پاس کے حالات کی وجہ سے سوچتا ہوں اور نہ بھی سوچوں تو کیا کروں۔

یہ جان کر بہت خوش ہوں کہ تم خوش ہو۔ میری خوشی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی باقی رہا اس لڑکے کا معاملہ جو مجھے تمہارے دل سے بھلا دینے کی فکر میں ہے اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں ہے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں تم کیا کرتی ہو۔ اس کی مجھے فکر کیوں؟

تمہارا اپنا

اس کے بعد جب کوریائی جنگ شروع ہوئی تو اس کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا" اس جنگ نے میری زندگی کے سارے ارادے بدل دئے ہیں۔ میں اب وہ کبھی نہیں ہو سکتی جو میں پہلے سوچتی تھی اب میں کوریائی جنگ میں چینی والنٹیر بن کے جا رہی ہوں وہاں نرس کا کام کروں گی اور اگر کبھی زندہ رہی تو شاید تم سے ملنے کی کوئی صورت نکل سکے۔ ورنہ الوداع" آخری فقرہ تھا" اچھا تو یہی ہے کہ مجھے دل سے بھلا دو۔ ہم وہاں ملے۔ جہاں حالات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے ایک پہاڑ پر نہیں ملے۔ مخالف پہاڑوں پر ملے۔ اس نئے ایک لمحے کے لئے رک کر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ اب میں تو خندق اگوتیوں اور آہنی باڑھوں کے رستے پر جا رہی ہوں۔ اپنے کاغذی پھولوں کو میرے رستے سے ہٹا دو۔ پیارے میرے وطن کی زندگی، کوریائی زندگی۔ سارے ایشیا کی زندگی خطرے میں ہے۔"

اس کے بعد اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں اس کے باپ سے ملنے گیا۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کے لئے اپنی بیٹی کو دل سے بھلا چکا تھا اور ذی ی بھی اس سے ناطہ توڑ چکی تھی۔ کسی ایک خط میں بھی اس نے مجھ سے کبھی اپنے باپ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ایک آخری مجبوری تھی وہ بھی ہمیشہ کے لئے کٹ گئی۔ اب ذی ی آزاد تھی اور کوریا چلی گئی تھی۔

کوریائی جنگ نے کئی پانسے بدلے۔ کئی رخ پلٹے۔ مگر ذی ی کی کوئی خبر نہ ملی۔ آزاد چین کی پہلی سالگرہ آئی اور چلی گئی۔ میں نے اس کے گاؤں کے سکول میں کئی خط ڈالے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ روز اخبار دیکھتا تھا۔ کیونکہ کوریائی جنگ اب ذی ی کی ہی جنگ نہ تھی وہ اب میری بھی جنگ تھی۔

کل بٹڑ اخبار دیکھنے سے ذی ی کا پتہ چل گیا۔ کوریائی لڑائی کے متعلق اس میں ایک تصویر چھپی تھی جس میں چند امریکی بہادر سپاہی پس منظر میں کھڑے تھے اور اپنے سامنے انھوں نے کوریائی اور چینی سپاہیوں کے بارہ سر کاٹ کے اینٹوں پر رکھ دیئے تھے ان بارہ سروں میں ایک سر ذی ی کا تھا بارہ کیا اگر ایک لاکھ سر بھی ہوتے تو میں اپنی ذی ی کا سر پہچان لیتا۔ اس کے ہونٹ بند تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ذی ی جو ذی ی کی طرح اپنے وطن کی خاطر اور شاید بہت سے وطنوں کی خاطر جن سے اسے دور کا بھی علاقہ نہ تھا شہید ہوگئی۔

پھر میرے سینے میں وہی دہکتی ابلتی ہوئی شام آئی جب چاروں طرف بارش ہو رہی تھی اور ہم دونوں ایک ساعت کے جزیرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں لئے تنہا کھڑے تھے ذی ی جو ایک

دائم محبت کی دائم جوانی کے لئے مرمٹی۔ آج میرے ہاتھ میں اس کا کٹا ہوا سر تھا۔ زندگی کی سنبل کی طرح جس میں چاروں طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ میں تجھ سے کیا کہوں؟ میری محبت کی آخری شام کس طرح تیرے بالوں کو چوم کے کہوں۔ لے میرے پیار کا آخری سلام اور سو جا۔ اپنی عمیق نگاہیں میرے ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بخش دے اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لے اور سو جا" سو جا چین دیس کی محبوبہ میرے گلاب میرے کرسنتھیمم۔ میرے یاسمن میرے موتیا کے پھولوں کی رانی۔ آج کی رات ہم سب پر بھاری ہے۔ ہم پر اس لئے کہ ہم تجھے موت سے نہ بچا سکے اور ان پر اس لئے کہ وہ تیرا سر کاٹ سکے۔ تیرا دل تیری عقل تیرا احساس نہ کاٹ سکے۔ ایسی کاٹ کسی تلوار میں نہیں ہے جو ایشیا کی محبت کو کاٹ سکے ذایاک آدم خور اور امریکی آدم اور ان کے انگریزی فرانسیسی اور ترکی غلام مل کر بھی ایشیائی محبت کو ختم نہیں کر سکتے

آج میں اس چیز کو سمجھ گیا ہوں کہ تو میرے پاس پھر آئے گی جس طرح دو ہزار سال پہلے میں چل کر تیرے پاس گیا تھا۔ اسی طرح آج دو ہزار سال کے بعد تو چل کر میرے پاس آئے گی اور پھر تجھے اور مجھے اور دنیا کے عوام کو ہم سے کوئی جدا نہ کر سکے گا۔

اس چیز کو میں آج سمجھ گیا ہوں۔ اس لئے ذی ی میں آج تیرا انتظار کرتا ہوں۔ کیونکہ جب میں ذی ی کا انتظار کرتا ہوں۔ تو میں روشنی کے منبع کا انتظار کرتا ہوں۔ تو میں بہار کا انتظار کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔!

شاہراہ۔ سالنامہ

مہندر ناتھ

بڑا مکان

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی اور وہاں سے نیچے کا منظر بڑی اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ نیچے سڑک پر ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر تین چار عورتیں میلے کچیلے کپڑے پہنے اپنے بچوں کو گود میں لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک کمزور سی لڑکی کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر کچھ بھیا بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک جلے ہوئے تمباکو سے دانت صاف کر رہا تھا۔ ایک شیشے میں منہ دیکھ رہا تھا اور ایک بھیا انگریزی فیشن کے بال کٹوا رہا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک دھوتی لٹک رہی تھی جو دھلنے کے باوجود کافی میلی اور گندی دکھائی دے رہی تھی یہ چیزیں، یہ لڑکے، یہ مرد یہ عورتیں تو وہ ہر روز دیکھتی تھی۔ ان میں کوئی بھی اجنبیت نہ تھی۔ یہ تو روزمرہ کی زندگی تھی اکثر سڑک پر ٹرک گذرتے تھے۔ سائکلیں بھاگتی تھیں۔ ریڑھی والوں کی آوازیں گونجتی تھیں مداری، تماشہ دکھانے والے، رسوں پر ناچنے والے، اس سڑک پر آکر تماشا دکھاتے، پیٹ دکھا دکھا کر لوگوں سے پیسے لیتے اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ——— لیکن آج وہ گردو پیش کے اس ماحول سے بے خبر اس سڑک پر نظریں جمائے کھڑی تھی جس پر سامان لادا جا رہا تھا۔ اکثر ٹرکوں پر لادا جاتا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ کبھی کبھار اس سڑک پر گندگی سے بھرے ہوئے ٹرک بھی گذرتے تھے اور وہ ناک پر پلو رکھ لیتی تھی تاکہ دماغ بدبو سے متعفن نہ ہو سکے لیکن اس ٹرک سے بدبو نہیں آ رہی تھی اس میں گندگی نہ تھی بلکہ اس کی سہیلی کا سامان

رکھا جا رہا تھا۔ اس کی سہیلی اس کے ساتھ والے کمرے میں رہتی تھی کئی سالوں سے۔ اور آج اس کمرے کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہی تھی۔ سنا گیا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا مکان لے لیا ہے۔ ٹرک میں سامان لادا جا رہا تھا۔ پہلے کچھ ٹرنک رکھے گئے پھر صوفے، ریڈیو، سائیکل، پلنگ اور اس طرح کی مختلف چیزیں رکھی جا رہی تھیں۔ واقعی اس کی سہیلی جا رہی تھی۔ اسے اپنی سہیلی کے جانے کا رنج تھا۔ دونوں اکثر باتیں کیا کرتی تھیں۔ دونوں نے فلمی زندگی اکٹھی شروع کی تھی زندگی کی نچلی تہہ سے یعنی ایک ایکسٹرا کی حیثیت سے وہ فلم لائن میں داخل ہوئی تھیں اور وہ تو اب تک ایکسٹرا میں کام کرتی تھی۔ ان دس سالوں میں اس کی زندگی نہ بدلی تھی، وہی جدوجہد وہی راشن اور کپڑے کا جھگڑا۔ کبھی روپے ہیں اور کبھی نہیں۔ کبھی بہن بیمار ہے تو کبھی باپ زندگی میں مسلسل کشمکش تھی نہ جانے یہ کب ختم ہو گی۔ کب سکھ اور چین کا دور آئے گا —— لیکن آج شانو واقعی اسے چھوڑ کر جا رہی تھی۔

وہ شانو کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کی بڑی پیاری سہیلی تھی۔ اسے شانو کا وہ زمانہ بھی یاد تھا جب اس کے پاس راشن کے لئے روپے نہ ہوتے اور وہ اس سے روپے لے جاتی۔ یہ روپے شانو نے کبھی واپس نہ کئے اور نہ اس نے کبھی مانگے۔ اکثر شانو اس کے جوتے اور ساڑھیاں پہن لیتی، کلپ اور پوڈر لگا لیتی لیکن ان دو سالوں میں شانو کی کایا پلٹ گئی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شانو کا کمرہ سج گیا۔ صوفہ سیٹ، ریڈیو، پلنگ، بجلی کا پنکھا، چادریں رنگین پردے، قیمتی برتن اور اب تو گھر کے کام کاج کے لئے ملازم بھی رکھ لیا گیا تھا۔ حال ہی میں اس نے ایک چھوٹی گاڑی خرید لی تھی۔ ان باتوں کے باوجود شانو اس کے کمرے میں آتی تھی لیکن کبھی کبھی۔ اس میں ایک نئے وقار، ایک نئے رعب، ایک نئی آن کا اضافہ ہوا تھا۔ اب وہ ایکسٹرا نہ تھی بلکہ اچھے اچھے رول ادا کرنے لگ گئی تھی۔ کہاں وہ دن رات گھر میں پڑی رہتی تھی لیکن اب تو دن رات شوٹنگ میں مصروف رہتی۔ کبھی اس سٹوڈیو میں تو کبھی اس سٹوڈیو میں۔ کبھی دن کی شوٹنگ کبھی رات کی۔ فرصت ہی نہ ملتی تھی نہ ملنے کی، نہ بات تک کرنے کی۔ گو اسے اسی بات کا رنج تھا لیکن اس نے شانو کے سامنے کبھی اس رنج کا اظہار نہ کیا کیونکہ وہ اپنی خامیوں اور شانو کی خوبیوں کو سمجھ چکی تھی۔ وہ شانو کی طرح خوب صورت نہ تھی، اس کی طرح پڑھ لکھ کر گفتگو نہ کر سکتی تھی۔ ڈائلاگ نہ بول سکتی تھی اگر

شانو ترقی کر گئی تھی تو اسے حسد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ شاید دنیا کا یہی دستور ہے کہ ایک بہتر آدمی دوسرے سے ترقی کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اس میں کیا کمی تھی وہ صرف اس لئے ترقی نہ کر سکی کہ وہ شانو کی طرح حسین نہ تھی یا اس کے جسم میں اتنا گداز، اتنی رعنائی اور کشش نہ تھی اور شاید اسے اس لئے فلموں میں اہم رول نہ مل سکے۔ اسے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا کہ وہ ساری عمر ایک ایکسٹرا ہی رہی اور اب تو عمر بھی ڈھلتی جا رہی تھی۔ اس نے کئی بار ایک ریڈیو خریدنے کی تمنا کی تھی لیکن روپے نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمنا ادھوری ہی رہی۔ آج کل اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہیں اس کی سانس پھول جاتی۔ شاید اس کا دل کمزور ہو گیا تھا وہ ڈرتی تھی کہیں اس کے دل کی حرکت یکایک بند نہ ہو جائے وہ موت سے بہت ڈرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کے بھائی کو تپ دق ہوا تھا اور لاکھ علاج معالجے کے باوجود وہ چل بسا اور آج کل جب اس کے اپنے سینے میں درد کی لہر اٹھتی تو اسے شک ہونے لگتا کہ اسے بھی تپ دق ہو گیا ہے۔ اگر اسے تپ دق ہو گیا تو اس کا علاج کون کرے گا۔ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ نیچے سے کسی نے ہارن دیا، سامان ابھی تک رکھا جا رہا تھا۔ ابھی تک شانو اس سے ملنے نہ آئی تھی کیا وہ جاتے وقت اس سے ملنے کے لئے نہ آئے گی۔ شاید وہ نہ آئے۔ اب تو وہ پہلی شانو نہ تھی۔ اب تو وہ اچھے اچھے رول ادا کرنے لگ گئی تھی۔ وہ اس سے ملنے کیوں آئے گی۔ آج کل خود اس کی حالت بھی اچھی نہ تھی کچھ عمر کا تقاضا تھا اور کچھ فلمیں ہی کم بنتی تھیں۔ ویسے بھی اب وہ موٹی ہو رہی تھی اس کا جسم ڈھلک گیا تھا۔ اب وہ لڑکی نہ دکھائی دیتی تھی۔ جب کالج کی شوخ لڑکیوں یا گاؤں کی الہڑ مٹیاروں کا سین ہوتا تو اسے بہت کم بلایا جاتا۔ اگر وہ اسی رفتار سے موٹی ہوتی گئی تو کچھ مہینوں کے بعد ایکسٹرا میں بھی اسے کام نہ ملے گا۔ پھر وہ کیا کرے گی۔ کہاں سے کھائے گی۔ مکان کا کرایہ کیسے ادا کرے گی۔

چند دن ہوئے ایک ایکسٹرا سپلائر نے بوڑھی اماں کا رول ادا کرنے کے لئے کہا تھا۔ اسے یہ بات سن کر سخت غصہ آ گیا تھا۔ کیا وہ واقعی بوڑھی ہو گئی تھی۔ کیا وہ ہیروئن نہ بن سکتی تھی۔ اگر ہیروئن نہیں تو سائڈ ہیروئن ہی سہی یا کسی جوان لڑکی کا رول اور ہیروئن کہاں کی خوبصورت اور جوان ہوتی ہے، بس ذرا میک اپ کر لیتی ہے۔ چہرے کی ساری بدصورتی پوڈر میں چھپ جاتی؟

چھاتیوں کے ابھار نمایاں کرنے کے لئے مصنوعی باڈی لگاتی ہے۔ بال لمبے نہ ہوں تو بازار سے
خرید کر پتلی سی چوٹی میں لگا لیتی ہے۔ قد چھوٹا ہو تو اونچی ایڑی کا جوتا پہنتی ہے اللہ رکھی کے متعلق تو
ہم نے عجیب و غریب باتیں سن رکھی تھیں۔ جوانی میں اللہ رکھی کی کیا سج دھج تھی۔ جدھر جاتی تھی
لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے لیکن اب وہ کتنی دبلی پتلی ہو گئی تھی۔ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی اور
عورت تو خاص کر جلد بوڑھی ہو جاتی ہے۔ اللہ رکھی کا کیا زمانہ تھا، کیا کچھ نہ تھا اس کے پاس جب
پہلی بار الفریڈ کمپنی کی فلم میں ہیروئن بن کر آئی تھی تو ساری فلمی دنیا میں تہلکہ مچ گیا تھا لیکن چند
سالوں میں وہ کیا سے کیا ہو گئی۔ آج کل وہ ایک نہایت گھٹیا قسم کے ہوٹل میں رہتی تھی جس کا
کرایہ اس نے چھ مہینے سے ادا نہ کیا تھا۔ کل ہی وہ ملی تو کہنے لگی کہیں کام نہیں ملتا۔ مردار نے
ایک بنا لونڈا پھانس رکھا تھا۔ نہ جانے اسے نوجوان لڑکے پھانسنے کا کیا شوق ہے۔ اتنی عمر
کی ہو کر بھی وہ ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہے۔ بڑھاپے میں ایک آپ کا کتنا شوق ہے۔ اس کا
سارا چہرہ پوڈر سے بھرا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود دق کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔ آج کل وہ فلموں
میں ماں کا رول ادا کرتی ہے۔ کہاں ہیروئن کہاں ماں اور آجکل ماں کے رول بھی تو نہیں ملتے
گال اتنے پچک گئے تھے کہ وہ بالکل ایک بھوتنی دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگی: زبیدہ پیٹ کے لئے
کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ آج کل جس سے ملتی ہوں وہ کہتا ہے، اللہ رکھی تمہارے گال کیوں پچک
گئے ہیں۔ کیا تم کھانا نہیں کھاتیں، تمہیں کس بات کا غم ہے ذرا بناسک کے روپوں کو ملوا لگاؤ۔
اور کمبخت یہ نہیں جانتے کہ چھ مہینوں سے کرایہ نہیں دیا۔ ہوٹل کے مالک نے ڈگری لے لی ہے
اور اب مجھے یہ کمرہ چھوڑنا پڑے گا۔ ادھر کام بالکل نہیں ملتا۔ ڈائریکٹر سیدھے منہ بات نہیں کرتے،
کہاں کاروں میں بٹھا کر لے جاتے تھے اب ملنے جاؤ تو کرسی تک نہیں دیتے، چائے کو نہیں
پوچھتے۔ پہلے وہ میرے گھر آتے تھے اب میں ان کے گھر جاتی ہوں تو دروازے بند کر لیتے ہیں
ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ نئی نئی چھوکریاں آ گئی ہیں۔ اب زمانہ ان کا ہے۔ ہم بوڑھوں کو کون کام
دیتا ہے۔ میں نے برا کیا جو بے دریغ روپیہ خرچ کر دیا۔ اب ہر شخص کہتا ہے تمہارا چہرہ پتلا ہے،
تمہارے گال پچک گئے ہیں لیکن میں نے چہرے کو بھرنے کا نیا طریقہ نکالا ہے اور وہ زبیدہ
کو ایک کونے میں لے گئی اور کہنے لگی، یہ طریقہ دیکھ لو، آج کل تو تم موٹی ہوتی جا رہی ہو لیکن جسم کا

گیا ہے' آج ہے کل غائب۔ اس نے فوراً منہ سے ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے نکالے اور پھر کہنے لگی' دیکھو میرا چہرہ۔ زبیدہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہکی بکی رہ گئی۔ دونوں گال آپس میں مل گئے تھے آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اللہ رکھی اتنی ڈراؤنی دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی لاش اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ہو۔ زبیدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور منہ سے یہ الفاظ نکلے "ہائیں یہ تمہیں کیا ہو گیا' ارے تمہارے گال تو بالکل ہی پچک گئے" ابھی ابھی تو یہ تھوڑے تھوڑے بھرے ہوئے تھے۔"

اللہ رکھی نے ڈبل روٹی پھر منہ میں رکھ لی۔ ایک ٹکڑا ایک گال کی طرف اور دوسرا دوسرے گال کی طرف اور دونوں گال تھوڑے سے ابھر آئے اور اللہ رکھی مسکرا دی۔۔۔۔ زبیدہ کو یوں معلوم ہوا جیسے کسی مردے میں جان پڑ گئی ہے "اری تو تو جادوگرنی ہے" زبیدہ ضبط نہ کر سکی۔

"پیٹ کے لئے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا" اللہ رکھی نے کہنا شروع کیا "پیٹ کے لئے انسان کو حیوان بھی بننا پڑتا ہے۔ شروع شروع میں میں خدا پر یقین رکھتی تھی لیکن اب۔ اب کہو تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی" زبیدہ بولی "لیکن اللہ رکھی یہ زندگی اچھی نہیں ہم عمر بھر محنت کرتے ہیں اور بڑھاپے کے لئے ایک پائی تک نہیں بچتی اور یہاں پر ایسے بھی لوگ ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور عیش کرتے ہیں' خیر یہ تو بتاؤ' یہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے تمہارے منہ میں پڑے پڑے گل نہیں جاتے' تم باتیں کیسے کر لیتی ہو' مجھ سے تو یہ بالکل نہ ہو سکے گا۔"

اللہ رکھی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے چھلک پڑے "تم ابھی جوان ہو زبیدہ' یعنی مجھ سے جوان' وقت انسان کو سب کچھ سکھلا دیتا ہے' فلمی دنیا میں صرف صورت اور جسم کو دیکھا جاتا ہے لیکن اس بھوک اور بے کاری کے زمانے میں ایک عورت اپنی خوبصورتی اور جسم کو کہاں تک قرار رکھ سکتی ہے کئی نئی لڑکیاں میدان میں آ رہی ہیں کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ڈائرکٹر صاحب کو جانتی ہوں' دل کے بڑے اچھے ہیں' میری حالت پر انہیں ترس آگیا اور ایک دن کا کام مل گیا ہے

کام مجھے دے دیا۔ میں نے سوچا، چلو اس مہینے کا راشن ہی چل جائے گا۔"

.... زبیدہ یہ سوچ رہی تھی اور سامنے دیکھ رہی تھی۔ اب سامان لاری میں رکھا جا چکا تھا۔ زبیدہ کا جی چاہتا تھا کہ وہ دوڑ کر ساتھ والے کمرے میں چلی جائے اور اپنی سہیلی کے گلے لگ کر کہے: "تو کتنی کٹھور ہو گئی ہے، کیا ہوا اگر تیرے اچھے دن آ گئے ہیں، کیا ہوا اگر تیرے پاس ریڈیو، الماریاں اور دوسری چیزیں ہیں اور میرے پاس یہ سب کچھ نہیں لیکن میرا دل تو بہا نہیں میرا پیار تو بہا نہیں، کیا انسان کو صرف روپوں میں ہی تولا جا سکتا ہے۔ تجھے وہ دن یاد نہیں۔ جب تمہارے والدین تجھے مارتے تھے اور تو میرے پاس آکر سوتی تھی۔ میں تیرا دل بہلاتی، کھانا کھلاتی، سینما دکھاتی۔ آج تو امیر ہو گئی اور مجھے بھول گئی۔ میرے ساتھ والے کمرے میں رہتے ہوئے اتنا نہ ہوا کہ میرا حال ہی پوچھ لیتی۔ مانا تم ایک بڑے مکان میں جا رہی ہو ——
زبیدہ نے پھر سوچا کہ وہ خود چلی جائے مگر وہ رک گئی، کہیں شانو برا نہ مان جائے، اس کے والدین کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دیں۔ شانو دو تین مہینوں سے ادھر نہ آئی تھی۔ ضرور جان بوجھ کر نہ آئی ہو گی کیوں کہ زبیدہ اب غریب ہو گئی تھی یا یوں کہو کہ شانو اب امیر ہو گئی تھی اور چاندی اور سونے کی دیواراں دونوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

نیچے سے گاڑی کا ہارن ہوا، زبیدہ نے جھانک کر دیکھا، ایک دبلا پتلا جوان، بیوک سے اترا، بائیں کھڑکی سے ایک سفید ہاتھ ہوا میں لہرایا، آدھر سے آنکھیں چمکیں اور وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

—— "یہ کس قسم کی دنیا ہے" وہ سوچنے لگی مگر سوچنے سے کیا ہوتا ہے، جب سے وہ پیدا ہوئی وہ کام کر رہی تھی، بچپن میں وہ ایک بڑھیا کے ہاں برتن مانجھتی رہی اور برتن صاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ کھردرے ہوتے گئے اور جب جوان ہوئی تو فلم میں ایکسٹرا گرل کی حیثیت میں کام کرنے لگی اور اب تک کام کر رہی تھی، اسے کام سے نفرت نہ تھی، کام کرنے میں تو اسے خوشی محسوس ہوتی اور جس دن اسے کام نہ ملتا وہ اکثر خاموش رہتی، لیکن اتنا کام کرنے کے باوجود زندگی میں خوشی نہ تھی، اسودگی نہ تھی، رونق نہ تھی، اجرت اتنی کم تھی کہ بڑی مشکل سے پیٹ بھرتا تھا۔ اس سے پہلے زبیدہ کی حالت کچھ سدھر گئی تھی، کچھ ساڑھیاں

کچھ برتن' آٹھ دس سونے کی چوڑیاں' بندے اور لاکٹ بھی بن گیا تھا لیکن اس سال سب کچھ بک گیا۔ لاکٹ' بندے اور باقی گہنے بہن کی بیماری پر صرف ہو گئے' اب وہ موٹی ہو رہی تھی جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے' موت کا خوف' کمتری کا احساس اور دوسری کمزوریاں اس کے اردگرد منڈلا رہی تھیں۔

—— "عجیب بات ہے" —— زبیدہ نے سوچا" میں نے کبھی بددیانتی نہیں کی' اس کے باوجود ایک آسودہ زندگی نہ گزار سکی اور اب مستقبل میں کچھ بھی نہیں' محض — بھوک' بے کاری خوف' ڈر' اور یہ سوچتے ہی اسے پھر اللہ رکھی یاد آ گئی —— "کیا وہ بھی ایک دن اللہ رکھی بن جائے گی اسے بھی کام نہ ملے گا" — یہ خیال آتے ہی وہ لرز اٹھی — نہیں نہیں' وہ اللہ رکھی نہ بنے گی' وہ یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی خودکشی کر لے گی' وہ مر جائے گی' وہ منہ میں ڈبل روٹی نہ رکھ سکے گی اللہ رکھی اب عورت نہ رہی تھی —— اسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ مگر اس میں اس بے چاری کا کیا قصور حالات نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی' سماج نے اس کا حلیہ بدل دیا تھا —— لیکن اللہ رکھی نے ایک نوجوان مرد سے شادی کیوں کی۔ کیا اس مصیبت کی وجہ شادی تھی' یہ بات نہیں۔ اس کی کئی سہیلیاں تھیں جنھوں نے ایسی حرکت نہ کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ بھوکی تھیں ننگی تھیں' کوڑی کوڑی کی محتاج تھیں —— اللہ رکھی کا خیال آتے ہی زبیدہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی' لبوں پر لپ اسٹک لگائی اور بھویں درست کرنے لگی۔

نیچے سے کسی نے پھر ہارن دیا۔ زبیدہ نے جھک کر دیکھا۔ وہی نوجوان اور شانو بیوک کے باہر کھڑے تھے' نوجوان کا ہاتھ شانو کی کمر کے گرد حمائل تھا' شانو نے مڑ کر دیکھا کھڑکی میں زبیدہ کھڑی تھی' شانو نے جلدی سے ہاتھ ہلایا۔ زبیدہ نے ہاتھ ہلانا چاہا مگر شانو نوجوان سے باتوں میں لگ گئی۔ نوجوان نے بیوک کا دروازہ کھولا۔ شانو اندر داخل ہو گئی۔ بیوک کے پیچھے سامان سے لدی ہوئی لاری کھڑی تھی —— اب بلڈنگ کی کچھ عورتیں باہر آ گئی تھیں۔ قریباً سبھی شانو کو جانتی تھیں لیکن اب شانو کی شان اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے ان عورتوں کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا' وہ برسوں اس محلے' اس کمرے میں رہی تھی یہ لوگ بھی یہاں رہ رہے تھے' محنت کرتے تھے' ایک کمرے میں رہتے تھے' دیانت دار تھے' جھوٹ نہ بولتے تھے' کام کرتے تھے لیکن یہ لوگ

بیوک میں نہ بیٹھ سکے۔ اب بیوک آہستہ آہستہ چلنے لگی اور لاری بھی۔

اور زبیدہ سوچ رہی تھی۔ کیا وہ بھی کسی دن کسی بڑے مکان میں جا سکے گی اس نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا۔ ان کے پیلے چہروں اور میلی آنکھوں میں بھی یہی سوال تھا۔ کیا وہ دن آئے گا۔ کیا ہم بھی کسی بڑے مکان میں جا سکیں گے . . . .

. . . . جہاں ہوا ہوگی، روشنی ہوگی، صفائی ہوگی۔ گندے کمرے نہ ہوں گے تاریکی اور گھٹن نہ ہوگی۔ ایک کمرے میں پندرہ پندرہ آدمی نہ سوئیں گے۔ ایک ہی کمرہ کچن ڈرائنگ روم، سونے اور بچے جننے کے کمرہ کے طور پر استعمال نہ ہوگا۔ زبیدہ سوچ رہی تھی اور بیوک اور لاری نظروں سے اوجھل ہوتی گئیں۔

دور سمندر کراہ رہا تھا۔ ہوا تیز اور تند ہوتی جا رہی تھی۔ نیچے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے بھیا جا چکے تھے اور سامنے ٹین کی دیوار پر ابھی تک ایک میلی دھوتی ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی

منہاج رہبر

ممتا

روپا کی آنکھ کھل گئی اور وہ چارپائی پر اُٹھ بیٹھی، اس کا دل مسرت سے بھرا ہوا تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ابھی ابھی وہ پوتے کو کھلا رہی تھی کہ بہو آ گئی۔ اس نے بچے کو لینا چاہا لیکن وہ جانے کو تیار نہیں ہوا۔

"آ، آ، سیانا بیٹا! چیزی دوں گی" ماں نے لالچ دیا۔

"نا میں نہیں بنتا تمہارا بیٹا"

"اور کس کے بیٹے ہو؟"

"میں دادی کا بیٹا ہوں" اس نے دادی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ دادی نے پیار سے اس کا منہ چوم لیا۔

یہی حسین منظر آنکھوں میں لئے وہ اُٹھ بیٹھی تھی۔ اس پر کتنی ہی دیر خود فراموشی کا عالم طاری رہا، وہ خواب کے تاثر میں ڈوبی جانے کیا سوچتی رہی۔ اسے اپنے گلے میں اب بھی ننھے ننھے بازوؤں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ کتنا پیارا تھا یہ لمس! اس کی روح میں جنت آباد ہو گئی۔ پوتے کو گود میں کھلانے اور دادی کہلانے کی حسرت میں تو وہ اب تک جی رہی تھی۔ سر کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئے تھے اور ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔ لیکن وہ جی رہی تھی۔ زندگی کم ہی

تھی۔ تمنا بڑھ رہی تھی۔

روپا جب بیوہ ہوئی تو اس کے اکلوتے بیٹے للّو کی عمر صرف دو سال تھی۔ اس کے تین بچے۔ ایک چھ ماہ کا اور دو جنم لینے سے پہلے ہی مکمل ہوئے بغیر ضائع ہو چکے تھے۔ بڑی حسرتوں کے بعد للّو کو پایا تھا۔ اس نے ابھی اپنی ننھی ٹانگوں پر چلنا ہی سیکھا تھا۔ توتلی زبان سے "ماں، ماں" کہنا ہی شروع کیا تھا کہ باپ مر گیا۔ بیٹے کو لاڈ لڈانے کا ارمان دل ہی میں لے کر چلا گیا۔

بیٹے کی پرورش کا سارا بار روپا پر آ پڑا۔ گھر میں اثاثہ تو زیادہ نہیں تھا لیکن تھوڑی سی زمین تھی۔ اس کی بٹائی آ جاتی تھی۔ روٹی کا گذارہ چل رہا تھا۔ روپا ابھی جوان تھی۔ لیکن کیا کرتی! بیٹے کا منہ دیکھ کر خاوند کی موت کا غم بھول جاتی تھی۔ وہی ایک اس کی حسرتوں اور ارمانوں کا مرکز تھا۔ وہ کسی چیز کے لئے مچلتا فوراً منگوا کر دیتی۔ وہ اس کے لئے چڑیا کا دودھ تک مہیا کرنے کو تیار رہتی۔ اس کے ساتھ جو دوسرے بچے کھیلنے آتے تھے روپا انھیں بھی پیار کرتی تھی۔ انھیں بھی بیٹے کی طرح کھلونے اور چیزیں دیتی تھی تاکہ وہ ہمیشہ اسی طرح آتے اور کھیلتے اور للّو کا دل بہلاتے رہیں۔

اور پھر جب ذرا بڑا ہوا۔ گلی میں جا کر محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا کھیل میں کئی بار جھگڑا ہو جاتا۔ للّو ماں کے پاس فریاد لے کر آتا "ماں مجھے دیبو مارتا ہے"۔ "ماں چندی میری گولیاں نہیں دیتا"۔ وہ تو جھٹ بیٹے کی حمایت کو دوڑی جاتی۔ گھر والوں سے کہتی "تم اپنے بچوں کو کیوں نہیں سنبھالتے وہ میرے للّو کو دق کرتے ہیں"۔ پڑوسنیں جانتی تھیں کہ معاملہ کی تہہ یہی نہیں۔ اس شکایت میں وہ خود نہیں۔ اس کے دل کا پیار بول رہا ہے۔ وہ ہنس کر جواب دیتیں "بچوں کو کوئی کیا سمجھائے یہ بچے جو ہوئے"۔

للّو کو بھی ماں سے اتنی ہی محبت تھی۔ اگر کبھی دو چار گھنٹے گھر سے باہر رہتا ساتھیوں سے مل کر کھیتوں وغیرہ میں گھومنے چلا جاتا تو لوٹ کر یوں ماں کی گود میں جا بیٹھتا جیسے اور کہیں بھی اسے تسکین نہ ملی ہو۔

دس گیارہ سال کا ہو کر بھی وہ دو تین سال کا معصوم ننھا بنا ہوا تھا اور ماں کی گود میں بیٹھ کر وہ دودھ پیتے بچوں کی طرح مسکرایا کرتا تھا اور ماں اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے

پھولی نہ سماتی۔

رفتہ رفتہ ماں کے لاڈلے للو نے لڑکپن کو پار کر کے جوانی کی حدود میں قدم رکھا۔ اس کی بھیگتی مسیں دیکھ کر ماں کے دل میں ایک آرزو نے جنم لیا۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔ میرا بیٹا للو دولھا بنے گا۔ دولھن بیاہ کر گھر لائے گا۔

اس وقت کا احساس کرتے ہوئے روپا نے ایک دن للو سے کہا۔ بیٹا للو! اب تمہارا بیاہ کر دیں؟" بیاہ" للو نے معصومیت سے دہرایا۔" ہاں بیاہ" ماں نے پیار سے بیٹے کا منہ چوم لیا اور اس کی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے کہا۔ اب میرا للو بیاہ کرے گا۔ دولہن لائیگا۔

" ناماں۔ میں بیاہ نہیں کروں گا" للو روٹھ گیا۔" میرا اچھا ننھا سا بیٹا۔ روٹھا نہیں کرتے" ماں نے منانا شروع کیا۔" اچھا نہ سہی"۔ ماں نے اس کا سر پیار کے ساتھ گھٹنوں سے اٹھایا۔

" تو آپ ہی بتا پھر کب بیاہ کرے گا"

"جب تم مر جاؤ گی"۔ للو ہنس دیا۔

مرنے کی بات سن کر ماں کے دل پر گھونسا سا لگا۔ لیکن بیٹے کی ہنسی نے چوٹ ابھرنے نہیں دی۔ وہ پھر بولی" تو کیا دولہن سونے گھر میں لاؤ گے۔ میرے سامنے آئے گی تو ساس کا منہ دیکھ لے گی"

روپا کو مرحوم خاوند کی یاد آئی اور اس پر رقت طاری ہو گئی۔

دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ للو نے معصوم انداز میں پوچھا" ہوتا کیا کہہ دیا کرے گی میری ساس بڑی اچھی تھی" اور یہ نہ کہے گی کہ میری ماں بہت بری تھی"

"یہ کیوں کہنے لگی" ماں نے تردید کی" آدمی بڑا ہو تبھی دوسرا بڑا کہتا ہے۔ پھر روپا نے بیٹے کو گود میں کھینچ کر اور دل کا تمام پیار آنکھوں میں بھر کر کہا۔ تو ہی بتا کیا میں بری ہوں؟"

للو نے ماں کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کا دل مسرت سے بھر گیا۔ لیکن کہنے کو کہا۔ 'ہاں میں تو کہتا ہوں بری۔ لاکھ بری۔ چل جھوٹا کہیں کا" ماں نے اس کا منہ چوم لیا۔

روپا جتنی جلدی بیٹے کا بیاہ کرنا چاہتی تھی اتنی جلدی نہ کر سکی۔ نند، دیور اور نہ جیٹھ جٹھانیاں۔ سونے گھر میں لڑکی کو کون دے۔ اکیلی بڑھیا کا کیا ٹھکانا۔ جانے کب آنکھیں بند

کرلے۔ الٹا لڑکی رو رو کر ہلکان ہو جائے گی۔

گاؤں میں عام طور پر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں لڑکوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں لیکن للّو بیس سال کا ہو کر بھی کنوارہ ہی رہا۔ روپا کو اب بیوگی کا احساس ستانے لگا۔ اگر اس کا خاوند زندہ ہوتا تو للّو اب تک کبھی کنوارہ نہ رہتا۔ جب دو سال اس طرح اور گذر گئے تو روپا کے دکھ کی انتہا نہ رہی۔ دو ہی سال میں اس کے سیاہ بال سفید ہو گئے۔ اس کے دل کا حوصلہ جو اس کی جسمانی قوت کا راز تھا جاتا رہا۔ وہ ہر ایک کی خوشامد کرتی اور اپنے رشتہ داروں کو بیٹے کے بیاہ کی سفارش کرنے کو کہتی۔

آخر اس کے جیٹھ نے کہہ سن کر اپنے سالے کی لڑکی کا رشتہ کرا دیا۔ للّو کا بیاہ ہو گیا۔ ایک سال بیت گیا۔ للّو جو پہلے تھا اب نہیں رہا۔ وہ جو پہلے ماں کے بغیر دم نہیں لیتا تھا۔ اب صرف بیوی کا ہو کر رہ گیا۔ وہ اس سے دو باتیں کرنے کو ترس جاتی۔ سارا دن ڈیوڑھی میں بیٹھی رہتی۔ للّو چپ چاپ پاس سے گذر جاتا۔ ماں کی بات تک نہ پوچھتا۔ روپا کبھی خود کہتی۔

"بیٹا بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں مجھے کام ہے۔" وہ جلدی سے گذر جاتا۔

ماں بیٹے کی اس بے اعتنائی پر کڑھتی اور سوچنے لگتی۔ کیا بیاہ ہو جانے کے بعد بیٹے ماں کی خدمات کو اس طرح بھول جاتے ہیں؟ لیکن للّو تو ایسا نہیں تھا۔ بیوی ضرور اس کے کان بھرتی ہوگی۔ اسے ماں کے خلاف سکھاتی پڑھاتی ہوگی۔

ایک شام للّو اور اس کی بہو چھت پر بیٹھے تھے۔ خوب گھل مل کر باتیں ہو رہی تھیں۔ ماں بھی دبے پاؤں سیڑھی چڑھ گئی اور ان کے قریب جا پہنچی۔ للّو چارپائی پر ادھر لیٹا پڑا تھا۔ وہ بیوی کے زانو پر سر رکھے تھا۔ اس کی بیوی دلاری اسے اپنی کسی سہیلی کی بات سنا رہی تھی اور بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ للّو نے ماں کو دیکھا تو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا کرنے آئی ہو ماں؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "نیچے جی نہیں لگا تھا۔ سوچا کہ چلوں میں بھی تمہاری باتیں سنوں۔"

"تم کیا سنوگی ہماری باتیں۔ جاؤ ماں نیچے جا بیٹھو۔"
اور ماں جب اسلئے پلٹی لوٹی تو اس کا دل رو رہا تھا اور وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی۔
للو کو ماں کا یوں یکایک آنا بڑا لگا اور اس جھڑلتے نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ چلا کر کرخت آواز میں بولا :-
"سچ ہے بڑھاپے میں عقل نہیں رہتی۔"
"ہے ہے تم کتنے برے ہو" بہو نے کہا "بیٹھ جانے دیتے بیچاری کو موڑے آئی تھی۔ بیٹھنے میں تو کچھ ہرج نہیں۔ پر کیسے چپ چاپ آئی تھی۔ شرم نہیں آئے گی اسے ہماری باتیں سنتے" اس کے سننے کی باتیں بھی تو ہو سکتی تھیں۔
اُدھر رو رہا غصے کے مارے ابل رہی تھی اسے ہر گز اس سلوک کی توقع نہیں تھی۔ للو پہلے بھی بسا اوقات جھڑک دیتا تھا لیکن وہ ماں بیٹے کی آپس کی بات تھی۔ اسے لڑائی جھگڑا یا بے عزتی مقصود نہیں تھی۔ آج تو اس نے ماں کی بے عزتی کی تھی اور بہو کے سامنے للو کے یہ الفاظ "بڑھاپے میں عقل ماری جاتی ہے" اسے رہ رہ کر کچوکے دے رہے تھے۔ بنا عقل کے پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا اور بڑا کیا ہے یہ سب بے عزتی برداشت کرنے کے لئے۔
بہو جب نیچے آئی تو ہمدردی سے کہا۔
"ماں جی برا نہ ماننا۔ ان کے من میں کچھ نہیں سبھاؤ ذرا تلخ ہے۔"
"اب تو آئی ہے بہلاؤ بہلانے والی!" رو پلانے تنک کر کہا۔ "میں کیا نہیں جانتی اپنے بیٹے کو۔ یہ سب تیرے کرتوت ہیں۔" "ماں جی! بنا بات کیوں دوش لگاتی ہو۔ میں انھیں کچھ سکھاتی تھوڑا ہوں۔"
"سکھایا نہ ہوتا تو للو میری بے عزتی کرتا۔ سارا محلہ جانتا ہے وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا تھا۔ ماں بیٹے میں ایک دن بھی تکرار نہیں ہوئی۔"
"نہیں ہوئی ہوگی اچھی بات ہے، میں تو کہتی ہوں اب بھی نہ ہو۔ ماں بیٹے کی بات میں میرا کوئی دخل نہیں۔"
"دخل کیوں نہیں تو لڑاتی ہے۔ سکھاتی ہے تو چاہتی ہے کہ ماں کی بات نہ سنے۔ بس تیرا بنا رہے۔"

بہو نے دیکھا بڑھیا اپنے آپے میں نہیں۔ اسے بیٹے کی بات سے صدمہ پہنچا ہے۔ آدمی جھلایا ہوا ہو تو اس کو بھلی بات بھی بری معلوم ہوتی ہے۔ اس سے کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ یہ سوچ کر بہو چپ چاپ اندر چلی گئی۔

لیکن یہ ایک دن کی بات نہیں۔ بیٹے کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر رویا بہو سے بگڑتی اور معمولی معمولی بات پر اس سے الجھ پڑتی۔ بہو کبھی ہنس کر اور کبھی کڑھ کر اس کے کھرے بول چپ چاپ سہہ لیتی۔ لیکن ایک دن بات زیادہ بڑھ گئی۔ رویا کی قمیص کندھے پر سے پھٹ گئی تھی۔ بہو نے ٹانکا لگا کر دیا تو اسے سپنہ آیا اور وہ برس پڑی۔

"ماں رانڈ نے تمہیں کچھ سکھایا بھی ہے یا نہیں؟"

بہو اور کچھ سہہ لیتی لیکن اپنے ماں باپ کو گالی نہ سن سکتی تھی بولی:-

"مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ لو میری ماں کو کچھ کہا تو زبان کھینچ لوں گی!"

"آج تک تو میری زبان کھینچی نہیں تو کہاں سے آ گئی میری زبان کھینچنے والی!"

رویا کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ کوسنے کی بھرمار کرتی ہوئی بہو پر جھپٹ پڑی۔ بہو سیڑھی چڑھا رہی تھی۔ اس نے کندھے جھیل کر چھلکے نزدیک ہی گرا دیئے اور ان پر کچھ پانی پڑنے سے کیچڑ ہو گئی تھی۔ بڑھیا کا پاؤں پھسل گیا۔ گری تو سر دہلیز سے جا ٹکرایا۔ اسے سخت چوٹ آئی اور پیشانی سے خون نکل آیا۔

بہو اس کی امداد کے لئے لپکی تو رویا نے اسے یوں دھتکار دیا جیسے اس کے چھونے سے چھوت لگ جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ بہو نے جان بوجھ کر اسے گرانے کے لئے چھلکے وہاں پھینکے تھے۔

رویا سارا دن بہو کو اور اس کے گھر والوں کو کوستی رہی اور روٹی نہیں کھائی۔ منہ سر لپیٹ کر چارپائی پر جا لیٹی۔ اس کا خیال تھا کہ للو گھر آئے گا۔ بہو کو اس کی زیادتی پر برا بھلا کہے گا۔ ماں کی منت سماجت کرے گا۔ تب وہ اٹھ کر کھانا کھائے گی۔

لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ للو اس روز کھیت میں بٹائی کا اناج لینے گیا تھا۔ رات گئے گھر لوٹا۔ اس نے ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ آتے ہی بولا۔

"ماں تم نے روٹی کیوں نہیں کھائی؟"

"مجھے بھوک نہیں۔" رویا نے جواب دیا۔

"بھوک کیوں نہیں۔ میں سب جانتا ہوں پہلے لڑتی ہو۔ پھر غصے سے بھاگتی ہو۔"

روپا نے دیکھا کہ بیٹا منانے کی بجائے ماں سے لڑنے پر آمادہ ہے۔ گرج کر بولی۔

"میں غصے سے بھاگتی ہوں تجھے شرم نہیں آتی۔ وہ کل کی چھوکری میری زبان کھینچتی ہے اور تو اس کی حمایت کرتا ہے۔"

"اچھا۔ میں نہ اس کی حمایت کروں نہ تمہاری۔ جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔ تم کل سے دوسرے گھر میں رہا کرنا۔"

ماں پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ بیٹے سے ایسی بات سن رہی تھی جس کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔ بیٹا اگر یہاں تک جا سکتا ہے تو اس سے ہمدردی اور دلجوئی کی امید بے کار تھی۔ اس پر خفا ہونے سے بھی کیا فائدہ! روپا نے کہا۔

"کیا کہا۔ میں دوسرے گھر میں رہا کروں۔ لوگ باگ کیا کہیں گے۔ بوڑھی ماں کو گھر سے نکال دیا۔ تمہاری ناک نہ کٹ جائے گی۔"

"لوگ کچھ بھی کہیں۔ مجھ سے یہ ہر روز کا جھگڑا نہیں دیکھا جاتا۔"

"بیٹا تم تو دنیا سے نرالی بات کر رہے ہو۔ بستے گھروں میں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں اور من منائی بھی۔ جہاں دو برتن ہوں گے وہ کھڑکیں گے ضرور۔"

"ماں کی یہ اپیل بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ للو جو فیصلہ کر چکا تھا اس پر اٹل رہا۔ بڑھیا دوسرے گھر میں الگ رہنے لگی۔ گھر دوسرے محلہ میں واقع تھا۔ دو بڑے کمرے تھے۔ آنگن میں بیری کا پیڑ تھا۔ اس لئے وہ بیری والا گھر کہلاتا تھا۔ جب روپا کا خاوند زندہ تھا تو اس میں مویشی باندھے جاتے تھے۔ اب مویشی رکھنے کی توفیق نہیں تھی۔ اس لئے مدت سے سونا پڑا تھا۔ روپا کو کیا معلوم تھا کہ کبھی خود اسے اس گھر میں رہنا پڑے گا۔

وہ چار ماہ سے اس گھر میں تنہا رہتی تھی۔ بہو دونوں وقت کا کھانا بھیج دیتی تھی۔ بالما خود بھی ملنے آجاتی تھی۔ وہ روپا سے کئی مرتبہ لوٹ چلنے کو بھی کہہ چکی تھی۔ لیکن روپا بہو کے کہنے سے جانے کو تیار نہیں تھی۔ البتہ للو کہتا تو اور بات تھی۔ لیکن للو تو اس دن کے بعد ماں سے ملنے بھی نہیں آیا۔ ایسا بے مروت بیٹا ماں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ روپا کے دل کا دکھ

روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

کچھ دنوں سے یہ دکھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ روپا سے سہا نہیں جاتا تھا۔ آج کل میں بہو کے بچہ ہونے والا تھا۔ اس وقت وہ زچہ کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ بہو سے اس کا موہ بڑھ گیا تھا۔ وہ دن رات پوتا ہونے کے خواب دیکھتی تھی اور اسے گود میں کھلانے کی بات سوچا کرتی تھی۔ آج اس نے پوتے کو خواب میں کھلایا تھا۔ اسے گلے میں باہیں ڈال کر "میں دادی کا پوتا ہوں" کہتے سنا تھا۔ اس کی روح تازگی اور شگفتگی سے بھر گئی تھی۔ اس پر دیر تک سُرور ومستی کا عالم طاری رہا۔

رات ابھی کافی تھی۔ خواب کا اثر دیر پا تو نہیں ہو سکتا۔ حقیقت خواب سے زبردست ہے۔ اس سے فرار کی صورت نہیں۔ آخر روپا نے آہ سرد بھری اور اپنے آپ سے کہا کاش! میں اس وقت بہو کے پاس ہوتی۔

اس نے حسرت بھری نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ مکان کے سونے پن سے اس کا دل دہل گیا۔

وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ رہی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھ رہے تھے کبھی للّو پر کڑھتی کبھی اپنے آپ پر کڑھتی تھی۔ اور کبھی مرحوم خاوند کی یاد آتی تھی۔ آہ وہ کتنی بدقسمت ہے اگر وہ زندہ ہوتے۔ للّو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر الگ نہ پھینک دیتا۔ اس کا یہ رویہ کبھی نہ ہوتا۔ وہ اس سونے گھر میں اکیلی نہ رہتی۔ بیوگی کا دکھ جو وہ پہلے بیٹے کا منہ دیکھ کر بھول جاتی تھی۔ اب ایک ناسور بن گیا۔ اسے اب بہو سے ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ سارا قصور للّو کا تھا۔ للّو کی بے مہری اور اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

لیکن اس وقت جب کہ بہو کے بچہ ہونے والا ہے۔ اس وقت جب کہ اس نے اتنا اچھا خواب دیکھا ہے۔ جی کو میلا کرنا مناسب نہیں۔ روپا نے آنسو پونچھ ڈالے۔ غم کی اس شدت میں بھی ایک مسند سپنا اس کی روح کو گدگدا رہا تھا۔

ایک نگاہ باہر ڈالی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا صحن میں ٹپ ٹپ ہونے لگی۔ پیڑ کی ٹہنیاں ہل رہی تھیں اور بیر سے پکے ہوئے بیر ٹہنیوں سے

ٹوٹ کر زمین پر گر رہے تھے۔

وہ چارپائی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ باہر نکلی۔ آنگن کی دیوار چھوٹی تھی محلے کے شریر بچے صبح سویرے ہی دیوار پھاند کر اندر آجاتے تھے اور بیر چن لیتے تھے۔ وہ اب بھی بیری کے نیچے بیر چن رہے تھے۔ جب نیچے کے بیر ختم ہوگئے تو وہ جھکی ہوئی ٹہنیاں پکڑ کر ہلانے لگے۔ بڑھیا اکثر انھیں دھتکار بھی دیتی تھی۔ لیکن اب پیار سے بولی "بیٹا پکے پکے توڑو۔ کچے رہنے دو کل پک جائیں گے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک بچے نے دوڑ کر کواڑ کھول دیے۔ نوری دائی اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ بولی:۔

"روپا مائی۔ بدھائی ہو بدھائی!!"

"بدھ سہاگن ہو نوری۔ سنا کیا خبر لائی؟"

"پوتا ہوا ہے لا مٹھائی کھلا۔"

"پوتا!" روپا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں پوتا۔ گول گول چہرہ، چپٹی ناک۔ بالکل تجھ پر پڑا ہے۔"

"اچھا!" حیرت اور مسرت کے مارے الفاظ نہیں نکلتے تھے۔ "چل دکھاؤں۔"

روپا نوری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسی حالت میں چل پڑی۔ پوتے کو دیکھنے کی حسرت آنکھوں میں رقصاں تھی۔ چاہتی تھی کہ پر لگا کر اڑ جائے۔ اس کی کمزور ٹانگوں میں کہاں سے قوت آگئی۔ نوری کو آگے ٹھیل کر کہا —— "جلدی چل!"

آجکل جون ۱۹۵۱ء

غزلیں

ابن انشا

غزل

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کردیں، رستہ روک ستاروں کا!
جھوٹے سکّوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا!
اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا
جس جپسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلہ لگا نگاروں کا
ایک ذرا سی لغزش تھی اور چرچا پہنچا گلی گلی!
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا
درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو عشق کا کہنا وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا
انشا اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

شاہراہ۔ جون ۱۹۵۱ء

بلراج کومل

غزل

آج میخوار یوں مچلتے ہیں
جام و مینا سے رنگ اچھلتے ہیں

انقلابات، غم کے جھولے میں
بھوک کی لوریوں سے پلتے ہیں

گرم اشکوں سے سرد آہوں سے
تیرے دیوانے کب بہلتے ہیں

منزلیں منتظر رہیں ملت سے
راہرو مسکرا کے چلتے ہیں

جوق در جوق آ کے مل جاؤ!
کارواں شوق کے نکلتے ہیں

جن کو انساں نے خوں سے سینچا ہو
ایسے پودے ضرور پھلتے ہیں

ہڈیاں تک دھنک کے رکھ دیں گے
اب کہاں یہ جوان ٹلتے ہیں

"سویرا" لاہور

جگر مرادآبادی

غزل

واہ مذاقِ آگہی، ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ، اپنے جہاں سے بے خبر

شورشِ گردِ الاماں، گردشِ دہر الحذر
بہکے ہوئے سے قافلے، سہمی ہوئی سی رہ گزر

دیکھا ہے اک جہانِ خاص، میں نے کبھی کبھی جگر
حسن سے بھی بلند تر، عشق سے بھی لطیف تر

آمری جانِ انتظار، آمرے شوقِ آفتاب
تیرے بغیر زندگی کب سے ہے شام بے سحر

عرضِ نیازِ عشق کا، چاہیے اور کیا صلہ
میں نے کہا بچشمِ نم، اس نے سنا بچشمِ تر

لاکھ بیانِ دردِ دل، اک وہ تبسمِ حزیں
لاکھ فسانہائے شوق، اک وہ نگاہ مختصر

حسن سے جو نہ ہو سکا، کر گئی حسن کی اک آہ
عشق نے توڑ دی کماں، عقل نے ڈال دی سپر

ادب لطیف فروری سنہ ۵۱ء

سید فیضی

غزل

روئے فطرت پہ دل کشی ہوگی — وہ بھی کیا صبح زندگی ہوگی
دل ہے آزردۂ بہار، نہ چھیڑ — نکہتِ گل سے برہمی ہوگی
تیری نظروں میں ہے جو خندۂ گل — اک چرائی ہوئی ہنسی ہوگی
جانتا ہوں کہ وہ نگاہِ کرم! — میرے زخموں کو ڈھونڈتی ہوگی
بے قراری ہو یا سکوں، کچھ ہو — مجھ کو ہر حال میں خوشی ہوگی
اک خلش، زار، ایک ہنگامہ — اور کیا شرحِ زندگی ہوگی
کیا اٹھے گا کسی سے پردۂ راز — آگہی دشمنِ آگہی ہوگی
سجدے سجدے میں فرق لازم ہے — ورنہ توہینِ بندگی ہوگی
اپنی جھوٹی تجلیاں نہ بکھیر — چاند ہوگا تو چاندنی ہوگی
میں نہیں چاہتا فریبِ وفا — تیرے پندار میں کمی ہوگی

وقت آنے تو دے ابھی فیضیؔ
دل کی دنیا ہی دوسری ہوگی

شاہراہ دہلی

ساحر ہوشیار پوری

غزل

بے طرح دل خوشی سے ڈرتا ہے — کون آشنا کسی سے ڈرتا ہے
اف ری نیرنگیاں زمانے کی — آدمی، آدمی سے ڈرتا ہے
دشمنی ہی نہ ہو مآل اس کا — دل تری دوستی سے ڈرتا ہے
عشق فرماں روائے ہفت افلاک — آپ کی برہمی سے ڈرتا ہے
یہ بھی ہے اک تعلقِ خاطر — کون ورنہ کسی سے ڈرتا ہے
منزلیں گرد بن گئیں پھر بھی — رہنما رہبری سے ڈرتا ہے
یہ کبھی جاوداں نہیں ہوتی — اس لیے دل خوشی سے ڈرتا ہے

جب سے وہ بے وفا ہوئے ساحرؔ
دل مرا ہر کسی سے ڈرتا ہے

(بیسویں صدی۔ دہلی جولائی ۵۱ء)

شاہد صدیقی

غزل

آدمی کی نظروں میں اک نیا اجالا ہے
آدمی اندھیروں پر فتح پانے والا ہے
ورنہ صبح کا دھوکا لوگ خود سمجھتے ہیں
کس قدر اندھیرا تھا کس قدر اجالا ہے
زندگی کے خالق ہم، زندگی کے مالک ہم
ہم نے اپنے سانچوں میں زندگی کو ڈھالا ہے
جو چھپائے رکھی ہے، لا وہ ساری مے ساقی
ورنہ آج رندوں کو ہوش آنے والا ہے
رات کے گزرتے ہی اور ایک رات آئی
آپ تو یہ کہتے تھے، دن نکلنے والا ہے

شہاب جعفری

غزل

غمِ دل سے غمِ اغیار تک آ پہنچے ہیں
وحشی اب عظمتِ کردار تک آ پہنچے ہیں

خواب سے جذبۂ بیدار تک آ پہنچے ہیں
زندگی کے نئے معیار تک آ پہنچے ہیں

حسن حیراں ہے کہ اب دعوتِ نظارہ پر
اہلِ غم جراتِ انکار تک آ پہنچے ہیں

حوصلے بڑھ کے خطاوار ہوئے جاتے ہیں
دل کے رشتے لبِ اظہار تک آ پہنچے ہیں

ٹوک دیتے ہیں تجھے ہر کرمِ بے جا پر
تیری محفل میں گنہ گار تک آ پہنچے ہیں

جوشِ وحشت میں فراواں ہے تمنائے چمن
گل بھی مل جائیں گے جب خار تک آ پہنچے ہیں

وہ تو ساحل پہ بھی ڈوبیں گے جو واپس لوٹے
جو چلے ہیں وہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں

جانے کیا ڈھونڈھ لیا ہے غمِ دوراں میں شہاب
زندگی کے لئے ہم دار تک آ پہنچے ہیں

ظہیر کاشمیری

غزل

جو پست ہیں تو بلندی سے ہم کنار بھی ہیں
زمیں نشیں ہی نہیں، آسماں شکار بھی ہیں

ہمارے حال سے مایوس کیوں ہیں اہلِ چمن
خزاں زدہ ہیں تو پیغمبرِ بہار بھی ہیں

سنبھال دامنِ خوں رنگ، مشقِ ناز نہ کر
مجھے دلوں میں ابھی دو اک شرار بھی ہیں

ہماری خاک سے ڈالیں گے طرحِ عالمِ نو
فنا درست، مگر جنسِ پائیدار بھی ہیں

جنھیں سلام کرے گا نظامِ مستقبل
وہ آج جرمِ بغاوت میں زیرِ دار بھی ہیں

ہمارا عشق ہمیں تمکنت سکھاتا ہے
کشیدہ سر بھی ہیں پابندِ زلفِ یار بھی ہیں

ہمارے پاس اجالا بھی ہے شرارے بھی
کہ شمعِ بزم بھی ہیں تیغ شعلہ دار بھی ہیں

ظہیر اپنا گریباں نہ دیکھ، بزم کو دیکھ
یہاں کچھ اور گریبان تار تار بھی ہیں

قتیل شفائی

غزل

عشق جلووں کو اگر دعوت پرواز نہ دے
کوئی بھی دیکھنے والا تجھے آواز نہ دے
میں نے ہر چند بلکتے ہوئے شب کاٹی ہے
پھر بھی اے درد مجھے طعنۂ دمساز نہ دے
ہم صفیروں کا بھروسہ ہی بہت ہے مجھ کو
اب خدارا کوئی صیاد کو آواز نہ دے
تجھ سے کٹ کر بھی میں انجام کو بہلا لوں گا
اپنے آنسو مجھے اے خندۂ آغاز نہ دے
ان کے پہلو میں دھڑکنا تو بجا ہے لیکن
اس قدر دور سے اے دل مجھے آواز نہ دے
میں نے بیداریٔ دوراں کی قسم کھائی ہے
اپنی تاثیر مجھے اے نگہ ناز نہ دے
بیچ کر حسن چمن شانِ چمن کہلاؤں!
دینے والے مجھے ایسا کوئی اعزاز نہ دے

ادب لطیف ۔ سالنامہ

کمال احمد صدیقی

غزل

شعور اور حقائق ابھر کے رہتے ہیں
کوئی بتاؤ کہ دار و رسن سے کیا ہوگا

شکستِ فاش یہ اک روز موت کو دیں گے
تمہیں خبر بھی ہے اہلِ کفن سے کیا ہوگا

ہم عزم لے کے اٹھے ہیں نظام بدلیں گے
یہ کام گردشِ چرخِ کہن سے کیا ہوگا

ہمیں لڑا دیا آپس میں، کارواں لوٹا
جو راہبر نے کیا، راہزن سے کیا ہوگا

شعور چاہیے اسبابِ پستی و غم کا
بس ایک جذبۂ حبِ وطن سے کیا ہوگا

اداس ہو کے بھروں آہِ سرد، اس کے سوا
غریب شہر ہوں، یادِ وطن سے کیا ہوگا

اٹھو اور اٹھ کے صف آرا ہو ظالموں کے خلاف
کمالؔ صرف جبیں کی شکن سے کیا ہوگا

شاہراہ - نومبر ۵۱ء

مجروح سلطانپوری

غزل

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی

بول کچھ بول مقید لبِ اظہار سہی
زیبِ منبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی

پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار
میں ترا دامِ خزاں لاکھ گرفتار سہی

آنے دے باغ کے غدار مرا روزِ حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائلِ راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

غیرتِ سنگ ہے ساقی یہ گلوئے تشنہ
ترے پیمانے میں جو موج ہے تلوار سہی

حل تو ہونا ہے مگر مسئلۂ تشنہ لبی
ساغرِ خشک ابھی عقدۂ دشوار سہی

میں نے دیکھی ہے اسی میں غمِ دوراں کی جھلک
بے خبر رنگِ جہاں سے نگہِ یار سہی

ان سے بچھڑے ہوئے مجروح زمانہ گزرا
اب بھی ہونٹوں میں وہی گرمیِ رخسار سہی

شاہراہ جنوری ۵۱ء

معین احسن جذبی

غزل

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بے باکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی!
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

ہر فتح کے غرور میں بے وجہ بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشش اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں
ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں
ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو!
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں
سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات!
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

شاہراہ سالنامہ

نظم حیدرآبادی

غزل

عجب ادا سے کچھ اب کے بہار گذری ہے
صبا چمن سے بہت سوگوار گذری ہے
چلو پھر اور کسی تشنہ لب کی بات کریں
ہماری بات اگر ناگوار گذری ہے
قفس کو ان کی نگاہوں سے دیکھئے کیا ہے
حیات جن کی سرِ رہگذار گذری ہے
انھیں سے شکوہ بیداد کس زباں سے کروں
فغانِ نیم شبی جن پہ بار گذری ہے
سوادِ شام غریباں ہو یا دیار وطن!
تمام عمر یوں ہی بے قرار گذری ہے
مری محبتِ معصوم، میری سعیٔ وفا!
جہاں سے گذری ہے بے اختیار گذری ہے،
نہ اضطراب، نہ حسرت، نہ آرزو، نہ سکوں
نہ پوچھ کیسے شبِ انتظار گذری ہے
نظرؔ وہاں کی ہوائیں ہیں عطر پیراہن
جہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گذری ہے

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

غزل

یہ دل ہے یا کوئی پتھر کہ چوٹ ہی نہ لگے؛
کھری کھری کہو منہ پہ تو کیوں بری نہ لگے؟

نکال لینے دو یاروں کو حوصلہ دل کا
دعائے بد بھی کریں وہ تو یاں کبھی نہ لگے

کبھی تو آئینہ دیکھو نگاہِ دشمن سے
خدا کرے یہ نصیحت تمہیں کڑی نہ لگے

وطن سے چھوٹ کے غربت میں دل لگے کیونکر
یہ وہ نہال ہے جس کی قلم کبھی نہ لگے

بدن کے بھیس زمانے کی تھاہ لینا ہے
نگاہِ شک میں کوئی بات اجنبی نہ لگے

جبھی تک آپ کا خادم ہوں میں تہہ دل سے
نہ اپنے ساتھ کوئی شرطِ بندگی نہ لگے

گناہ گار ہوں پھر بھی وہ دل دیا تو نے
تری جناب میں پہنچوں تو تھرتھری نہ لگے

کہاں یہ بھوک کے مارے کہاں یہ حکمِ نماز
وہ کام بھی ہے کوئی کام جس میں جی نہ لگے

یہی حدیثِ یگانہ جو تم نے دل سے سنی
زبانِ غیر سے سنئے تو کچھ بھلی نہ لگے

طنز و مزاح

کنہیا لال کپور

وزیر ٹیکس

اس دن جب مجھے وزیر ٹیکس کا خط ملا تو میں بہت حیران رہ گیا۔ وزیر ٹیکس سے میری رسم و راہ تک نہ تھی اور مجھے شان وگمان نہیں تھا کہ وہ مجھے نہ صرف خط لکھے گا بلکہ اپنے یہاں چائے پر مدعو بھی کرے گا۔ وزیر ٹیکس نے لکھا تھا۔

محترمی!

مجھے آپ کی آج بہت ضرورت ہے اگر ہو سکے تو چار بجے میرے یہاں تشریف لائیے اور میرے ساتھ چائے پیجیے۔ آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔

مخلص

وزیر ٹیکس

یہ خیال کرتے ہوئے کہ وزیر ٹیکس جیسے سمجھ دار آدمی سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے یعنی اس نے یہ دعوت نامہ کسی اور کو بھجوانے کے بجائے مجھے بھجوا دیا ہے پہلے تو میں اس کے ہاں جانے سے ہچکچایا لیکن جب تین بجے وزیر ٹیکس کے سکریٹری نے فون پر مجھ سے وقت مقررہ پر پہونچ جانے کی درخواست کی تو میں یہ سمجھا کہ وزیر ٹیکس ضرور کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور اسے میرے مشورے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں ٹھیک چار بجے اس کی کوٹھی پر پہونچ گیا۔

بے حد۔ مزاج کیسے ہیں؟ آج موسم خوشگوار ہے۔ تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ وغیرہ وغیرہ رسمی باتوں کے بعد وزیر ٹیکس مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک پرتکلف کرسی پر

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیرا چائے لایا وزیرِ ٹیکس نے میرے لئے چائے کا پیالہ بناتے ہوئے کہا ؛ "آپ حیران ضرور ہوں گے کہ میں نے آپ کو بلا بھیجا' لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھے واقعی آپ کی ضرورت ہے"

"فرمایئے" میں نے عاجزی سے کہا ۔" میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ؟"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ بڑے ذہین آدمی ہیں "۔

"صاحب میں کیا ہوں۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے "

"کسرِ نفسی کی ضرورت نہیں۔ آپ واقعی بڑے ذہین آدمی ہیں اور مجھے ذہین آدمی کی ضرورت ہے"

"فرمایئے ۔"

"آپ جانتے ہیں۔ میں خسارے کا بجٹ تیار کرنے میں ماہر ہوں "

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں تین سال ہوئے آپ نے بجٹ میں پچاس کروڑ کا خسارہ دکھایا تھا۔ پچھلے سال ستر کروڑ اور اس سال تو آپ نے اپنے تمام پچھلے ریکارڈ مات کر دئے' یعنی ننانوے کروڑ"

"بس اسی کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا ہے "

"گستاخی معاف۔ لیکن مجھے بجٹ تیار کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنا ذاتی بجٹ تیار کرنے میں بھی اکثر ناکام رہتا ہوں۔ اسی کو لیجئے کہ آج مہینے کی بیس تاریخ ہے اور میرے بٹوے میں صرف ایک کھوٹی چونی ہے اور ابھی بجلی کا بل' درزی کا بل' دھوبی کا بل اور اسی قسم کے متعدد بل مجھے ادا کرنے ہیں۔ ایسی حالت میں . . . . . "

"چھوڑئے یہ قصہ" وزیرِ ٹیکس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا : "آپ کے بٹوے میں کم از کم کھوٹی چونی تو ہے یہاں میرے خزانے میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ۔"

"عجیب بات ہے۔ لیکن آپ اتنے نئے ٹیکس ہر سال لگاتے ہیں وہ روپیہ کہاں جاتا ہے ؟"

"آپ بھی عجیب سادہ لوح ہیں" وزیرِ ٹیکس نے ذرا بے تکلف ہوتے ہوئے کہا ۔" یہ بھی نہیں جانتے کہ اگر ادھر میں نئے ٹیکس لگاتا ہوں تو ادھر فوراً اخراجات بڑھا دیتا ہوں۔ اس حالت میں خزانے میں کچھ بچ رہنے کے کیا امکانات ہیں ۔"

"لیکن آپ اخراجات کیوں بڑھاتے ہیں ؟" میں نے چیں بجبیں ہو کر پوچھا۔

"اخراجات نہ بڑھاؤں تو خسارہ کیسے دکھاؤں ؟ "

"خسارہ نہ دکھائیے" میں نے آہستہ سے کہا۔
"خسارہ نہ دکھاؤں؟" وزیر ٹیکس نے چمک کر کہا "تو پھر وزیر ٹیکس کیسے رہ سکتا ہوں؟ پھر تو مجھے وہی کام کرنا پڑے گا جو پیشۂ آبا ہے۔"
"یعنی —— ؟"
"خیر چھوڑیئے یہ قصہ ہاں تو بات یہ ہے کہ مجھے اخراجات بڑھانا ہی پڑتے ہیں دراصل میں اس معاملہ میں کچھ مجبور سا ہوں۔ اب اس سال ہی دیکھئے . . . . ."
"ہاں ہاں اس سال . . . . ."
"اس سال میں نے نو نئے وزیر مقرر کئے، دس نئے سفیر غیر ممالک میں بھیجے، پچانوے سکریٹری تعینات کئے، ساڑھے سات سو ڈپٹی سکریٹری، پندرہ سو نئے سکریٹری تعینات اور اگر سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹریوں کی تعداد پوچھو تو شاید بتا نہ سکوں۔"
"نو وزیر! دس سفیر یہ تو ناقابل یقین سی بات معلوم ہوتی ہے —!"
"ناقابل یقین؟ اچھا گن لیجئے —— وزیر قحط، وزیر وعدہ، وزیر تقریر، وزیر جلسہ، وزیر جلوس، وزیر جیل، وزیر مذاق، وزیر حادثہ اور وزیر اعداد و شمار۔"
"اور سفیر کون سے نئے ممالک میں بھیجے؟"
"ان ممالک کے نام تو مجھے بھی اچھی طرح یاد نہیں آتے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اب دنیا کے کونے کونے میں ہمارے سفیر ہیں۔ مثلاً ایک جزیرہ ہے "ٹگ ٹگ جگ ٹگ" بحرالکاہل میں ہے یا شاید بحر اوقیانوس میں اس کا رقبہ صرف ایک مربع میل ہے آبادی، پچاس ساٹھ کے قریب ہوگی۔ وہاں میں نے ابھی ابھی ایک سفیر کو تعینات کیا ہے۔"
"لیکن یہ نئے وزیر اور سفیر کچھ کام بھی کرتے ہیں یا محض اخراجات بڑھانے کے کام کر رہے ہیں"
"اخراجات بڑھانا ان سب کا بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی یہ اور بہت سے کام انجام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیر قحط کو لیجئے۔"
"ہاں ہاں، ان حضرت کا کیا کارنامہ ہے؟"
"ان کا کارنامہ یہ ہے کہ ملک کی ہر چھوٹی بڑی ریاست پر قحط مسلط کر رہے ہیں، ابتدا انھوں نے

ایک شمالی مشرقی ریاست سے کی ہے لیکن انتہا کہاں کر رہے گئے؟ اس کا علم ان کے سوا کسی کو نہیں یہ حضرت جب چاہیں کسی قسم کے قحط کو معرض وجود میں لا سکتے ہیں۔ خوراک کا قحط، کپڑے کا قحط کھانڈ کا قحط، مٹی کے تیل کا قحط، یا محض مٹی کا قحط!"

"خوب!" میں نے مسکرا کر کہا ۔۔۔ "اور وزیر مذاق؟"

"ہا ہا ہا! وزیر مذاق! بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان کا کام عوام سے مذاق کرنا ہے۔ جوں ہی کوئی مسئلہ عوام کی پریشانی کا باعث بنتا ہے اور ان کی توجہ اس کی طرف دلائی جاتی ہے یہ اسے ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"اگر عوام شکایت کریں کہ چائے حد سے زیادہ مہنگی ہو گئی ہے تو یہ کہتے ہیں، اگر چائے مہنگی ہو گئی ہے تو چائے کی بجائے سوکھی گھاس کا جوشاندہ پیا کیجئے۔"

"واقعی وزیر مذاق بڑے با مذاق واقع ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں یہ بات نہ ہوتی تو میں انھیں پانچ ہزار ماہانہ پر تعینات نہ کرتا۔ خیر چھوڑیے یہ قصہ ہم اصل موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔ دراصل میں نے آپ کو اس لئے نہیں یاد فرمایا کہ نئے وزیروں یا سفیروں کے کارناموں سے آگاہ کروں۔ میرا مطلب کچھ اور تھا۔"

"ارشاد!"

"آپ چونکہ ذہین آدمی ہیں اس لئے ذرا اپنے دماغ سے کام لیجئے اور مجھے بتائیے کہ پچھتر کروڑ روپے کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے کون کون سے نئے ٹیکس لگائے جائیں ۔۔۔؟"

"نئے ٹیکس! گستاخی معاف!" میں نے ذرا گھبرا کر کہا۔ "پہلے ہی آپ نے ٹیکس لگا لگا کر عوام کی کمر کبڑی کر دی ہے۔ خدارا نئے ٹیکس لگانے کے ارادے سے باز آئیے۔"

"عوام پر ٹیکس؟ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ" میں نے عوام پر تو کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ صحیح ہے۔ میں نے تمباکو پر ٹیکس لگایا، پان پر لگایا لیکن عوام تمباکو ہیں نہ پان۔"

"ظالم!" میں نے وزیر ٹیکس سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹیکس عوام پر ہی تو ہیں۔ عوام پان یا تمباکو نہ سہی لیکن پان کھاتے اور تمباکو پیتے تو ہیں۔"

"یہ اور بات ہے۔ اچھا چھوڑیئے یہ قصہ۔ اب جلدی جلدی بتایئے کہ کون سے نئے ٹیکس ہیں
"آپ ٹیکس لگانے پر مصر ہیں؟"

"بالکل ــــ"

"ضرور لگانا چاہتے ہیں؟"

"ضرور ــــ"

"اچھا تو سگائی کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"سگائی؟ کس کی سگائی؟ میری یا آپ کی؟"

"ہا ہا! واہ وزیر ٹیکس صاحب آپ ہیں تو وزیر لیکن معاف کیجیے گا میں نے سگائی...."

"بس بس آگے مت کہیے۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا.... لیکن.... لیکن سگائی کا ٹیکس سے کیا تعلق ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"میرا مطلب ہے۔ سگائی ٹیکس۔"

"اچھا اچھا۔ سگائی ٹیکس۔ خوب۔ خوب۔ بہت دور کی سوجھی۔ بھئی واہ کیا بات ہے۔ سگائی ٹیکس۔ واقعی آپ ذہین ترین آدمی ہیں۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

"اچھا بھلا اندازاً بتایئے آپ کے ملک میں ہر سال کتنی سگائیاں ہوتی ہیں؟"

"یہ تو کسی پنڈت سے دریافت کیجیے۔"

"نہیں نہیں۔ مذاق چھوڑیئے۔ بتایئے۔"

"کوئی دس بارہ لاکھ۔"

"ٹھیک! اگر ہر سگائی پر دس روپے ٹیکس لگایا جائے تو ایک کروڑ سے کچھ زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ اچھا اور کوئی ٹیکس تجویز کیجیے۔"

"پیدائش ٹیکس۔"

"بہت خوب! بہت خوب! میرے خیال سے اپنے ملک میں ہر سال کوئی پچاس لاکھ نئے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پانچ روپے فی بچہ ٹھیک رہے گا۔"

"زیادہ ہے۔ غریب لوگ نہیں دے سکیں گے۔"

"تو پونے پانچ کر دیجیے۔ پچاس لاکھ صرف پونے پانچ۔ کافی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اب آگے چلیے۔"

"کفن ٹیکس"

"ہاں ہاں کفن ٹیکس! کیوں نہیں۔ اگر پیدائش ٹیکس لگ سکتا ہے، تو کفن ٹیکس لگانے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس ٹیکس سے بھی پچاس ساٹھ لاکھ کی رقم دستیاب ہو سکتی ہے۔ چلیے یہ بھی نوٹ کر لیا۔ اور......"

"بکری ٹیکس"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو شخص بکری پالے اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ آجکل گائے یا بھینس پالنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس ٹیکس کا دائرہ ذرا وسیع ہونا چاہیے کتنے ہی لوگ مرغیاں، بٹیریں، بلبلیں، طوطے، کتے، بلیاں اور چوہے بھی تو پالتے ہیں۔"

"تو چلیے بکری ٹیکس کے علاوہ بٹیر ٹیکس، جو ہا ٹیکس، مرغی ٹیکس بھی نکال دیجیے۔"

"اچھا اب کوئی ایسی چیز بتائیے جسے ہر شخص استعمال کرتا ہو۔ میری رائے میں اگر اس پر ٹیکس لگایا جائے تو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔"

"سوچنا پڑے گا۔"

"ہاں ہاں دو تین منٹ سوچ لیجیے۔ میں اتنے میں سگرٹ پیتا ہوں۔"

دو تین منٹ کے وقفے کے بعد میں نے کہا ـــــ "میرے خیال میں ایسی صرف دو چیزیں ہیں۔"

"فرمائیے۔"

"شیشہ اور کنگھی۔"

"شیشہ اور کنگھی!" وزیر ٹیکس نے کرسی پر اچھلتے ہوئے کہا۔ "آپ واقعی ذہین ترین آدمی ہیں شیشہ اور کنگھی! کنگھی اور شیشہ۔ کیا بات ہے واللہ!"

"اگر آپ ان دونوں پر ٹیکس لگا دیں چاہے معمولی سا تو کروڑوں کی آمدنی ہو سکتی ہے۔"

"کروڑوں! واسے نیارے ہو جائیں گے ۔ . . . اچھا اب ایک منٹ کے لئے دماغ کو پھر آزمائش میں ڈالئے اور سوچ کر بتائیے کہ کوئی ایسی چیز رہ تو نہیں گئی جس پر ہم نے ٹیکس نہیں لگایا۔ آپ بھی سوچئے، میں بھی سوچتا ہوں ۔"

"چند ثانیے ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ معاً وزیر ٹیکس نے کہا ۔ " ایک چیز کا تو مجھے پتہ چل گیا ہے ۔ باقی آپ بتا دیجئے ۔"

"وہ کون سی چیز ہے ؟"

"برف ؟"

"برف ؟"

"ہاں ہاں ! بھئی برف ! جانتے نہیں گرمی کے موسم میں ہر آدمی برف کا استعمال کرتا ہے ۔"

"خوب ' بہت خوب !" میں نے وزیر ٹیکس کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب آپ کہئے ' آپ نے کیا سوچا ہے ؟"

"میرے خیال میں تو ابھی بہت سی چیزیں باقی ہیں ۔ مثال کے طور پر " غرارہ ۔۔۔"

"آپ کا مطلب ہے ریشمی غرارہ ؟"

"ہاں"

"اس پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا ۔"

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ ۔۔۔" وزیر ٹیکس نے رازدارانہ لہجے میں کہا ۔۔۔ " شریمتی جی پہنتی ہیں ۔"

"تو رہنے دیجئے ۔۔۔ حنا کے متعلق کیا خیال ہے ؟"

"حنا پر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے ۔ حنا سے شریمتی جی کو خاص طور پر نفرت ہے ۔"

"خضاب ؟"

"خضاب پر ٹیکس لگانا ٹھیک نہیں رہے گا ۔ والد محترم خضاب لگاتے ہیں ۔ . . . خضاب کے علاوہ کوئی اور چیز بتائیے ؟"

"عینک ' چھتری ' بٹوا ' چاقو ' چمچہ ' دیگچی ' لحاف ' رضائی ' تکیہ ' تولیہ ' جھومر ' نتھ ' بازوبند

لکڑی، ونش پن، ہلدی، مرچ، دار چینی، گرم مصالحہ۔"

"بس بس کافی ہیں۔ میرے خیال میں ننانوے کروڑ کا خسارہ پورا ہو جائے گا۔"

"اگر اب بھی پورا نہ ہوا تو، دھوپ اور پانی پر بھی ٹیکس لگا دیجیے گا۔"

"نہیں نہیں ـــــ میرے خیال میں اس سال یہ نوبت نہیں آئے گی۔ اگلے سال دیکھا جائے گا ـــــ"

"اچھا تو اب مجھے اجازت ہے؟"

"بہت بہت شکریہ۔" وزیر ٹیکس نے مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے فرمایا۔
"آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے ـــــ آپ نہ صرف ذہین بلکہ ذہین ترین آدمی ہیں!"

شفیق الرحمان

ملکی پرندے

کوّا

کوّا گرامر میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔
کوّا صبح صبح موڈ خراب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ایسا موڈ جو پہلے بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا
علی الصبح کوے کا شور انسان کو مذہب سے قریب لاتا ہے اور نروان کی خواہش شدت سے پیدا
ہوتی ہے۔
کوّا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا وہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ کائیں کے کیا معنی ہیں
میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کوے کالے ہوتے ہیں۔ جی نہیں برفانی علاقوں میں
سفید یا سفیدی مائل .... کوّا سیاہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب میں سوچ کر بتاؤں گا۔
پہاڑی کوا ڈیڑھ فٹ لمبا اور بھاری ہوتا ہے میدان کے باشندے اس سے کہیں چھوٹے
کوے پر قانع ہیں۔ پہاڑی کوّا زیادہ بدنما ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ معمولی کوے سے حجم میں زیادہ ہوتا ہے۔
کبھی کبھی کوے ایک دوسرے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں دراصل ایک کوّا
دوسرے کوے کو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس سے ہم دیکھتے ہیں۔ دوسرے پرندوں کی طرح کوّوں
کے جوڑے کو کبھی چہلیں کرتے نہیں دیکھا گیا۔ کوا کبھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا —— یا کرتا ہے؟
کوّا کا بچپن گھونسلے میں گذرتا ہے جہاں اہم واقعات کی خبر نہیں پہنچتی اگر وہ عقلمند ہو تو بقیہ
عمر وہیں گذار دے، لیکن سوشل بننے کی تمنا اسے آبادی میں کھینچ لاتی ہے۔ جو کوا ایک مرتبہ شہر

آجائے وہ ہرگز پہلا سا کوا نہیں رہتا۔

کوے کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے۔ جن چیزوں کو وہ نہیں دیکھتا وہ اس قابل نہیں ہوتیں کوا بے چین رہتا ہے اور جگہ جگہ اڑ کر جاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ زندگی بے حد مختصر ہے، چنانچہ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے — یہ کون نہیں چاہتا۔

کوّے کو لوگ ہمیشہ غلط سمجھتے ہیں، سیاہ رنگ کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا جاتا۔ لوگ تو بس ظاہری رنگ و روپ پر جاتے ہیں، باطنی خوبیوں اور کیریکٹر کو کوئی نہیں دیکھتا۔ کوا کوئی جان بوجھ کر تو سیاہ نہیں ہوا۔ لوگ چڑیوں، مرغیوں اور کبوتروں کو دانہ ڈالتے وقت کووں کو بھگا دیتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح نہ صرف کووں کے لاشعور میں کئی باتیں بیٹھ جاتی ہیں بلکہ ان کی ذہنی نشو و نما پر برا اثر پڑتا ہے۔ آخر کووں کے بھی تو حقوق ہیں۔ کوا باورچی خانے کے پاس بہت مسرور رہتا ہے، ہر لحظے کے بعد کچھ اٹھا کر کسی اور کے لئے کہیں پھینک آتا ہے اور درخت پر بیٹھ کر سوچتا ہے کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

کہیں بندوق چلے تو کوّے اسے ذاتی توہین سمجھتے ہیں، اور لاکھوں کی تعداد میں کہیں سے آجاتے ہیں، اس قدر شور مچتا ہے کہ بندوق چلانے والا ہفتوں پچھتاتا رہتا ہے۔

بارش ہوتی ہے تو کوے نہاتے ہیں اور حفظانِ صحت کے قوانین کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔

کوا سوچ بچار کے قریب نہیں پھٹکتا، اس کا عقیدہ ہے کہ زیادہ فکر کرنا اعصابی بنا دیتا ہے۔ کوے سے ہم کئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کووں کا جوڑا اگر چاہے تو اپنی زندگی میں تقریباً ایک ہزار کوے تخلیق کر سکتا ہے مگر چند نامعلوم وجوہات کی بنا پر ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا اتنی بری نہیں جتنی ماہرین سمجھتے ہیں۔ کوا بڑی سنجیدگی سے اڑتا ہے بالکل ناک کی سیدھ میں۔ کوے اڑ رہے ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شرط لگا کر اڑ رہے ہیں۔ کوے فکرِ معاش میں دور دور نکل جاتے ہیں لیکن کبھی کھوئے نہیں جاتے، شام کے وقت کوئی ڈیڑھ دو ہزار کوا کہیں سے واپس آجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلط کوّے ہوں۔ کوا اتنا غیر رومانی نہیں جتنا بعض اوقات آپ سمجھتے ہیں۔ شاعروں نے اکثر کوے کو مخاطب کیا ہے۔ "کاگا لے جا ہمارو سندیش" — "کاگا رے جا رے جا رے" — تقریباً ہمیشہ کوے کو کہیں دور جانے کے لئے کہا گیا ہے کسی نے بھول کر بھی خوش آمدید نہیں کہا، بلکہ ایک شاعر نے تو یہاں تک

ہے دیا ـــــ" کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس" ـــــ یہاں میں کچھ نہیں کہوں گا آپ جانیں اور آپ کا کاگا۔

اگر آپ کوّوں سے نالاں ہیں تو یہ سن ہو لے کہ اور لوگ بھی نالاں ہیں۔ اگر آپ کوّوں سے سچ مچ نفرت ہے تو آپ مکان بدل سکتے ہیں۔

بلبل۔ بلبل ایک روایتی پرندہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے سوائے وہاں کے جہاں اسے ہونا چاہیئے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ نے چڑیا گھر میں بلبل دیکھی ہے تو یقیناً کچھ اور دیکھ لیا ہے۔ نیز ہم ہر اس خوش گلو پرندے کو جو نظر آئے بلبل سمجھتے ہیں قصور ہمارا نہیں، ہمارے ادب کا ہے۔ شاعروں نے نہ بلبل دیکھی ہے نہ اسے سنا ہے کیونکہ اصلی بلبل اس ملک میں نہیں پائی جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں کہیں کہیں بلبل ملتی ہے لیکن کوہ ہمالیہ کے دامن میں شاعر نہیں ہوتے۔

بلبل کی نظمیں "اے عندلیب" "عندلیب زار" یا "بلبل ناشاد" سے شروع ہوتی ہیں اُن کا اختتام "بلبل ناشاد" "عندلیب زار" اور "اے عندلیب" پر ہوتا ہے۔ اور درمیان میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ سائینٹ وہ نظم ہے جسے محض بلبل کے لئے لکھا گیا ہو ـــــ خوش قسمتی سے بلبل اَن پڑھ ہے۔

عام طور پر بلبل کو آہ و زاری کی دعوت دی جاتی ہے اور جی بھر کے رونے پیٹنے کو کہا جاتا ہے۔ بلبل کو ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔ ویسے بلبل ہونا کافی مضحکہ خیز ہوتا ہوگا۔

بلبل اور گلاب کے پھول کی افواہ کسی شاعر نے اڑائی تھی جس نے رات گئے گلاب کی ٹہنی پر بلبل کو نالہ و شیون کرتے دیکھا تھا، یا کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ پرندہ بلبل ہے اور وہ چیز نالہ و شیون، رات کو عینک کے بغیر کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔

بلبل جہاں بھی ہو مسرور رہتی ہے اگر اسے انسان نہ ستائے۔ دنیا میں بلبل کی تقریباً بلیں قسمیں دریافت ہو چکی ہیں، کوئی مزید پچاس قسمیں دریافت ہونے کے لئے منتظر ہیں۔

بلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے یعنی اگر پروں کو نکال دیا جائے تو کچھ

زیادہ بلبل نہیں بجتی۔

بلبل کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ بلبل رات کو کیوں گاتی ہے، پرندے جب رات کو گائیں تو ضرور کچھ مطلب ہوتا ہے۔ وہ اتنی رات گئے باغ میں اکیلی کیوں جاتی ہے۔ بلبل کو چہچہاتے سن کر دور کہیں ایک اور بلبل چہچہانے لگتی ہے، پھر کوئی بلبل نہیں چہچہاتی، وغیرہ۔

ہمارے ملک میں تو لوگ بس سکینڈل کرنا جانتے ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر کسی چیز کا یقین مت کیجئے۔

کبھی کبھار بلبل غلطیاں کرتی ہے لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی، چنانچہ پھر غلطیاں کرتی ہے۔ سیاسیات میں تو یہ چیز عام ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ بلبل کے گانے کی وجہ اس کی غمگین خانگی زندگی ہے جس کی ذمہ دار یہ ہر وقت کا گانا ہے دراصل بلبل ہمیں محظوظ کرنے کے لئے ہرگز نہیں گاتی، اسے اپنے فکر ہی نہیں چھوڑتے۔

کئی لوگ کہتے ہیں کہ بلبل گاتے وقت بل ـــ بل ـــ بلبل ـــ بل ـــ کی سی آوازیں نکالتی ہے ـــ یہ غلط ہے۔ بلبل پکے راگ گاتی ہے یا دوسرے؟ بہرحال اس سلسلے میں وہ بہت سے موسیقاروں سے بہتر ہے۔ ایک تو وہ گھنٹے بھر کا الاپ نہیں لیتی، بے سری ہو جائے تو بہانے نہیں کرتی کہ ساز والے نکمے ہیں آج گلا خراب ہے۔ اگر آپ بور ہونے لگیں تو اسے خاموش کرا سکتے ہیں ـــ اور کیا چاہیئے؟ جہاں تیتر سبحان تیری قدرت، پپیہا پی کہاں اور گیدڑ پدرم سلطان بود کہتا ہوا سنا گیا ہے وہاں بلبل کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصرعے کے ایک حصے پر اٹک گئی ہے ـــ شاید اسی میں آرٹ ہو ـــ مثلاً ـــ "مانا کہ ہم پہ جور و جفا، جور و جفا ..... " یا تعریف ہے اس خدا کی خدا کو ..... اور دے بغر و ختم بغر و ختم بغر و ختم ......"

ہو سکتا ہے کہ ہماری توقعات زیادہ ہوں لیکن قصور بلبل کا ہے، یہ گانے کا ریکٹ خود اس نے شروع کیا تھا۔ بلبل کو شروع شروع میں قبول صورتی، گانے بجانے کے شوق اور نفاست

پسندی نے بڑی شہرت پہنچائی۔ کیونکہ یہ خصوصیات دوسرے پرندوں میں یکجا نہیں ملتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیت جاتی رہتی ہے اور لوگوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور ہر بلبل پر نئی نئی تحریکوں اور جدید قدروں کا اتنا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بلبل سوئی صدی رجعت پسند ہے کچھ لوگ اس زمانہ میں بھی بلبل کے نغموں چاندنی راتوں اور پھولوں کے شائق ہیں۔ یہ لوگ حالاتِ حاضرہ اور جدید مسائل سے بے خبر ہیں اور سماج کے مفید ممبر ہرگز نہیں بن سکتے۔ وقت ثابت کر دے گا کہ ...... وغیرہ وغیرہ۔

جیسے گرمیوں میں لوگ پہاڑ پر چلے جاتے ہیں اسی طرح پرندے بھی موسم کے لحاظ سے نقل وطن کرتے ہیں اور کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں۔ بلبل سفر نہیں کرتی۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی وہاں ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بھی اگر بلبل نے اس ملک کا رخ کیا تو نتائج کی ذمہ داری پیشتر اس کے کہ آپ مجھ سے پوچھیں کہ آیا میں نے بلبل دیکھی ہے، میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں...... اگر میں نے بلبل نہیں دیکھی تو کیا آپ نے دیکھی ہے؟ ان دنوں میری دلی تمنا یہی ہے کہ اے کاش شاعروں کو کوئی بلبل دکھا دے۔

بھینس

بھینس موٹی اور خوش طبع ہوتی ہے۔

بھینسوں کی قسمیں نہیں ہوتیں، وہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بھینس بہت سے انسانوں کے لئے باعث مسرت ہے، ایسے لوگوں کی زندگی میں بھینس کے علاوہ مسرت بس گنی گنائی ہوتی ہیں۔ دوسرے ملک اپنے نوادرات اور عجائبات پر ڈینگیں مارتے رہیں لیکن جہاں تک بھینس کا تعلق ہے کوئی ہمارے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ بھینس کا ہم عصر جو پایہ گائے دنیا بھر میں تمام ہے لیکن بھینس کا فخر صرف ہمیں ہی نصیب ہے۔ تبت میں گائے کے وزن پر سواگائے ہوتی ہے، سوا بھینس کہیں نہیں ہوتی۔ پروفیسر کہتے ہیں کہ افریقہ میں بھینس سے ملتی جلتی کوئی چیز ہوتی ہے مگر وہ دودھ نہیں دیتی۔ پروفیسر اتنا نہیں سمجھتے کہ جو چیز دودھ نہ دے بھلا وہ بھینس جیسی کیسے ہو سکتی ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بھینس اتنی ہی بے وقوف ہے جتنی دکھائی دیتی ہے، یا اس سے کم

کیا بھینسیں ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں؟ غالباً نہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہو مگر اتنی اندھی نہیں
بھینس کے بچے شکل صورت میں ننھیال اور ددھیال دونوں پر جاتے ہیں لہٰذا فریقین
ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بھینس سے ہماری محبت بہت پرانی ہے، بھینس ہمارے بغیر
رہ لے لیکن ہم بھینس کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتے۔ آج کل یہ شکایت عام ہے کہ لوگوں کو کوٹھی
ملتی ہے تو ایسی جس میں گیراج تک نہیں ہوتا جہاں بھینس باندھی جا سکے۔ پتہ نہیں دوسرے
ملکوں کے لوگ بھینس کے بغیر صبح و شام کیسے بسر کرتے ہیں، انھیں اندازہ نہیں کہ وہ کیسی نعمت
سے محروم ہیں۔

جس گھر میں بھینس ہو (اور بھینس کہاں نہیں ہے) وہاں اندرونِ حویلی سب کے سب
صبح کاذب سے لے کر اگلی صبح صادق تک بھینس کے چکنے اونٹے ہوئے دودھ کے لمبے لمبے گلاس
غٹ غٹ چڑھاتے ہیں، پھر خمار چڑھتا ہے، کائنات اور اس کا کھیل بے معنی معلوم ہونے لگتا
ہے کسی اور دنیا کے خواب نظر آتے ہیں جہاں اور بھینس کا دودھ ہو تا کہ کسی تیسری دنیا کی آرزو
کی جا سکے۔ رہ گئی یہ دنیا سو یہ دنیا تو مایا ہے مایا۔!

کئی بھینسیں اتنی بھدی نہیں ہوتیں مگر کچھ ہوتی ہی ہیں۔ دور سے یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا
ہے کہ بھینس اس طرف آ رہی ہے یا اس طرف جا رہی ہے۔ رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر ـــ
والا شعر یاد آنے لگتا ہے۔ بھینس اگر ورزش کرتی اور غذا کا خیال رکھتی تو شاید سمارٹ ہو سکتی
تھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا بعض لوگ پورا احتیاط کرنے پر بھی موٹے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بھینس کا شغلہ جگالی کرنا ہے یا تالاب میں لیٹے رہنا۔ وہ اکثر نیم باز آنکھوں سے گھنٹوں
افق کو تکتی رہتی ہے۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ کہ وہ کیا سوچتی ہے ـــ وہ کچھ بھی نہیں
سوچتی! اگر بھینس سوچ سکتی تو رونا کس بات کا تھا۔

ڈارون کی تھیوری کے مطابق صدیوں سے ہر جانور اسی کوشش میں ہے کہ اپنے آپ کو
بہتر بنا سکے۔ یہاں تک کہ بندر انسان بن گئے ہیں، لیکن بھینس نے محض سستی کی وجہ سے اس
تگ و دو میں حصہ نہیں لیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ارتقائی دور ختم ہو چکا ہے کیونکہ انسان بالکل
نہیں سدھر رہا۔ بھینس یہ سب کچھ نہ جانتی ہے نہ جاننا چاہتی ہے، اگر آپ اسے نقشوں اور

تصویروں کی مدد سے سمجھانا چاہیں تب بھی بے سود ہوگا۔

بھینس کا حافظہ کمزور ہے، اسے کل کی بات آج یاد نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے وہ انسان سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ اگر بھینس کی کمر میں پتھر یا لٹھ آ لگے تو وہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتی ذرا سی کھال ہلا دیتی ہے، بس اسے فلسفۂ عدم تشدد کہتے ہیں۔

بھینسے کو بالکل نکما سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہل میں جوتنے کی اسکیم ناکامیاب رہی کیونکہ وہ دائمی طور پر تھکا ہوا اور ازلی سست ہے —— اس نے بچپن میں بھینس کا دودھ پیا تھا۔

کبھی کبھی بھینسا چہرے کی جھریوں کو دیکھ کر چونک اٹھتا ہے اور سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو جاتا ہے —— لیکن یہ حرکت کون نہیں کرتا؟

بھینس کے سامنے بین بجائی جائے تو نتیجہ تسلی بخش نہیں نکلتا۔ بھینس کو موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کبھی کبھی مجھ پر موڈ آتے ہیں جب میں گائے بکری وغیرہ کو بھی بھینس جیسا سمجھنے لگتا ہوں۔

الّو۔ الو بردبار اور دانش مند ہے لیکن پھر الو ہے۔ وہ کھنڈروں میں رہتا ہے لیکن کھنڈر بننے کی وجوہات دوسری ہیں۔ الو کا ذکر پرانے بادشاہوں نے اپنے روزنامچوں میں کیا ہے لیکن اس سے الو کی پوزیشن بہتر نہ ہو سکی۔

الو کی چالیس قسمیں بتائی جاتی ہیں، میرے خیال میں پانچ چھ قسمیں کافی تھیں۔ سیاہ الو جنوبی حصوں میں ملتا ہے، چت کبرا الو یورپ میں اور برفانی الو برفانی علاقوں میں پایا جاتا ہے بعض الو جہاں جاؤ موجود ہوتا ہے ویسے الوؤں کی عادتیں آپس میں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ایک الو کو دیکھ لینا تمام الوؤں کو دیکھ لینے کے مترادف ہے۔

الو کو وہی پسند کر سکتا ہے جو فطرت کا ضرورت سے زیادہ مداح ہو۔ روز مرہ کے اوسط الو کو بوم کہا جاتا ہے، اس سے بڑے کو چغد۔ چغد سے بڑا الو ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔

پالتو الو وہ لوگ رکھتے ہیں جو اس قسم کی چیزوں کو پالنے کے عادی ہوں۔ الو کی شکل صورت میں اصلاح کی بہت کچھ گنجائش ہے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک الو دوسرے الو کو کیوں کر بھا جاتا ہے۔ دن بھر الو آرام کرتا ہے اور رات بھر ہو ہو کرتا ہے۔ اس میں کیا مصلحت؟

ہے! ــــ میرا قیاس اتنا ہی صحیح ہے جتنا آپ کا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اُلو تو ہی تو کا وظیفہ پڑھتا ہے اگر یہ سچ ہے تو وہ خود پسندوں سے ہزار درجے بہتر ہے جو ہر وقت میں ہی میں کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

یورپ میں اُلو مقابلتاً کم گو ہے اور دو تین بار ٹووِٹ ٹووو کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ شوخ اور باتونی پرندوں میں اُلو کا رتبہ منفرد ہے کیونکہ وہ چپ چاپ رہتا ہے اور غالباً حسِ مزاح سے محروم ہے، بہت سے لوگ محض اس لئے ذی فہم سمجھے جاتے ہیں کہ وہ کبھی نہیں مسکراتے۔

اُلو کی سوشل زندگی بڑی دلچسپ ہے۔ اُلو یہ انتظار نہیں کرتے کہ کوئی ان کا تعارف کرائے دیکھتے دیکھتے یوں بے تکلف ہو جاتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ شریکِ حیات منتخب کرتے وقت اُلو شکل صورت، خاندان اور طبیعت کا خیال نہیں رکھتے تبھی وہ صدیوں سے ویسے کے ویسے ہیں۔ مادہ ننھے بچوں کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے مگر جونہی وہ ذرا بڑے ہوئے اور ان کی شکل اپنے ابا سے ملنے لگی انہیں باہر نکال دیتی ہے۔

اُلو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ یہ سب بے سود ہے اُلو دوسرے پرندوں سے میل جول نہیں رکھتا۔ وہ اپنا وقت اور زیادہ اُلو بننے میں صرف کرتا ہے "آپ کام، سو مہا کام" ـــ اُلو کا مقولہ ہے۔

اُلو کا محبوب مشغلہ رات بھر بھیانک آوازیں نکال کر پبلک کو ڈرانا ہے، وہ جانتا ہے کہ پبلک کیا چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کی مثال تو ہم پرستی میں اُلو نے قابلِ تقلید حصہ لیا ہے بہت سے لوگ اپنی ناکامیوں کا سبب اس غریب اُلو کو بتاتے ہیں جو مکان کے پچھواڑے درخت میں رہتا ہے، اُلو کی نحوست ہوتی ہے مگر اس قدر نہیں۔

اُلو اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ اچھے اُلو وہ ہیں جو دور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اُلوؤں کو برا بھلا کہتے وقت یہ مت بھولئے کہ انھوں نے اُلو بننے کی درخواست تھوڑا ہی کی تھی۔

اُلو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر قدرت ایک مرتبہ کچھ ٹھان لے تو وہ پورا کر کے رہتی ہے۔

ماہرین غور کرتے رہتے ہیں کہ اُلو ہمیشہ تنہا کیوں نکلتا ہے، اُلوؤں کا جوڑا باہر کیوں نہیں نکلتا اس سے متعلقین کے بارے میں متعدد نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے

کہ اُلو دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں کہیں نایاب نہ ہو جائیں۔ انھیں فکر نہیں کرنا چاہیے
ایسی چیزیں نہیں مٹتیں، یہ ہمیشہ رہنے کے لئے دنیا میں آئی ہیں۔

ویسے اُلوؤں کے بغیر گذارا ہو سکتا ہے مگر وہ بات نہیں رہے گی۔

اُلو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے تو اس کی نیت آپ کو پریشان کرنے کی نہیں ہوتی ـــــ آپ بھی تو اسے گھور رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں بغیر زبان ہلائے وہ آپ کو ہم خیال بنا لے گا ـــ اسے ہپناٹزم کہتے ہیں۔

اُلو کی تلاش میں آپ کو زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔ اُلو آپ کے قیاس سے کہیں قریب ہے۔ انسان کو ناشکرا نہیں ہونا چاہیے، دنیا میں اُلو سے زیادہ بری چیزیں بھی ہیں۔ دوا لو اس ساری لے دے کے باوجود اُلو کی زندگی کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتی ہے۔

بلّی۔ بلیاں سلطنتِ برطانیہ کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں، چنانچہ بلیوں پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔

بلیوں کی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں، جو لوگ بلیوں کی قسمیں گنتے رہتے ہیں ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بلیاں پالنے والوں کو یہ وہم ہے کہ بلی ان کو خواہ مخواہ چاہتی ہے، اس لیے ہرگز نہیں کہ وہ بلی کے قیام و طعام کا انتظام کرتے ہیں ـــــ کاش کہ ایسا ہی ہوتا۔

بلیاں دو ہفتے کی عمر میں نخرے دکھانے شروع کر دیتی ہیں، بغیر کسی ٹریننگ کے۔ سنا ہے کہ کئی بلیاں دوسری بلیوں سے خوب صورت ہوتی ہیں۔ بعض لوگ سیامی بلی کو حسین سمجھتے ہیں (ایسے لوگ کسی چیز کو بھی حسین سمجھنے لگیں گے)، انگورا کی بلی کی جسامت اور خد و خال کتے سے زیادہ ملتے ہیں، ویسے ایرانی بلی ایک اچھی آل راؤنڈ بلی کہی جا سکتی ہے۔ ایران میں ایرانی بلیوں پر غیر ملکی بلیوں کو ترجیح دی جاتی ہے ـــــ سودیشی بدیشی کا سوال ہر جگہ ہے۔ ایرانی بلی بھی تماشا ہے، کبھی گربۂ مسکین بن جاتی ہے اور کبھی نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود ـــــ شاید ایرانیوں نے اپنی بلی کو نہیں سمجھا، یا شاید سمجھ لیا ہے۔

بلیاں میاؤں میاؤں کرتی ہیں، فونیٹکلی می ی ی آ آ ؤ ؤں کہتی ہے تاکہ ہر ایک سن لے۔ جب بلی زیرِ لب بڑبڑانا شروع کر دے اور تنہائی میں دیر تک بڑبڑاتی رہے تو سمجھ لینا

چاہیئے کہ وہ زندگی کے بہترین دن گذار چکی ہے۔ گرمیوں میں بلیاں پنکھے کے نیچے سو نہیں پاتیں، سردیوں میں بن ٹھن کر، ربن مندھوا کر دھوپ سینکتی ہیں، ان کے نزدیک زندگی کا مقصد یہی ہے۔ بلی کا بو نہ تر وا پن نوعمر لڑکے لڑکیوں کے لیے مہلک ہے، انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بلی کے لیے مفید ہے، وہ سب کے لئے مفید ہو گا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ بلیاں اتنی خودغرض اور مغرور کیوں ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو بغیر محنت کئے بلا ناغہ ایسی مرغن غذا ملتی رہے جس میں پروٹین اور وٹامن ضرورت سے زیادہ ہوں تو آپ کا رویہ کیا ہوگا؟

بلی دوسرے کا نکتۂ نظر نہیں سمجھتی۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ہم دنیا میں دوسروں کی مدد کرنے آئے ہیں تو اس کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔

سال بھر میں بلی سدھائی جا سکتی ہے، لیکن سال بھر کی مشقت کا نتیجہ صرف ایک سدھائی ہوئی بلی ہوگا۔ جہاں بقیہ چوپائے دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہیں وہاں بلی دودھ پینے والے جانوروں سے تعلق رکھتی ہے اگر غلطی سے دودھ کھلا رہ جائے تو آپ کی سدھائی ہوئی بلی پی جائے گی۔ اگر دودھ کو بند کر کے قفل لگا دیا جائے تب بھی پی جائے گی کیونکر؟ یہ ایک راز ہے جو بلیوں تک محدود ہے۔ شکی لوگ بلیوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ بلیاں کیا کریں، ان پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب انھیں خود اپنے اوپر اعتبار نہیں رہتا۔

بلی کو بلانے کے لیے پوس پوس، مانو مانو یا پسی پسی جیسے مہمل اور غیر مہذب کلمات استعمال کئے جاتے ہیں اور بلی پھر بھی نہیں آتی۔ کبھی کوئی بلی خواہمخواہ ساتھ ہو لیتی ہے جہاں جاؤ پیچھا کرتی ہے، ایسے موقعوں پر سوائے صبر و شکر کے کوئی چارہ نہیں۔ بلیاں پیار سے پنجے مارتی ہیں اور کبھی چند وجوہات کی بنا پر جنھیں غیر بلی نہیں سمجھتے کاٹ بھی لیتی ہیں۔ شکر ہے کہ بلی کے کاٹے کا علاج آسان ہے۔ اس کا کاٹا پاگل نہیں ہوتا۔

شہر میں بلیاں کافی بور ہو جاتی ہیں اور اس کا اظہار کرنے سے بھی نہیں چوکتیں بلیاں آپس میں لڑتی ہیں تو ناخنوں سے ایک دوسرے کا منہ نوچ لیتی ہیں اور مہینوں ایک دوسرے کو کوسنے دیتی رہتی ہیں۔

بلی اور کتے کی رقابت مشہور ہے بلی برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان کا کوئی دفادار دوست ہو۔ بلی میں برداشت بہت کم ہوتی ہے۔

بلیاں اپنی کمر کو خم دے کر بہت اونچا کر لیتی ہیں اور دیر تک کئے رکھتی ہیں اس کی وجہ تو وہی جانتی ہوں گی، مگر جو کچھ بھی وہ کرتی ہیں اکثر غلط ہوتا ہے ممکن ہے اس طرح وہ گیئر بدلتی ہوں۔

جب بلی چاند کی طرف دیکھ کر بری طرح روئے تو روئے سخن آپ کی یا میری طرف نہیں ہوتا، یہ سب کسی اور بلی کے لئے ہے۔

چند بلیاں گھر میں سارے چوہوں کو ختم کر سکتی ہیں چوہے تو دفع ہو جائیں گے مگر بلیاں رہ جائیں گی۔ بلیاں دن بھر میک اپ کرتی رہتی ہیں۔ ان کی جلد پر طرح طرح کے ڈیزائن ہوتے ہیں، موٹی بلیاں اپنے جسم پر لمبائی میں سیدھی دھاریاں بنالیں تو ان کا موٹاپا چھپ سکتا ہے۔ وہ چھریری اور "کیوٹ" معلوم ہوں گی۔

ہماری بلیاں اپنے آپ کو "جینئیس" سمجھنے لگتی ہیں، وہ کیوں نہ سمجھیں قصور ہمارا ہے بعض اوقات میں گھنٹوں سوچا رہتا ہوں کہ میں بلیوں سے دور رہتا تو بہتر ہوتا۔

بلیاں دوپہر کو سو جاتی ہیں وہ رات تک انتظار نہیں کر سکتیں۔ رات گئے بظاہر سوئی ہوئی بلی ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے باہر نکل جاتی ہے۔ غالباً یہ دیکھنے کہ باہر کیا ہو رہا ہے موسم کیسا ہے۔ جو آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں۔ اگلی صبح اس پر بس کیا جائے تو خفا ہو جاتی ہے۔ بلی کی جگہ کوئی بھی ہو خفا ہو جائیگا۔ ایک ہی گھر میں سالہا سال رہنے کے باوجود انسان اور بلی اجنبی رہتے ہیں۔ زندگی کتنی عجیب ہے ہمارے ملک میں اور چیزوں کی کمی ہو تو ہو بلیوں کی ہرگز کمی نہیں یہاں بلیاں اپنا "کیریئر" بنا سکتی ہیں وہ دن دور نہیں جب بلیاں مساوی حقوق مانگیں گی۔

بلی سامنے سے گذر جائے تو لوگ خوشخبری کا انتظار کرتے ہیں میں یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے میں کسی کام جا رہا ہوں اسی طرح بلی بھی کہیں جا رہی ہو گی۔ اندھیرے میں کالی بلی کا نظر آنا خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے پتہ نہیں بدقسمتی کیا ہوتی ہو گی۔ خیر کچھ بھی ہو ہم سب کی تقدیر میں بلی لکھی ہے آپ اپنی بلی سے نہیں بچ سکتے کوئی دلیر ہو یا بزدل، عقلمند ہو یا احمق کسی نہ کسی دن ایک بلی اسے آئے گی۔

ویسے ایرانیوں کا اصول ہے کہ گربہ کشتن روز اول۔

ڈرامہ

میرزا ادیب

آنسو اور ستارے

(تمثیل ایک باب میں)

کردار :- حسب ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں -

غیاث ــــــــــــــــــــ
ڈاکٹر ــــــــــــــــــــ
صغریٰ ــــــــــــــــــــ
ممتاز ــــــــــــــــــــ

منظر : شیخ غیاث احمد کے گھر کا ایک کمرہ -

سامان مختصر اور معمولی مگر بڑے قرینے سے رکھا گیا ہے - شمالی دیوار میں ایک دروازہ جو صحن میں کھلتا ہے کمرے میں صرف یہی ایک دروازہ ہے - اس وقت رات کے آٹھ بجے ہوں گے ، یہ موسم سرما کی رات ہے کھڑکیاں بند ہیں اور کمرے کے وسط میں ایک انگیٹھی کے اندر سرخ کوئلے کمرے کی فضا کو گرم کئے ہوئے ہیں

ایک طرف ایک پلنگڑی بچھی ہے جس میں آٹھ نو ماہ کا ایک بچہ آنکھیں بند
کئے پڑا ہے پلنگڑی کے پاس غیاث احمد اور ڈاکٹر کھڑے ہیں۔ غیاث احمد
بچے کو فکر مندانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر بچے کی نبض دیکھتا ہے
نبض دیکھنے کے بعد آہستہ سے بچے کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ جیب سے
سٹیتھسکوپ نکال کر بچے کی چھاتی کا جائزہ لیتا ہے پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

غیاث :۔ کیوں ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر :۔ کچھ فرق ہے۔ کل جیسی حالت نہیں۔

غیاث :۔ چھاتی ۔۔۔!

ڈاکٹر :۔ کل جیسی حالت نہیں، دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔

غیاث :۔ کتنا زرد ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر :۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔

غیاث :۔ کوئی فکر کی بات تو نہیں ہے نا۔

ڈاکٹر :۔ فکر نہ کیجئے۔ میں نے کہا نا جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ نسخہ لکھے دیتا ہوں وہی پڑیاں
مکسچر دینا ہے، وہ ختم ہو گئی ہوگی۔

غیاث :۔ جی ہاں

ڈاکٹر :۔ کل دوپہر کو دھوپ میں پشت پر سفید تیل بھی لگا دیجئے۔

(ڈاکٹر نسخہ لکھ کر کاغذ غیاث کو دے دیتا ہے)

غیاث :۔ ڈاکٹر صاحب دودھ۔

ڈاکٹر :۔ ایک حصہ دودھ میں دو حصے پانی۔

غیاث :۔ دے رہے ہیں

ڈاکٹر :۔ غیاث صاحب یہ آپ کا بچہ ہے بالکل ہے۔

غیاث :۔ میرا تو نہیں بہن کا ہے۔ میرا ہی سمجھ لیجئے اس سے اتنی محبت ہے جتنی ایک حقیقی باپ
کو ہو سکتی ہے۔ اس کی ماں ہسپتال میں اس کی پیدائش کے فوراً بعد مر گئی تھی۔ باپ بھی زندہ

نہیں تھا۔ بہن ہسپتال والوں کی منت سماجت کرکے اسے یہاں لے آئی —— ہم دونوں کو اس کا بڑا خیال رہتا ہے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر :۔ آپ دونوں کو اس کی بڑی فکر ہے۔!

غیاث :۔ دل بہل گیا ہے غم غلط ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا بچہ مر گیا تھا۔ اور بہن کے کوئی بچہ تھا ہی نہیں۔

ڈاکٹر :۔ فسادات میں مرا تھا آپ کا بچہ؟

غیاث :۔ فسادات سے کچھ پہلے۔ ان فسادات میں جو کچھ ہوا اس کی داستان بڑی دردناک ہے سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ بیوی کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں ملا۔ کبھی سوچتا ہوں، مار ڈالی گئی ہوگی۔ پھر خیال آتا ہے شاید زندہ ہو اور یہ دوسرا خیال سوہان روح ثابت ہو رہا ہے

ڈاکٹر :۔ مر چکی ہوگی

غیاث :۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے مگر دل نہیں مانتا۔ ہر روز اخبار دیکھتا ہوں کہ بازیافتہ خواتین کی فہرست میں اس کا نام کبھی نظر آجائے مگر نہیں۔ اب تک اس کا نام نظر نہیں آیا۔

ڈاکٹر :۔ یقیناً اس دنیا میں نہیں ہوگی (بیگ اٹھاتے ہوئے) اچھا نوکر کو بھیج دیجیے۔

غیاث :۔ خود لے آؤں گا۔ نوکر تو سو گیا ہے کیا ضرورت ہے جگانے کی۔

ڈاکٹر :۔ یقین ہے صبح تک اور فرق نظر آجائے گا۔ اطلاع دیجئے گا۔

غیاث :۔ بہتر۔

(ڈاکٹر کمرے سے نکل جاتا ہے غیاث دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر دیکھتا ہے یہ تصویر ممتاز کی ہے۔ دو تین لمحے تصویر دیکھنے کے بعد وہ کرسی پر گر پڑتا ہے اور کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتا ہے۔

صغریٰ آتی ہے۔ صغریٰ چھریرے بدن کی عورت ہے۔ رنگ کھلتا ہوا۔ سن چوبیس کے لگ بھگ۔ غیاث ابھی تک سوچ میں غرق ہے اسے بہن کی آمد کا علم نہیں ہے)

صغریٰ :۔ چلے گئے ڈاکٹر صاحب۔ کیا کہا انھوں نے؟

غیاث :۔(چونک کر) نہیں میں کچھ سوچ نہیں رہا۔
صغریٰ :۔ بھائی جان
غیاث :۔ نوکر سو رہا ہوگا۔ خود ہی جاؤں گا۔ قریب ہی تو ڈسپنسری ہے۔
صغریٰ :۔ بات کیا ہے بھائی جان۔ کیا کہا ڈاکٹر صاحب نے؟
غیاث :۔ کہتے ہیں دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔
صغریٰ :۔ آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ اتنی فکر کیوں کرتے ہیں بچے کی جب ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے تو پھر کیسی؟
غیاث :۔ میں بچے کے بارے میں فکر مند نہیں ہوں
صغریٰ :۔ تو پھر سوچ کیا رہے ہیں۔
غیاث :۔ آج یونہی ایک خیال ذہن میں آگیا۔ تمہیں معلوم ہے ممتاز اپنی سالگرہ کا دن کتنے اہتمام سے منایا کرتی تھی اور آج اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ ۲۹ جنوری —— ہم دونوں سالگرہ کے موقع پر ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے۔ آج یک لخت پرانی یادیں ذہن میں امڈ پڑی ہیں۔ کاش مجھے صرف یہ معلوم ہو جائے کہ وہ زندہ ہے یا ——
صغریٰ :۔ بھائی جان! اگر وہ زندہ ہو تو۔
غیاث :۔ زندہ ہو۔ (غم سے بوجھل پلکیں اٹھا کر دیکھتے ہوئے) سب سے بڑا غم تو یہی ہے۔
صغریٰ :۔(یہ محسوس کر کے بھائی کو اس ذکر سے صدمہ پہنچتا ہے) بھائی جان! ڈاکٹر کہتا ہے بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔
غیاث :۔ (اپنے خیال میں) دنیا میں کتنے بڑے دکھ ہیں۔ انسان کس طرح دوسرے کو تباہ کر دیتا ہے۔ کتنی بے دردی، کتنی سفاکی کے ساتھ۔ پھر یہی انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے —— اشرف المخلوقات —— آج کے انسان میں تو انسانیت رہی ہی نہیں۔
صغریٰ :۔ بھائی جان، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے
غیاث :۔ (چونک کر) کیا پوچھا ہے تم نے —— ڈاکٹر، ہاں ڈاکٹر کہتا تھا۔ دو دو گھنٹے کے بعد یہ پڑیا کھلا دینا —— دوا لے آتا ہوں۔

صغریٰ:۔ آپ آرام کیجئے بھائی جان، محمود لے آئے گا
غیاث:۔ ابھی لے آتا ہوں۔ قریب ہی تو ڈسپنسری ہے۔

(غیاث کمرے سے نکل جاتا ہے۔ صغریٰ اسے جاتے ہوئے دیکھتی ہے۔ پھر بچے کے پاس پہنچتی ہے۔ جھک کر اسے دیکھتی ہے۔ اور کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ چار پانچ لمحے گذر جاتے ہیں۔ ممتاز دروازہ پر آتی ہے۔ جھانک کر اندر دیکھتی ہے۔ صغریٰ تیزی سے اس کے پاس پہنچتی ہے)

ممتاز: (سرگوشی سے) کوئی ہے تو نہیں؟
صغریٰ:۔ آجاؤ۔
ممتاز:۔ سو گئے۔
صغریٰ:۔ نہیں بچے کے لئے دوا لینے گئے تھے۔
ممتاز:۔ جلدی آجائیں گے!
صغریٰ:۔ دروازہ بند کر دیتی ہوں۔

(ممتاز اندر آتی ہے۔ صغریٰ دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دیتی ہے۔ ممتاز مڑ کر دروازہ کو دیکھتی ہے۔ پھر بچے کی پلنگڑی کے نزدیک پہنچ کر بچے کو محبت سے دیکھتی ہے۔)

ممتاز:۔ کیا حال ہے، اب کچھ فرق تو ضرور محسوس ہوتا ہے۔
صغریٰ:۔ ہاں کافی فرق ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے دو ایک روز تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا
ممتاز:۔ رنگ ابھی زرد ہے
صغریٰ:۔ ٹھیک ہو جائے گا۔
ممتاز:۔ صغریٰ کو احسان مند نگاہوں سے دیکھکر، بڑی تکلیف اٹھائی ہے تم نے۔ آخری سانس تک تمہارا احسان نہیں بھولوں گی ـــــ ان کے آنے سے پہلے پہلے مجھے واپس چلا جانا چاہیئے۔

صغریٰ: جب دروازہ بند ہے تو پھر فکر کی کیا ضرورت ہے۔ جب دروازہ کھٹکھٹائیں تم ادھر الماری کے پیچھے چلی جانا۔ وہ دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جائیں گے۔ پھر صبح تک نہیں آئیں گے۔

ممتاز: ایک ایک لمحہ جو میں یہاں گذارتی ہوں میرے لئے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔

صغریٰ: یہ صرف اسی لئے کہ تم اپنے آپ کو مجرم سمجھتی ہو۔

ممتاز: مجرم اپنے آپ کو مجرم نہ سمجھے تو اور کیا سمجھے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ سمندر کے کنارے ریت کا ایک گھروندا بنا رہی ہوں۔ کسی نہ کسی وقت ایک تند و تیز لہر آئے گی اور اس گھروندے کو بہا کر لے جائے گی۔ میرا یہاں آنا میرے لئے نہیں اس معصوم کے لئے بھی سخت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ـــــ کئی بار ارادہ کیا کہ آئندہ یہاں نہیں آؤں گی۔ مگر ممتا چین لینے نہیں دیتی۔

صغریٰ: کاش تم بھائی جان کے سینے میں جھانک سکتیں۔ تمہیں معلوم ہو جاتا بھائی جان وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔

ممتاز: سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ ایک ہی طرح عمل کرتے ہیں۔

صغریٰ: یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟

ممتاز: اب تک اس قسم کی بدنصیب عورتوں کے ساتھ مردوں نے کیا سلوک کیا ہے تم اس سے واقف نہیں ہو؟

صغریٰ: بھائی جان ان مردوں سے مختلف ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے کہہ رہے تھے آج ممتاز کی سالگرہ کا دن ہے۔ سالگرہ کے موقع پر ہم ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے۔ جب وہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے تو میں محسوس کر رہی تھی کہ ان کے سینے میں آنسوؤں کا سیلاب موجزن ہے۔

ممتاز: یہ سیلاب غصے کے شراروں میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔

صغریٰ :- جی چاہتا ہے آج یہ دیوار ہٹا دوں ان سے صاف صاف کہہ دوں (بھائی جان) ممتاز زندہ ہے یہ اس کا ——

ممتاز :- (بے تاب ہو کر) صغریٰ

صغریٰ :- بھابی !

ممتاز :- اپنا وعدہ بھول گئی ہو —— چاہتی ہو کہ میں زندہ نہ رہوں —— چاہتی ہو کہ پھول نفرت سے اٹھا کر کسی یتیم خانہ میں پھینک دیا جائے !

صغریٰ :- نہیں بھابی !

ممتاز :- تو پھر خاموش رہو۔ ایک لفظ بھی زبان پر نہ لاؤ۔ اگر تمہیں کچھ میرا خیال ہے۔ اگر اس معصوم کی سسرتوں کا خیال ہے تو سمجھ لو وہ بدنصیب عورت مرچکی ہے جو کبھی تمہاری بھابی تھی جس کا نام ممتاز تھا۔

صغریٰ :- آج انھوں نے کہا تھا انسان انسان پر کس بیدردی اور سفاکی سے ظلم کرتا ہے اور یہی انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے۔ دیکھو تو تمہاری تصویر انھوں نے دیوار پر لگا رکھی ہے —— روز اسے تکتے ہیں۔ یہ دیکھو اخبارات کا انبار ان کی نظریں ہر پرچے میں تمہارا نام تلاش کرتی رہتی ہیں انھیں ابھی تک یقین ہے کہ تم ایک روز آجاؤ گی۔

ممتاز :- اگر انھیں اس بات کا علم ہو جائے کہ بعض آنے والیاں اپنے ساتھ اپنی بدقسمتی کا بوجھ بھی اٹھا کر لے آتی ہیں اور میں بھی انھیں عورتوں میں شریک ہو چکی ہوں تو ان کا رویہ بالکل بدل جائے۔ پھر ان کی نظریں بازیافتہ خواتین کی فہرست پر نہ پڑیں۔ پھر یہ تصویر اس دیوار پر آویزاں نہ رہے۔ پھر انھیں کبھی سالگرہ کی یاد بھی نہ ستائے۔

صغریٰ :- یہ کس جرم کی سزا ہو گی ؟

ممتاز :- یہ اس جرم کی سزا ہو گی جسے ایک عورت کی بے کسی اور مجبوری کہا جاتا ہے۔ تم لوگ جالندھر سے آگئے مگر میرے راستہ میں درندے نما انسان برچھیاں تان کر کھڑے ہو گئے۔ پھر مجھے ایک چار دیواری میں بند کر دیا گیا۔ میں کیا کر سکتی تھی۔

ایک بے کس و مجبور عورت کیا کر سکتی تھی۔ اور پھر ایک مدت کے بعد جب ایک انسان نے مجھے پاکستان کی سرحد پر پہنچایا تو میں اپنے وجود کے اندر اپنی بے کسی کی نشانی لئے ہوئے تھی۔ جب تک یہ پیٹ میں تھا۔ میں چاہتی تھی اس کا نشان تک ختم ہو جائے لیکن جب ایک ہسپتال کے ایک کمرے میں میرے وجود کی خلوت سے نکل کر میرے آغوش میں آگیا تو میری سوئی ہوئی ممتا جاگ اٹھی۔ نفرت کا جذبہ جس کو تو یا وہ سے پرورش کر رہی تھی نہ جانے کہاں گیا —— اس کی معصوم نگاہیں جیسے کہہ رہی تھیں میں تمہارا خون ہوں میں تمہارے جسم کا ایک حصہ ہوں۔ میں تمہارا سب سے مقدس جذبہ ہوں۔ میں تمہاری تمناؤں اور آرزوؤں کی دنیا ہوں —— اس کے ننھے ننھے ہاتھ میرے گالوں کو چھونے لگے اور میں اپنے سینے میں برف کی ایک تاش پگھلتی ہوئی محسوس کرنے لگی۔ ایک دن تم اتفاقاً ہسپتال پہنچ گئیں۔ تم نے میری کہانی سنی اور پھر —— میرے بچے کو لے پالک بنا کر اس گھر میں لے آئیں اور میں ایک اسکول میں معلمہ بن گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا قصہ ہے۔ مگر اس میں ایک عورت نے اپنے دل کی تمام دھڑکنیں سمو دی ہیں۔ اپنے بچے کو اپنے دل کے ٹکڑے کو کتنی قریب سے دیکھ رہی ہوں لیکن کل میرے اور اس کے درمیان کئی میل حائل ہو جائینگے۔ یہ فاصلہ بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ میں پاکستان کے دوسرے کونے میں چلی جاؤنگی۔

صغریٰ:۔ بھابی!

ممتاز:۔ ایک خاندان ٹھاکہ جا رہا ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلی جاؤں۔ کم از کم ایک خطرہ تو دور ہو جائے گا۔ آج رات آخری مرتبہ یہاں آئی ہوں رجیب سے ایک رسٹ واچ نکالتی ہے) یہ گھڑی تمہارے بھائی جان نے مجھے آخری سالگرہ پر دی تھی جب یہ بڑا ہو جائے گا تو اسے دے دینا —— اور کچھ بھی نہیں دے سکتی۔

(گھڑی تپائی پر رکھ دیتی ہے)

صغریٰ:۔ صبح چلی جاؤگی؟

ممتاز:۔ ہمیشہ کے لئے یہ میرا اٹل ارادہ ہے۔ بچے کی اس میں بہتری ہے

(ممتاز بچے کو گود میں اٹھاتی ہے۔ بچہ رونے لگتا ہے)

ابھی بدن گرم ہے

(صغریٰ کوئی جواب نہیں دیتی۔ حسرتناک نظروں سے یہ منظر دیکھنے لگتی ہے

ممتاز بچے کو پلنگڑی پر لٹا دیتی ہے)

اچھا خدا حافظ (بچے پر نظر ڈالتی ہے)

صغریٰ:- بچے کو خاموش تو کرا جاؤ۔

ممتاز:- مجھے جانے دو۔ کافی دیر ٹھہر چکی ہوں کہیں میرے سینے کا طوفان میری آنکھوں میں نہ آ جائے۔

(دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے

ممتاز گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے)

غیاث:- (باہر سے) صغریٰ!

صغریٰ:- جی

غیاث:- دروازہ کیوں بند کر لیا ہے

(صغریٰ ممتاز کو ہاتھ کا اشارہ کرتی ہے جس کا مطلب ہے پرے
چلی جاؤ۔ ممتاز کمرے کے اس حصے میں چلی جاتی ہے جو تاریک
ہے۔ صغریٰ دروازہ کھولتی ہے بچہ رو رہا ہے)

غیاث:- (اندر آ کر) بچہ کیوں رو رہا ہے

صغریٰ:- جاگ پڑا ہے۔

(غیاث دوا تپائی پر رکھ دیتا ہے اور بچے پر جھکتا ہے)

غیاث:- تم نے اٹھایا نہیں۔

صغریٰ:- میں نے نہیں اٹھایا۔ (غیاث بچہ کو اٹھا لیتا ہے)

غیاث:- چمچہ میں ایک پڑیا گھول دو

صغریٰ:- بہتر

(صغریٰ چمچہ میں گھول ڈالتی ہے۔ پھر پڑیا گھول کر بچے کے منہ میں آہستہ آہستہ انڈیلتی ہے)

مجھے دیدیں اور آپ کمرے میں جاکر آرام کریں

غیاث: چپ کرالوں

صغریٰ: چپ ہوجائے گا۔ لائیے مجھے دیجئے۔ ۔

صغریٰ بچہ کو گود میں اٹھالیتی ہے۔ بچہ خاموش ہوجاتا ہے ۔

غیاث: تمہارے پاس جاکر خاموش ہوگیا

صغریٰ: آپ اسے چپ کرانے کا طریقہ نہیں جانتے ۔ اچھا اب آرام کیجئے ۔

غیاث: دو گھنٹے بعد دوائی دینی ہوگی

صغریٰ: دے لونگی ۔

غیاث: اچھا —— یکایک تپائی پر رسٹ واچ دیکھکر) یہ کیا ہے ۔

(غیاث رسٹ واچ اٹھالیتا ہے)

صغریٰ: (گھبراکر) ایک سہیلی کی ہے یہیں چھوڑ گئی ۔

غیاث: (آہ بھرکر) اسی قسم کی گھڑی میں نے ممتاز کو سالگرہ کے موقع پر دی تھی

صغریٰ: پرانی باتیں یاد نہ کیجئے بھائی جان! خواہ مخواہ دکھ ہوتا ہے

غیاث: صغریٰ تم جاکر سو رہو۔ میں اب نہیں سو سکوں گا۔ ادھر بھی جاکر جاگتا ہے تو ادھر کیوں نہ بیٹھا رہوں —— تم کیوں اپنی نیند حرام کرتی ہو۔

صغریٰ: آپ جاکر لیٹیں تو سہی۔ نیند آجائے گی ۔

غیاث: تمہیں اصرار ہے تو میں چلا جاتا ہوں ۔ نیند نہ آئی تو آجاؤں گا۔ پھر تمہیں جانا پڑے گا

صغریٰ: بہتر

(رسٹ واچ کو ایک بار پھر دیکھتا ہے اور تپائی پر رکھ دروازے سے نکلنے لگتا ہے۔ جب وہ دروازے سے نکل جاتا ہے تو ممتاز آتی ہے)

دیکھا بھابی اس شخص کے متعلق بھی تمہاری ہی رائے ہر جو عام مردوں کے بارے میں ہوسکتی ہو

ممتاز: مجھے جانا ہی چاہیئے۔ دور یہاں سے بہت دور

صغریٰ :- ذرا ٹھہرو۔ کمرے میں چلے جائیں
(ممتاز دو تین لمحے خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر دروازے کی طرف
جاتی ہے۔ غیاث آتا ہے۔ ممتاز ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔
غیاث پر بھی اس کی نظریں نہیں پڑیں)
غیاث :- ابھی نہیں آئے گی نیند (ممتاز کو دیکھتا ہے) کون (ایک قدم آگے بڑھ کر) ممتاز
(ممتاز منہ سے کچھ نہیں کہتی۔ آنکھیں جھکا لیتی ہے)
صغریٰ یہ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں!
صغریٰ :- بھائی جان! یہ بھابی ہی ہیں
غیاث :- تو ــــ تو ــــ یہ کیا ہوا ــــ یہ ہو کیا رہا ہے!
صغریٰ :- بھابی! اب تو وہ دیوار خود بخود گر پڑی ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے
اپنا وعدہ نہیں توڑا۔ اب خاموش نہ رہو۔
غیاث :- ممتاز!

(ممتاز خاموش رہتی ہے)
صغریٰ :- یہ کچھ نہیں بتائے گی بھائی جان! میں ہی بتاتی ہوں۔ بھابی زندہ سلامت پاکستان
میں آگئی مگر ــــ بھائی جان! آپ جانتے ہیں اس فساد میں عورت پر جو ظلم ہوئے
ہیں تاریخ ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بھابی اپنے بچے کو ایک جرم سمجھتی تھی۔ یہ
یہ بچے نے پالک بنا کر ہسپتال سے اٹھا لائی اور آپ سے کہہ دیا کہ اس کے والدین
فوت ہو چکے ہیں ــــ بھابی ایک سکول میں معلمہ بن گئی اور آپ کی غیر موجودگی
میں بچے کو دیکھتی رہی ــــ یہ بچہ ممتاز کا ہے ــــ یہ گھڑی ممتاز کی ہے۔ جو
اس نے اپنے بچے کو دی ہے۔ کیونکہ کل یہ ڈھاکہ چلی جائے گی۔
(صغریٰ خاموش ہو جاتی ہے ــــ ممتاز بچے کو گود میں اٹھاتی ہے
اور چپ چاپ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ غیاث راستہ روک
اٹھا کر آگے بڑھتا ہے۔

غیاث :- ممتاز اپنی سالگرہ کا تحفہ تو لے جاؤ!

(ممتاز رک جاتی ہے مگر بولتی نہیں)

یہ تمہاری چیز ہے اسے یہاں نہیں رہنا چاہیے اور تم بھی مجھے تحفہ دیا کرتی تھیں۔ میں تم سے یہ چیز مانگتا ہوں — یہ بچہ

(غیاث بچہ ممتاز سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے)

ممتاز :- آپ — (مسرت و حیرت سے وہ کچھ کہہ نہیں سکتی)

صغریٰ :- بھائی جان! — (تیزی سے ان کی طرف بڑھتی ہے اور پردہ گرتا ہے)

سالنامہ ادب لطیف سنہ ۱۹۵۱ء